شیطان کے پجاری

بیرسٹر رحمان جمیل ہائی کورٹ کی پرانی مگر پرشکوہ عمارت کی بیرونی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ وہ ایک بہت اہم مقدمہ جیت کر عدالت سے نکل رہے تھے۔ ایک ایسا مقدمہ جس کا ایک عرصے سے ملک بھر کے اخبارات میں چرچا تھا اور جس کے فیصلے پر نہ جانے کتنے لوگوں کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ لوگ بھی تجسس و اشتیاق سے اس کیس کے فیصلے کے منتظر تھے جن کا اس سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ تو صحیح معنوں میں اس کے تماشائی بھی نہیں تھے۔ وہ تو محض اخباروں میں اس کے تذکرے پڑھ رہے تھے۔

بیرسٹر رحمان جمیل نے ملزم فیروز رشید کے دفاع کی ذمے داری قبول کی تھی اور انہوں نے یہ ذمے داری پوری کر کے دکھا دی تھی۔ بہت سے لوگوں کو یقین تھا کہ فیروز رشید کو سزائے موت ہو جائے گی لیکن رحمان جمیل نے اسے صاف بچا لیا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی اور اس کامیابی پر انہیں خوش نظر آنا چاہئے تھا۔ ان کے چہرے پر بشاشت ہونی چاہئے تھی لیکن ان کی کیفیت اس کے بالکل برعکس تھی۔

کوئی انہیں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ وہ کوئی بہت اہم کیس ہار کر آ رہے ہیں۔ چہرہ ستا ہوا، رنگت زرد اور آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک عجیب سی وحشت تھی۔ سیڑھیاں اترتے وقت وہ نہ تو نیچے دیکھ رہے تھے اور نہ ہی ان کی توجہ اردگرد کسی کی طرف تھی۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے ناک کی سیدھ میں جیسے کسی نادیدہ سی چیز کو تک رہے تھے اور انہیں گویا اس بات کی بھی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ سیڑھیاں اترتے وقت ان کا کوئی قدم غلط بھی پڑ سکتا تھا۔ وہ جیسے جاگتی آنکھوں سے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے تھے یا پھر وہ گویا نیند کے عالم میں چل رہے تھے اور کوئی غیبی قوت انہیں کسی خاص سمت میں کھینچے لئے جا رہی تھی۔ وہ اس قوت سے سخت خوفزدہ ہونے کے باوجود اس کے ساتھ گھسٹنے پر مجبور تھے۔

ان کے آس پاس سے یا پھر سامنے سڑک سے گزرتے لوگوں کو تو ان کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی۔ دنیا کے بیشتر بڑے شہروں کی طرح کراچی میں بھی اکثر لوگ تقریباً ہر وقت عجلت میں ہی نظر آتے تھے۔ کسی کو بس پکڑنے کی جلدی تھی، کسی کو رکشا ٹیکسی میں بیٹھنے کی جلدی تھی، کسی رکشا ٹیکسی والے کو اپنی سواری اتارنے کی جلدی تھی، کسی کو کام پر پہنچنے کی جلدی تھی، کسی کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی، غرضیکہ ہر کوئی عجلت میں تھا لیکن

اس تمام تر عجلت کے باوجود عالم یہ تھا کہ کسی کی آدھی زندگی مختلف کاموں کے سلسلے میں قطاروں میں کھڑے گزر جاتی تھی اور کسی کی بس اسٹاپوں پر۔۔۔ گویا وقت کا زیاں بھی رکنے میں نہیں آتا تھا۔

رحمان جمیل کے پیچھے ایک ایسی شخصیت چلی آ رہی تھی جس کی طرف بہت سے لوگوں کی توجہ تھی۔ یہ رحمان صاحب کا موکل رشید فیروز تھا جسے بہت سے اخباری رپورٹروں نے گھیرا ہوا تھا اور وہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ حقیقت میں تو رشید فیروز کو اس کے تین لحیم شحیم' بارعب اور باوردی مسلح گارڈز نے گھیرا ہوا تھا اور وہ اسے اپنے حفاظتی حلقے میں لئے چل رہے تھے۔ وہ رپورٹروں کو مناسب فاصلے پر رکھنے کی کوشش کر رہے تھے تاہم ان کا تعلق چونکہ اخبارات سے تھا اس لئے وہ ان کے ساتھ حتی الامکان تہذیب اور شائستگی سے پیش آ رہے تھے۔

رپورٹر' رشید فیروز پر سوالات کی بوچھاڑ کر رہے تھے لیکن درحقیقت وہ سب گھوم پھر کر ایک ہی بات جاننا چاہتے تھے کہ وہ ایک ایسے خطرناک کیس سے بری ہونے کے بعد کیسا محسوس کر رہے تھا' جس میں اسے سزائے موت بھی ہو سکتی تھی۔ رشید فیروز ان کے سوالات پر بڑے تحمل سے مربیانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ شاید اس کے خیال میں یہ ایک بچگانہ سوال تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی؟ موت کے منہ سے زندگی سلامت واپس آنے پر بھلا کوئی کیا محسوس کر سکتا تھا؟

ظاہر ہے وہ بہت خوش تھا۔ اسے نئی زندگی ملی تھی۔ ایک لٹکتی ہوئی تلوار گویا اس کے سر سے ہٹ گئی تھی۔ خصوصاً جبکہ اسے یہ بات بھی یقینی طور پر معلوم ہو چکی تھی کہ استغاثہ اب ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کے لئے اس کا کیس سپریم کورٹ میں لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا کیونکہ بیرسٹر رحمان جمیل جیسے آدمی کی موجودگی میں استغاثہ کو وہاں بھی کیس جیتنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ گویا بات ختم ہو گئی تھی۔ رشید فیروز کے سر سے خطرہ ٹل گیا تھا۔ اسے نئی زندگی مل گئی تھی۔

رشید فیروز کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اسے شہر کی ممتاز و معروف سماجی و کاروباری شخصیت کہا جاتا یا بدنام زمانہ آدمی؟ اس میں تو بہرحال کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بے حد دولت مند تھا لیکن اسے ذاتی طور پر یا غائبانہ جاننے والوں میں سے کسی کو بھی سو فیصد یقین نہیں تھا کہ وہ ساری کی ساری دولت جائز ذرائع سے ہی کمائی گئی تھی۔ یوں تو اس کے کئی کاروبار تھے اور شہر کے مرکزی علاقے میں ایک بڑی بلڈنگ کے دو طویل و عریض فلورز پر اس کے دفاتر بھی پھیلے ہوئے تھے لیکن کسی کا بھی یہ ماننے کو دل نہیں چاہتا تھا کہ اس کی تمام تر دولت انہی کاروباروں کی رہین منت تھی جن کے نام اس کے دفتر کے بڑے سے بورڈ پر لکھے ہوئے تھے۔



بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ڈرگ مافیا اور لینڈ مافیا کے اہم ارکان میں سے ایک تھا۔ بعض کا کہنا تھا کہ یہ اس کے ماضی کی باتیں تھیں ایک طویل عرصے سے تو اس کی دولت بینکوں کے ان قرضوں کی کوکھ سے جنم لے رہی تھی جو اس نے کبھی واپس نہیں کئے تھے۔ بعض کا خیال تھا کہ ماضی میں بھی اس کے یہی سب دھندے تھے اور اب بھی جائز کاروباروں کی آڑ میں یہی سب کچھ چل رہا تھا بلکہ کاروبار تو درحقیقت محض آڑ تھے ان سے کوئی منافع وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ سب صرف بلیک منی کھپانے اور کالے دھن کو سفید کرنے کے ذرائع تھے۔

اس کے بارے میں صحیح طور پر کسی کو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ شہرت کے افق پر اس کی شخصیت نمودار کیسے ہوئی تھی۔ بارہ پندرہ برس پہلے تک کوئی اسے جانتا تک نہیں تھا پھر دھیرے دھیرے اس کا نام سامنے آنا شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر اسے جاننے لگا۔ اخبارات میں اکثر و بیشتر کسی نہ کسی حوالے سے اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی خبر اور کبھی کبھی تصویر بھی چھپتی رہتی۔ کبھی وہ کسی تقریب کی صدارت کرتا' کبھی کسی فلاحی مہم میں حصہ لے رہا ہوتا' کبھی کسی مذاکرے میں شرکت کرتا' کبھی کسی نیک مقصد کے لئے کسی رفاہی تنظیم کو چیک دیتا تو اس کی تصویر اخبار میں ضرور آتی۔ غیر سیاسی شخصیت ہونے کے باوجود اکثر اہم قومی مسائل پر اس کا بیان بھی اخبارات کی زینت ضرور بنتا۔ غرضیکہ اخبارات والے کسی نہ کسی بہانے اسے ضرور یاد کر لیتے تھے یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ کسی نہ کسی بہانے اخبار والوں کو یاد کرتا رہتا تھا۔

رفاہی اور فلاحی سرگرمیوں کے سلسلے میں اس کا نام کافی نمایاں ہونے کے باوجود بہت سے لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ جس طرح اخبارات میں اس کے بارے میں اکثر اچھی خبریں چھپتی تھیں اس طرح "سینہ گزٹ" کے ذریعے اس کے بارے میں منفی باتیں سننے میں آتی رہتیں۔ کوئی دبی دبی زبان میں تبصرہ کرتا۔ "یہ رفاہی کام تو صرف ضمیر کی آواز دبانے کے لئے ہیں نہ جانے کیسے کیسے کاموں میں ٹانگ پھنسی ہوئی ہے بہت سا عذاب کما کر ساتھ میں تھوڑا سا ثواب کمانے کی کوشش کرتا ہے کہ زندگی میں کچھ توازن آ جائے۔"

کوئی دور کی کوڑی لاتا۔ "فلاں جگہ اس نے عشرت کدہ بنا رکھا ہے کئی لڑکیوں کے اغواء کے پیچھے بھی اس کا ہاتھ ہے۔"

کوئی خیال ظاہر کرتا "نیک کام بھی حرام کی کمائی میں سے کرتا ہے' اس طرح کوئی ثواب تھوڑا ہی ملتا ہے۔"

رشید فیروز کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے بارے میں اس طرح کی باتیں افواہوں تک ہی محدود تھیں اس کے بارے میں کبھی کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہیں آیا۔ ایک دو مرتبہ وہ بعض معاملات میں اہم قانونی اداروں کی تحقیقات کی زد میں آیا لیکن اسے کوئی سزا

ہونا تو درکنار، صحیح معنوں میں کبھی اس پر مقدمہ بھی نہیں چلا اس لئے اس کی شہرت بھی رسوائی میں تبدیل نہیں ہوئی۔

بہت سے لوگوں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ جب ان کے پاس کافی دولت آ جاتی ہے تو پھر انہیں سیاست میں حصہ لینے کی سوجھتی ہے ایسے لوگوں کے لئے عموماً سیاسی پارٹی کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ فیروز رشید کے بارے میں بھی امکانات نظر آ رہے تھے کہ وہ کافی دھوم دھام کے ساتھ ایک پارٹی میں شامل ہو جائے گا اور کوئی اہم عہدہ تھالی میں رکھ کر اسے پیش کیا جائے گا۔۔۔ لیکن پہلی مرتبہ کچھ یوں محسوس ہوا جیسے فیروز رشید کی شہرت پر بدنصیبی کے سائے پڑنے لگے تھے۔

○

انہی دنوں شہر میں دو مختلف علاقوں میں دو افراد قتل کر دیئے گئے۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی کسی بھی معمولی وجہ سے۔۔۔ اور بعض اوقات بغیر کسی وجہ کے بھی لوگوں کا قتل ہونا اور دلدوز حالتوں میں لاشوں کا پایا جانا ایک عرصے سے شہر کا معمول ہو گیا تھا۔ مجبور ہو کر لوگوں نے بھی بے حسی کی چادر تان لی تھی۔ صبح اخباروں میں یہ خبریں پڑھتے تھے۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والی تصویریں دیکھتے تھے اور ناشتا کر کے چپ چاپ روبوٹس کی طرح اپنے اپنے کاموں پر چلے جاتے تھے۔

لیکن ان دو افراد کے قتل کا معاملہ کچھ مختلف ہو گیا۔ ان کے بارے میں پہلی خاص بات تو یہ تھی کہ وہ دونوں فیروز رشید کی ایک کمپنی کے سابق ملازم تھے اور کچھ عرصے قبل دونوں کو بدعنوانی کے الزام میں ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ان دونوں سابق ملازمین نے اخبارات سے رابطے کی کوششیں شروع کر دی تھیں اور کئی اخبار نویسوں کو بتایا تھا کہ درحقیقت وہ نہ تو بدعنوان تھے اور نہ ہی انہوں نے کوئی غبن وغیرہ کیا تھا۔ بات اصل میں صرف یہ تھی کہ محض اتفاقاً فیروز رشید کے کاروبار کے بارے میں بعض ایسی باتیں ان کے علم میں آ گئی تھیں جن سے آگاہ ہونے کی ان کی "اوقات" نہیں تھی۔

کسی نے اس معاملے میں ان کی کوئی خاص ہمت افزائی نہیں کی۔ صحافت کی اپنی کچھ مصلحتیں رہی ہوں گی یا پھر شاید رپورٹرو اور اخبارات نے اس لڑائی میں فریق بننا بہتر نہ سمجھا۔ شاید ان کے پاس ثبوت بھی کچھ مبہم سے ہی تھے ویسے بھی اخبارات نے خود فیروز رشید کا ایک امیج بنایا تھا۔ اپنے ہی بنائے ہوئے بت کو توڑنا شاید انہیں کچھ بھلا معلوم نہ ہوا۔ بہت ہی مبہم، غیر واضح اور غیر متاثر کن سے انداز میں دو تین اخبارات میں کونے کھدرے میں ان دونوں کے بیانات شائع ہوئے جن سے کوئی متجسس اور باریک بین قاری ہی اندازہ کر سکتا تھا کہ م کیا قصہ تھا اور وہ دونوں افراد کس کوشش میں لگے ہوئے تھے۔



اخبارات سے تو انہیں کوئی خاص سپورٹ نہ مل سکی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دھن کے پکے تھے یا پھر پس پردہ انہیں بھی کسی مضبوط ہاتھ کا سہارا مل چکا تھا جو وہ اس پہاڑ سے ٹکرانے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے۔ آخر کار ایک اخبار نے ان کے انکشاف کو "الزامات" کی صورت میں کافی نمایاں طور پر چھاپ ہی دیا اور وہ اخبار بھی معمولی نہیں تھا حکومتی و سیاسی حلقوں میں اس کی ساکھ خاصی مضبوط تھی۔

اس خبر نے کافی ہلچل مچائی۔ پھر وقفے وقفے سے دو تین مرتبہ اس کا فالو اپ بھی آیا یعنی تسلسل سے اس موضوع پر مزید کچھ خبریں بھی چھپیں جن سے بات کچھ آگے بڑھتی دکھائی دینے لگی لیکن صورتحال نے اس وقت یکدم سنسنی خیز انداز میں پلٹا کھایا جب ایک رات شہر کے دو مختلف حصوں میں بیک وقت دونوں ہی افراد کو قتل کر دیا گیا۔

جس طرح گھڑی کی سوئیاں وقت بتاتی ہیں اس طرح یہ دو قتل گویا فیروز رشید کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور اونچے پیمانے پر شاید اس کے کسی مخالف کیمپ سے کچھ ڈوریاں بھی ہلائی جا رہی تھیں۔ آخر کار پولیس فیروز رشید کو پوچھ گچھ کے لئے حراست میں لینے پر مجبور ہو گئی پھر شاید کچھ ایسے شواہد بھی سامنے آئے کہ اس پر باقاعدہ مقدمہ قائم ہو گیا اس کے خلاف پہلی بار باضابطہ طور پر ایف آئی آر درج ہوئی اور وہ بھی نہایت سنگین الزام میں۔

اس کی ضمانت ہو گئی تاہم مقدمہ چلنے لگا۔ بیرسٹر رحمان جمیل اس کے وکیل صفائی تھے۔ بیرسٹر رحمان جمیل نامور وکیلوں کی ایک فرم میں پارٹنر تھے ان کی عمر گو کہ زیادہ نہیں تھی لیکن وکالت کے شعبے میں ان کا اور ان کی فرم کا نام بہت بڑا تھا۔ ان کے کریڈٹ پر سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ کوئی مقدمہ آج تک ہارے نہیں تھے۔ ان کی فرم کا نام فرم کے سب سے سینئر پارٹنر اور بانی جمشید مختار کے نام پر "جمشید مختار اینڈ ایسوسی ایٹس" تھا۔

جمشید مختار خود بھی ایک نہایت سینئر اور منجھے ہوئے وکیل تھے۔ اپنے زمانے میں انہوں نے بھی مقدمات جیتنے کے معاملے میں بڑی دھوم مچائی تھی ان کی لیاقت و قابلیت اور بعض حیرت انگیز صلاحیتوں سے ان کے حریف ڈرتے تھے لیکن جب سے عمر بڑھی تھی جمشید نے خود عملی طور پر مقدمات کی پیروی کرنا اور زیادہ محنت طلب کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ انہیں اب اس کی ضرورت بھی نہیں تھی انہوں نے اپنی فرم کو اتنا مضبوط اور موثر بنا لیا تھا کہ انہیں خود عدالتوں میں جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے شاندار آفس میں بیٹھ کر صرف ڈوریاں ہلاتے تھے اور سب کچھ اسی طرح ہوتا رہتا تھا جس طرح وہ چاہتے تھے۔ ان کے چاروں جوان پارٹنر گویا انہی کے جانشین تھے۔ انہوں نے ان کی تمام روایات کو قائم رکھا تھا۔

رشید فیروز کے مقدمے کے سلسلے میں بھی رحمان جمیل نے اپنی فرم کی شہرت کو داغدار ہونے نہیں دیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح کچھ نامعلوم ذرائع سے ایسی شہادتیں ڈھونڈ نکالی تھیں اور مقدمے کے ہر مرحلے سے اس چابکدستی سے گزرے تھے کہ استغاثہ کا مقدمہ خود اسی پر الٹ کر رہ گیا تھا وہ سب سے بڑی دلیل جسے استغاثہ اپنے حق میں سب سے وزنی سمجھ رہا تھا وہی سب سے بے وقعت ہو کر رہ گئی تھی۔

استغاثہ نے ابتداء میں ہی اس بات پر زور دیا تھا کہ فیروز رشید نے اس لئے اپنے سابق ملازمین کو قتل کرایا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ اہم رازوں سے پردہ اٹھانے والے تھے جس کا ثبوت ایک اہم اخبار میں حال ہی میں چھپنے والے ان کے بیانات تھے جن میں الزامات لگائے گئے تھے کہ وہ منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ میں ملوث تھا۔ بعض ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کی سرپرستی کرتا تھا' کئی افراد کو غائب کروا چکا تھا۔ صرف یہی نہیں وہ ایک نہایت پراسرار قسم کی شخصیت تھا' اس کا وجود فی الحال اس ملک کے لئے خطرناک ہی تھا لیکن کچھ شواہد بتاتے تھے کہ مستقبل میں وہ ملک کے لئے کچھ زیادہ ہی خطرناک قسم کے عزائم رکھتا تھا۔

استغاثہ کے پاس درحقیقت کوئی موثر گواہ نہیں تھا کچھ مبہم سی شہادتیں تھیں جو اصل میں مقتولین نے اخبار نویسوں کو فراہم کر کے مزید کچھ زبانی کلامی دلیلوں سے انہیں اپنے موقف کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ خفیہ اداروں اور پولیس نے کچھ تحقیقات بھی کی تھی لیکن وہ بھی کوئی ٹھوس چیز سامنے نہیں لا سکے تھے شاید کسی خاص طاقت نے ان کی تفتیشی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیا تھا۔

بہرحال رحمان جمیل نے سب سے اہم نکتہ یہی اٹھایا تھا کہ جس شخص کے اتنے عیار اور خطرناک ہونے کے دعوے کئے جا رہے تھے کیا وہ اتنا ہی بے وقوف تھا کہ عین اس وقت جب اس کے دونوں سابق ملازمین اس کے خلاف مہم چلانے میں مصروف تھے اور ان کے سنسنی خیز انکشافات اخبار میں چھپ رہے تھے' وہ انہیں قتل کرا دیتا؟ جب اس کے بارے میں اتنے دعوے کئے جا رہے تھے کہ وہ کتنے ہی لوگوں کو غائب کرا چکا تھا اور کیسے کیسے خطرناک لوگوں کا سرپرست تھا تو کیا اس کے لئے ان دو معمولی حیثیت کے آدمیوں کو بھی "غائب" کروا دینا زیادہ محفوظ راستہ نہیں تھا؟ یا پھر وہ اپنی زیر سرپرستی پلنے والے خطرناک لوگوں کو استعمال کر کے ان دو آدمیوں کی زبانیں بند نہیں کرا سکتا تھا؟

اس دلیل نے عدالت کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ دوسری بہت سی باتیں' بہت سی شہادتیں' رحمان جمیل کی قانونی قابلیت' ان کا جرح کا انداز' ان کی فرم کے وسائل اور پس پردہ ان کی بہت سی کوششیں--- ان سب عناصر نے مل کر ہمیشہ کی طرح انہیں کامیابی سے ہمکنار کر دیا تھا۔ پریس کو اس مقدمے کے فیصلے کا بے تابی سے انتظار تھا۔ رشید فیروز



کو شہرت حاصل کرنے کا ہنر خوب آتا تھا اس نے اپنی رسوائی کو بھی شہرت میں بدل لیا تھا۔ رحمان جمیل نے عدالت میں اس نکتے پر بھی زور دیا تھا کہ رشید فیروز کو اس مقدمے میں الجھانا درحقیقت کچھ ایسی خفیہ طاقتوں کی حکمت عملی کا شاخسانہ تھا جو درپردہ ملک کی سیاست میں اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ رشید فیروز اس پارٹی میں جائے جس میں اس کی شمولیت تقریباً یقینی ہو چکی تھی اسی لئے اس اہم موقع پر ایسا چکر چلایا گیا تھا کہ رشید فیروز اس میں الجھ کر رہ جائے۔ اگر اسے مقدمے میں سزا ہو جائے تب تو نادیدہ قوتوں کا مسئلہ ہی حل ہو جائے لیکن اگر کسی طرح وہ بچ بھی جائے تب بھی اس کی شخصیت پر بدنامی کی دھول اتنی جم جائے کہ اس کی صورت چھپ کر رہ جائے اور اس کے دامن پر اتنی سیاہی پھیل جائے کہ بے اصولیوں اور بدعنوانیوں میں ایک دوسرے کو مات دیتی ہوئی پارٹیاں بھی اسے قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرنے لگیں۔ خود رشید فیروز کے اپنے اعصاب بھی اس کشمکش میں ٹوٹ پھوٹ جائیں۔

یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ایسی کچھ نادیدہ قوتیں موجود تھیں یا نہیں--- اور ان کے اس قسم کے مقاصد تھے یا نہیں--- لیکن حالات بتاتے تھے کہ خوش قسمت رشید فیروز کو اس مقدمے سے بری ہونے کے بعد سیاسی طور پر اس کا زیادہ فائدہ پہنچنے والا تھا اس کا سیاسی وزن کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ کسی بھی پارٹی کا رخ کرے گا تو وہ اسے پہلے سے زیادہ گرم جوشی سے خوش آمدید کہے گی۔

چنانچہ ان حالات میں اگر رپورٹروں میں گھرے ہوئے رشید فیروز کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں تو یہ ایک فطری سی بات تھی لیکن رحمان جمیل کا چہرہ گویا زندگی کی بدترین شکست کی کہانی سنا رہا تھا۔ اگر رپورٹرز کو ان کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہوتی تو انہیں رحمان جمیل کے تاثرات پر یقیناً حیرت ہوتی۔ خود رشید فیروز کو بھی رحمان جمیل کے چہرے کی ویرانی پر توجہ دینے کا موقع نہیں ملا تھا۔

ایک رپورٹر اس سے پوچھ رہا تھا "سنا ہے استغاثہ نے آپ کے خلاف ایک گواہ تلاش کیا تھا--- اسے عدالت میں کیوں پیش نہیں کیا گیا؟"

رشید فیروز نے جواب دینے کے بجائے مسکرانے پر اکتفا کیا فوراً ہی دوسرے رپورٹر نے سوال جڑ دیا۔ "کیا واقعی آپ کو سیاسی مقاصد کے تحت اس مقدمے میں الجھایا گیا تھا؟"

رشید فیروز گو کہ عملی طور پر ابھی سیاستدان نہیں بنا تھا لیکن ڈپلومیٹک انداز میں مسکرانے اور بات گول کرنے کے معاملے میں وہ منجھے ہوئے سیاستدانوں کو بھی پیچھے چھوڑ سکتا تھا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر دوستانہ انداز میں ایک رپورٹر کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔ "بھئی آپ لوگوں کو جو بھی سوال کرنا ہے میرے وکیل صاحب سے کر لیجئے میں نے یہ کیس انہیں

سوچتے وقت شروع میں ہی معاہدہ کر لیا تھا کہ عدالت کے اندر ہی نہیں بلکہ باہر بھی مجھ سے جو سوالات کئے جائیں گے ان سب کے جوابات یہی دیں گے۔ اس بات کی میں نے الگ سے انہیں بھاری فیس ادا کی ہے۔" وہ یوں ہنسا جیسے اس نے بڑی مزاحیہ بات کی ہو۔

رپورٹر سمجھ گئے کہ رشید فیروز اس وقت سرعام کھڑے ہو کر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ بعد میں کوئی پریس کانفرنس وغیرہ کرے گا اور سوچ سمجھ کر ہر متوقع سوال کے لئے تیاریاں کر کے آئے گا۔ بہرحال اس وقت بھی خبر بنانے کیلئے وکیل صاحب سے بھی کچھ نہ کچھ مواد تو مل ہی سکتا تھا چنانچہ وہ سب رحمان جمیل کی طرف لپکے جو اس وقت تک عدالت کے احاطے سے نکل چکے تھے۔

قریب ہی سڑک کے کنارے سیاہ رنگ کی ایک مرسیڈیز کھڑی تھی جس کے سیاہ شیشے چڑھے ہوئے تھے اور ایک دراز قد' خوش لباس آدمی مستعد سے انداز میں گاڑی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ وہ خاصا خوش شکل بھی تھا جسم ورزشی' رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور آنکھوں میں عقاب کی سی چمک تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس مرسیڈیز کا ڈرائیور تھا البتہ اس پر گاڑی کے مالک ہونے کا گمان ضرور گزر سکتا تھا۔ وہ سیاہ مرسیڈیز وکیلوں کی اس فرم کی دفتری گاڑی تھی۔ جمشید مختار کے سوا وہ باقی تمام وکیلوں کی آمدورفت کے لئے کام آتی تھی۔

اس سے پہلے کہ رپورٹر رحمان جمیل کو گھیر پاتے وہ گاڑی تک پہنچ چکے تھے اور ڈرائیور نے پھرتی سے ان کے لئے پچھلا دروازہ کھول دیا تھا۔ اندر بیٹھتے ہی انہوں نے دروازہ مقفل کر لیا اور گویا باہر کی دنیا سے ان کا رابطہ کٹ گیا۔ وہ چھوٹی سی ایک محفوظ اور نیم تاریک پناہ گاہ میں آ گئے جہاں عافیت اور سکون کا احساس تھا۔ گاڑی کا انجن پہلے ہی اسٹارٹ تھا اور اے سی بھی چل رہا تھا اس لئے اندر آرام دہ خنکی بھی پھیلی ہوئی تھی اور باہر کا شور شرابا بھی نہیں پہنچ رہا تھا۔

ڈرائیور نے بھی پھرتی سے اندر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ رشید فیروز اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ رحمان جمیل نے اس سے رسمی طور پر رخصت ہوتے وقت مصافحہ کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی وہ گویا اپنے گردوپیش سے بے خبر' اس ماحول سے بہت دور' خیالوں کی کسی اور ہی دنیا میں پہنچے ہوئے تھے۔ رپورٹر اور فوٹو گرافر سڑک کے کنارے ہی کھڑے رہ گئے۔

○

رحمان جمیل نے تھکے تھکے انداز میں سیٹ پر نیم دراز ہو کر پشتے سے ٹیک لگا لی اور ایک طویل سانس لی۔ ڈرائیور کامران عقب نما آئینے میں گہری نظروں سے ان کا جائزہ لے



کے لئے گویا کسی اور دنیا کی باتیں تھیں۔ شاید قصے کہانیوں کو دلچسپ بنانے کے لئے گھڑی گئی تھیں۔

نوجوانی میں بہت سے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں--- رحمان جمیل نے افسردگی سے سوچا۔ انہوں نے دنیا صحیح طرح دیکھی جو نہیں ہوتی انہیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ یہ کیسی بھیانک جگہ ہے--- اور جب انہیں علم ہوتا ہے تو---

انہوں نے گویا اندر ہی اندر کراہ کر آنکھیں کچھ زور سے بند کر لیں۔ وہ جس دور کے بارے میں سوچ رہے تھے اس وقت نگار کی عمر ہی کیا تھی۔ یہی کوئی اٹھارہ انیس سال کی تھی وہ--- اور بے پناہ خوبصورت۔ اس کی ہر سانس میں گویا خوشبو رچی تھی اور انگ انگ میں بجلیاں بھری تھیں۔ رحمان جمیل کا شمار بھی خوش شکل اور وجیہہ لوگوں میں ہوتا تھا پھر بھی انہوں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ انہیں اتنی کم عمر اور اتنی خوبصورت بیوی مل سکتی تھی۔

ان کی بند آنکھوں کے سامنے گزرے ہوئے ان گنت خوبصورت لمحوں کی ایک فلم سی چل رہی تھی۔ یہ تیز رفتار فلم دیکھتے دیکھتے انہیں احساس بھی نہ ہو سکا کہ کب اس میں چپکے چپکے بدصورتی در آئی۔ کب کسی نادیدہ عفریت نے دبے قدموں اس میں داخل ہو کر ساری خوبصورتیاں چرا لیں۔ ان کے لاشعور کے کسی تاریک گوشے سے بس ایک ہی دھندلا سا خیال رہ رہ کر ابھرتا تھا کاش وہ اور نگار یہاں نہ آئے ہوتے۔

پھر انہوں نے اسی افسردگی سے سوچا شاید قصور نہ تو زمانے کا تھا' نہ دنیا کا اور نہ ہی اس شہر کا--- بلکہ قصور شاید ان کا اپنا تھا۔ اونچی اڑان کی خواہش کا تھا۔ ان کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ دولت' ناموری اور کامیابیاں حاصل کریں۔ زندگی کی تمام آسائشیں اور خوشیاں لا کر نگار کے قدموں میں ڈھیر کر دیں۔ وہ اس گردن کاٹ' مقابلے میں' اس سفاک دوڑ میں شریک ہی کیوں ہوئے تھے جس میں ہر کوئی سب سے آگے نکل جانا' سب سے اوپر پہنچ جانا چاہتا تھا؟ جس میں ہر کوئی اپنے لئے بہترین کا خواب دیکھنا چاہتا تھا اور دوسرے کو کچل کر گزر جانا چاہتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر--- بلکہ بسا اوقات تو بلا ضرورت ہی دوسرے کی گردن کاٹنے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔

زندگی تو بہت محدود وسائل میں' بہت قناعت کے ساتھ بھی گزر جاتی ہے سارا قصور ان کا اپنا تھا وہ خود مجرم تھے اور ان کی زندگی نے جو رنگ ڈھنگ اختیار کیا تھا' وہ جس نادیدہ جال میں پھنس گئے تھے اس کے ذمے دار وہ خود تھے مگر پھر شاید ان کے اندر کے وکیل نے سر ابھارا اور وہ خود اپنا دفاع کرنے پر تل گئے۔ ان کے خیالوں کی رو بدلی' سوچ نے پلٹا کھایا۔

دل ہی دل میں انہوں نے سوچا' ترقی کی خواہش کوئی جرم تو نہیں تھی فطری سی بات

تھی آگے سبھی بڑھنا چاہتے تھے۔ قدرت نے بھی یہ حق انسان کو دیا تھا' لیکن سبھی کے ساتھ تو وہ کچھ نہیں ہوتا تھا جو ان کے ساتھ ہوا۔ شاید ان کی قسمت ہی خراب تھی۔

○

"گھر آ گیا سر!" کامران کی مودبانہ مگر قدرے اونچی آواز نے انہیں چونکایا اور وہ یکدم آنکھیں کھول کر سوچوں کے بھنور سے باہر آ گئے۔ انہیں احساس بھی نہیں ہو سکا تھا کہ کب گاڑی ایک شاندار دس منزلہ عمارت کی پارکنگ لاٹ میں آن رکی تھی۔

کلفٹن کے شاندار علاقے میں واقع یہ خوبصورت بلڈنگ شاید اس لحاظ سے ایک منفرد حیثیت کی حامل تھی کہ یہ خاص طور پر ایک بڑا پلاٹ خرید کر ایک ہی فرم کے بانی اور پارٹنر کے لئے خاص طور پر تعمیر کی گئی تھی اس کے ہر فلور پر صرف ایک ہی اپارٹمنٹ تھا جس کی خوبصورتی' کشادگی اور آرائش بہت سے بنگلوں کو شرما سکتی تھی۔

اس بلڈنگ میں مکینوں کے لئے گویا دنیا کی تمام آسائشیں جمع کر دی گئی تھیں۔ ہر اپارٹمنٹ کے اندر اعلیٰ درجے کی ہر آسائش موجود ہی تھی لیکن گراؤنڈ فلور پر دوسری بہت سی اضافی آسائشیں بھی موجود تھیں۔ مثلاً ہر اپارٹمنٹ کے لئے دو گاڑیوں کی علیحدہ پارکنگ' شاندار اور طویل و عریض کورڈ سوئمنگ پول جس کا پانی ٹھنڈا بھی رکھا جا سکتا تھا اور گرم بھی کیا جا سکتا تھا۔ پھر ورزش کے لئے جمنازیم تھا' مختلف کھیلوں کے کمرے تھے' اونچے طبقے کے طرز زندگی میں جس آسائش کا بھی تصور کیا جا سکتا تھا وہ اس بلڈنگ میں موجود تھی اور یہاں صرف فرم کے لوگ رہائش پذیر تھے کسی دوسرے کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اوپر کی منزل کا اپارٹمنٹ یعنی پینٹ ہاؤس خود جمشید مختار کے پاس تھا اور وہ تمام اپارٹمنٹس سے بڑھ کر تھا۔ اس کے نیچے پارٹنر تھے۔ جمشید صاحب کے بعد دفتر میں بھی انہی کا نمبر آتا تھا۔ رہائش میں بھی ان کی ترتیب یہی تھی۔

کامران نے ان کے لئے دروازہ کھول دیا تھا اور ان کا بریف کیس اٹھائے کھڑا تھا۔ رحمان جمیل خاموشی سے اس کے ہاتھ سے بریف کیس لے کر لفٹ کی طرف چل دیئے۔ ان کے کندھے کسی شکست خوردہ سپاہی یا مضمحل مسافر کی طرح جھکے ہوئے تھے۔ انہیں مڑ کر دیکھے بغیر بھی احساس تھا کہ کامران اپنی جگہ کھڑا پرخیال نظروں سے انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچے۔ ملازم نے ان کے لئے دروازہ کھولا اور ان کے ہاتھ سے بریف کیس لیا۔ وہ اندر پہنچ کر لاؤنج کے طور پر استعمال ہونے والے طویل و عریض ہال میں کھڑے ہو کر ابھی ٹائی کی گرہ ہی ڈھیلی کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ملازم ان کا بریف کیس میز پر رکھ کر ان کا کوٹ دیوار گیر الماری میں لٹکا رہا تھا۔ رحمان جمیل نے



خود آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہا۔

○

"مبارک ہو۔۔۔" دوسری طرف سے جمشید مختار کی بھاری اور گونجیلی آواز سنائی دی۔ وہ صرف "ہیلو" سن کر ہی رحمان جمیل کی آواز پہچان گئے تھے۔ وہ غالباً اوپر اپنے اپارٹمنٹ سے ہی بول رہے تھے وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "ایک اور کامیابی مبارک ہو رحمان! تم نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ ہماری فرم کا کوئی وکیل کوئی کیس نہیں ہارتا۔"

"شکریہ سر!" رحمان جمیل نے اپنی آواز میں کچھ جان پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "ان سب کامیابیوں کا اصل کریڈٹ آپ کو ہی جاتا ہے۔ آپ نے جن خطوط پر اس فرم کو قائم کیا اور جس طرح اسے چلا رہے ہیں اسی کی وجہ سے یہ کامیابیاں ممکن ہوئی ہیں۔"

"قدر دانی کا شکریہ۔" جمشید مختار نے گونجیلا سا قہقہہ لگایا پھر یکدم پوچھا۔ "آج تم اپنی بیوی کو دیکھنے نہیں گئے؟"

"کچھ دیر آرام کر کے جاؤں گا سر!"

"ٹھیک ہے۔۔۔ تم آرام کرو تم نے جتنا بڑا معرکہ سر کیا ہے اس کے بعد اب تم کئی دن آرام کے مستحق ہو۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔

رحمان جمیل نے ابھی ریسیور رکھا ہی تھا کہ گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔ انہوں نے آہستگی سے ریسیور اٹھایا۔ "رحمان صاحب۔۔۔؟" دوسری طرف سے کسی نے تصدیق چاہی۔

"جی۔۔۔" انہوں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"میں ہسپتال سے ڈاکٹر ترمذی بول رہا ہوں۔" ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں کہا گیا۔ "میں بہت افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دے رہا ہوں کہ کچھ دیر پہلے آپ کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ ہم نے انہیں بچانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن یکدم ہی ان کے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا۔"

پھر ڈاکٹر ترمذی طبی اصطلاحوں کے ساتھ بتانے لگے کہ دل کی کیا کنڈیشن ہوئی تھی' کس طرح موت واقع ہوئی' وہ فی الحال اس کی وجہ سمجھنے سے بھی قاصر تھے لیکن رحمان جمیل یہ سب کچھ نہیں سن رہا تھے۔ انہیں ڈاکٹر ترمذی کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ان کی رنگت کچھ اور زرد ہو گئی۔

"مجھے معلوم تھا کہ ایسا کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔۔۔" وہ زیر لب بڑبڑائے۔

"جی۔۔۔ کیا فرمایا آپ نے؟" ڈاکٹر ترمذی ذرا بلند آواز میں بولے۔

"کچھ نہیں۔" انہوں نے پہلے سے بھی دھیمی آواز میں کہا۔

"بہرحال۔۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ صبر کیجئے۔۔۔۔ خدا کی مرضی یہی تھی۔۔۔"
ڈاکٹر ترمذی شاید کچھ اور بھی کہہ رہے تھے لیکن رحمان جمیل نے دھیرے سے ریسیور رکھ دیا پھر انہوں نے یوں چاروں طرف نظر ڈالی جیسے درودیوار سے جھانکتی خوبصورت یادوں کا الوداعی نظارہ کر رہے ہوں۔ ملازم دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔

رحمان جمیل دھیرے دھیرے خواب کے سے عالم میں چلتے ہوئے بالکونی میں آ گئے۔
کچھ دور سمندر تا حد نظر سرمئی دھند میں لپٹا دکھائی دے رہا تھا وہ چند لمحے ساکت کھڑے رہے پھر انہوں نے زور سے آنکھیں بند کر لیں اور بالکونی سے چھلانگ لگا دی۔

دوسرے ہی لمحے ان کا جسم شکستہ ہڈیوں' خون اور کچلے مسلے گوشت کے ایک انبار کی صورت میں نو منزل نیچے بلڈنگ کے احاطے میں کنکریٹ کے فرش پر پڑا تھا۔

○



کراچی میں رحمان جمیل اور ان کی اہلیہ کی تدفین عمل میں آ چکی تھی۔ اخبارات نے ان کی بیگم کی اچانک موت اور اس کے فوراً بعد ان کی خودکشی کے بارے میں زیادہ قیاس آرائیاں نہیں کی تھیں۔ وہ اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ رحمان جمیل کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی اور وہ اس کی اچانک موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکے تھے۔ شاید اپنے کام کی نوعیت کے اعتبار سے ان کے اعصاب پر دباؤ بھی تھا۔ کسی بھی اخبار نویس کو اس معاملے میں کوئی پراسراریت دکھائی نہیں دی تھی۔

ان کے نوزائیدہ بچے کو جمشید مختار نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور اس کے لئے چوبیس گھنٹے ساتھ رہنے والی ایک عورت کا انتظام کر کے اسے عمارت ہی کے ایک چھوٹے حصے میں رہائش دے دی تھی۔ رحمان جمیل اور ان کی بیگم' دونوں ہی کے والدین نہیں تھے۔ رحمان جمیل کے والدین کے انتقال کو تو کافی عرصہ گزر چکا تھا جبکہ نگار کے والدین کو وفات پائے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ کوئی اور ایسا عزیز رشتے دار نہیں تھا جو ایک نوزائیدہ بچے کی پرورش کی ذمہ داری قبول کرتا۔ نگار کی رشتے کی ایک خالہ البتہ یہ خواہش لیکر آئی تھیں۔ کافی دنوں تک تو ان کی جمشید مختار تک رسائی ہی نہ ہو سکی اور جب رسائی ہوئی تو ان کے درمیان نہ جانے کیا بات چیت ہوئی کہ وہ فوراً ارادہ ترک کر کے رخصت ہو گئیں اور پھر پلٹ کر نہیں آئیں۔

زندگی بڑی تیز رفتار ہے۔ بڑے شہروں میں کچھ زیادہ ہی تیز رفتار معلوم ہوتی ہے۔ کوئی واقعہ ایک روز رونما ہوتا ہے تو بڑا اہم' بڑا سنگین یا بڑا سنسنی خیز معلوم ہوتا ہے لیکن دوسرے روز وہ کسی اور واقعے کی دھول میں دب جاتا ہے۔ رحمان جمیل اور ان کی اہلیہ کا چہلم ہوتے ہی انہیں دوسرے لوگ تو کیا' گویا ان کے اپنے ساتھی بھی بھول گئے۔ فرم کے لوگوں نے اب کبھی کبھار بھی ان کا تذکرہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتر کی عمارت میں ان کا کمرہ اب بھی خالی اور مقفل تھا لیکن کسی کو جیسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ اس شاندار' آراستہ و پیراستہ اور طویل و عریض کمرے میں کبھی کوئی بیٹھا کرتا تھا۔ چہلم سے اگلے روز البتہ اس طرح دو ملازموں نے ان کے کمرے کی جھاڑ پونچھ' ترتیب نو اور صفائی وغیرہ شروع کر دی تھی جیسے جلد ہی وہاں کسی اور کی آمد کی توقع ہو۔

عین اس وقت جبکہ رحمان جمیل کے کمرے میں جھاڑ پونچھ' صفائی اور ترتیب نو کا کام ہو رہا تھا وہاں سے دور حیدر آباد کی ایک عدالت میں ایک نوجوان وکیل جج صاحب کے سامنے کھڑا پرخیال انداز میں ایک فائل کھولے ایک کاغذ پر نظر دوڑا رہا تھا۔ اٹھائیس سالہ اس دراز قد' وجیہہ اور اسمارٹ وکیل کا نام خالد تیموری تھا۔ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے نفسیات میں بھی ایم اے کیا تھا۔ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں وہ ایک اچھا مقرر رہا تھا۔

عملی طور پر وکالت کے میدان میں آجانے کے بعد اس کا یہ علم اور اضافی صلاحیتیں اس کے بہت کام آ رہی تھیں۔ اسے اب پتا چلا تھا کہ اچھے اور مدلل طریقے سے تقریر کی صلاحیتیں اور چھوٹے چھوٹے نفسیاتی حربے کوئی کیس جیتنے کے سلسلے میں کتنے اہم ثابت ہوتے تھے۔ وہ وکیلوں کی ایک چھوٹی سی فرم میں ملازم تھا۔ ابتداء میں تو اسے تنہا اور خودمختارانہ انداز میں عدالت میں پیش ہونے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کی حیثیت ایک زیر تربیت وکیل کی تھی اور وہ ایک سینئر وکیل کے اسسٹنٹ کے طور پر ان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔

پھر جوں جوں اسے ضرورت کے تحت چھوٹے موٹے کیسوں میں آزادانہ طور پر تنہا عدالت میں بھیجا جانے لگا تو اس نے بہت تیزی سے فرم کے مالک اور سینئر وکیلوں کو اپنی صلاحیتوں کا قائل کر لیا۔ جلد ہی اسے قدرے اہم کیسوں میں وکالت نامہ دیکر مکمل خود مختاری کے ساتھ بھیجا جانے لگا اور اس کی صلاحیتیں زیادہ نکھر کر سامنے آنے لگیں۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ اس کی خوش قسمتی تھی' محض اتفاقات تھے یا پھر خالصتاً" اس کی صلاحیتوں کا ثمر تھا کہ اس نے جو کیس بھی تنہا ہاتھ میں لیا تھا اس میں فیصلہ اس کے حق میں ہوا تھا لیکن فرم کے مالک اور ملازمین کی رائے میں بھی وہ جلدی ہی حد سے زیادہ خوداعتمادی کا شکار ہو گیا تھا اس لئے اس نے از خود آگے بڑھ کر تازہ ترین کیس ہاتھ میں لے لیا تھا۔

○

فرم کے مالک سید صدر الدین اور دوسرے سینئر وکلاء اپنے آپ کو پرانی قدروں کا امین قرار دیتے تھے۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ وکالت کا پیشہ مظلوم کی مدد کے لئے تھا۔ ان کا نظریہ محض روپیہ کمانا نہیں تھا اور وہ اس طریقہ کار کے قائل نہیں تھے کہ ملزم یا مجرم' مدعی یا مظلوم جو بھی آپ کے پاس پہنچ جائے اس سے فیس پکڑ کر اس کا مقدمہ لڑنا شروع کر دیں۔ آپ کا موکل خواہ آپ کے اندازے کے مطابق مجرم بھی ہو لیکن آپ اسے بچانے کے لئے لڑنا شروع کر دیں صرف اس لئے کہ آپ نے اس سے فیس لی ہے ان کے



خیال میں اس فریق کا ساتھ دینا ضروری تھا جو آپ کے خیال میں مظلوم تھا' جس کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی' جو کسی وجہ سے قانون کی لپیٹ میں آ گیا تھا گو کہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا یا جسے انصاف کے حصول میں دشواری پیش آ رہی تھی۔

اسی لئے اسے اپنی نوعیت کی ایک منفرد فرم سمجھا جاتا تھا اور گو کہ اس کے پاس کلائنٹس کی کمی نہیں تھی لیکن اس کی مالی حالت کچھ ایسی زبردست نہیں تھی۔ اس کا دفتر اتنا شاندار نہیں تھا' ملازموں کی تنخواہیں اور مراعات اتنی زیادہ نہیں تھیں۔ خود صدر الدین کچھ اتنے زیادہ ٹھاٹ باٹ سے نہیں رہتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے اور ان کے ملازمین یا ساتھیوں کے چہروں پر بشاشت' طمانیت اور آسودگی نظر آتی تھی۔

تازہ ترین مقدمہ قبول کر کے صدر الدین کے خیال میں خالد تیموری نے فرم کی روایات سے بغاوت کی تھی اور تو اور خود اس کی اپنی والدہ اور نوبیاہتا بیوی میمونہ اس کے حق میں نہیں تھیں۔ کیس ایک قریبی دیہی علاقے سے عدالت میں آیا تھا۔ علاقے کے ایک بڑے زمیندار کے تیس سالہ غیر شادی شدہ بیٹے پر الزام تھا کہ اس نے مقامی پرائمری سکول کی ایک دس سالہ لڑکی کو اغوا کر لیا تھا۔ زمیندار کا بیٹا اس وقت لڑکی کو راستے میں سے اٹھا کر جیپ میں ڈال کر اپنے ڈیرے پر لے گیا تھا جب وہ اسکول سے واپس آ رہی تھی اور چند لمحے پہلے راستے میں تنہا رہ گئی تھی۔

زمیندار کو علاقے میں کافی حد تک شریف آدمی سمجھا جاتا تھا لیکن اس کے تیس سالہ بیٹے نیاز علی کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ وہ چیچک زدہ سیاہ فام' لحیم شحیم آدمی تھا۔ صورت اور سیرت' دونوں ہی اعتبار سے گیا گزرا تھا۔ تعلیم کے معاملے میں بھی یہی عالم تھا کہ میٹرک بھی پاس نہیں کر سکا تھا۔ دن بھر اپنے بدقماش دوستوں کے ساتھ سیر و شکار یا بے ہودہ قسم کے مشاغل میں وقت گزارتا تھا۔

لڑکی کے اغواء کا مقدمہ البتہ کافی بڑا اور سنگین اسکینڈل بن گیا تھا اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ لڑکی کے والدین نے دولت' طاقت اور بدمعاشی کے سامنے سرنگوں ہونے سے انکار کر دیا تھا اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی نہایت جرات و دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کا ساتھ دینے پر کمربستہ ہو گئے تھے۔ اخبارات میں بھی یہ قصہ خاصے نمایاں انداز میں آ رہا تھا۔ نیاز نے معاملے کو دبانے کے لئے اپنے مخصوص ہتھکنڈے استعمال کئے ہوں گے لیکن شاید بات بنی نہیں تھی' معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

اس نے ضمانت قبل از گرفتاری کرا لی تھی اور پھر جب کیس عدات میں چلنے لگا تو وہ اپنی وکالت کے لئے صدر الدین کے پاس بھی آیا تھا۔ صدر الدین غائبانہ طور پر اس شخص کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس سے ملنے کے بعد اس کے بارے میں ان کی رائے اور بھی خراب ہو گئی۔ انہوں نے صاف طور پر یہ کہہ کر تو اس کی وکالت سے انکار نہیں کیا کہ وہ

اسے پسند نہیں کرتے تھے اس لئے اس کا مقدمہ لینا نہیں چاہتے تھے یا وہ اسے اس طرح کا آدمی سمجھتے تھے جس سے اس قسم کے جرائم کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔

اس طرح کی رائے کا اظہار کر کے وہ اس قسم کے لوگوں سے دشمنی مول لینے کے بھی حق میں نہیں تھے چنانچہ انہوں نے بے پناہ مصروفیت کا بہانہ کر کے جان چھڑا لی تھی۔
خالد تیموری بھی اس وقت صدر الدین کے کمرے میں موجود تھا۔ وہ ہمیشہ صدر الدین کے سامنے ایک مودب ملازم اور سعادت مند جونیئر رہا تھا لیکن اس روز اس نے انہیں بھی حیران کر دیا۔ اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے صدر الدین سے اجازت یا مشورہ لئے بغیر اپنے طور پر کیس لڑنے کے لئے خدمات پیش کر دی تھیں۔

صدر الدین نے سخت نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا اسے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن خالد انہیں خاطر میں نہ لایا۔ اس پر گویا کوئی عجیب سی دھن سوار ہو چکی تھی۔ لمبا تڑنگا' سیاہ فام نیاز علی جسے دیکھ کر انجان لوگ بھی راستہ چھوڑ دیتے تھے' کترا کر گزرتے تھے اور جاننے والے نفرت سے منہ پھیر لیتے تھے یا نظریں نیچی کر لیتے تھے' اس سے خالد تیموری بڑا متاثر نظر آ رہا تھا۔ وہ دھول میں اٹی جیپ میں ان کے آفس آیا تھا۔ بگلے جیسے سفید' کلف لگے شلوار قمیض میں تھا۔ پیروں میں بیش قیمت زری کے کام والے جوتے تھے وجود سے کسی عمدہ کلون کی مہک پھوٹ رہی تھی۔ دائیں بائیں دو مسلح گارڈ کھڑے تھے۔ شکل صورت اپنی جگہ تھی لیکن پہناوے اور رکھ رکھاؤ سے وہ مکمل طور پر ایک معزز اور اہم آدمی نظر آتا تھا بس چہرے پر ذرا خباثت اور کمینگی نہ ہوتی تو حلیہ اس کی شخصیت سے اور بھی میل کھاتا لگتا۔

نیاز علی نے مونچھ کو بل دیتے ہوئے پرخیال' انداز میں خالد کا سرتاپا جائزہ لیا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔ "بابا۔۔۔۔ تم آدمی ذرا نوجوان ہے' شکل سے ہم کو قابل اور پڑھا لکھا تو لگتا ہے لیکن بابا معاملہ ذرا نازک ہے۔ ہمارے کو بڑا سمجھدار' تجربہ کار اور سینئر وکیل چاہئے جو سارے داؤ پیچ جانتا ہو اور جس کا عدالت میں بڑا ٹھیک ٹھاک احترام ہو' عزت ہو۔"

خالد مربیانہ انداز میں مسکرا دیا جیسے اس نے کوئی بچگانہ بات سن لی ہو۔ صدر الدین یقیناً نہیں چاہتے تھے کہ خالد وہ کیس لے لیکن اس وقت اس کی حمایت میں وہ بھی کم از کم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکے۔ "عقل اور ذہانت کا تعلق عمر سے نہیں ہوتا نیاز صاحب! خالد بہت سے سینئر اور عمر رسیدہ وکیلوں سے بہتر ہے یہ تو شاید پیدا ہی وکالت کے پیشے کے لئے ہوا تھا اس سے اچھی تو کوئی بات نہیں تھی کہ یہ آپ کا کیس لڑتا لیکن میں جانتا ہوں کہ اس پر بھی کام کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔"

"سر! میں گنجائش نکال لوں گا۔" خالد ان کی بات کاٹتے ہوئے بولا' یہ بھی غنیمت



تھا کہ اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ صدر الدین کون سے کام کے بوجھ کا ذکر کر رہے تھے۔ وہ تو کئی دن سے فارغ تھا۔ اس کی ملازمت کی شرائط میں یہ شق شامل تھی کہ اگر فرم کی طرف سے اس کے پاس کوئی کام نہ ہو اور فرم کسی کیس کو اپنے لئے مناسب نہ سمجھتے ہوئے چھوڑ رہی ہو تو وہ اسے اپنے طور پر لے سکتا ہے۔ اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اس معاملے میں ٹانگ اڑائی تھی۔

○

مزید تھوڑی سی بات چیت کے بعد نیاز علی اسے اپنا وکیل مقرر کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا حتیٰ کہ اس نے وہ بھاری فیس ادا کرنے پر بھی آمادگی ظاہر کر دی تھی جس کا خالد نے مطالبہ کیا تھا۔ صدر الدین کے تاثرات بتا رہے تھے اور خود خالد کو بھی اندیشہ تھا کہ ایک جونیئر وکیل کی طرف سے اتنی فیس کا مطالبہ سن کر نیاز علی بدک جائے گا مگر شاید اس کا الٹا اثر ہوا تھا یعنی نیاز علی متاثر ہو گیا تھا کہ اگر ایک نوجوان وکیل اتنی خود اعتمادی سے اتنی فیس مانگ رہا تھا تو اس میں کوئی بات ضرور تھی۔

اس نے رقم کی پیشگی ادائیگی بھی کر دی تھی لیکن ساتھ ہی واضح کر دیا تھا۔ "رقم کی کوئی بات نہیں ہے بابا! روپیہ پیسا اور چاہئے تو اور لے لو بس ہم کو اس الزام میں سزا نہیں ہونی چاہئے۔ بھلے اور بھی کوئی جوڑ توڑ کرنا پڑے تو کر لینا۔ کسی گواہ کو خریدنا پڑے' کسی کو رشوت دینی پڑے' جیسا بھی بندوبست مناسب سمجھ لو کر لینا' میرے سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ روپے پیسے کی پروا نہ کرنا ہم بھی اپنے جیسی کوشش کر رہا ہے تم بھی کرنا بس فیصلہ ہمارے حق میں ہونا چاہئے۔"

"ہماری فرم کے وکیل اس قسم کی حرکتیں نہیں کرتے۔" صدر الدین نے گہری سنجیدگی سے گفتگو میں دخل دیتے ہوئے واضح کیا۔

خالد نے گویا نیاز علی کو پچکارا۔ "آپ فکر نہ کریں فیصلہ آپ کے حق میں ہو گا اسی لئے تو میں کیس لے رہا ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد صدر الدین نے صاف طور پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا۔
"تم نے اچھا نہیں کیا خالد۔"

"سر! گستاخی معاف میرے خیال میں تو اگر ہم میں سے کوئی بھی نیاز علی کا کیس قبول نہ کرتا تو بہت برا ہوتا۔" خالد گہری سنجیدگی سے بولا۔

"وہ کیسے؟" صدر الدین نے ناگواری سے پوچھا۔

"ہم وکالت اور قانون کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے کیونکہ ہم نیاز علی پر مقدمہ چلنے سے پہلے' شہادتیں پیش ہونے سے پہلے اور عدالت کے کسی فیصلے

پر پہنچنے سے پہلے ہی اسے مجرم سمجھنے والا محاورہ کچھ ایسا درست نہیں ہے سر! آپ اس کی بری شہرت پر نہ جائیں سر! یہ بھی تو دیکھیں کہ اس پر آج تک مقدمہ نہیں چلا اسے کبھی سزا نہیں ہوئی۔" خالد کو جیسے اندر سے کوئی طاقت نیاز علی کے دفاع پر اکسا رہی تھی اور اس نے گویا ابھی سے اس کا مقدمہ لڑنا شروع کر دیا تھا۔

دو اچھے وکیلوں کی طرح وہ ایک دوسرے کے موقف کے قائل نہ ہو سکے اور خالد نے نیاز علی کا مقدمہ لڑنا شروع کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ صرف اس کے دفتر میں ہی نہیں' اس کے گھر میں' حتیٰ کہ مقدمے کی ساعت کے دوران میں عدالت میں موجود رہنے والے افراد کے دلوں میں بھی اس کے لئے ناپسندیدگی کے جذبات پیدا ہو چکے تھے لیکن اسے گویا کسی کی پروا نہیں تھی اس پر تو بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ وہ مقدمہ جیت کر دکھائے گا۔

مقدمہ اب آخری مراحل میں تھا۔ اہم گواہوں پر جرح جاری تھی غیر اہم گواہ بھگتائے جا چکے تھے۔ جلد ہی فیصلہ سنائے جانے کی توقع تھی۔ اس وقت اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر فدا حسین گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے تھے جہاں وہ دس سالہ لڑکی شاہدہ پڑھتی تھی جسے اغواء کیا گیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سے سوالات شروع کرنے سے پہلے خالد نے ایک فائل اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی تھی وہ جیسے بہت اہم دستاویزات پر نظر دوڑا رہا تھا۔

یہ محض ایک ڈرامائی حرکت تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کسی گواہ پر جرح شروع کرنے سے پہلے اگر کچھ کاغذات الٹنے پلٹنے شروع کر دیئے جاتے اور پھر اچانک سر اٹھا کر معنی خیز سے انداز میں گواہ کی طرف دیکھا جاتا تو وہ سٹپٹا جاتا تھا۔ خصوصاً اگر اس کے کردار میں کوئی کمزوری ہوتی تھی تو اسے یہی اندیشہ ہوتا تھا کہ شاید وہ کمزوری وکیل کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ خالد نے کئی بار یہ حربہ کامیابی سے استعمال کیا تھا اور گواہ کو بدحواس کرنے کے بعد آسانی سے اس کے بیان کو مشکوک بنا دیا تھا۔

وہ اس وقت جو فائل دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے دفتر کی ایک عام سی فائل تھی جس میں اس مقدمے کے غیر اہم سے کاغذات لگے ہوئے تھے۔ سمن' نوٹس' رسیدیں اور بل وغیرہ۔ عدالت میں گہرا سکوت چھا گیا تھا کافی افراد وہاں موجود تھے ان میں سے بعض کا کسی نہ کسی زاویئے سے اس مقدمے سے کوئی تعلق بنتا تھا۔ کچھ محض تجسس کے تحت بھی آ جاتے تھے کیونکہ اس مقدمے کے بارے میں وقفے وقفے سے خبریں چھپ رہی تھیں۔ بعض لوگ دوسرے مقدمات کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔

ہیڈ ماسٹر فدا حسین تقریباً پچپن کی عمر کے ایک باریش آدمی تھے۔ سر پر ٹوپی اور ماتھے پر محراب کا نشان تھا جو ان کے پرانے نمازی ہونے کی علامت تھا۔ وہ ایک دبلے پتلے مختصر



الوجود اور منحنی سے آدمی تھے لیکن ان کے نازک سے چشمے کے پیچھے چھپی ہوئی آنکھیں بتاتی تھیں کہ ان کے اندر ایک مضبوط آدمی چھپا ہوا تھا جو کسی جائز اور حق بات کے لئے ڈٹ جانے کا حوصلہ رکھتا تھا خواہ ان کے سامنے کتنی ہی سفاک طاقت آن کھڑی ہوتی۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب سی طمانیت اور استقلال تھا۔ یہ چہرہ بتاتا تھا کہ وہ دوسروں کو بھی انصاف دلانے کے لئے لڑنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اس کا واضح ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے علاقے کے بے تاج بادشاہ نیاز علی کے خلاف گواہی دینے کے لئے عدالت کے کٹہرے میں آن کھڑے ہوئے تھے۔ وہی نیاز علی جس کی آوارگی اور ستمگری کے سیلاب پر اس کے باپ نے بھی کبھی بند باندھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

خالد تیموری نے فائل سے نظر ہٹا کر ان کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں مسکرا دیا لیکن ہیڈ ماسٹر فدا حسین پر اس کا یہ حربہ ناکام رہا۔ انہوں نے نہ تو اس سے نظر چرائی نہ ہی مضطربانہ انداز میں انگلیاں مروڑیں اور نہ ہی ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے اور خالد حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ ان پر تو نیاز علی بھی اپنے حربے استعمال کر چکا ہو گا اگر وہ ان سے گزر کر عدالت تک آن پہنچے تھے تو پھر وہ ایک مہذب وکیل سے کیونکر خوفزدہ ہو سکتے تھے؟ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک کمزور سے اور خاصی معمولی حیثیت کے مالک انسان میں اتنی جرات و ہمت کہاں سے آئی تھی؟

آخر کار خالد کو ہی نظر چرانی پڑی۔ اپنے ڈرامائی انداز کا بھرم رکھنے کے لئے اس نے گمبھیر سنجیدگی سے حاضرین کا جائزہ لیا۔ اس کی نظر پچھلی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھے ہوئے شخص پر جا ٹھہری حاضرین میں اس کی شخصیت خاصی نمایاں تھی۔ ایک تو وہ ویسے ہی دراز قد' خوش شکل اور وجیہہ تھا اس پر اس کا لباس بھی نہایت عمدہ تھا۔ وہ نفیس قسم کے سوٹ میں تھا۔ اس قسم کے سوٹ سلوانے کی خالد کو ہمیشہ حسرت رہی تھی لیکن اگر اسے کبھی سوٹ سلوانے کی توفیق ہوتی بھی تھی تو بڑے جوڑ توڑ سے' بچت کی کئی ترکیبوں کے ساتھ سستا سوٹ سلوانے پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا۔

اس شخص کو وہ پہلے بھی کئی پیشیوں پر دیکھ چکا تھا وہ ہمیشہ ایسے ہی کسی نفیس مگر مختلف سوٹ میں ہوتا تھا اور نہ جانے کس وقت آ کر حاضرین میں بیٹھ جاتا تھا۔ خالد کے کیس کی سماعت ختم ہوتے ہی وہ نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا تھا۔ مقدمے کی کارروائی کے دوران میں البتہ کئی مرتبہ ان کی نظر ضرور ملتی تھی اور یوں گویا ان کے درمیان ایک خفیف اور بے عنوان سی شناسائی پیدا ہو چکی تھی۔ آج تو جونہی خالد کی نظر اس سے ملی وہ دھیرے سے مسکرا بھی دیا اور اس نے سلام کے سے انداز میں سر کو ہلکی سی جنبش بھی دی۔ خالد بھی غیر ارادی طور پر سر کو خفیف سی جنبش دیئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس سے کسی قسم کی

شناسائی نہ ہونے کے باوجود خالد اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی خود اعتمادی تھی اور اس کا ظاہری سراپا ہی بتاتا تھا کہ وہ جس میدان میں بھی تھا، بے پناہ کامیاب تھا۔

خالد نے ایک نظر نیاز علی پر بھی ڈالی جو فی الحال ملزموں والے کٹہرے میں نہیں تھا وہ عام حاضرین کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے مسلح محافظوں کو کمرے میں آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی البتہ ایک پولیس اہلکار اس کے قریب کھڑا تھا۔ خالد نے نیاز علی کو بہت سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ عدالت کے کمرے میں ویسا نظر آنے کی ہرگز کوشش نہ کرے جیسا کہ وہ عام زندگی میں نظر آتا تھا یعنی نہ تو وہ سرخ سرخ آنکھوں سے لوگوں کو گھورے اور نہ ہی کسی کی طرف دیکھتے ہوئے مونچھوں پر تاؤ دے۔ وہ بارعب اور منتقم مزاج نظر آنے کے بجائے ایک ایسا مظلوم اور دکھی انسان نظر آنے کی کوشش کرے جس کے احساسات مجروح ہوئے تھے۔ جسے کسی کی بہتان تراشی کی وجہ سے دلی صدمہ پہنچا تھا۔ اس قسم کی ایکٹنگ کرنا نیاز علی کے بس کی بات نہیں تھی لیکن خالد نے اسے اپنے آفس میں بٹھا کر باقاعدہ اس طرح مشق کرائی تھی جیسے وہ وکیل نہیں بلکہ فن اداکاری کا کوئی استاد ہو اور نیاز علی اس کے پاس تربیت لینے آیا ہو۔

اس سے نیاز علی اور بھی متاثر ہوا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس نے ایک قابل وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں جو قانون جاننے کے علاوہ دوسری باریکیاں بھی سمجھتا تھا۔ خالد نے اسے بتایا تھا کہ عدالت میں ملزم کے ظاہری سراپا اور حرکات و سکنات کی بھی بڑی اہمیت تھی۔ عدالت پر اس کے اثرات ضرور مرتب ہوتے تھے۔ عام وکیل ان باتوں کی اہمیت کو نہیں سمجھتے تھے۔ خالد نے دفتر میں اس قسم کی تیاریاں کرنے اور قانون کی موٹی موٹی کتابوں میں سر کھپانے کے علاوہ باہر بھی اس کیس کے سلسلے میں حقیقتاً بہت محنت کی تھی۔ وہ نہ جانے کتنے لوگوں سے ملا تھا۔ کس کس پر دباؤ ڈلوایا تھا، کس کس کو قانونی پیچ و خم سے ڈرا کر اور غچا دے کر کوئی ایسا بیان دینے پر مجبور کیا تھا جو نیاز علی کے حق میں جاتا تھا۔ یہ ہتھکنڈے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق نیاز علی خود بھی استعمال کر چکا تھا مگر اس کا انداز اناڑیوں اور خاص بدمعاشوں والا تھا۔ خالد کو معلوم تھا کہ بعض اوقات یہ طور طریقے کام نہیں آتے، اپنا مقصد کسی اور ہی حساب کتاب سے نکالنا پڑتا ہے۔

جج صاحب نے کھنکار کر گویا خالد کو احساس دلایا کہ خاموشی کا وقفہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا تب وہ ڈرامائی انداز میں اچانک ہیڈ ماسٹر فدا حسین کی طرف گھوما اور تیکھے لہجے میں بولا۔ "ہیڈ ماسٹر فدا حسین صاحب! آپ کا کہنا ہے کہ نیاز علی اس سے پہلے بھی اسکول کی تین بچیوں سے راستے میں کچھ ناشائستہ قسم کا ہنسی مذاق کرنے اور بے تکلف ہونے کی کوشش کر چکا تھا اور کبھی کبھار اسکول کے گرد منڈلاتا رہتا تھا؟"



"جی ہاں۔" فدا حسین نے کراری آواز میں جواب دیا جو ان کے منحنی وجود سے میل نہیں کھاتی تھی۔

"کیا آپ نے کبھی اس سلسلے میں پولیس کو --- کسی اور ذمے دار اتھارٹی کو --- یا کم از کم گاؤں کے کسی بزرگ یا معتبر شخص کو مطلع کرنے کی کوشش کی؟" خالد نے عین ان کے سامنے پہنچ کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"پولیس ---؟" فدا حسین استہزائیہ انداز میں دھیرے سے ہنسے۔ "پولیس کی تو آنکھوں کے سامنے بعض اوقات قتل ہو جاتا ہے لیکن وہ آگے بڑھ کر قاتل کو روکنے یا قتل کے بعد بھی پکڑنے کی کوشش نہیں کرتی اور بعض اوقات وہ قتل کی اطلاع ملنے کے گھنٹوں بعد جائے واردات پر پہنچتی ہے۔ آپ کا خیال ہے میں پولیس کو اتنی سی بات بتاتا تو وہ فوراً نیاز علی کو سیدھا کر دیتی؟"

"پولیس کیا کرتی اور کیا نہ کرتی، اس بات کو چھوڑیئے۔" خالد ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "جس قسم کی تنقید آپ پولیس پر کر رہے ہیں ایسی تقریباً ہر شخص ہی کرتا ہے۔ اخباروں رسالوں میں بھی آئے دن یہ باتیں آتی رہتی ہیں لیکن اپنے گریبان میں کوئی نہیں جھانکتا۔ ہم صرف یہ جاننا چاہ رہے ہیں کہ اب جبکہ اچانک ہی آپ کو یہ خیال آیا ہے کہ آپ خود کو ایک فرض شناس، بے خوف اور انسان دوست شہری ظاہر کریں تو اس سے پہلے آپ کو کم از کم احتیاطاً" ہی اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے کا خیال کیوں نہیں آیا؟"

"مجھے اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آیا تھا اور میرا خیال تھا کہ خواہ مخواہ اسکول کی بدنامی ہو گی۔" فدا حسین کے لہجے میں خفیف سی کمزوری آ گئی۔

"اور اب جبکہ اتنا بڑا اسکینڈل بن چکا ہے --- اخباروں میں خبریں آ رہی ہیں تو آپ کو اسکول کی بدنامی کا خیال نہیں آیا؟" خالد کے لہجے میں گھن گرج آ گئی۔

"اس وقت کی بات اور تھی اس وقت عملی طور پر کچھ نہیں ہوا تھا اب کی بات اور ہے۔" فدا حسین سنبھل کر بولے۔ "ایک بچی کے ساتھ ایک خاندان کے ساتھ اتنی بڑی زیادتی ہوئی ہے۔"

"ابھی آپ فیصلہ نہ دیں کہ زیادتی ہوئی ہے یا نہیں ہوئی ہے۔" خالد نے گرج کر ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے آپ صرف ان سوالوں کے جواب دیجئے جو آپ سے کئے جائیں۔"

فدا حسین کے چہرے پر خجالت کی سرخی آ گئی وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولے۔ "میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کیا جا چکا ہے جس کے مطابق بچی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔"

"میڈیکل سرٹیفکیٹ کا کیا ہے جناب! سب کو معلوم ہے میڈیکل سرٹیفکیٹ کیسے لئے جاتے ہیں۔" اب خالد کا لہجہ طنزیہ اور استہزائیہ ہو گیا۔

"آبجیکشن یور آنر۔۔۔!" سرکاری وکیل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "فاضل وکیل صفائی قانون اور سرکاری نظام کا مضحکہ اڑا کر اس کے بارے میں عدم اعتمادی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"اعتراض مسترد کیا جاتا ہے۔" جج صاحب نے کہا۔ اس پیشی میں وہ خالد کے دلائل سے متاثر معلوم ہو رہے تھے۔

"شکریہ یور آنر! میرے فاضل دوست وکیل سرکار کو شاید معلوم ہی نہیں ہے کہ قانونی و سرکاری نظام اور پولیس کی تفتیش کے بارے میں کیا فضا پائی جاتی ہے۔ عدم اعتماد کا لفظ تو اس کے لئے بہت چھوٹا ہے۔" خالد کا لہجہ کچھ اور جارحانہ ہو گیا۔ "اور اگر بات میڈیکل سرٹیفکیٹ ہی کی ہے تو فاضل وکیل شاید بھول رہے ہیں کہ عدالت میں ایک اور بہت اچھے بہت بڑے اور قابل اعتبار اسپتال کے دو بڑے ڈاکٹروں کا میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی پیش کیا جا چکا ہے جس کی رو سے بچی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی۔"

اس موقع پر فدا حسین گویا غیر ارادی طور پر تلخ لہجے میں بول اٹھے۔ "یہ بتاتے ہوئے بھی آپ اپنے الفاظ دہرا دیجئے کہ سب کو معلوم ہے میڈیکل سرٹیفکیٹ کیسے حاصل کئے جاتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ اپنے اس بیان کی روشنی میں آپ نے اس غریب اور بے وسیلہ بچی کے والدین کو داد کیوں نہیں دی کہ وہ سرکاری میڈیکو لیگل آفیسر سے ایسا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں کیونکر کامیاب ہو گئے جو نیاز علی کو مجرم ثابت کرتا ہے۔۔۔ ورنہ عام طور پر تو ان افسروں سے نیاز علی جیسے لوگ ہی اپنی مرضی کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے اور اپنی مرضی کی ایف آئی آر درج کرانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔"

خالد کچھ یوں فاتحانہ انداز میں مسکرایا جیسے اس کی مطلوبہ مچھلی خود ہی اس کے جال میں آن پھنسی تھی وہ سرہلاتے ہوئے بولا۔ "میں اسی طرف آرہا تھا۔" پھر وہ جج صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "فاضل عدالت کو معلوم ہے کہ نیاز علی کے خاندان کی اپنے علاقے میں کئی نسلوں سے ایک مسلمہ سیاسی حیثیت چلی آ رہی ہے اسی علاقے میں ان کی مخالف سیاسی قوتیں بھی موجود ہیں ان کا اپنا ایک حلقہ اثر ہے۔ وہ لوگ بھی بڑے زمیندار ہیں ایک عرصے سے علاقے کے ان دونوں بڑے خاندانوں کے درمیان سیاسی۔۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہر طرح کی مخالفت چلی آ رہی ہے جس کے ثبوت میں مختلف اخباری بیانات اور جلسوں میں ہونے والی تقریروں کی رپورٹوں اور کسٹوں وغیرہ پر مشتمل مواد فاضل عدالت میں پیش کیا جا چکا ہے۔"



"آبجیکشن یور آنر۔" سرکاری وکیل نے ایک بار پھر مداخلت کی۔ "ان تمام باتوں کا مقدمے سے کوئی تعلق نہیں۔"

"اعتراض منظور کیا جاتا ہے فاضل وکیل صفائی جواب دیں۔" جج صاحب نے حکم دیا۔

"تعلق ہے۔۔ بہت گہرا تعلق ہے جناب والا۔" خالد ڈرامائی انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔ "جیسا کہ مقدمے کے اہم ترین گواہ ہیڈ ماسٹر فدا حسین نے فرمایا کہ شاہدہ جیسی بچی کے غریب اور بے وسیلہ والدین کیلئے ایسی رپورٹ حاصل کرنا آسان نہ ہوتا جو ان کے الزام کی تائید کرتی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ نیاز علی جیسے اثر و رسوخ والے آدمی کی موجودگی میں یہ کام واقعی مشکل ہوتا لیکن اس کام کو ان کے لئے آسان بنایا گیا۔ بھلا کس طرح۔۔۔؟"

اس نے ایک بار پھر ڈرامائی انداز میں گھوم کر تمام حاضرین پر نظر ڈالی گویا ان سے اپنے سوال کا جواب طلب کر رہا ہو پھر وہ دوبارہ جج صاحب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "یہ کام ان کے لئے اس طرح آسان ہو گیا کہ ان کی پشت پر دوسری بڑی سیاسی قوت کام کر رہی ہے۔ یہ انسانی' اخلاقی اور فوجداری مقدمہ نہیں سر! درحقیقت یہ سیاست کا شاخسانہ ہے۔ موقع مناسب دیکھ کر میرے موکل کو اس طرح پھنسانے کی کوشش کی گئی کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ سیاسی طور پر اس کے خاندان کی ساکھ ختم ہو جائے۔ شاہدہ کے والدین' ہیڈ ماسٹر فدا حسین صاحب اور کچھ دوسرے لوگ اپنی کچھ مخصوص اغراض کے تحت مخالفین کے آلہ کار بن گئے ہیں۔ فدا حسین صاحب کی ہمدردیاں ایک عرصے سے نیاز علی کے مخالف خاندان کے ساتھ چلی آ رہی ہیں میں آپ کو اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔"

اس نے فائل میں سے ایک تصویر نکال کر جج صاحب کے سامنے رکھ دی اور گویا عدالت میں موجود تمام افراد کو آگاہ کرنے کے لئے اس کی تفصیل بھی بہ آواز بلند بیان کرنی شروع کر دی۔ "یہ نیاز علی کے مخالف خاندان کی سیاسی جلسے کی تصویر ہے جو پچھلے سال ہی انتخابات کے موقع پر کھینچی گئی ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس میں ہیڈ ماسٹر فدا حسین صاحب اسٹیج کے بالکل قریب کھڑے ہیں اگر عدالت مناسب سمجھے تو ماسٹر صاحب سے کئی سوالات کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے وہ اس حد تک سیاسی سرگرمیوں میں کیونکر ملوث رہے کہ ایک سیاسی جلسے میں اسٹیج کے قریب پائے جا رہے ہیں؟

کیا ہم اسے محض اتفاق سمجھ لیں کہ جن لوگوں کے جلسے میں وہ شریک ہیں ان کے سب سے بڑے حریف کے خلاف گواہ کے طور پر پیش ہو رہے ہیں؟"

فدا حسین کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن ساتھ ہی ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے بھی چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ "اس کا ایک طویل پس منظر ہے کہ میں وہاں کیوں گیا تھا عدالت نے اجازت دی تو میں وہ پس منظر بھی بیان کر دوں گا۔ مختصراً بس یہ سمجھ لیجئے کہ میں وہاں ایک کام سے گیا تھا۔ سیاسی مقاصد یا سیاسی دلچسپی کے تحت نہیں گیا تھا۔ ویسے تو ہزاروں۔۔۔ بلکہ لاکھوں سرکاری ملازمین کھلم کھلا سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں اپنی پسندیدہ پارٹیوں کے جلسے کرانے میں پیش پیش ہوتے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی تو مخالفین کے جلسے درہم برہم کرنے میں بھی پیش پیش ہوتے ہیں لیکن میں اس بات کو بھی اپنے لئے جواز نہیں بناؤں گا کیونکہ مجھے معلوم ہے عدالتیں اس قسم کے جواز تسلیم نہیں کرتیں۔ چلئے اگر مان بھی لیا جائے کہ میں کسی دلچسپی کے تحت وہاں گیا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کوئی دیانتدار آدمی نہیں ہوں۔ میں سچ نہیں بول سکتا یا میں کسی ظلم کو ظلم کہنے اور کسی بدمعاش کو بدمعاش کہنے کا اہل نہیں رہا۔"

"بہت خوب۔۔۔ بہت خوب!" خالد نے سر ہلایا۔ "آپ تو خود بہت اچھے وکیل ثابت ہو سکتے تھے آپ کو تو قانون کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے تھی۔ آپ ٹیچنگ میں کہاں چلے گئے؟" اس کے لہجے میں استہزائیہ رنگ محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"آپ نے میرے بارے میں اتنی محنت، اتنی باریک بینی اور اتنی جاں فشانی سے تفتیش کی ہے۔ حیرت ہے کہ آپ کو یہ معلوم نہیں ہو سکا میں نے ایل ایل بی کیا ہوا ہے۔" اب فدا حسین کا لہجہ بھی طنزیہ ہو گیا۔ "لیکن پھر میں نے وکیل نہ بننے کا فیصلہ کیا تھا۔۔۔ اور اب میں سوچتا ہوں کہ میں نے اچھا ہی کیا تھا میں نے اپنے شوق کے تحت معلمی کا پیشہ اختیار کیا تھا اور مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں۔۔۔ فخر ہے۔"

"بہت خوب۔۔۔ بہت خوب۔" خالد نے ایک بار پھر سر ہلایا۔ اسے یقیناً فدا حسین کے ایل ایل بی ہونے کا سن کر جھٹکا لگا تھا لیکن وہ اپنے رد عمل کو صاف چھپا گیا تھا۔ وہ ایک نظر فائل پر ڈال کر بولا۔ "بہرحال ہمیں جذباتی تقریروں سے عدالت کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے اور کام کی بات کرنی چاہئے۔ آپ کی رہنمائی پر پچھلی پیشیوں پر عدالت میں آپ ہی کے اسکول کی تین بچیوں کو پیش کیا گیا جنہوں نے بتایا کہ نیاز علی ان سے راستے میں ناشائستہ قسم کا ہنسی مذاق کرنے اور ان سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر چکا تھا اور



کبھی کبھار اسکول کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ ان بچیوں نے خود آپ سے شکایت کی تھی یا آپ نے اپنی دلچسپی کے تحت خود یہ بات کسی طرح معلوم کی تھی؟"

"انہوں نے اپنے والدین سے ذکر کیا تھا۔ والدین نے ان کے ٹیچر سے بات کی اور ٹیچر نے مجھ سے ذکر کر کے مشورہ طلب کیا تھا کہ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہئے۔"

"کیا آپ کے خیال میں وہ تینوں لڑکیاں عمدہ کردار کی حامل اور قابل اعتبار ہیں؟" خالد نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

"جی ہاں۔۔۔ میرے خیال میں تو ہیں۔"

"خیال کی بات چھوڑیئے ہیڈ ماسٹر صاحب! خیالوں اور حقیقت کی دنیا میں بڑا فرق ہے۔" خالد کی آواز بلند ہو گئی۔ "گواہ کے طور پر ان لڑکیوں کے پیش ہونے کے بعد میں نے ان کے والدین کے بارے میں کچھ چھان بین کی تو کچھ حیرت انگیز اور دلچسپ انکشافات ہوئے۔ میرے لئے یہ بات خاصی حیرت کا باعث ہے کہ فدا حسین صاحب ان لڑکیوں کے ہیڈ ماسٹر ہوتے ہوئے ان کے والدین کے بارے میں لاعلم رہے۔ مزید کچھ کہنے سے پہلے میں عدالت کے سامنے ایک تصویر اور کچھ کاغذات پیش کرنا چاہوں گا۔" اس نے جیب سے ایک خاکی لفافہ نکال کر نہایت آہستگی سے کھولا اور اس میں سے ایک تصویر اور دو کاغذ نکال کر جج صاحب کے سامنے رکھ دیئے۔

عدالت میں گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ جج صاحب نے دونوں چیزیں اچھی طرح ملاحظہ کرنے کے بعد سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ خالد تیموری نے گویا عدالت میں موجود افراد کو سنانے کے لئے کہنا شروع کیا۔ "یہ تصویر جو آپ نے ملاحظہ کی اس کے بارے میں شاید آپ کو اندازہ ہو گیا ہو کہ یہ نیاز علی کے زبردست مخالف اور حریف ارباب کرم کی اوطاق کی ہے۔ ارباب کرم اس علاقے کی جانی پہچانی سیاسی شخصیت ہے اس تصویر میں اس کے سامنے جو تین افراد دست بستہ بیٹھے ہیں وہ ان تین بچیوں کے باپ ہیں جنہیں نیاز علی کے خلاف گواہی دینے کے لئے پیش کیا گیا تھا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان لوگوں کے رابطے دراصل کہاں ہیں۔۔۔"

عدالت میں بھنبھناہٹ سی شروع ہو گئی۔ خالد نے کچھ اور بلند آواز میں سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس تصویر کے ساتھ میں نے جو کاغذات پیش کئے ہیں وہ قرضے کی رسیدوں کی فوٹو اسٹیٹس ہیں یہ قرضے انہیں تینوں افراد نے ارباب کرم سے لے رکھے ہیں اور ابھی ادا نہیں کئے۔ ان کے ادا کئے جانے کی کوئی امید بھی نہیں۔ اب آپ اندازہ کر

سکتے ہیں کہ ان تین افراد کی لڑکیوں نے نیاز علی کے خلاف گواہی کیوں دی۔ اگر ان بچیوں کو دوبارہ عدالت میں پیش کیا جائے تو میں ان پر جرح کر کے ان کے جھوٹ کا پول کھول سکتا ہوں۔ ان حالات میں کسی کے لئے بھی یہ جاننا مشکل نہیں کہ محض سیاسی مخالفت کی بنا پر اور موقعے سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے نیاز علی کو اس مقدمے میں پھنسایا گیا ہے۔"

خالد نے مزید کچھ دلائل دیئے اور یکدم کچھ یوں محسوس ہونے لگا جیسے غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ وکیل سرکار کے موقف میں ذرا بھی جان نہ رہی خالد مکمل طور پر عدالت پر چھایا ہوا تھا۔ آخر کار جج صاحب نے فیصلہ سنا دیا۔ انہوں نے نیاز علی کو بری کر دیا۔ نیاز علی نے اٹھ کر خالد کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا مگر خالد محسوس کر رہا تھا کہ عدالت میں موجود بیشتر افراد اسے نفرت بھری نظروں سے گھور رہے تھے۔ اسے ان کی پروا نہیں تھی اس کے لئے جیت اہم تھی۔

وہ نیاز علی اور اس کے آدمیوں کے گھیرے میں عدالت سے نکل آیا۔ باہر آکر وہ سیڑھیاں اتر رہے تھے کہ عقب سے کسی نے پکارا۔ "خالد صاحب! ذرا میری بات سنئے گا---"



خالد نے پلٹ کر دیکھا' اس کے عقب میں وہی خوش لباس اور پروقار شخص کھڑا مسکرا رہا تھا جسے وہ کئی پیشیوں پر عدالت میں حاضرین کے درمیان دیکھ چکا تھا۔ نہ جانے کیوں ایک بے عنوان سے تجسس سے خالد کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔ وہ شخص آگے آکر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے سعید پاشا کہتے ہیں۔"

خالد نے غیر ارادی سے انداز میں اس سے مصافحہ کیا۔ اس کی شخصیت نفیس نظر آنے کے باوجود اس کا ہاتھ مضبوط اور چوڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی دفتری کام سے وابستہ ہونے کے باوجود سخت ورزش وغیرہ کا عادی تھا۔ اس نے نام کے سوا اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس نے نیاز علی سے بھی مصافحہ کر لیا لیکن نیاز علی کی ذات سے اسے گویا کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف خالد کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"سب سے پہلے تو میں آپ کو ایک مشکل کیس جیتنے پر مبارکباد پیش کروں گا۔ آپ نے واقعی کمال کر دکھایا۔" وہ شخص دلکش اور پراعتماد مسکراہٹ کے ساتھ بولا جو اس کی شخصیت کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔

"شکریہ---" خالد صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی اگر آپ چند منٹ کا وقت نکال سکیں تو ہم کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔" سعید پاشا بولا۔

نیاز علی کے بری ہونے کی خبر عدالت کے احاطے سے باہر پہنچ چکی تھی جہاں اس کے آدمی موجود تھے اور انہوں نے ڈھول تاشے بجانے شروع کر دیئے تھے۔ وہ نیاز علی کو جلوس کی شکل میں لے جانے کے لئے آئے ہوئے تھے جیسے نیاز علی مجرمانہ حملے کے مقدمے سے بری نہ ہوا ہو بلکہ اس نے کوئی بہت اہم کارنامہ انجام دیا ہو۔ نیاز علی جلدی سے بول اٹھا۔ "بابا--- آپ وکیل صاحب کو اتنی جلدی کدھر لے جا رہے ہیں؟ وکیل صاحب تو ہمارے ساتھ جائیں گے۔ آپ ڈھول باجوں کی آوازیں نہیں سن رہے ہیں؟ ہم جلوس کے ساتھ گاؤں جائیں گے اور وکیل صاحب کے بغیر بھلا جلوس کیسے مکمل ہو گا؟؟"

اجنبی نے گہری سنجیدگی سے نیاز علی کی طرف دیکھا اور خالد کو کچھ یوں محسوس ہوا جیسے ایک لمحے کے لئے نیاز علی جیسا آفت' گرگ باراں دیدہ اور اپنے آپ کو بڑی توپ چیز

سمجھنے والا شخص بھی سٹپٹا گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے سعید پاشا خلیق مسکراہٹ کے ساتھ نرم لہجے میں بولا۔ "یہ جلسے جلوس تو آپ ہی کے ساتھ سجتے ہیں نیاز صاحب! آپ بے چارے وکیل صاحب کو ان چکروں میں کہاں ڈالنے لگے ہیں۔ آپ کا کام ہو گیا۔ بس اب آپ جا کر خوشیاں منائیں۔ وکیل صاحب کو ہمارے لئے چھوڑ دیں۔ مقدموں کا کیا ہے ـــ وکیل صاحب کو تو ابھی ایسے نہ جانے کتنے مقدمے جیتنے ہیں۔ یہ تو ابھی صرف آغاز ہے۔"

نیاز علی کی گویا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے پہلے پگڑی پر ہاتھ پھیرا پھر مونچھ کو بل دے کر خالد کی طرف دیکھا اور کمزور سے لہجے میں بولا۔ "کیا کہتے ہیں وکیل صاحب؟ آپ کی کیا مرضی ہے؟"

خالد کا دل کہہ رہا تھا کہ اجنبی واقعی اس کے ساتھ کوئی اہم بات کرنا چاہتا تھا اور نیاز علی کے جلوس کے ساتھ جانا اسے ویسے بھی کچھ اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے موقع غنیمت جانا' نیاز علی سے معذرت کی' البتہ نیاز علی کی طرف سے عنقریب بننے والے ضیافت کے پروگرام میں شرکت کا وعدہ کیا اور اس سے اجازت لے کر ہجوم سے بچتا بچاتا اجنبی کے ساتھ چل دیا۔ چند لمحے بعد اس احساس سے اسے قدرے حیرت ہوئی کہ اجنبی اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ اسے بغلی راستے کی طرف سے باہر لے جا رہا تھا جدھر بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔

وہ باہر آئے تو خالد نے دیکھا' کونے پر عدالت کے احاطے کے قریب بڑی سی ایک سیاہ مرسیڈیز کھڑی تھی جس کے شیشے گہرے رنگ کے تھے۔ ایک دراز قد' خوش لباس آدمی مستعد سے انداز میں گاڑی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ اس کی شکل صورت بھی معقول تھی۔ جسم مضبوط' رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور آنکھوں میں عقاب کی آنکھوں کی سی چمک تھی۔ کھڑے ہونے کے انداز سے وہ ڈرائیور معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی شخصیت یا حلیہ ڈرائیوروں والا ہرگز نہیں تھا۔ تاہم اس نے سعید پاشا کو دیکھ کر ڈرائیوروں والے انداز میں ہی دروازہ کھولا۔

سعید پاشا نے پہلے خالد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں بیٹھ گئے اور دروازہ بند ہو گیا تو خالد کو کچھ یوں لگا جیسے وہ چھوٹے سے ایک طیارے میں بیٹھ گیا ہو۔ حبس' دھول' مٹی' ناگوار آوازیں' سب کچھ باہر رہ گیا تھا اور وہ دن بھر کی تھکا دینے والی مصروفیات اور اعصابی کشمکش کے بعد گویا سکون کی آغوش میں پہنچ گیا تھا۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا تو اس کی آواز بلی کی خرخراہٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

"کامران! ہمیں سائیں جھنڈ لے چلو۔" سعید پاشا نے حکم دیا۔

گاڑی جلد ہی شہر کی تنگ اور پرہجوم سڑکوں کو چھوڑ کر ذرا کھلے نواحی علاقے میں آ گئی۔ کئی منٹ کی خاموشی کے بعد خالد ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ



مجھ سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ آپ کو لنچ میرے ساتھ ہی کرنا ہے۔" سعید پاشا نے مسکراتے ہوئے یک طرفہ طور پر ہی فیصلہ سنا دیا۔

کچھ دیر بعد وہ سائیں جھنڈ جا پہنچے۔ یہ ایک پرسکون ریستوران تھا جہاں سبزہ زار پر بھی بیٹھنے کا انتظام تھا۔ سعید پاشا نے وہیں ایک سایہ دار جگہ منتخب کی اور کولڈ ڈرنکس اور کھانے وغیرہ کا آرڈر دینے کے بعد بولا۔ "آج عدالت میں آپ کی کارکردگی واقعی کمال کی تھی۔"

"کیا آپ بھی مجھ سے کسی مقدمے کے سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں؟" خالد اس کا اصل مقصد جاننے کے لئے بے چین تھا۔

"مقدمے کے بارے میں ـــ نہیں ـــ مقدموں کے بارے میں کہئے۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "لیکن آپ مجھے کلائنٹ نہ سمجھئے میں تو خود وکیل ہوں اور آپ سے یقیناً کافی سینئر ہوں لیکن یہ مت سمجھئے گا کہ میں سنیارٹی کا ذکر کر کے اپنے آپ کو آپ سے زیادہ قابل ظاہر کرنا چاہ رہا ہوں۔ قابلیت شاید آپ میں مجھ سے زیادہ موجود ہو لیکن میرے خیال میں ابھی اس کا پوری طرح سامنے آنا باقی ہے۔"

"اچھا ـــ تو آپ بھی اپنی ہی برادری کے آدمی ہیں ـــ" خالد نے ذرا گرمجوشی سے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ "لیکن میرا خیال ہے میں نے آپ کو یہاں کبھی دیکھا نہیں۔ میں یہاں کے تقریباً سبھی قابل ذکر وکلاء سے کم از کم صورت آشنا ضرور ہوں۔"

"میں یہاں نہیں ہوتا۔" سعید پاشا نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں کراچی میں ہوتا ہوں اور خاص طور پر آپ سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔ میں اخبارات میں اس کیس کے بارے میں پڑھتا رہا ہوں ـــ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم پڑھتے رہے ہیں۔"

"ہم سے کیا مراد ہے؟" خالد نے وضاحت چاہی۔

"ہم سے مراد اس فرم کے مالک اور پارٹنر وغیرہ ہیں جس کے لئے میں کام کرتا ہوں۔ میں "جمشید مختار اینڈ ایسوسی ایٹس" میں سینئر پارٹنر ہوں۔ شاید آپ نے کبھی اس فرم کا نام سنا ہو۔ ہمارے ہاں لوگ تو زیادہ نہیں ـــ لیکن اس کے باوجود یہ ایک بہت بڑی فرم ہے۔ ہم صرف خاص خاص لوگوں کے کیس لیتے ہیں۔"

"جمشید مختار اینڈ ایسوسی ایٹس ـــ؟" خالد نے سر ہلاتے ہوئے دہرایا۔ "یہ نام تو کئی بار اخبارات میں نظر سے گزرا ہے ـــ بہت اہم اور مشہور مقدمات کے سلسلے میں ـــ اس کے علاوہ آپ لوگوں کے لیگل نوٹس وغیرہ بھی اکثر چھپتے رہتے ہیں۔"

"بالکل درست ـــ" سعید پاشا مسکراتے ہوئے بولا۔ "گو کہ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ ہمارا نام زیادہ نمایاں نہ ہونے پائے۔ اس کے باوجود کسی نہ کسی وجہ سے

اخبارات میں آ ہی جاتا ہے۔ اپنے طور پر تو ہم شہرت سے دور بھاگتے ہیں۔ ہمیں شہرت کی ضرورت نہیں۔ کچھ خاص حلقوں میں ہماری بڑی شہرت ہے اور ہمیں صرف اسی شہرت کی ضرورت ہے۔ ہم خاص قسم کے فوجداری مقدمات کے اسپیشلسٹ ہیں۔ ایسے مقدمات جنہیں لیتے ہوئے بڑے بڑے قابل وکیل گھبراتے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔؟ یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے۔۔۔" خالد کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اور کیا کہے۔ اس دوران میں کولڈ ڈرنکس آ چکی تھیں۔

چند لمحے خاموشی سے گھونٹ بھرنے کے بعد سعید پاشا میز پر ذرا جھکتے ہوئے بولا۔

"خالد صاحب! بات یہ ہے کہ میں محض اتفاقاً آپ کے مقدمے کی کارروائی سننے نہیں آتا رہا ہوں۔ ہم نے ابتداء ہی میں آپ کے بارے میں سن لیا تھا اور مجھے ہمارے باس جمشید مختار صاحب نے خاص طور پر آپ پر نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔"

"اوہ۔۔۔!" خالد ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بے یقینی سے بولا۔ "ایک ہی مقدمے سے میری شہرت کراچی تک جا پہنچی۔۔۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

"بات مقدمے کی نہیں' اس کی نوعیت کی ہوتی ہے۔" سعید پاشا گہری سنجیدگی سے بولا۔ "مقدمے تو ملک کے طول و عرض میں لاکھوں چل رہے ہیں اور لاکھوں التواء میں پڑے رہتے ہیں لیکن ہم کچھ خاص قسم کے مقدمات پر نظر رکھتے ہیں اور ہمیں کچھ خاص قسم کے وکیلوں کی تلاش رہتی ہے۔ خصوصاً جو کہ نوجوان بھی ہوں۔ جن میں بہت تیزی سے آگے بڑھنے کی صلاحیت اور طلب نظر آرہی ہو اور جو دل و جان سے ہمارے لئے کام کر سکتے ہوں۔ ضرورت پڑنے پر بہت زیادہ محنت بھی کر سکتے ہوں۔ میں ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ آپ ہمیں اپنے مطلب کے آدمی دکھائی دیئے ہیں اور میں نے فوراً آپ سے رابطہ کر لیا ہے۔ ہمارے ہاں اہم معاملات بہت تیزی سے نمٹائے جاتے ہیں۔ آپ سے فوری طور پر بات کرنا اس لئے بھی ضروری ہو گیا کہ ہمارے ہاں آج کل آپ جیسے ایک آدمی کے لئے جگہ خالی ہے۔۔۔ اور ہم اسے زیادہ دن خالی رکھنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ عدالت میں آپ کی آج کی کارکردگی دیکھنے کے بعد تو میں نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس جگہ کو صرف اور صرف آپ پر کریں گے۔ مجھے امید ہے میرے اس فیصلے کو باس کی بھی بھرپور تائید حاصل ہو گی۔ آپ پہلے ہمارا یہ کارڈ تو رکھ لیں۔ اس موضوع پر مزید بات تو ہوتی رہے گی۔۔۔"

اس نے ایک نہایت خوبصورت وزیٹنگ کارڈ خالد کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس پر فرم کا نام' ایڈریس' کتنے ہی فون نمبر' فیکس نمبر' حتیٰ کہ ای میل نمبر تک درج تھا۔ خالد کارڈ کو اٹھائے بغیر کئی لمحے تک دیکھتا رہا۔

"میں چاہتا ہوں آپ ہماری پیشکش پر سنجیدگی سے غور کریں اور اس غور و خوض کو



زیادہ طول نہ دیں۔"

"دیکھیں۔۔۔ سعید صاحب۔۔۔"

سعید پاشا اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "مجھے معلوم ہے کہ اس وقت آپ جس فرم کے ساتھ کام کر رہے ہیں' اگر آپ کی ہمت برقرار رہی اور آپ نے ثابت قدمی سے اسی کے لئے کام جاری رکھا تو شاید پانچ دس سال بعد وہ آپ کو جونیئر پارٹنر بنا لیں لیکن اتنے طویل عرصے تک جاں فشانی سے کام کرنے کے بعد اس مقام پر پہنچ کر بھی ہمارے اندازے کے مطابق آپ کو جو کچھ مل رہا ہو گا' ہم آپ کو ابھی اور اسی وقت اس سے چار گنا کی پیشکش کر سکتے ہیں۔"

"چار گنا۔۔۔؟" خالد نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

سعید پاشا گویا اس کی بے یقینی سے ذرا لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "صرف یہی نہیں آپ کو کلفٹن کے شاندار علاقے میں بہت سے بنگلوں سے زیادہ اچھا اور کشادہ فرنشڈ اپارٹمنٹ بھی بغیر کسی کرائے کے مہیا کیا جائے گا۔ میڈیکل فری ہو گا۔ ایک نہایت شاندار پرائیویٹ اسپتال ہمارے پینل پر ہے۔ اس کے علاوہ جس گاڑی میں ہم یہاں تک آئے ہیں یہی اکثر آپ دونوں میاں بیوی کو آمدورفت کے لئے میسر رہا کرے گی۔"

خالد اب دم بہ خود سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد سعید پاشا نے سلسلہ کلام جوڑا۔۔۔ "اسی پر بس نہیں ہے۔۔۔ فراخدلی اور حسن سلوک میں ہمارے باس جمشید مختار صاحب کا جواب نہیں۔۔۔ یہ تو میں آپ کو صرف موٹی موٹی باتیں بتا رہا ہوں۔ ساتھ ساتھ چھوٹے موٹے تو نہ جانے کتنے فوائد آپ کو حاصل ہوتے رہیں گے۔ کوئی خاص کیس جیتنے پر آپ کو الگ سے بونس بھی مل سکتا ہے۔۔۔ اور بونس ہمارے ہاں کوئی چھوٹی موٹی رقم نہیں ہوتی۔"

خالد اب خاموش رہا۔ سعید پاشا اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "اس کے علاوہ ایک خاص بات یہ ہے کہ اکثر ملازمتوں کا کوئی سماجی پہلو نہیں ہوتا۔ یہ صرف آپ پر اور آپ کے حالات پر منحصر ہوتا ہے کہ آپ کی سماجی مصروفیات کیا ہوتی ہیں اور کن حلقوں میں آپ کا میل ملاپ رہتا ہے۔۔۔ لیکن ہمارے ساتھ شامل ہو کر آپ بہت اچھی سماجی زندگی بھی گزار سکیں گے۔ فرم سے تعلق رکھنے والے ہم سب لوگ ایک ہی بلڈنگ میں ایک فیملی کی طرح رہتے ہیں۔ ہماری بیگمات کی بھی آپس میں دوستی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی بیگم بھی ان میں شامل ہو جائیں گی۔ انہیں کبھی بور ہونے یا آپ کی مصروفیات کی وجہ سے اپنے تنہا رہ جانے کی شکایت کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ اس شاندار بلڈنگ میں تقریبات کے لئے ایک الگ ہال بھی ہے اور ہم لوگوں کے اپنے اپارٹمنٹ بھی تقریبات کے لئے چھوٹے نہیں ہیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی تقریب' ضیافت یا پارٹی ہوتی ہی رہتی

ہے۔ کسی نہ کسی بہانے دل بہلانے کا سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ اور آپ کی بیگم وہاں بہت خوش رہیں گے۔"

خالد ذرا سنبھل کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ میری بیگم کا ذکر کئے جا رہے ہیں۔۔۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ میں شادی شدہ ہوں؟"

سعید پاشا گویا اس کے سوال سے محظوظ ہوتے ہوئے دھیرے سے ہنسا اور پہلے سے زیادہ خوش دلی سے بولا۔ "مانا کہ آپ نوجوان ہیں اور آپ پر غیر شادی شدہ ہونے کا گماں بھی گزر سکتا ہے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ آپ کی شادی کو دو سال گزر چکے ہیں البتہ ابھی آپ دو سے تین نہیں ہوئے ہیں۔"

"اوہ۔۔۔!" خالد کو واقعی حیرت کا ایک نیا جھٹکا لگا۔ وہ ایک ٹک سعید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سعید نے جلدی سے گویا وضاحت کی۔ "ہم جس کے ساتھ اتنا بڑا معاملہ کرنے جا رہے ہوتے ہیں۔۔۔ ایک طرح سے جسے اپنا فیملی ممبر بنانے لگتے ہیں اس کے بارے میں اتنی معلومات تو کر ہی لیتے ہیں۔ میں آپ کو اس لئے بھی سوشل لائف والے پہلو کی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بعض لوگ اس خیال سے پریشان ہو جاتے ہیں کہ نہ جانے وہ فیملی سمیت نئے شہر میں ایڈجسٹ بھی کر سکیں گے یا نہیں؟ میں اصل میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ آپ کے ذہن میں اس سلسلے میں جو بھی مسئلہ آئے گا' ہمارے پاس اس کا حل پہلے سے موجود ہو گا۔"

خالد خاموش تھا اور پرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سعید ایک لمحے منتظر سے انداز میں اس کی طرف دیکھنے کے بعد بولا۔ "زیادہ سوچوں میں نہ الجھیں خالد صاحب! قسمت روز روز کسی کے دروازے پر دستک نہیں دیتی۔ اس دنیا میں بعض لوگ کچھوے کی رفتار سے ترقی کرتے ہیں۔ بعض مناسب رفتار سے ترقی کرتے ہیں لیکن بعض ایک ہی جست میں کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں۔ آپ کو بھی ایسی ہی جست لگانے کا موقع مل رہا ہے۔۔۔ اور پھر بات صرف ایک جست تک ہی محدود نہیں رہے گی اس کے بعد بھی آپ کی ترقی کا سفر نہ جانے کس رفتار سے اور کن منزلوں تک جاری رہے۔ شاید اپنی رفتار پر آپ خود بھی حیران ہو جائیں۔"

سعید پاشا نے خاموش ہو کر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا لیا اور منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ خالد کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی عمر یا تجربہ زیادہ نہیں تھا لیکن وہ ایک تیز و طرار نوجوان تھا۔ اس نے دنیا کو گہری نظر سے دیکھا تھا۔ اسے زندگی میں کئی ایسے کردار چلتے پھرتے نظر آئے تھے جو کسی مطلب کے تحت نہایت شاطرانہ انداز میں بہت اونچے اونچے خواب دکھاتے تھے' خیالوں ہی خیالوں میں اسے نہ جانے کہاں سے کہاں



لے جاتے تھے اور اپنا مطلب نکل جانے کے بعد گویا اوروں کے پیروں تلے سے سیڑھی کھینچ لیتے تھے۔

وہ غور کر رہا تھا کہ سعید پاشا بھی اسی قسم کا کوئی کردار تو نہیں تھا؟ اس کا دل یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ ایک تو سعید پاشا کی شخصیت میں کوئی "جعلی پن" نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بذات خود زندگی کے میدان میں ایک کامیاب آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرے وہ کسی فرضی یا مستقبل میں قائم ہونے والے اداروں اور کمپنیوں کی باتیں نہیں کر رہا تھا۔ وہ خالد کو محض ایک فرم میں ملازمت کی پیشکش کر رہا تھا اور خالد کو معلوم تھا کہ وہ فرم بہرحال موجود تھی۔ خالد کو اپنے بارے میں بھی معلوم تھا کہ وہ ایک تہی دست انسان تھا۔ سعید پاشا اس سے بھلا ایسا کون سا فائدہ اٹھا سکتا تھا جس کے لئے وہ اتنا تردد کرتا؟

ان سب باتوں کے باوجود یہ سوال اسے پھر بھی پریشان کر رہا تھا کہ آخر اس میں ایسا کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا تھا جو سعید پاشا اتنے دن سے اس پر نظر رکھنے کے بعد شاندار شرائط پر اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آیا تھا؟ ملک میں وکیلوں کی کمی تو نہیں تھی۔ جمشید مختار اینڈ ایسوسی ایٹس جیسی فرم کو تو کراچی میں ہی اس سے کہیں زیادہ قابل اور کامیابیوں کا زیادہ طویل ریکارڈ رکھنے والے نہ جانے کتنے وکیل مل جاتے جو ان شرائط پر بہ خوشی اس فرم کے لئے کام کرنے پر تیار ہو جاتے۔

"تو پھر میں ہی کیوں؟" یہ سوال اسے سب سے زیادہ پریشان کر رہا تھا۔ اس نے تکلف نہیں کیا اور یہ سوال سعید پاشا کے سامنے زبان پر بھی لے آیا۔

سعید پاشا مربیانہ انداز میں مسکرایا۔ "خالد صاحب! یہ صرف باس کو ہی صحیح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کون سا آدمی ان کے لئے کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے وہ مجھے ہر باصلاحیت وکیل کے پیچھے تو نہیں دوڑاتے اور ہمارے ہاں بہت زیادہ وکیلوں کی گنجائش بھی نہیں ہوتی۔ ہمارا تو بس ایک لگا بندھا سا مخصوص قسم کا سیٹ اپ ہے۔ باس نے اخبار میں آپ کے کیس کے بارے میں پڑھا۔ انہوں نے تو آپ کو دیکھنے یا عدالتی کارروائی سننے کی بھی زحمت نہیں کی۔ بس انہوں نے مجھے دفتر میں بلایا اور اخبار پر انگلی رکھ کر کہا۔ "مجھے یہ آدمی چاہئے۔" بس۔۔۔ میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ میں آپ کو قائل کرنے کی مہم پر نکل کھڑا ہوا۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔۔۔ لیکن فیصلہ سمجھداری سے کیجئے گا۔ یہ آپ کی زندگی کا اہم موڑ ہے۔"

سعید پاشا کی بات کچھ عجیب سی تھی لیکن خالد کے خیال میں قدرت کو اگر کسی شخصیت پر معجزاتی انداز میں مہربان ہونا ہوتا تھا تو اس کے لئے ظاہری طور پر اسی طرح بہانے بنتے تھے' اسی طرح اسباب پیدا ہوتے تھے۔ سعید پاشا کی یہ بات بہرحال سو فیصد سچ تھی کہ خوش قسمتی روز روز انسان کے دروازے پر دستک نہیں دیتی۔ یہ بھی سچ تھا کہ زیادہ

سوچوں میں الجھا رہنے والا آدمی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اور جو خطرہ مول نہیں لے سکتا وہ تیز رفتاری سے آگے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ خالد کو اپنی قوت فیصلہ پر بہرحال ناز تھا۔ اسی وقت فیصلہ کا مظاہرہ اس نے اس وقت کیا تھا جب سب کی مخالفت کے باوجود نیاز علی کا کیس ہاتھ میں لیا تھا۔

اس نے بہت کم وقت سوچ بچار میں صرف کیا۔ کھانے سے فارغ ہونے تک وہ فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ "ٹھیک ہے سعید صاحب! مجھے آپ کی پیشکش منظور ہے لیکن پہلے میں فرم کا دفتر دیکھنا چاہوں گا۔۔۔ وہ کمرہ دیکھنا چاہوں گا جو مجھے آفس کے طور پر استعمال کرنے کے لئے دیا جائے گا۔۔۔ وہ اپارٹمنٹ دیکھنا چاہوں گا جو آپ نے رہائش کے لئے دینے کی بات کی ہے۔ اس کے علاوہ میں باقاعدہ تقرری کا خط لینا چاہوں گا جس میں ان تمام مراعات وغیرہ کا ذکر ہو۔"

"یہ تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔" سعید پاشا طمانیت سے مسکرایا۔ "ایک بڑے ادارے میں تقرریاں وغیرہ باضابطہ طریقے سے ہی ہوتی ہیں۔ آپ چاہیں تو ابھی میرے ساتھ اسی گاڑی میں کراچی چل سکتے ہیں۔ رات وہیں اپنے ہی اپارٹمنٹ میں قیام کیجئے گا جو آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ ہمارا دفتر۔۔۔ اس میں آپ کا کمرہ۔۔۔ یہ سب چیزیں آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے گا۔۔۔ نہ صرف دیکھ لیجئے گا بلکہ محسوس بھی کر لیجئے گا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

خالد نے صرف ایک لمحے سوچا۔ تجویز یہ بھی مناسب تھی۔ اب اسے کوئی مصروفیت تو تھی نہیں۔ وہ اپنے اس فاضل وقت کا بہت اچھا استعمال کر سکتا تھا۔ سیر کی سیر ہو جاتی اور کام کا کام۔۔۔ اس کا ایک دوست کہا کرتا تھا۔ "اس دنیا میں اول تو کوئی کسی کو بہت اچھی کوئی چیز دیتا نہیں ہے لیکن اگر قسمت تم پر مہربان ہو ہی جائے اور کوئی تمہیں بہت اچھی چیز دینے لگے تو اسے فوراً قبول کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ دینے والے کا ارادہ بدل جائے۔"

اس وقت اس نے اپنے اس دوست کی نصیحت پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ سعید پاشا بھی اپنی جگہ گویا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے خالد کو سگریٹ پیش کیا مگر خالد نے شکریئے کے ساتھ انکار کر دیا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ سعید پاشا نے سگریٹ سلگا کر گہرا کش لیتے ہوئے سوچ میں ڈوبے لہجے میں بولا۔ "میرا تو ایک اور بھی مشورہ ہے۔۔۔ اگر آپ کو پسند آئے اور آپ یہ نہ سوچیں کہ میں کچھ زیادہ ہی جلد بازی کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ مشورہ یہ ہے کہ آپ اسی چکر میں اپنی بیگم کو بھی ساتھ لے چلیں۔ وہ کم از کم اپارٹمنٹ تو دیکھ لیں گی جس میں انہیں آئندہ رہنا ہو گا۔ ان کی رائے شامل ہونے کے بعد آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔"

تجویز یہ بھی اچھی تھی۔ خالد کی بیوی میمونہ کو تو ویسے بھی ہر مہینے دو مہینے بعد کراچی



کا چکر لگانے کا شوق تھا۔ کبھی کسی تقریب کے بہانے، کبھی عزیزوں سے ملنے ملانے کے بہانے اور کبھی یونہی سیر سپاٹے کی غرض سے وہ کراچی آتے ہی رہتے تھے۔ میمونہ پڑھی لکھی لڑکی تھی مگر اس کا تعلق نیم دیہاتی علاقے سے تھا۔ کراچی اس کے خوابوں کا شہر تھا۔ کچھ برسوں سے یہ خواب لہو کے چھینٹوں سے اکثر آلودہ ہوتے رہتے تھے۔ آنے جانے کا شوق کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ بہت سی احتیاطیں دامن گیر ہونے لگی تھیں۔ وہ بات نہیں رہی تھی کہ دن ہو یا رات، جنوری ہو یا جولائی جب دل چاہا جا کر چکر لگا آئے۔۔۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود شہر کا طلسم اپنی جگہ قائم تھا۔ خواب مجروح ہوئے تھے، مرے نہیں۔۔۔

خالد کو یقین تھا کہ میمونہ کو یہ سب کچھ سننے کے بعد اپنے کانوں پر یقین نہیں آئے گا اور اگر اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو وہ نہ صرف کراچی منتقل ہونے کے لئے فوراً تیار ہو جائے گی بلکہ اصرار کر کے خالد کو جلد از جلد اس فیصلے پر عملدر آمد کے لئے مجبور کرے گی۔ وہ اس وقت دو کمروں کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے جس میں خالد کی بیوہ والدہ بھی اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ مکان درحقیقت والدہ ہی کا تھا جو انہوں نے جوانی میں بیوہ ہونے کے بعد تھوڑی بہت جمع پونجی سے خرید لیا تھا۔ یہ برسوں پہلے کی بات تھی اور مکان کسی اچھے علاقے میں بھی نہیں تھا اس لئے بہت سستا مل گیا تھا۔ بس جبھی سے سر چھپانے کا ٹھکانہ بنا ہوا تھا۔ خالد اور میمونہ وہاں وقت تو گزار رہے تھے لیکن خوش بہرحال نہیں تھے۔ دونوں اپنی آنکھوں میں خوبصورت مستقبل کے خواب لئے جی رہے تھے۔ خالد کو ورثے میں اپنے باپ کی کوئی اچھی یا بری یاد بھی نہیں ملی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کی ماں نے بتایا تھا کہ وہ اس کی پیدائش سے کچھ پہلے ہی ٹرین کے حادثے میں مرگیا تھا اور اس کے بعد اس نے خالد کی خاطر دوسری شادی نہیں کی تھی۔ جوانی بھی بیوگی میں گزار دی تھی اور اب بڑھاپا بھی نہایت صبر شکر سے گزار رہی تھی۔

خالد آج تک یہی سوچتا آیا تھا کہ وہ اپنے جن خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھرنا چاہتا تھا ان کے لئے اسے بہت طویل جدوجہد کرنا تھی، محنت مشقت کرنی تھی، بڑی ذہانت اور منصوبہ بندی سے کام لینا تھا کیونکہ اسے ورثے میں کچھ نہیں ملنا تھا، اس نے خالی ہاتھوں سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ ماں نے بیوگی اور تمام تر کم مائیگی کے باوجود اسے پڑھا لکھا دیا تھا، قانون کی تعلیم مکمل کرا دی تھی۔ یہی بہت بڑی بات تھی۔۔۔ لیکن اب سعید پاشا جیسے اچانک ہی زندگی کے کسی تاریک موڑ سے نکل کر سامنے آگیا تھا اور سارے ہی خوبصورت خوابوں کی تعبیریں گویا اپنے ہاتھوں میں لئے چلا آ رہا تھا۔ کئی بار تو خالد کو یہ اندیشہ بھی محسوس ہو چکا تھا کہ کہیں سعید پاشا بھی کوئی خوبصورت خواب ہی تو نہیں تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ ابھی عدالت کے احاطے میں موجود تھا اور اسے غنودگی آگئی تھی

یا پھر وہ جاگتی آنکھوں سے ہی خواب دیکھنے لگا تھا؟ پہلی قابل ذکر کامیابی پر ہی اس کا لاشعور اس کے ساتھ شرارتیں کرنے لگا تھا؟

مگر نہیں ـــ سعید پاشا خواب نہیں ہو سکتا تھا ـــ اسے تو وہ کئی پیشیوں پر عدالت میں دیکھ چکا تھا۔ سعید پاشا خود ہی زور سے کھنکار کر اسے خیالوں کی دنیا سے باہر لے آیا۔ "خالد صاحب! آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیا آپ کو میری تجویز پسند نہیں آئی؟"

"تجویز تو بہت پسند آئی ہے ـــ" خالد نے اعتراف کیا۔ "میں تو اپنے آپ کو اس پر عملدر آمد کے لئے تیار کر رہا تھا اور یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کل تک مجھے کوئی اور مصروفیت تو درپیش نہیں۔"

"آپ اطمینان سے سوچئے ـــ تب تک میں سگریٹ ختم کرتا ہوں۔" سعید پاشا نے کہا مگر خالد اس کے سگریٹ ختم کرنے سے پہلے ہی چلنے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ خالد کے اصرار کے باوجود بل سعید نے ہی ادا کیا۔ اس نے خالد کو حق میزبانی دینے سے انکار کر دیا۔

وہ ایک بار پھر گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ پندرہ بیس منٹ بعد گاڑی جس تنگ سی گلی میں جا کر رکی اس میں اس کا وجود اجنبی لگ رہا تھا۔ کئی پڑوسیوں نے دروازوں سے سر نکال کر اس گاڑی کو دیکھا تاہم خالد نے گاڑی سے اترتے وقت کسی کی طرف توجہ نہیں دی۔ محلے پڑوس میں ویسے بھی صرف اس کی والدہ کا زیادہ میل جول تھا۔ وہ کم ہی کسی سے ملتا تھا۔ اسے زندگی نے اتنی فرصت بھی نہیں دی تھی۔

دستک کے جواب میں دروازہ میمونہ نے کھولا۔ سعید پاشا' خالد کے ساتھ ہی تھا۔ وہ دروازے پر ایک لمحے کے لئے رکا لیکن خالد اسے اندر چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ میری مسز ہیں ـــ میمونہ ـــ"

"مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔" سعید پاشا گہری نظر سے اس کا جائزہ لے کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "میمونہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں اپنا دوپٹہ درست کرتے ہوئے ایک طرف ہو گئی۔ وہ گوری چٹی' سروقد اور دلکش خدوخال کی مالک تھی۔ غزالی آنکھوں اور بھورے تراشیدہ بالوں کے ساتھ وہ اس علاقے کی مخلوق نہیں لگتی تھی۔ اس کا لباس بھی ہمیشہ ڈھنگ کا ہوتا تھا۔ اپنے وسائل میں رہتے ہوئے وہ زیادہ سے زیادہ خوش لباس اور سلیقے قرینے کی عورت نظر آنے کی کوشش کرتی تھی اور یہ بات خالد کو پسند تھی۔ صرف یہی نہیں اس کی حرکات و سکنات دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اس کی رگ و پے میں غضب کی توانائی بھری ہوئی تھی۔ تھکنا تو اس نے گویا سیکھا ہی نہیں تھا۔ گھر کے کام کاج' گھومنے پھرنے یا تقریبات کی تیاریوں میں کسی کا ہاتھ بٹانے میں وہ کبھی پہلو تہی نہیں کرتی تھی۔ حرکت میں رہنے میں گویا اسے لطف آتا تھا۔ شاید اسی لئے ساس کے ساتھ بھی اس کی اب تک بہت اچھی نبھ رہی تھی۔ وہ انہیں کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھی۔ گھر میں گاؤں سے



آئی ہوئی ایک نو عمر سی لڑکی بھی تھی۔ بہت سے کام اس نے سنبھال رکھے تھے۔ میمونہ نے اسے گھر کے تقریباً سبھی کام سکھا دیئے تھے۔ ایک فل ٹائم ملازمہ کے طور پر وہ انہیں مہنگی نہیں پڑتی تھی۔

خالد کو اپنی بیوی کی سیمابی سی فطرت اس کی پھرتی اور مستعدی اچھی لگتی تھی۔ اس کے نزدیک وہ زندگی کی علامت تھی۔ ایک بھرپور اور خوش باش عورت ـــ

گھر چھوٹا اور غریبانہ مگر صاف ستھرا اور سلیقے کا تھا۔ میمونہ کی آمد کے بعد سے گھر کی حالت بہتر ہوئی تھی۔ وہ خود بھی گو کہ کسی خوشحال گھرانے سے نہیں آئی تھی لیکن بہرحال نئی نسل کی نمائندہ تھی۔ اس کے پاس تعلیم اور سلیقہ بھی تھا۔ کم وسائل کے باوجود جلد ہی ان کا گھر اور رہن سہن اس علاقے میں کچھ الگ تھلگ اور نمایاں دکھائی دینے لگا تھا۔ چھوٹے سے صاف ستھرے صحن میں چاروں طرف پھولدار پودوں کے گملے رکھے تھے۔ سعید پاشا نے پہلے میمونہ اور پھر گھر کا جائزہ لیتے ہوئے تحسین آمیز انداز میں سر ہلایا۔ خالد نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ یہ تحسین میمونہ کے لئے تھی یا گھر کے لئے ـــ اسے تو بس یہی غنیمت لگا تھا کہ سعید پاشا نے اس گلی میں اور پھر گھر میں داخل ہونے کے بعد ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں اب تک جو خفیف سا احساس کمتری سر اٹھا رہا تھا وہ دور ہو گیا۔

صحن میں ایک طرف انہوں نے کم لاگت سے چھوٹا سا ایک کمرہ بنا رکھا تھا جو غریبانہ سے ڈرائنگ روم کے طور پر کام آتا تھا۔ خالد نے سعید پاشا کو وہاں بٹھایا' میمونہ کو اس کے لئے چائے بنانے کو کہا اور اس کے ساتھ ہی کچن میں جا کر پرجوش انداز میں جلدی جلدی اس پیشکش کے بارے میں بتانے لگا جو سعید پاشا لے کر آیا تھا۔ اس کی والدہ جہاں آراء بیگم بھی وہیں آ گئی تھیں اور انہوں نے بھی ساری بات سن لی تھی۔

میمونہ کی حالت تو خوشی سے کچھ ایسی ہو گئی گویا اس کا بس نہ چل رہا ہو کہ ہواؤں میں اڑنے لگے لیکن جہاں آراء کچھ ایسی خوش نظر نہیں آ رہی تھیں بلکہ کئی سیکنڈ کی خاموشی کے بعد جب وہ بولیں تو ان کے لہجے سے کچھ فکر مندی جھلک رہی تھی۔ "بیٹا جو کچھ بھی کرو بہت سوچ سمجھ کر کرنا اور سب چیزوں کا اچھی طرح جائزہ لینے سے پہلے کسی بات کی حامی نہ بھرنا۔"

خالد اس وقت بہت خوش تھا۔ وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولا۔ "امی! میں کتنی بار آپ کو یاد دلا چکا ہوں کہ اب میں آپ کا وہ منا نہیں جس کی ناک دوپٹے کے پلو سے پونچھ کر آپ اسے گلی میں کھیلنے کے لئے بھیجا کرتی تھیں۔ اب میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں اور دن بھر مجھے ایک سے ایک بڑے لفنگے' اچکے' بدمعاش اور دھوکے باز سے واسطہ پڑتا ہے۔ میں اب لوگوں کو سمجھ بھی سکتا ہوں' ان سے نمٹ بھی سکتا ہوں اور اپنا

برا بھلا بھی سمجھتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں حالات کا جائزہ لینے کے لئے وہاں اکیلا نہیں جا رہا۔ میمونہ کو بھی ساتھ لے جا رہا ہوں۔ ایک سے دو بھلے۔"

جہاں آراء بیگم کچھ اس انداز میں اس کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں جیسے کہنا چاہتی ہو۔۔۔ "بچوں کی یہ تو خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ بہت جلد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ ماں باپ سے زیادہ سمجھدار ہو گئے ہیں۔" مگر انھوں نے زبان سے یہ بات نہیں کہی۔

میمونہ ڈرائنگ روم میں چائے پہنچاتے ہی کراچی جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ ہلکے سے میک اپ اور اپنی سب سے اچھی ساڑھی میں تیار ہو کر کمرے سے نکلی تو قیامت ڈھا رہی تھی۔

○

کراچی پہنچ کر جب گاڑی کلفٹن کے علاقے میں داخل ہو چکی تو سعید پاشا بولا۔

"ہماری رہائشی بلڈنگ اور وہ بلڈنگ جس میں ہمارا آفس ہے' دونوں کلفٹن میں ہی ہیں اور ان کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ پہلے میں آپ کو رہائشی بلڈنگ میں لے چلتا ہوں۔ میرا خیال ہے آپ لوگوں کو آپ کا اپارٹمنٹ دکھانے کے بعد ہم مسز تیموری کو وہیں چھوڑ دیں گے۔ یہ ہماری بیگمات سے گپ شپ کریں گی۔ وہاں کے ماحول سے کچھ آشنا ہوں گی۔"

پھر وہ خالد تیموری سے مخاطب ہوا۔ "میں اس دوران میں آپ کو آفس دکھانے لے چلوں گا۔ اس وقت آفس تقریباً بند ہی ہو چکا ہے۔ باقی لوگ تو آپ کو رہائشی بلڈنگ میں ہی مل جائیں گے البتہ باس' ان کی سیکرٹری اور ریسپشنسٹ آفس میں موجود ہیں۔"

وہ کچھ دیر پہلے اپنے موبائل فون پر آفس بات کر چکا تھا۔ پھر وہ میمونہ سے مخاطب ہوا۔ "کیا خیال ہے۔۔۔ یہ پروگرام ٹھیک ہے مسز تیموری؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔ میرا اس وقت آفس جانا تو بے کار ہی ہے۔ ویسے بھی آفس تو دراصل خالد صاحب کے دیکھنے کی چیز ہے مجھے تو اس جگہ سے زیادہ دلچسپی ہے جہاں ہمیں رہنا ہو گا اور جہاں میرا سارا وقت گزرے گا۔۔۔" میمونہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "اور ہاں۔۔۔ اب آپ کا بار بار مجھے مسز تیموری کہہ کر مخاطب کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔ آپ مجھے میمونہ ہی کہہ سکتے ہیں۔"

"بلکہ سچ پوچھیں تو میں محسوس کر رہا ہوں جیسے آپ ہماری فیملی میں شامل ہو چکے ہیں۔" سعید پاشا اگلی سیٹ پر سے ترچھا ہو کر ان سے باتیں کر رہا تھا۔

"زیادہ امکان تو یہی ہے۔" خالد مسکراتے ہوئے بولا۔



خالد اور میمونہ کے لئے کلفٹن کا علاقہ اجنبی نہیں تھا اور وہ اس کی قدروقیمت اور اہمیت سے بھی واقف تھے۔ میمونہ ایئر کنڈیشنڈ گاڑی کے رنگین شیشوں سے چوڑی چکلی صاف ستھری سڑکوں اور بلند و بالا خوبصورت عمارتوں کا خاصے انہماک اور اشتیاق سے جائزہ لے رہی تھی لیکن کچھ دیر بعد گاڑی جس عمارت کے سامنے جا کر رکی اسے دیکھ کر تو وہ مبہوت ہی رہ گئی۔

وہ عمارت گنجان آباد علاقے سے ہٹ کر کچھ ریتیلے سے ٹیلوں کے دامن میں گویا فخر و غرور سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔ وہ ایک جدید عمارت تھی اور اس میں جدید دور کے طرز تعمیر کی خوبصورتی نمایاں تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ اس میں قدیم عمارتوں کا سا رعب و جلال جھلک رہا تھا اور ویسی ہی مضبوطی کا تاثر بھی مل رہا تھا۔ یہ متضاد سی خصوصیات کا امتزاج تھا مگر بھلا لگ رہا تھا۔

○

کامران نے ہارن دیا تو ایک باوردی مسلح گارڈ نے بلند و بالا مضبوط آہنی گیٹ کھولا۔ گیٹ خودکار تھا اور گارڈ نے غالباً کوئی بٹن دبایا تھا جس سے وہ آہستگی سے خود بہ خود کھلتا چلا گیا تھا۔ اندر خوبصورتی اور شگفتگی کی ایک اور چھوٹی سی دنیا ان کی منتظر تھی۔ دائیں بائیں خوبصورت سرسبز لان پھیلا ہوا تھا جس میں ایک خاص ترتیب سے رنگا رنگ پھولوں سے لدے پودے جمگھٹا سا لگائے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے تھے۔ یہ لان غالباً اصل عمارت کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

ایک طرف خوبصورت چھت سے ڈھکا ہوا سوئمنگ پول تھا جس کے اردگرد رنگین چھتریوں اور خوبصورت ٹائلز سے آراستہ بیٹھنے کی جگہیں تھیں جہاں پول چیئرز اور لان چیئرز وغیرہ بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ عمارت کی چار دیواری بہت بلند تھی اور اس سے مزید اونچائی تک خار دار تاروں کا جنگلا پھیلا ہوا تھا۔ سعید پاشا نے بتایا کہ رات کو ان تاروں میں کرنٹ دوڑتا تھا۔

پھر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ گویا جدید دور کے ایک آدمی کا جدید قلعہ ہے۔ جمشید مختار کے ایک خواب کی تعبیر ہے۔ اس دنیا میں تقریباً سبھی لوگ جب عملی زندگی کا آغاز کرتے ہیں تو بہت سے خواب دیکھتے ہیں لیکن ان میں سے بہت کم کو ان کی تعبیر دیکھنا نصیب ہوتی ہے۔"

گاڑی ایک خفیف سے ہچکولے کے ساتھ تہہ خانے میں جا اتری۔ وہاں کئی گاڑیوں کی پارکنگ کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی اور اس پر نمبر لگا ہوا تھا۔ سعید ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ڈی نائن نمبر کے نیچے جو سرخ گاڑی کھڑی ہے وہ ایک طرح سے آپ

کی ذاتی گاڑی ہو گی۔ اگر آپ کو بوقت ضرورت دفتر کی یہ گاڑی میسر نہ ہو' یہ کہیں اور مصروف ہو تو آپ وہ گاڑی استعمال کر سکتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کے ساتھ ڈرائیور نہیں ہو گا۔ آپ کے اپارٹمنٹ کا نمبر بھی ڈی نائن ہے۔"

خالد اور میمونہ خاموش تھے۔ سحر زدہ سی نظروں سے چاروں طرف دیکھے جا رہے تھے۔ گاڑی سے اتر کر وہ ایک خوبصورت لفٹ کے ذریعے نویں منزل پر پہنچے تو وہاں لابی میں دو مرد اور تین عورتیں گویا استقبالیہ وفد کی طرح ان کے انتظار میں کھڑے تھے۔ لابی میں بھی سرخ رنگ کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔

ذرا چھوٹے قد کا ایک مرد آگے بڑھ کر خالد اور سعید پاشا سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "نسرین بھابھی نے گاڑی بلڈنگ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لی تھی۔ انہوں نے انٹر کام پر سب کو اطلاع دی۔ ہم نے سوچا آپ کو گارڈ آف آنر پیش کرنے کے لئے یہاں جمع ہو جائیں۔ ہم سب ابھی ابھی گرتے پڑتے یہاں جمع ہوئے ہیں۔"

"وہ تو تم سب کی شکلوں سے لگ رہا ہے---- لیکن اس بھگدڑ کی ضرورت کیا تھی؟" سعید پاشا بولا۔

"بھئی مہمانوں کو خوش آمدید کہنے والا کوئی نہ ہو تو اچھا نہیں لگتا۔" وہ شخص بولا۔

"گویا آپ لوگوں کو ہماری آمد کی اطلاع تھی؟" خالد نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں---- ہمیں تو وقت کا بھی اندازہ تھا۔" اس شخص نے مسکراتے ہوئے خوش دلی سے جواب دیا۔ "ہمارے رابطے بڑے تیز ہیں۔"

خالد نے سعید پاشا کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ "دراصل حیدر آباد میں جب آپ اپنے گھر میں چائے وغیرہ کا کہنے اندر گئے ہوئے تھے تو میں نے موبائل فون پر انھیں اطلاع دے دی تھی کہ آپ لوگوں کا میرے ساتھ آنے کا پروگرام بن گیا ہے۔ اس پر یہ اتنا اترا رہے ہیں۔ اب میں ان کا تعارف بھی کرا دوں۔ یہ ہماری فرم میں جونیئر پارٹنر ہیں۔ نام ان کا حنیف قیصر ہے۔"

پھر اس نے ایک دراز قد' خوش لباس اور خوبصورت عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ان کی بیگم سعدیہ ہیں۔ یہ چھٹے فلور پر رہتے ہیں۔"

سعدیہ قد میں اپنے شوہر سے بھی نکلتی ہوئی تھی لیکن ان کی جوڑی جچ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر یوں گرم جوشی سے میمونہ سے ملی گویا اسے بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ ایک خوبصورت شخصیت کی مالک ہی نہیں' نہایت خوش مزاج بھی معلوم ہوتی تھی۔

سعید پاشا نے دوسرے مرد سے خالد کا تعارف کرایا۔ "یہ تنویر کمال ہیں۔ یہ بھی فرم میں پارٹنر ہیں----" پھر اس نے ایک دبلی مگر نہایت دلکش خدوخال اور تیکھے نقوش کی مالک عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ان کی مسز ہیں۔ ان کا نام عالیہ ہے۔" عالیہ بھی آگے



بڑھ کر میمونہ سے پرانی دوستوں کی طرح ملی۔

اب سعید پاشا نے ذرا الگ کھڑی ہوئی ایک سروقد عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ مجھ گناہگار کی بیگم ہیں--- نسرین----"

وہ ذرا الگ ہی کھڑی تھی اور اپنی ساتھی عورتوں سے بالکل الگ تھلگ ہی نظر آ رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سی افسردگی تھی بلکہ شاید افسردگی اس کی پوری شخصیت پر ہی دھند کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ خوبصورتی میں وہ بھی کچھ کم نہیں تھی لیکن ایک تو وہ عمر میں باقی تینوں عورتوں سے بڑی تھی دوسرے اس کا حسن کسی حد تک "حسن بیمار" سا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کافی دنوں سے کچھ بیمار چلی آ رہی ہو۔ ایک ہلکا سا اضمحلال اس پر سر سے پاؤں تک سایہ کئے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود بہرحال اس کی دلکشی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میمونہ سمیت ان چاروں عورتوں کی موجودگی گویا کشادہ لابی کو جگمگائے دے رہی تھی۔

سعدیہ جو ذرا شوخ و شنگ معلوم ہوتی تھی سامنے ہی نظر آنے والے ایک خوبصورت دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "آیئے آپ کو آپ کا اپارٹمنٹ دکھائیں۔"

تنویر کمال بولا۔ "بھابھی! آپ نے تو جیسے فرض کر لیا ہے کہ خالد صاحب فرم میں آ ہی گئے ہیں۔"

سعدیہ کے بجائے سعید پاشا بول اٹھا۔ "فرض کرنے کی کیا بات ہے---- بس سمجھو آ ہی گئے ہیں۔"

خالد یا میمونہ نے اس کی تردید نہیں کی۔ ان کی رہنمائی میں وہ اپارٹمنٹ کا جائزہ لینے لگے۔ پورا اپارٹمنٹ دیکھنے میں انہیں کافی دیر لگ گئی۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اپارٹمنٹ اتنا بڑا' اتنا عالیشان اور اتنا پرتعیش بھی ہو سکتا تھا۔ کشادہ اور آراستہ کمرے' چمکتے دمکتے باتھ روم' شاندار فرنیچر' دبیز قالین' خوبصورت پردے' جدید ترین سازو سامان سے آراستہ کچن---- خالد اور میمونہ نے اس قسم کی رہائش کا خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ دونوں گم صم تھے آخر میں وہ سب ایک کشادہ بالکونی میں آن کھڑے ہوئے جہاں سے سمندر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ سمندر سرمئی سی دھند میں لپٹا دکھائی دے رہا تھا۔

سعید پاشا کی افسردہ سی بیوی نسرین جواب تک خاموش تھی' اچانک بول اٹھی۔ "یہ اس اپارٹمنٹ کی سب سے بری جگہ ہے۔"

"کیوں؟" میمونہ نے بے ساختہ حیرت سے پوچھا۔ "یہاں سے تو اتنا خوبصورت نظارہ دکھائی دے رہا ہے۔"

سب نے نسرین کو گھور کر دیکھا گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے خاموش رہنے کی

ہدایت کر رہے ہوں مگر وہ سب سے بے نیاز عجیب سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی اسے میمونہ کے سوال کا جواب دینے سے نہیں روک سکتا تھا۔

○



میمونہ ایک ٹک نسرین کی طرف دیکھ رہی تھی اور نسرین بالکونی سے جھک کر تو منزل نیچے کنکریٹ کی اس پختہ روش کی طرف دیکھ رہی تھی جو عقبی لان کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کچھ اذیت زدہ سے انداز میں سکڑی ہوئی تھیں جیسے وہ کنکریٹ کے اس فرش پر کوئی تکلیف دہ منظر دیکھ رہی ہو۔ میمونہ نے بھی اس کی نظروں کی تقلید میں جھک کر نیچے دیکھا لیکن اسے وہاں کچھ نظر نہ آیا۔ بس خوبصورت لان تھا اور اس کے درمیان پختہ گزرگاہ بنی ہوئی تھی۔

میمونہ سیدھی ہوئی تو نسرین نے یکدم گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ میمونہ کو جھرجھری سی آگئی۔ نسرین کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی۔ میمونہ کو اس کی آواز سرگوشی کی سی صورت میں کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ "یہاں سے چھلانگ لگا کر رحمان جمیل صاحب نے خودکشی کی تھی۔ وہاں خون میں لت پت ان کی لاش پڑی تھی۔" اس نے نیچے دیکھے بغیر ہاتھ سے اشارہ کیا۔

سعید پاشا نے اپنی بیوی کا ہاتھ کھینچ کر پیچھے کیا اور گھٹی گھٹی سی آواز میں لیکن ڈانٹنے کے سے انداز میں بولا۔ "نسرین! یہ کوئی موقع ہے ایسی باتیں کرنے کا؟" لیکن نسرین گویا اس کی آواز نہیں سن رہی تھی۔

میمونہ نے کچھ دلچسپی اور کچھ خوف سے پوچھا۔ "یہ رحمان جمیل صاحب کون تھے؟"

سعید پاشا افسردہ سے انداز میں گہری سانس لے کر بولا۔ "وہ فرم میں مجھ سے پہلے سینئر پارٹنر تھے۔ وہ اپنی بیوی کی وجہ سے بڑے پریشان تھے۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں رہی تھی۔ اس نے رحمان صاحب کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اس کے باوجود رحمان صاحب اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ پھر بدقسمتی سے زچگی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ویسے بھی شادی کے بہت طویل عرصے بعد انہیں یہ خوشی دیکھنا نصیب ہو رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اتنا بڑا صدمہ آن پڑا۔ کچھ کام کا دباؤ بھی زیادہ تھا۔ رحمان صاحب کمزور اعصاب کے مالک تھے۔ وہ یہ سب دباؤ برداشت نہیں کر سکے اور اچانک ہی انتہائی قدم اٹھا بیٹھے۔۔۔۔"

میمونہ اور خالد دم بخود سے سن رہے تھے جبکہ باقی لوگ یکدم ہی کچھ مضطرب نظر آنے لگے تھے۔ سعید پاشا نے سمجھانے والے انداز میں سلسلہ کلام جوڑا۔۔۔۔ "لیکن ان

باتوں سے واہموں اور وسوسوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ہر ایک کے اپنے اپنے حالات اور اپنی اپنی تقدیر ہوتی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ایک گھر میں اگر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ چکا ہے تو وہاں آنے والی دوسری فیملی کے ساتھ بھی خدا نخواستہ ویسا ہی ہو گا۔ اگر لوگ اس قسم کے واہموں میں گرفتار ہونے لگیں تو نہ جانے کتنے مکانوں کی فروخت رک جائے اور کتنے مکان کرائے پر اٹھنے سے رہ جائیں۔ آپ دونوں تو ویسے بھی نوجوان اور حوصلہ مند ہیں۔ آپ میں زندگی کی امنگ اور ولولہ نظر آتا ہے۔ آپ رحمان جمیل اور ان کی بیوی کی طرح شکستہ اعصاب کے مالک اور کم حوصلہ یقیناً نہیں ہیں۔ آپ کو اس واقعے کو توہم پرست اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کی طرح اپنے ذہن پر سوار نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح کی باتیں ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوتی ہیں۔"

نسرین نے شاید محسوس کر لیا تھا کہ وہاں اس کی موجودگی سے کوئی خوش نہیں تھا حتیٰ کہ اس کا شوہر بھی اس کی طرف کچھ ناگواری سے دیکھ رہا تھا۔ وہ پیشانی مسلتے ہوئے بولی۔ "میں سر میں کچھ درد محسوس کر رہی ہوں۔ کہیں یہ بڑھ نہ جائے میرا خیال ہے کہ میں چل کر آرام کرتی ہوں۔ آپ لوگ باتیں کریں——" پھر اس نے معذرت خواہانہ سی نظروں سے میمونہ اور خالد کی طرف دیکھا۔ "آپ لوگوں سے تو اب ملاقات ہوتی ہی رہے گی۔ حالات بتا رہے ہیں کہ آپ ہمارے پڑوسی بن ہی جائیں گے۔ میری باتوں کا کچھ خیال نہ کیجئے گا۔ میں یونہی کبھی کبھی خیالوں کی دنیا میں کچھ زیادہ ہی آگے چلی جاتی ہوں۔"

صاف لگ رہا تھا کہ اس نے ماحول کی ناگواری کو دیکھتے ہوئے پینترا بدلا تھا ورنہ یہ اس کے دل کی آواز نہیں تھی۔ پھر وہ یکدم ہی مڑی اور تیزی سے وہاں سے رخصت ہو گئی۔ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے جانے سے گویا ماحول کی کشیدگی اور تناؤ دور ہو گیا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد سعید پاشا، خالد سے مخاطب ہوا۔ "ہاں—— تو پھر آپ نے کیا سوچا؟"

خالد مسکراتے ہوئے بولا۔ "سوچ لیں گے ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ویسے بھی ابھی تو آفس دیکھنا اور جمشید صاحب سے ملنا باقی ہے۔"

"چلئے تو پھر مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے یہ کام بھی کر ہی ڈالتے ہیں۔" سعید پاشا مستعدی سے بولا۔ پھر وہ سعدیہ اور عالیہ سے مخاطب ہوا۔ "بھئی آپ دونوں ہمارے آنے تک میمونہ کی خاطر مدارات کریں۔ ان سے واقفیت اور شناسائی بڑھائیں۔ انہیں ان کے مستقبل کے گھر سے زیادہ مانوس ہونے میں مدد دیں۔ یہاں کے بارے میں مزید باتیں بتائیں—— تب تک ہم یہ دفتر والا مرحلہ بھی سر کر آئیں۔"

"ہم لوگوں نے چائے وغیرہ کا اہتمام کر رکھا ہے۔" سعدیہ نے بتایا۔ "آپ کچھ دیر



تو رکیں۔ سفر کی تکان بھی ہو گی۔"

"وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔" سعید پاشا مسکراتے ہوئے بولا۔ "اور ہمارے ہاں تکان کا کوئی تصور نہیں—— خالد صاحب تو ویسے بھی نوجوان آدمی ہیں۔ کیوں خالد صاحب؟"

"ذرہ نوازی ہے آپ کی——" خالد ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "ورنہ آج کل کون اپنے سامنے کسی کو نوجوان سمجھتا ہے۔"

سب ہنس دیئے اور سعید پاشا، خالد کو ساتھ لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ وہ نیچے پہنچے تو کامران گاڑی کے پاس اسی طرح مستعد کھڑا تھا۔ جیسے وہ اسے چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ ایک بار پھر انہیں گاڑی میں بٹھا کر روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ سفر مختصر ہی تھا۔ چند منٹ بعد وہ مین روڈ پر واقع ایک اور خوبصورت عمارت کے سامنے رکے جس کی تعمیر میں نہایت اعلیٰ درجے کے شیشے کا بے تحاشا استعمال کیا گیا تھا۔ "جمشید مختار اینڈ ایسوسی ایٹس" کا دفتر سب سے اوپر کی منزل پر تھا۔

اس کی شان و شوکت اور تزئین و آرائش دیکھ کر بھی خالد حیران رہ گیا۔ ریسپشن پر ایک ایسی لڑکی ٹیلیفون بورڈ اور کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی جسے دیکھ کر بہت زیادہ معاوضہ لینے والی اونچے درجے کی ماڈل کا گماں گزرتا تھا۔ آفس سے باہر تک راہداری میں بھی دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ریسپشن سے آگے بڑھے سے ایک ہال میں کئی خوبصورت میزیں شیشے کی دیواروں والے چھوٹے چھوٹے کمروں میں سجی ہوئی تھیں۔ ان پر کمپیوٹرز، انٹرکام اور دوسرے لوازمات موجود تھے۔ دیواروں پر خوبصورت کیبنٹوں اور لاکروں کی قطاریں تھیں۔ کھڑکیوں پر شاندار بلائنڈز، فالس سیلنگ میں نصب خوبصورت لائٹس اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ سرسری نظر میں تو سب چیزوں کا جائزہ بھی نہیں لیا جا سکتا تھا۔ اس پر کسی لاء فرم کے دفتر کے بجائے ملٹی نیشنل کمپنی کے دفتر کا گماں گزرتا تھا۔

ریسپشنسٹ انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ سعید پاشا بے نیازی سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے گزر گیا اور ہال میں شیشے کی دیواروں والے چھوٹے چھوٹے کمروں میں موجود خالی میزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہاں ہمارا پیرا لیگل اسٹاف بیٹھتا ہے —— کلرک وغیرہ—— جو سارا ریکارڈ کمپیوٹروں میں بھی محفوظ رکھتے ہیں اور کاغذات کی صورت میں بھی۔ بوقت ضرورت وہ ہمیں چند لمحوں میں کوئی بھی ضروری چیز نکال کر دے دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسے بھی ہزاروں خاص خاص مقدمات کا ریکارڈ محفوظ ہے جن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔"

خالد کے ذہن میں اس وقت اپنی فرم کے دفتر کی تصویریں ابھر رہی تھیں۔ وہ دفتر حیدر آباد کے ایک گنجان علاقے میں پرانی سی بلڈنگ میں تھا جس کی دیواروں سے پلستر جھڑتا

تھا اور سیڑھیوں کے کونے کھدروں میں پانی کی ہمکس جمی ہوئی تھیں۔ دفتر صرف تین چھوٹے چھوٹے ڈربا نما کمروں پر مشتمل تھا جن کے دروازوں پر چقیں لٹکی ہوئی تھیں۔ کونے کھدروں میں اور بوسیدہ الماریوں کی چھتوں تک فائلوں کے انبار نظر آتے تھے جن میں سے بعض پر مکڑیوں نے جالے تان لئے تھے۔ صرف فرم کے مالک صدر الدین صاحب کا کمرہ قدرے غنیمت تھا۔ ان کے پورے دفتر سے بڑا یہاں کا صرف ریسپشن تھا۔ اگر ان کے دفتر کا پورا کاٹھ کباڑ نما فرنیچر فروخت کر دیا جاتا تب بھی شاید اتنی رقم حاصل نہ ہوتی کہ اس قسم کا ایک صوفہ سیٹ ہی آ جاتا جیسا یہاں ریسپشن پر ملاقاتیوں کو بٹھانے کے لئے پڑا تھا اور یہاں ویسا ایک نہیں تین صوفہ سیٹ تھے۔ دوسرا خوبصورت اور جدید قسم کا فرنیچر اس کے علاوہ تھا۔

پھر وہ اس حصے میں پہنچے جہاں ایک قطار میں پارٹنرز اور باس کے کمرے تھے۔ ان کے دروازوں پر پیتل کے حروف والی چمکتی اور جھلملاتی نیم پلیٹیں نصب تھیں۔ حنیف قیصر، تنویر کمال اور سعید پاشا کے نام دیکھنے کے بعد خالد یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک کمرے کے دروازے پر اس کے نام کی تختی بھی نصب تھی۔ پیتل کے حروف میں اس کا نام چمک رہا تھا۔ "خالد تیموری ایڈووکیٹ۔" اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

"یہ کیا۔۔۔؟" وہ ہکلایا۔ "یہاں تو میرے نام کا کمرہ بھی موجود ہے۔"

سعید پاشا دھیرے سے ہنسا جیسے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ "دراصل یہ رحمان جمیل صاحب کا کمرہ ہے۔" وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔ "ویسے وہ تو ہمارے سینئر پارٹنر تھے اور آپ فی الحال کچھ عرصے کے لئے ملازم ہوں گے لیکن ہم نے سوچا ہے انہی کا کمرہ آپ کو دے دیا جائے۔ کیا پتا آپ ہماری فرم میں سینئر پارٹنر سے بھی زیادہ اہم ہو جائیں۔"

"لیکن۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ آپ لوگ آج میرے مقدمہ جیتنے سے پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے کہ آپ مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت دیں گے؟" خالد ہکلایا۔

"جی ہاں۔۔۔ یہ فیصلہ تو کئی دن پہلے ہو چکا تھا۔" سعید پاشا نے اطمینان سے جواب دیا۔ "مقدمہ جیتنے سے اس کا کچھ زیادہ تعلق نہیں۔۔۔ اور ویسے بھی ہمیں معلوم تھا کہ مقدمہ آپ ہی جیتیں گے۔"

"آپ کو کیسے معلوم تھا؟" خالد نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

"ہمارے پاس شیشے کا ایک جادو کا گولا ہے ہمیں اس میں مستقبل کا حال نظر آ جاتا ہے۔" سعید پاشا نے گویا مذاق میں اس کی بات ٹالنے کی کوشش کی لیکن پھر اس کی سنجیدگی دیکھ کر بولا۔ "آپ ایک لائق وکیل ہیں خالد صاحب۔۔۔ اور ہم آپ سے بھی زیادہ سینئر ہیں۔ آپ کو معلوم ہے مقدمہ ایک خاص موڑ پر پہنچ کر اپنے رخ کا پتا دے دیتا ہے۔"

خالد یہ اعتراف کرتے کرتے رہ گیا کہ آخری پیشی تک اسے یقین نہیں تھا کہ فیصلہ



اس کے حق میں ہو گا۔ بے شک اس نے دو تین نہایت غیر متوقع شہادتیں کھود نکالی تھیں لیکن وہ اتنی ٹھوس نہیں تھیں جتنی عدالت میں ثابت ہوئی تھیں۔ مقدمے میں اور بھی کچھ جھول تھے۔ اس کے باوجود وہ جیت گیا تھا۔

"چلیں۔۔۔ یہ تو ٹھیک ہے۔" خالد نے تسلیم کیا۔ لیکن آپ کا یہ یقین میرے لئے پھر بھی حیران کن ہے کہ میں آپ کی پیشکش قبول کر لوں گا۔ آپ اس سلسلے میں اتنے پراعتماد ہیں کہ آپ نے میرے لئے کمرہ بھی تیار کر رکھا ہے۔ اس کے دروازے پر میری نیم پلیٹ بھی لگا رکھی ہے۔" اس نے بے یقینی سے سر ہلایا۔

"ارے بھئی آپ اندر تو چلیں۔ ابھی تو آپ کو ہمارے یقین اور اعتماد کے کچھ اور نمونے دیکھنے کو ملیں گے۔" سعید پاشا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

خالد نے اس کمرے میں قدم رکھا تو گویا ایک اور جہان حیرت میں داخل ہو گیا۔ کہنے کو وہ ایک کمرہ تھا مگر خالد کے لئے ایک کائنات سے کم نہیں تھا۔ اس خوبصورت صاف ستھرے، آراستہ و پیراستہ کمرے کی فضا میں بھی خوشبو رچی ہوئی تھی اور اس میں ایک شاندار دفتر کے وہ تمام لوازمات موجود تھے جن کے خواب بھی خالد ڈرتے ڈرتے دیکھا کرتا تھا۔ اسے کچھ زیادہ یقین نہیں تھا کہ زندگی میں کبھی اس کا ایسا آفس ہو گا۔۔۔ اور اتنی جلدی۔۔۔؟ یہ تو اس کے خیال میں بالکل ہی ناممکن تھا۔ اپنے لئے اتنا اچھا آفس سیٹ کرنے کا خواب تو شاید اس کے باس صدر الدین صاحب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ حالانکہ حیثیت کے اعتبار سے وہ ایسے گئے گزرے نہیں تھے۔ اگر وہ اپنے کارکنوں کو بہت شاندار ماحول مہیا کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے تھے تو کم از کم اپنا آفس تو شاندار بنا ہی سکتے تھے لیکن وہ اپنے لئے بھی ٹھاٹ باٹ میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ فضول اور غیر ضروری چیزیں تھیں۔

خالد گھوم پھر کر ہر چیز کا جائزہ لینے لگا اور جب وہ ریوالونگ چیئر کے قریب رکا تو اس کی نظر شاندار میز پر رکھی ہوئی ایک نفیس فائل پر پڑی جس پر ٹیگ لگا ہوا تھا۔ "مسٹر خالد تیموری کی توجہ کے لئے۔۔۔"

ٹیگ پر یہ جملہ جلی حروف میں انگریزی میں غالباً کمپیوٹر سے چھپا ہوا تھا۔ خالد نے چونک کر غیر ارادی سے انداز میں فائل اٹھا لی اور حیرت سے بولا۔ "ارے۔۔۔ میری میز پر تو میرے دیکھنے کے لئے کوئی فائل بھی پہنچ چکی ہے۔" وہ غیر ارادی طور پر اس میز کو "میری میز" کہہ گیا تھا۔

سعید پاشا مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ کمرے میں ہمارے یقین اور خود اعتمادی کے مزید چند نمونے آپ کے منتظر ہوں گے۔"

خالد نے فائل کا کور پلٹا تو اس کا دل معمول سے کچھ زیادہ تیزی سے دھڑک رہا

تھا۔ وہ ایک مقدمے کی فائل تھی جس میں فرم کی طرف سے اسے وکیل صفائی نامزد کیا گیا تھا۔ وکالت نامہ بھی کچھ دگر کاغذات کے ساتھ منسلک تھا جس پر ملزم کے دستخط بھی موجود تھے۔ یعنی اس نے بھی خالد کو اپنا وکیل مقرر کیا تھا حالانکہ نہ تو خالد اس سے ملا تھا اور ہی اس نے خالد کو دیکھا تھا جبکہ مقدمہ بہت اہم معلوم ہوتا تھا۔ اس شخص پر اپنی بیوی کے قتل کا الزام تھا لیکن کسی طرح اس کی ضمانت قبل از گرفتاری سیشن کورٹ سے منظور ہو چکی تھی۔ ابھی مقدمے کی سماعت شروع ہونا تھی۔ یہ کوئی معمولی مقدمہ نہیں تھا۔ اس شخص کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔۔۔۔ اور اگر وہ شخص جمشید مختار اینڈ ایسوسی ایٹس جیسی فرم کا کلائنٹ تھا تو پھر وہ کوئی معمولی آدمی بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

○

ماحول کی خنکی کے باوجود خالد کو اپنے ماتھے پر پسینے کی بوندیں پھوٹنے کا احساس ہوا۔ ہاتھوں میں ارتعاش سا آنے لگا۔ اس کی کیفیت اس سرجن کی سی تھی جس کا تجربہ زیادہ نہیں تھا۔ لیکن اسے اچانک دل کی سرجری کا کوئی کیس سونپ دیا گیا تھا مگر پھر اس نے اپنی خود اعتمادی کو مجتمع کیا اور مسکرا کر سعید پاشا کی طرف دیکھا۔

"آپ لوگ تو واقعی بہت تیز رفتار ہیں۔" وہ بولا۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔" سعید پاشا نے اطمینان سے جواب دیا اور میز پر رکھی ہوئی چھوٹی سی ایک مخملیں ڈبیا اٹھاتے ہوئے بولا۔ "ذرا اسے بھی ملاحظہ فرمائیں۔"

خالد نے ڈبیا کھولی۔ اندر ایک خوبصورت سنہری انگوٹھی جگمگا رہی تھی جس پر نظر پڑتے ہی اسے یقین ہو گیا کہ وہ سونے کی تھی۔ اس پر انگریزی کا حرف "کے" کندہ تھا۔ ویسی ہی ایک انگوٹھی خالد' سعید پاشا کی انگلی میں بھی دیکھ چکا تھا جس پر حرف "ایس" کندہ تھا۔ خالد اسے اس کی شادی کی انگوٹھی سمجھا تھا۔ حنیف قیصر اور تنویر عالم کے بارے میں اس نے غور نہیں کیا تھا لیکن اب اسے یقین تھا کہ ان کی انگلیوں میں بھی ایسی انگوٹھیاں موجود رہی ہوں گی جن پر ان کے نام کے پہلے حروف تہجی کندہ ہوں گے۔

اسے اندازہ ہو گیا کہ انگوٹھی اس کے لئے تھی پھر بھی اس نے قدرِ بے یقینی سے تصدیق چاہی۔ "یہ میرے لئے ہے؟"

"یقیناً۔" سعید پاشا نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "انگوٹھی بندھن کی علامت ہے اسی لئے عموماً منگنی اور شادی کے موقعوں پر پہنائی جاتی ہے۔ آپ کی ایک شادی تو ہو چکی ہے۔ یوں سمجھ لیں آپ کی دوسری شادی اس فرم سے ہو رہی ہے۔"

انگوٹھی کافی وزنی اور ٹھوس دکھائی دے رہی تھی۔ یقیناً" کافی مہنگی ہو گی۔ وہ اسے ڈبیا سے نکال کر ذرا بہتر طور پر اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں نے تو اپنی شادی کی



انگوٹھی بھی چند دن سے زیادہ نہیں پہنی تھی۔ مجھے اس سے الجھن سی ہوتی ہے۔"

"لیکن اس سے نہیں ہو گی۔" سعید پاشا نے اسے یقین دلایا۔ "یہ تو آپ کو پہننی ہی پڑے گی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ اس فرم میں ہم ایک فیملی کی طرح ہیں اور اس فیملی کی اپنی کچھ روایات ہیں۔ آپ کو ان میں سے کوئی بھی روایت تکلیف دہ نہیں لگے گی اور نہ ہی وہ آپ کے لئے الجھن کا باعث بنے گی بلکہ رفتہ رفتہ آپ ان سے لطف اندوز ہونے لگیں گے۔ آپ کو کہیں اور جانے کا تصور بھی محال محسوس ہونے لگے گا۔"

خالد کچھ نہ بولا اور غیر ارادی سے انداز میں انگوٹھی پہن کر دیکھنے لگا۔ وہ اسے درمیانی انگلی میں پوری آ گئی جیسے ناپ دے کر بنوائی گئی ہو۔ یہاں کی ہر بات واقعی عجیب تھی اور ہر کام کا ایک الگ ہی انداز تھا۔ ایک لمحے کے لئے پھر خالد کو شبہ ہوا کہ کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا؟ مگر نہیں۔۔۔۔ خواب اتنا طویل نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔۔ اور پھر خواب تو عموماً بڑے بے سروپا سے انداز میں آگے بڑھتے تھے۔ یہ سب کچھ تو ایک خاص ترتیب سے' مرحلہ وار دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا انداز خواب والا نہیں تھا۔ فائل وہ آہستگی سے میز پر رکھ چکا تھا۔ انگوٹھی اس کی انگلی میں ہی رہ گئی۔ اس نے اسے اتارنے کی زحمت نہیں کی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر اب وہ چاہے بھی تو اس فرم میں ملازمت کی پیشکش قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس کے اندر گویا کسی غیبی سی قوت نے اسے انکار کرنے سے روک دیا تھا اور وہ ایک حقیقت پسند' مادت پرست یا موقع پرست انسان بن کر سوچتا تھا' تب بھی اسے اس پیشکش سے منہ موڑنے کا کوئی جواز نظر نہیں آ رہا تھا۔ جو کچھ اسے اس عمر میں اس پیشے میں ان حالات میں مل رہا تھا اس کی جگہ کوئی اور نوجوان شاید اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

سعید پاشا کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ "آیئے۔۔ اب آپ کو باس سے بھی ملوا دوں۔"

وہ سعید پاشا کے ساتھ چل پڑا۔ اب وہ جس کمرے میں پہنچے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ کشادہ اور کہیں زیادہ شاندار انداز میں آراستہ تھا جس سے خالد نکل کر آیا تھا۔ ایک شانداز میز کے عقب سے جس سوٹڈ بوٹڈ شخص نے اٹھ کر خالد کا استقبال کیا وہ اس کے تصور سے کافی مختلف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جمشید مختار برف سے سفید بالوں والے اور چہرے سے قدرے خشک مزاج یا شاید چڑچڑے دکھائی دینے والے کوئی بزرگ ہوں گے لیکن اس کے سامنے جو دراز قد' وجیہہ اور خوش شکل شخص کھڑا تھا وہ بہ مشکل پینتالیس پچاس کا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی برائے نام تھی۔ اس کے چہرے پر روشن مسکراہٹ اور غضب کی بشاشت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی آفس کے لئے گھر سے تیار ہو کر نکلا ہو۔ اس نے مضبوطی سے خالد سے مصافحہ کیا تو خالد کو احساس

ہوا کہ وہ ورزشی جسم کا مالک تھا۔

"آیئے۔۔۔ آیئے خالد صاحب۔۔۔!" وہ بھاری گونجیلی آواز میں خوشدلی سے بولا۔ "آج ہم نے آپ کے انتظار میں دیر تک آفس کھلا رکھا ہے۔ سعید پاشا اس معاملے میں ذرا شک زدہ تھے لیکن میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ آپ ان کے ساتھ آئیں گے۔"

"اب آپ غیب دانی کا دعویٰ مت کر دیجئے گا۔" خالد نے بے ساختہ کہا تاہم اس نے یہ بات مسکراتے ہوئے اور نرم لہجے میں کہی تھی کہ کہیں جمشید صاحب برا ہی نہ مان جائیں۔

"یہ غیب دانی نہیں' صرف یقین کی طاقت ہے خالد صاحب! تشریف رکھئے۔" اس نے خود بھی بیٹھتے ہوئے اسے اپنے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خالد ایک کرسی میں دھنس گیا۔ اسی لمحے ایک خوبصورت سفید فام لڑکی ٹرالی دھکیلتی ہوئی کمرے میں آئی۔ ٹرالی پر چائے اور دیگر لوازمات کے برتن سجے ہوئے تھے۔

"یہ میری سیکرٹری مس لوئیس پیٹرسن ہیں۔ بیرونی کمرے میں بیٹھتی ہیں۔ آپ کو راستے میں ملتیں لیکن آپ کو آتے دیکھ کر یہ خاطرمدارت کے انتظام میں لگ گئی تھیں۔" جمشید صاحب نے بتایا اور لوئیس نے قریب آتے ہی گرمجوشی سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ جمشید نے بہت ہی تزئینی انداز میں اس سے خالد کا تعارف کرایا۔ خالد کی مرعوبیت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اسے پہلی بار کسی ایسے پاکستانی سے ملنے کا اتفاق ہوا جس کی سیکرٹری ایک سفید فام اور ایسی حسین و نوجوان لڑکی تھی۔ خالد نے رسمی انداز میں اس سے حال چال دریافت کیا۔ وہ چائے اور کافی دونوں چیزیں لائی تھی۔ جمشید کی دعوت پر وہ خود بھی کافی نوشی میں شریک ہو گئی اور چند لمحے بعد ہی ان چاروں کے درمیان یوں گپ شپ اور تبادلہ خیالات ہونے لگا جیسے خالد بھی ان کا پرانا ساتھی تھا۔ لوئیس کی موجودگی کی وجہ سے تمام بات چیت انگریزی میں ہونے لگی تھی تاہم اس دوران میں خالد کو اندازہ ہوا کہ وہ تھوڑی بہت اردو بھی بول اور سمجھ لیتی تھی۔

کچھ دیر بعد جمشید نے لوئیس پیٹرسن کو مخاطب کیا۔ "مس پیٹرسن! خالد صاحب کا اپائنٹمنٹ لیٹر لا دیجئے۔"

لوئیس مستعدی سے اٹھی اور خوشبو کا ایک جھونکا کمرے میں چھوڑتے ہوئے خود بھی نسیم سحر کے ایک سبک جھونکے کی طرح غائب ہو گئی۔ خالد ایک بار پھر دم بخود بیٹھا تھا۔ وہ ایک ٹک جمشید عثار کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے اس سے پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ ملازمت کے لئے تیار تھا یا نہیں؟ جمشید اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ وہ گویا اس کے خیالات پڑھ سکتا تھا اور اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس لمحے خالد کو احساس ہوا کہ جمشید کی شخصیت بلاشبہ طلسماتی سی تھی۔ اس کی آنکھوں میں



ایک مقناطیسی قوت تھی اور جب وہ چند لمحے کسی سے بات کرتا تھا تو اسے گویا اپنے خیالوں کا اسیر کر لیتا تھا۔ اسے گویا سو فیصد یقین ہوتا تھا کہ اس کا مخاطب اس کی کسی بات سے انکار ہی نہیں کر سکے گا۔

اس لمحے خالد کے دل کے کسی تاریک گوشے میں ایک کمزور سی آواز ابھری کہ وہ ایک بار صرف اس حد سے بڑھی ہوئی خوداعتمادی کا طلسم توڑے' ایک بار صرف اسے اس کی خوش فہمی ثابت کرنے کے لئے انکار کر دے کہ وہ اس کے ہاں ملازمت کرنا نہیں چاہتا۔ صرف ایک بار اسے احساس دلا دے کہ اسے کسی کے منہ سے انکار بھی سننا پڑ سکتا ہے۔ اس کی تمام ترغیبات بھی کسی کو خریدنے میں ناکام رہ سکتی ہیں۔۔۔ لیکن یہ کمزور سی سوچ اس کے دل و دماغ میں چند لمحے سے زیادہ زندہ نہ رہ سکی۔ فوراً ہی اس پر دوسری سوچ نے غلبہ پا لیا۔ اس نے اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کیا۔ اسے پتا چلا کہ وہ انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ انکار کرنا اسے کفران نعمت کے مترادف محسوس ہونے لگا۔ اس پیشکش کو قبول کرنے کا فیصلہ کر کے وہ بالکل یکسو اور پرسکون ہو گیا۔

ذرا دیر بعد لوئیس نے ایک نفیس فائل میں لگی ہوئی کمپیوٹر سے ٹائپ شدہ اپائنٹمنٹ لیٹر کی دو کاپیاں لا کر اس کے سامنے رکھ دیں اور خود بھی اس کے کندھے پر جھک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے وجود سے مسحور کن خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ خالد کو لیٹر کے متن پر توجہ مرتکز رکھنا دشوار محسوس ہونے لگا مگر اس نے کسی نہ کسی طرح اسے پڑھ ڈالا۔ اس میں وہی تمام پیشکشیں موجود تھیں جن کا سعید پاشا نے زبانی ذکر کیا تھا۔ بس ایک شرط تھی جس کا باتوں میں کوئی ذکر نہیں آیا تھا اور وہ یہ کہ خالد کم از کم تین سال تک کسی بھی حال میں فرم کو نہیں چھوڑے گا۔

خالد نے صرف چند سیکنڈ اس شرط کے بارے میں سوچا اور اسی فیصلے پر پہنچا کہ اگر اس دوران میں بہ فرض محال کسی وجہ سے فرم سے اس کے اختلافات پیدا بھی ہو گئے تب بھی تین سال یا اس کی باقی ماندہ مدت گزارنا اس کے لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہو گا۔ اس نے لیٹر کی کاپی پر سائن کر دیئے اور جمشید کے دستخط والا اریجنل لیٹر خود رکھ لیا۔ کمرہ تین افراد کی تالیوں سے گونج اٹھا جیسے کوئی بہت بڑی خوشی کی رسم انجام پا گئی تھی۔ اس لمحے خالد نے خود کو بہت اہم محسوس کیا۔

○

حیدر آباد واپس پہنچ کر جب اس نے ماں کو بتایا کہ وہ کراچی منتقل ہو رہا ہے تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔ تمام راستے وہ میمونہ کو ساری تفصیلات بتاتا آیا تھا۔ وہ خاموش ہوتا تو میمونہ مسرت بھرے لہجے میں اسے وہ باتیں بتانے لگتی جو خالد کی عدم موجودگی میں سعدیہ اور عالیہ

نے بتائی تھیں۔ جب وہ اسے اپارٹمنٹ بلڈنگ میں چھوڑ کر دفتر دیکھنے سعید پاشا کے ساتھ چلا گیا تھا۔ انہوں نے میمونہ کو بتایا تھا کہ کس طرح وہ سب ایک بلڈنگ میں ایک فیملی کی طرح رہتے تھے' کس طرح وہیں کسی نہ کسی بہانے تقریبات کا اہتمام کرتے رہتے تھے' کس طرح وہ باہر بھی تفریحات اور پکنک وغیرہ پر جاتے تھے' کس طرح ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے' کس طرح ہر چھوٹے بڑے کام میں ایک دوسرے سے مشورے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔ میمونہ کو وہ سب کچھ سننا ہی بہت بھلا لگتا تھا۔ اس کے خیال میں وہ لوگ ایک آئیڈیل زندگی گزار رہے تھے۔ اس دور میں کم وسائل والوں یا غربت کے مارے ہوئے لوگوں کا تو کیا ذکر' جنہیں دنیا کی تمام نعمتیں اور آسائشیں میسر تھیں وہ بھی اس قسم کی زندگی کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ میمونہ خود بھی ان لوگوں میں شامل ہونے کے لئے بے تاب ہو گئی تھی چنانچہ خالد کو اس سلسلے میں اسے سمجھانے یا قائل کرنے کا مسئلہ تو پیش نہیں آیا تھا لیکن اس کی والدہ جہاں آراء بیگم برسوں کا جما جمایا گھر اور اپنا پرانا محلہ اتنی جلدی چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئیں۔

ہر طرح سے سمجھانے کے باوجود وہ اس طرح عجلت میں میاں بیوی کے ساتھ کراچی منتقل ہونے پر آمادہ نہ ہو سکیں۔ "بیٹا! پہلے تم بہو کے ساتھ جا کر اچھی طرح سیٹ ہو جاؤ۔ میں بعد میں جب مناسب سمجھوں گی' آ جاؤں گی۔ مجھے یہاں کوئی مسئلہ تو ہے نہیں—— ابھی میرے اپنے بھی ہاتھ پاؤں چلتے ہیں اور گھر میں وہ ملازمہ بھی موجود ہے جو تقریباً سارے کام کر لیتی ہے۔ تمہیں اگر اتنی ساری سہولتیں مل رہی ہیں تو ضرور جاؤ۔ ترقی کا یہ اتنا شاندار موقع گنوانا ٹھیک نہیں—— لیکن اتنی جلدی اپنے پرانے گھر کو تالا لگانا بھی ٹھیک نہیں—— میں ابھی کچھ عرصہ یہیں رہتی ہوں۔"

آخر کار خالد اور میمونہ ان کے موقف کے قائل ہو گئے تھے۔ ان کے خیال میں اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ امی اس گھر میں بھی آرام سے رہ سکتی تھیں۔ دونوں شہروں کے درمیان فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ وہ جب چاہتے ان سے ملنے آ سکتے تھے اور جب وہ مناسب سمجھتیں تب مستقل طور پر ان کے ساتھ رہنے کے لئے آ سکتی تھیں۔ یہ مسئلہ طے ہو چکا تو ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اس دوران میں میمونہ سامان پیک کرتی رہی۔ انہیں گھر گرہستی کا سامان تو لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اپارٹمنٹ میں ضرورت کی ہر چیز نہایت اعلیٰ درجے کی موجود تھی۔ وہ صرف اپنے کپڑے وغیرہ اور ذاتی استعمال کی چیزیں لے جا رہے تھے۔ جہاں آراء بیگم بظاہر نارمل سے چہرے کے ساتھ ان کی تیاریاں دیکھ رہی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں ہلکی سی افسردگی تھی۔ خالد اور میمونہ دونوں کو اس وقت اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ زیادہ توجہ سے ان کی طرف دیکھتے یا ان کی آنکھوں میں جھانکتے—— اور اگر وہ ایسا کر بھی لیتے تب بھی شاید وہ اس افسردگی کو محسوس نہ کر



پاتے۔ ان کے ذہنوں پر اپنے کام سوار تھے اور وہ مستقبل کے منصوبوں میں بھی الجھے ہوئے تھے۔

دفعتاً" جہاں آراء بیگم کچھ عجیب سی نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ "تم نے آج کا اخبار پڑھا خالد؟"

"نہیں امی—— فرصت ہی نہیں ملی۔" خالد نے اپنے کچھ کاغذات ایک سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"آج کا اخبار تو تمہیں ضرور پڑھنا چاہئے تھا۔ اس میں تمہارے کیس جیتنے کی خبر کافی نمایاں چھپی ہے۔" اس کی والدہ نے بتایا۔

"اچھا——؟" خالد نے قدرے دلچسپی سے پوچھا۔ "رات کو آرام سے بیٹھ کر دیکھوں گا۔ ابھی تو بہت سے کام کرنے ہیں۔"

جہاں آراء بیگم بغور اس کی طرف دیکھ رہی تھیں لیکن ان کی نظریں اس ماں کی نظریں ہرگز نہیں تھیں جسے ایک اہم کیس جیتنے والے اپنے بیٹے کی صلاحیتوں پر فخر ہو۔ وہ ذرا دھیمے لہجے میں بولیں۔ "تمہیں معلوم ہے—— اخبار میں یہ بھی لکھا تھا کہ—— وہ جو دس سالہ بچی تھی نا—— شاہدہ—— اس کے باپ نے نیاز علی کے بری ہونے کے بعد عدالت میں ہی دونوں ہاتھ اٹھا کر تمہیں بددعائیں دی تھیں۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا اور تمہیں بددعائیں دے رہا تھا۔ تم نے اسے دیکھا تھا؟"

"نہیں امی!" وہ بے پروائی سے بولا۔ "میں نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس وقت مجھے بہت سے لوگوں نے گھیرا ہوا تھا۔ ویسے بھی تھانے کچہریوں میں اس قسم کے سلسلے چلتے رہتے ہیں جس کے خلاف فیصلہ ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح تو دل کا غبار نکالتا ہے۔ بہت سے ایسے ڈاکو اور دہشت گرد جنہوں نے پچاسوں ڈاکے ڈالے ہوتے ہیں اور بیسیوں قتل کیے ہوتے ہیں انہیں بھی جب پولیس پکڑ کے لے جانے لگتی ہے تو ان کے لواحقین پولیس کو کوسنے اور بددعائیں دینے لگتے ہیں۔"

جہاں آراء بیگم کچھ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔ خالد اپنی مزید کچھ چیزیں سوٹ کیس میں رکھنے اور باقی سامان کے بارے میں میمونہ کو کچھ ہدایات دینے کے بعد گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں اب ذرا دفتر ہو آؤں مجھے ان کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا ہے وہاں سے اپنے کچھ کاغذات وغیرہ لینے ہیں اور کچھ حساب کتاب بھی کرنا ہے۔ شاید مجھے وہاں کافی دیر لگ جائے۔"

وہ دوپہر کے بعد دفتر پہنچا۔ دفتر میں اصل گہما گہمی اسی وقت شروع ہوتی تھی۔ چاروں وکیل اپنی پیشیاں وغیرہ بھگتانے کے بعد دفتر پہنچ جاتے تھے۔ اس روز صدر الدین صاحب اسے بیچ کے کمرے میں ہی کھڑے مل گئے جہاں جونیئر وکیل بیٹھتے تھے۔ وہ ان کلرکوں میں

سے ایک ایک سے بات کر رہے تھے جنہیں ان کے ہاں منشی کہا جاتا تھا۔ انہوں نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے اس کی طرف دیکھا۔

"کل فیصلہ سنتے ہی کہاں غائب ہو گئے تھے صاحبزادے؟" انہوں نے ناگواری سے پوچھا۔ وہ غالباً یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ معمول کے مطابق دفتر آیا تھا۔ ان کے شاید وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایک ہی رات میں' ایک ہی زقند میں زندگی کے راستے پر کتنا فاصلہ طے کر گیا تھا۔ خالد نے محسوس کیا کہ باقی لوگوں کی نظروں میں بھی اس کے لئے ناپسندیدگی کے جذبات تھے۔

"میں ذرا ایک صاحب کے ساتھ ایک ضروری کام سے چلا گیا تھا۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"شاید تم یہ دیکھنے کے لئے بھی نہیں رکے کہ اس بچی کا باپ کس طرح ہاتھ اٹھا اٹھا کر نیاز علی کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی بددعائیں دے رہا تھا۔" صدر الدین صاحب تیکھے لہجے میں بولے۔ "اس جاہل اور ان پڑھ آدمی نے بہت بڑی بات کی کہ تم جیسے وکیل بھی نیاز علی جیسے لوگوں کے جرائم میں برابر کے شریک ہیں جو عدالتوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ شہادتوں کا غلط استعمال کرتے ہیں اور قانون کی کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کی یہ باتیں اخباروں میں بھی رپورٹ ہوئی ہیں۔"

"ہاں ـــ میری والدہ مجھے بتا رہی تھیں لیکن میں اس قسم کی فضول باتوں پر دھیان نہیں دیا کرتا ـــ" خالد کی بے نیازی کچھ اور بڑھ گئی۔ "مقدمے ہارنے والے تو نہ جانے کیا کچھ بولتے ہیں۔ اگر ہم ان کی باتوں پر توجہ دینے لگیں تو پھر ہم مقدمے لڑ چکے۔ اہم بات صرف یہ ہے کہ آپ کو مقدمہ جیتنا چاہئے۔" آخری جملہ اس نے یوں صدر الدین صاحب کی طرف انگلی اٹھا کر ادا کیا جیسے کوئی استاد کسی شاگرد کو نکتے کی بات بتا رہا ہو۔

صدر الدین صاحب نے عینک ناک پر درست کرتے ہوئے گویا ایک نئے زاویہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور بولے ـــ "تم مجھے کچھ بدلے بدلے سے لگ رہے ہو خالد تیموری!"

"ممکن ہے مجھ میں تبدیلی آ گئی ہو ـــ" خالد بدستور بے نیازی سے بولا۔ "انسان جب تک خود کو بدلتا نہیں اس وقت تک وہ غربت اور گمنامی کے راستوں سے ترقی اور شہرت کے راستوں کی طرف نہیں مڑتا۔"

صدر الدین صاحب نے کچھ اور غور سے اس کی طرف دیکھا اور تیکھے لہجے میں بولے۔ "مجھے تو تم ترقی اور شہرت کے بجائے شیطانیت کے راستے کی طرف جاتے دکھائی دے رہے ہو۔ تمہارے اندر راتوں رات کوئی تبدیلی آ گئی ہے جس نے تمہیں سادگی' نیکی' شرافت اور پرانی اقدر سے بیزار کر دیا ہے۔ مجھے تو کچھ یوں لگ رہا ہے جیسے تمہارے اندر



کوئی شیطان حلول کر گیا ہے۔"

خالد نے بے اختیار ایک قہقہہ لگایا۔ اسے خود بھی اپنی آواز کچھ کرخت سی محسوس ہوئی۔ آج وہ اپنے دل میں صدر الدین صاحب کے لئے پہلا سا احترام اور مرعوبیت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہ قطعی بے جھجک لہجے میں بولا۔ "صدر الدین صاحب! آپ جیسے لوگ ہم جیسے نوجوانوں کو سادگی' نیکی' شرافت اور پرانی اقدار جیسے تصورات کا جھانسا دے کر ہمیں گدھا بنا کر ہماری پیٹھ پر سواری گانٹھے رکھتے ہیں۔ محنت ہم کرتے ہیں' دولت آپ کی تجوریوں میں جمع ہوتی رہتی ہے۔"

صدر الدین صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کمرے میں موجود تمام افراد گویا دم بخود سے خالد کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کئی لمحے تک تو صدر الدین صاحب کچھ بول ہی نہ سکے پھر انہوں نے گویا خود کو سنبھالا اور نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے۔ "خالد! پہلے تو تم نے نیاز علی والا کیس پکڑ کے ہماری فرم کے نام پر کالک ملی لیکن میں نے اسے درگزر کر دیا۔ آج تمہارا لہجہ کچھ اور ہی کہانی سنا رہا ہے۔ میرا خیال ہے پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ تم اپنے کمرے میں جا کر بیٹھو میں تمہیں ایک شوکاز نوٹس تیار کر کے بھجوا رہا ہوں۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارا اب ہمارے ساتھ چلنا مشکل ہو گیا ہے۔"

"شوکاز نوٹس ـــ!" خالد استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "آپ کیوں خواہ مخواہ اتنی زحمت کر رہے ہیں۔ میں یہاں کوئی شوکاز نوٹس وغیرہ وصول کرنے نہیں آیا ہوں۔ میں نے خود آپ سے پہلے محسوس کر لیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ یہ رہا میرا استعفیٰ ـــ"

اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر منشی کی میز پر پٹخ دیا۔ استعفیٰ وہ گھر سے ہی لکھ کر لایا تھا۔ صدر الدین صاحب کے چہرے پر ایک اور رنگ آ کر گزر گیا۔ انہوں نے استعفیٰ اٹھانے کی زحمت نہیں کی اور سرد لہجے میں بولے۔ "ٹھیک ہے ـــ تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے مجھے زحمت سے بچا لیا۔ اکاؤنٹنٹ کے پاس جا کر اپنا حساب کر لو۔"

○

خالد اور میمونہ کو کراچی پہنچ کر سیٹ ہونے میں ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئی۔ ہر چیز گویا تیار حالت میں انہی کی منتظر تھی۔ خالد دوسرے دن سے ہی دفتر جانے لگا تھا اور میمونہ نے گھر سنبھال لیا تھا۔ دو چار دن میں ہی وہاں اس کا دل بھی لگ گیا تھا۔ عالیہ اور سعدیہ سے اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ نسرین البتہ ابھی تک اس کی دوستی استوار

نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اسے کچھ عجیب اور ذرا مختلف سی عورت لگی تھی۔ کبھی کبھی اسے شبہ ہوتا کہ شاید اس کے ساتھ کوئی ذہنی مسئلہ ہے۔ بہرحال میمونہ اپنی زندگی میں اتنی مگن اور مصروف ہو گئی تھی کہ اس نے نسرین کی طرف زیادہ توجہ دینے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔

خالد اپنی جگہ مصروف ہو گیا تھا۔ اس نے سرفراز احمد کے کیس پر کام شروع کر دیا تھا جو ایک کروڑ پتی شخص تھا مگر اس کی دولت درحقیقت اس کی بیوی کی مرہون منت تھی اور سرفراز پر اسی بیوی کے قتل کا الزام تھا۔ وہ ایک اہم پیچیدہ اور سنسنی خیز مقدمہ تھا۔ سرفراز احمد صرف ایک کروڑ پتی ہی نہیں، معروف بلڈر بھی تھا اور اسے شہر کے سماجی حلقوں میں اپنا نام نمایاں رکھنے کا شوق بھی تھا۔ دولت مند ہونے کی وجہ سے یہ کام اس کے لئے کچھ ایسا مشکل بھی نہیں تھا۔ سماجی تقریبات اور سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے اس کا نام لوگوں کے لئے جانا پہچانا تھا چنانچہ جب اس پر بیوی کے قتل کا الزام آیا تو اخبارات نے اس خبر کو خاصی اہمیت دی۔ وہ ضمانت قبل از گرفتاری پر تھا اور ابھی مقدمے کی سماعت شروع نہیں ہوئی تھی۔ خالد نے مقدمے کے لئے حکمت عملی تیار کر لی تھی اور کام شروع کر دیا تھا۔ لوگوں سے ملاقاتیں شروع کر دی تھیں۔ وہ کافی مصروف تھا۔

اس رات وہ کافی دیر سے گھر پہنچا تو میمونہ نے شب خوابی کے ایک عجیب ہی لبادے میں اس کا استقبال کیا۔ خالد ایک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ لبادہ بھی خالد کے لئے نیا تھا اور میمونہ کا انداز بھی۔ شاید اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اٹھلانے اور اترانے لگتی۔ اسے اس لبادے میں دیکھ کر خالد کے ذہن میں کئی انگریزی فلموں کے مناظر تازہ ہو گئے۔

"یہ نائٹی تم نے کب خریدی؟" خالد نے اندر پہنچ کر ذرا حیرت سے پوچھا۔

میمونہ کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے اس سے بھی زیادہ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ پوچھ کر کیا آپ مجھ سے کسی قسم کا مذاق کر رہے ہیں؟"

"مذاق——" اس میں مذاق کی کیا بات ہے؟ میں تو سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں۔" خالد واقعی گہری سنجیدگی سے بولا۔

"آپ تو مذاق بھی واقعی بڑی سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ اب میمونہ بڑی دلکشی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ابھی گھنٹہ بھر پہلے آپ خود ہی تو یہ نائٹی میرے لئے لے کر آئے تھے۔ آپ ہی نے اسے پہننے کی فرمائش کی تھی۔ میں نے اسی وقت آپ کی یہ فرمائش پوری کر دی تھی اور——" وہ بات ادھوری چھوڑ کر ایک لمحے کے لئے شرما کر رہ گئی پھر بولی۔ "پھر آپ یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ میں تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔ اب آپ ایسے معصوم



اور انجان بن رہے ہیں۔" وہ شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی۔ گویا توقع کر رہی ہو کہ کسی بھی لمحے وہ اعتراف کر لے گا کہ ہاں وہ مذاق کر رہا تھا، اسے تنگ کرنے کے لئے انجان بن رہا تھا۔

لیکن خالد ایک ٹک اسے گھور رہا تھا کیونکہ وہ نہ تو اس روز اس سے پہلے گھر آیا تھا، نہ وہ میمونہ کے لئے نائٹی لایا تھا، نہ ہی اس کے پاس رکا تھا اور نہ اس نے ایسی کوئی بات کی تھی۔ وہ تو صبح کا دفتر گیا، ابھی سیدھا وہیں سے آ رہا تھا۔"

○

ایک لمحے کے لئے خالد کو شبہ ہوا کہ شاید میمونہ اس سے مذاق کر رہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ مسکرا دیا اور بولا۔ "میں سمجھ گیا شاید تم خود یہ ٹائی خرید کر لائی ہو۔۔۔ اور شاپنگ بھی کی ہو گی۔ شاید تم سعدیہ یا عالیہ کے ساتھ گئی ہو گی لیکن مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو جو میں نہیں بنوں گا۔"

اب گویا میمونہ کے سنجیدہ ہونے کی باری تھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "جی نہیں۔۔۔ میں آپ کو بے وقوف بنانے کی کوشش ہرگز نہیں کر رہی۔ الٹا آپ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گھنٹہ بھر پہلے آپ مجھے اس ٹائی کا تحفہ پیش کر کے اس کا خراج بھی وصول کر گئے تھے۔ پھر آپ کو کوئی کام یاد آ گیا۔ آپ اب واپس آئے ہیں تو شاید پھر رومانٹک ہونے کا ارادہ ہو رہا ہو گا۔ آپ نے سوچا ہو گا بہتر ہے پچھلی ملاقات سے منکر ہی ہو جاؤ۔"

پھر وہ ایک ادائے دلبری سے مسکرا کر اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔ "لیکن آپ کو ان بہانے بازیوں کی ضرورت کیا ہے۔ میں نے آپ کے رومانٹک ہونے کا کوٹہ تو مقرر نہیں کیا ہوا ہے۔ بیوی کو اس سے بڑھ کر کیا چاہئے کہ شوہر کی اس پر مسلسل نگاہ التفات رہے۔۔۔" وہ کچھ اور قریب آ گئی۔

اس میں شک نہیں تھا کہ گھر میں داخل ہونے کے بعد جب خالد کی نظر میمونہ پر پڑی تھی تو اس کی رگ و پے میں ایک ہلچل سی برپا ہو گئی تھی۔ اس کا ذہن ہواؤں میں اڑنے لگا تھا مگر میمونہ نے یہ ذکر چھیڑ کر گویا اس کے محسوسات پر پانی ڈال دیا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی آ چکا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "تم یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہی ہو نا؟"

یہ سوال اس نے گویا غیر ضروری طور پر کیا تھا۔ اب وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا تو اسے احساس ہو رہا تھا کہ ان میں گزرے ہوئے مخمور لمحوں کی پرچھائیاں موجود تھیں۔ زندگی سے بھرپور ان آنکھوں سے ایک ایسی طمانیت اور آسودگی کا نشہ چھلک رہا تھا جو خالد نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

میمونہ بوجھل سے لہجے میں بولی۔ "پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ اس وقت نشے میں



تھے جب پہلے آئے تھے یا اب نشے میں ہیں جو اس بات کو بھول گئے ہیں؟"

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے میں کوئی نشہ نہیں کرتا۔۔۔ میں تو سگریٹ بھی نہیں پیتا۔" خالد سنجیدگی سے بولا۔

"تو پھر ضرور مذاق کر رہے ہوں گے۔ چلیں مذاق چھوڑیں۔۔۔ آپ تھکے ہوئے ہوں گے۔ چلیں۔۔۔ لباس تبدیل کر لیں۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے کپڑوں کی الماری تک لے گئی۔ خالد کا آسمانوں کی طرف اڑتا ہوا دماغ اب زمین پر آ چکا تھا۔ میمونہ کے رویے اور انداز و اطوار میں کوئی خاص بات تھی جو اسے بار بار چونکا رہی تھی۔ کوئی تبدیلی تھی جس سے وہ مانوس نہیں تھا۔ وہ کوئی اور ہی میمونہ لگ رہی تھی۔ سب سے زیادہ حیران کن چیز اس کی بے باکی تھی۔ خالد نے اسے اس کی تمام تر کم عمری، چلبلے پن اور ہر مسام جاں سے چھلکتے ہوئے زندگی کے سیلاب کے باوجود کبھی اتنا بے باک نہیں پایا تھا جتنا وہ اسے آج دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا۔

اس سے پہلے کبھی کبھی اس کے دل کے کسی چور دروازے سے یہ خواہش رینگ آیا کرتی تھی کہ کاش وہ ذرا ایسی ہوتی۔۔۔ لیکن آج جبکہ وہ خود نہیں، بلکہ اس کے مطلوبہ معیار سے کافی آگے نظر آ رہی تھی تو یکدم ہی جیسے اس پر برف سی گر گئی تھی۔ وہ ایک عجیب بے عنوان سی تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے اس موضوع پر مزید بحث نہیں کی کہ وہ پہلے آیا تھا یا نہیں؟ اس نے میمونہ کو مزید کریدنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ یقیناً مذاق نہیں کر رہی تھی لیکن خالد کو معلوم تھا کہ وہ اس سے پہلے نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ میمونہ کو کسی قسم کا وہم ہوا تھا مگر اب وہ اسے مزید جھٹلانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ میمونہ چڑ نہ جائے یا الجھن میں نہ پڑ جائے۔ دونوں صورتوں میں اس کا خوبصورت موڈ تباہ ہو سکتا تھا۔ اس نے اس موضوع پر خاموشی تو اختیار کر لی لیکن اس کے ذہن میں بہرحال ایک کانٹا سا چبھ گیا۔

میمونہ کا جوش و خروش اور رومانویت کچھ دیر بعد رخصت ہو گئی۔ اسے گویا خالد کی طرف سے کچھ مایوسی ہوئی تھی۔ اس نے گفتگو کے ذریعے ماحول کا بوجھل پن کم کرنے کی کوشش کی اور گپ شپ کے سے انداز میں کہا۔ "آج کا دن کیسا گزرا؟"

میمونہ منہ پھیرے لیٹی تھی۔ وہ کروٹ لئے بغیر بولی۔ "بس ٹھیک ہی گزرا۔ عالیہ اور سعدیہ اچھی پڑوسنوں کی طرح میرا دل بہلائے رکھتی ہیں۔ گھر کے کاموں اور آرائشوں کے سلسلے میں مشورے دیتی رہتی ہیں۔ شاپنگ کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرتی رہتی ہیں۔ دونوں عورتیں بہت اچھی ہیں۔۔۔" میمونہ باتیں ضرور کر رہی تھی لیکن اس کے لہجے سے دلچسپی کا قطعاً کوئی اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

"نسرین البتہ ذرا مختلف معلوم ہوتی ہے۔" خالد نے لقمہ دیا۔ "وہ شاید گھلنا ملنا پسند

نہیں کرتی۔ شاید تنہائی میں ہی خوش رہتی ہے۔"

"ہاں۔" میمونہ نے اس سے اتفاق کیا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی زندگی سے کوئی ٹریجڈی وابستہ ہے جس نے اسے آدم بیزار بنا دیا ہے مگر وہ اس کے بارے میں زبان کھولنا بھی پسند نہیں کرتی لیکن کبھی کبھی سامنا ہوتا ہے تو کچھ عجیب سی نظروں سے ٹکر ٹکر دیکھنے لگتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی وحشت ہوتی ہے کہ مجھے خوف آنے لگتا ہے۔"

خالد نے محسوس کیا کہ میمونہ نے جھرجھری سی لی تھی پھر شاید اس نے بات چیت میں کچھ دلچسپی محسوس کرتے ہوئے کروٹ لے کر رخ اس کی طرف کرتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑا۔۔۔ "میں کبھی کبھی سیڑھیوں کے راستے نیچے جاتی ہوں تو وہ مجھے اپنے اپارٹمنٹ کے سامنے ہال نما حصے میں ٹہلتی ہوئی مل جاتی ہے۔ انداز کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی قیدی رہائی کے انتظار میں کوٹھری میں ٹہل رہا ہو۔ بداخلاق اتنی ہے کہ کبھی اندر آنے کے لئے بھی نہیں کہتی۔ باہر کھڑے کھڑے ہی بات کرتی ہے۔۔۔ بلکہ بات بھی وہ کیا کرتی ہے' میں ہی کرتی ہوں۔"

"شاید بے چاری کے ساتھ کوئی پرابلم ہو۔" خالد مربیانہ انداز میں بولا۔ "اگر وہ مراسم بڑھانا نہیں چاہتی تو ہمیں بھی اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دینا چاہئے۔"

"پرابلم تو بے چاری کے ساتھ یقیناً ہے۔۔۔" میمونہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "سعدیہ اور عالیہ مجھے بتا رہی تھیں کہ اس کے ساتھ نفسیاتی مسئلہ ہے۔ وہ تو کچھ عرصہ ذہنی امراض کے اسپتال میں بھی گزار کر آئی ہے۔"

"اچھا۔۔۔!" خالد نے ذرا چونک کر میمونہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت بھی بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی اور اچانک خالد کو احساس ہوا کہ میمونہ کے بال تو لمبائی میں آدھے رہ گئے تھے۔ اس نے بال ترشوا لئے تھے اور خالد نے اب تک دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ مختلف باتوں میں ذہن الجھا ہونے کی وجہ سے اس طرف اس کا ذہن ہی نہیں گیا تھا۔ کسی خفیف سی تبدیلی کا احساس تو ہوا تھا لیکن وہ اسے ہیئر اسٹائل کی تبدیلی سمجھا تھا۔ میمونہ نت نئے طریقوں سے تو بال بنواتی رہتی تھی لیکن اس نے کبھی بال کٹوانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اسے اپنے لمبے بالوں سے بہت محبت تھی اور سچی بات یہ تھی کہ وہ اس کی شخصیت پر جچتے بھی بہت تھے۔ اس موضوع پر کبھی بات نہیں ہوئی تھی لیکن خالد بہرحال اس کے بال کٹوانے کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے گویا دل ہی دل میں فیصلہ کیا ہوا تھا کہ اگر میمونہ نے کبھی لمبے بالوں کی دیکھ بھال کے مسائل سے تنگ آکر انہیں کٹوانے کی بات کی تو وہ اسے منع کر دے گا۔۔۔ لیکن اس نے تو پوچھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ خالد کو جھٹکا سا لگا۔



"یہ۔۔۔ تم نے' بال کٹوا لئے؟" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

میمونہ نے استہزائیہ سے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور قدرے ناگواری سے بولی۔ "آج آپ اتنی اداکاری پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ آپ تو کچھ یوں ظاہر کر رہے ہیں جیسے میرے تراشیدہ بال آپ نے ابھی ابھی دیکھے ہیں حالانکہ جب آپ دو ڈیڑھ گھنٹے پہلے آئے تھے تو سب سے پہلے آپ نے اسی تبدیلی کو محسوس کیا تھا اور بہت خوش ہوئے تھے۔ آپ کو یہ تبدیلی بہت پسند آئی تھی۔"

وہ گویا بالوں میں مسلسل انگلیاں پھیر کر ان کی لمبائی میں کمی کے احساس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ آپ نے شام جو گھر کا چکر لگایا تھا وہ ہر لحاظ سے میرے لئے خوشی کا باعث تھا۔ اس وقت آپ ہر لحاظ سے میرے لئے ایک آئیڈیل شوہر بنے ہوئے تھے۔ آپ کو میری ہر بات اچھی لگ رہی تھی اور آپ میں وہ تمام خوبیاں پیدا ہو گئی تھیں جن کی ایک بیوی تمنا کر سکتی ہے لیکن اتنے سے وقفے کے بعد آپ دوبارہ گھر آئے ہیں تو بالکل بدلے ہوئے انسان بن کر آئے ہیں۔ تھکے ماندے' مضمحل اور چڑچڑے سے۔۔۔ کچھ کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے ہماری شادی کو بیس پچیس سال گزر چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے زندگی کے ڈرامے میں ڈبل رول کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔"

خالد حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اسے آج نہ صرف میمونہ کی حرکات و سکنات' انداز و اطوار مختلف لگ رہے تھے بلکہ اس کا لہجہ' اس کی آواز بھی کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ وہ صبح جس میمونہ کو گھر پر چھوڑ کر گیا تھا' یہ وہ میمونہ نہیں تھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ اس تبدیلی کو الفاظ میں بیان کرنا چاہتا تو شاید نہ کر سکتا اس تبدیلی کو صرف محسوس کر سکتا تھا کیونکہ وہ اس کا شوہر تھا۔

میمونہ نے ایک بار پھر اس سے پہلے اس کی آمد کا تذکرہ چھیڑ دیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ چیخ کر کہہ اٹھے وہ اس سے پہلے نہیں آیا تھا آخر میمونہ کیوں اصرار کئے جا رہی تھی؟ وہ کس قسم کا مذاق کر رہی تھی اور کیوں اسے اتنا طول دیئے جا رہی تھی؟ مگر وہ دوبارہ اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میمونہ اپنی بات پر قائم رہے گی۔

میمونہ گویا اس کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے بولی۔ "بہرحال۔۔۔ آپ کی تسلی کے لئے دوبارہ بتا دیتی ہوں کہ میرے بال سعدیہ نے تراشے ہیں۔ آج پتا چلا کہ وہ تو بہت اچھی بیوٹیشن بھی ہے۔ اس نے ایک بہت اچھے ادارے سے بیوٹیشن کا کورس بھی کیا ہوا ہے۔ اس نے مجھے لباس کے انتخاب' اس کی تراش خراش' میک اپ اور سر سے پاؤں تک آرائش کے بارے میں بھی بہت سے مفید مشورے دیئے ہیں جن پر میں رفتہ رفتہ عمل

کروں گی۔ سعدیہ کا کہنا ہے کہ میں اس سے کہیں زیادہ خوبصورت نظر آ سکتی ہوں جتنی کہ میں حقیقت میں ہوں۔"

اس سے پہلے خالد کا بھی بارہا دل چاہا تھا کہ اس کی بیوی اس سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت نظر آئے جتنی کہ وہ حقیقت میں تھی' اسے اپنے آپ کو بنانے سنوارنے کا زیادہ سلیقہ آ جائے اور اسے دیکھنے والے خالد کی خوش قسمتی پر رشک کیا کریں کہ اسے کیسی حسین بیوی ملی تھی لیکن آج جس لہجے میں اس نے خود میمونہ سے یہ بات سنی تھی اس سے نہ جانے کیوں اس کا دل ڈوب سا گیا تھا۔ تاہم وہ ماحول کے تناؤ' کشیدگی اور اپنے احساس خجالت کو کچھ کم کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم نے تو اس ماحول میں خود کو کچھ زیادہ ہی تیزی سے ڈھالنا شروع کر دیا ہے۔"

"یہ زمانہ ہی تیز رفتاری کا ہے۔" میمونہ ایک ادائے خاص سے بولی۔ "جو زمانے کا ساتھ نہیں دے گا' زمانہ اسے تیز رفتاری سے ہی کچلتا ہوا گزر جائے گا۔ ہمیں تو وقت نے خود ہی اپنی اوقات بدلنے کا موقع فراہم کیا ہے تو اس سے کیوں نہ بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ بے وقوفوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھے رہنے کا کیا فائدہ؟"

خالد کے دل میں ایک قسم کا ہول سا پڑنے لگا۔ یہ سب اس کے اپنے خیالات تھے۔ اس قسم کی باتیں اگر اس نے کبھی منہ سے نہیں کی تھیں تو کم از کم سوچی ضرور تھیں لیکن اب ان پر عملدرآمد کا وقت آیا تھا اور یہی باتیں وہ میمونہ کے منہ سے سن رہا تھا تو نہ جانے کیوں اسے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ اب وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا اور ایک ٹک دیوار کو گھورنے لگا۔ آج اس نے گھر آ کر کھانا نہیں کھایا تھا اور ابھی تک اسے بھوک بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

○

میمونہ نے جن عزائم کا اظہار کیا تھا ان کے مطابق ہی عمل کر کے دکھایا۔ اس آنے والے دنوں میں اس کی کایا ہی پلٹ کر رہ گئی۔ وہ جس معیار تک پہنچ پائے تھے' میمونہ اس سے بھی کہیں اونچے اور جدت پسند یا آزاد خیال طبقے کی فرد دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کے انداز و اطوار حتیٰ کہ لہجے اور گفتگو سے بھی مغربیت جھلکنے لگی تھی۔ خالد کو کبھی شبہ تک نہیں ہوا تھا کہ اس کی بیوی میں اتنی تیزی سے خود کو بدلنے اور نئے سانچے میں ڈھالنے کی صلاحیت موجود تھی۔

رہن سہن' پہناوا اور انداز و اطوار تو خالد کے بھی بدلے تھے لیکن میمونہ کے مقابلے میں وہ خود کو بہت پیچھے محسوس کرتا تھا۔ اسے خود میں اب بھی ذرا دیہاتی پن کا احساس ہوتا تاہم اسے اس بارے میں کچھ زیادہ تشویش یا پریشانی نہیں تھی۔ وہ باہر اپنی دنیا



میں بہت زیادہ مصروف تھا۔ اس کے بہت سے تفکرات اس کی مصروفیات میں دب کر رہ گئے تھے۔ اسے خوشی اس بات کی تھی کہ بڑے شہر میں بھی اپنے پیشے میں اس کے پاؤں ابتداء ہی سے جم گئے تھے۔

جمشید مختار نے پہلا ہی کیس جو اس کے سپرد کیا تھا وہ بے حد اہم تھا۔ پریس میں اس کا بے حد چرچا تھا کیونکہ معاملہ ایک کروڑ پتی اور شہر کی ایک نمایاں سماجی شخصیت سرفراز احمد کا تھا جس کے بارے میں ایک عام تاثر یہ تھا کہ اس کی تمام تر دولت درحقیقت اس کی بیوی کی مرہون منت تھی۔ نوجوانی میں وہ محض ایک کھلاڑی تھا اور اس میدان میں ابھی کچھ ایسا زیادہ کامیاب نہیں تھا۔ اس کا نہ تو بہت بڑا نام بنا تھا اور نہ ہی اس نے بہت دولت کمائی تھی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس دوران میں اس کی ملاقات ایک دولت مند لڑکی سے ہو گئی جسے ایک بہت بڑی انڈسٹری ورثے میں ملی ہوئی تھی۔

اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ انہوں نے جو کچھ بھی چھوڑا تھا' سب کچھ اسے ہی ملا تھا اور شادی کے امیدوار اس کے گرد پروانوں کی طرح منڈلا رہے تھے جن میں سے بعض بہت معقول تھے اور خود ان کا اپنا شمار بھی موٹی اسامیوں میں ہوتا تھا لیکن قرعہ فال سرفراز احمد کے نام نکلا اور سرفراز نے بھی شادی میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے کھیل کے میدان میں اپنے کیریئر کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی اور جلد ہی اس میدان میں اس کا نام معدوم ہو گیا لیکن وہ ایک بڑا صنعت کار بن کر ابھرا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ اس نے خود بھی اپنی بیوی کی انڈسٹری کو پھیلانے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ بہت محنت کی تھی لیکن یہ تاثر بہرحال اس کی شخصیت کے ساتھ چسپاں ہو چکا تھا کہ وہ جو کچھ بھی تھا اپنی بیوی کی بدولت تھا ــــــ اور شادی کے بارہ سال بعد اس پر اسی بیوی کے قتل کا الزام آ گیا تھا۔ چند سال سے وہ مستقل بیمار رہنے لگی تھی اور کچھ عرصے سے اس کے عوارض بڑے شدید ہو گئے تھے۔ سرفراز پر الزام تھا کہ اس نے موقع پا کر اپنی بیوی کی نرس کی عدم موجودگی میں بیوی کو اس کی دوا کی زیادہ مقدار کا انجکشن لگا دیا تھا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اس کا الزام نرس پر آ جائے گا لیکن اتفاق سے نرس کی بے گناہی کی کچھ شہادتیں سامنے آ گئی تھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ اس نے اس روز ان اوقات میں بیگم سرفراز کو کوئی انجکشن نہیں لگایا تھا جن کا تعین پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹروں نے کیا تھا۔ اس کے برعکس اس بات کی کچھ شہادتیں سامنے آ گئی تھیں کہ اس دوا کی کچھ شیشیاں' انجکشن اور سرنجیں سرفراز اپنے پاس بھی رکھتا تھا۔

یہ چیزیں اس کے کمرے سے برآمد بھی ہو گئی تھیں اور اسی بات نے اسے سب سے زیادہ مشتبہ بنا دیا تھا۔ بیوی سے اس کے اختلافات کی خبریں عام تھیں اور اس کی آوارگی

کے بھی چرچے تھے۔ یہ تاثر عام تھا کہ وہ کئی دوسری خواتین میں دلچسپی رکھتا تھا اور اپنی بیمار بیوی سے عاجز تھا۔ کیس بہت پیچیدہ تھا اور سرفراز کی پوزیشن بڑی مشکوک تھی۔ اسے سزا دلوانے کے لئے سب سے زیادہ اس کی ساس ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

جمشید مختار نے اتنا مشکل اور اہم کیس خالد کے سپرد کر کے گویا ابتداء میں ہی اس کا امتحان لیا تھا لیکن وہ اس امتحان میں پورا اترا تھا۔ اس نے بہت بھاگ دوڑ کی تھی۔ چھوٹی چھوٹی غیر اہم شہادتوں تک کے بارے میں بہت چھان بین کی تھی۔ گواہوں کے پیچھے بھاگا تھا۔ سرکاری وکیل سے گٹھ جوڑ کرنے کی کوشش کی تھی۔ کچھ جعلی گواہ تیار کئے تھے۔ غرضیکہ اس نے کوئی حربہ نہیں چھوڑا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس دوران میں اسے یقین ہو چکا تھا کہ سرفراز نے واقعی اپنی بیوی کو انجکشن لگا کر مارا تھا۔ اس کے باوجود اس نے نہایت جوش و خروش سے اس کے وکیل صفائی کے طور پر ہی مقدمہ لڑا اور جیت کر دکھایا۔ سرفراز احمد بری ہو گیا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

اسے تو خیر خوش ہونا ہی تھا لیکن جمشید مختار صاحب کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ خالد کو وہ دن یاد تھا جب وہ مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد آفس پہنچا تھا اور جمشید کے کمرے میں گیا تھا۔ جمشید نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا تھا اور اسے بے اختیار سینے سے لگا کر بھینچ لیا تھا۔ خالد ایک تو ان کی طاقت پر حیران رہ گیا تھا۔ اس عمر میں بھی انہوں نے اس طرح خالد کو بھینچا تھا کہ اس کی پسلیاں کڑکڑا اٹھی تھیں اور سانس گویا سینے میں اٹکنے لگی تھی۔

مزید حیرت اسے ان کی اس قدر خوشی پر ہوئی تھی۔ ان کا چہرہ مسرت سے تمتما رہا تھا اور ان کا گویا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ناچنے لگیں۔ خالد کے خیال میں ان کے لئے مقدمہ جیتنا کوئی نئی بات نہیں تھی اور پھر باس تو عموماً کسی نئے ملازم کی اچھی کارکردگی پر مصلحتاً بھی ضرورت سے زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کرتے تھے کہ کہیں اس کا "دماغ خراب" نہ ہو جائے—— مگر جمشید تو پھولے نہیں سما رہے تھے۔

انہوں نے اچھی طرح اس کی پسلیاں کڑکڑانے کے بعد اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے انگریزی میں کہا تھا—— "مجھے تم پر فخر ہے بیٹا! گو کہ مجھے معلوم تھا کہ مقدمہ تم ہی جیتو گے کیونکہ مقدمہ ہارنا تو ہماری فرم کی روایت ہی نہیں ہے—— اس کے باوجود باضابطہ طور پر اس کی خبر مل جانے کے بعد سے میں اتنا خوش ہوں کہ دل چاہ رہا ہے سڑکوں پر نکل کر رقص کرنے لگوں۔"

"ہمت افزائی کا بہت شکریہ۔" خالد نے اپنی سانس قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔ اسے جمشید کے اس جملے پر بھی حیرت ہوئی تھی کہ "مجھے معلوم تھا مقدمہ تم ہی جیتو گے کیونکہ مقدمہ ہارنا تو ہماری فرم کی روایت ہی نہیں ہے۔" کوئی شخص



اتنے وثوق سے بھلا یہ بات کیسے کہہ سکتا تھا؟

جمشید صاحب کی خوشی بھی صرف دفتر تک محدود نہیں رہی تھی۔ انہوں نے سڑکوں پر رقص کر کے تو اس کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اپنے طویل و عریض شاندار اور نہایت پرتعیش اپارٹمنٹ میں ایک نہایت ہی رنگا رنگ تقریب کا اہتمام کر کے اپنے ارمان ضرور نکالے تھے۔ بقول ان کے یہ تقریب صرف اور صرف خالد کے اعزاز میں تھی۔

اس تقریب میں صرف فرم سے وابستہ اور اس بلڈنگ میں رہنے والے لوگ ہی شریک تھے البتہ تفریح طبع کے لئے جمشید نے بھاری معاوضے پر ایک نامور گلوکارہ اور ایک مشہور کامیڈین کو بلوایا ہوا تھا جنہوں نے صرف گنتی کے ان چند افراد کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور انہیں محظوظ کیا۔ ایک بے حد اونچے معیار کی کیٹرنگ سروس کے ذریعے شاندار اور پرتکلف ڈنر کا اہتمام کیا گیا جس کے بعد ماحول کچھ ایسا بن گیا کہ انگریزی دھنوں پر رقص بھی کیا گیا۔ تقریب کے اس مرحلے میں خالد کو خاص طور پر کئی طرح کی حیرتوں کا سامنا رہا۔

سب سے زیادہ حیرت تو اسے اپنی بیوی پر تھی جو جان محفل دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے حسن بلاخیز نے تو سب کی آنکھیں خیرہ کر ہی رکھی تھیں لیکن خالد کو اس کی شوخی' تیزی و طراری' انداز گفتگو اور نشست و برخاست پر بھی حیرت تھی۔ پھر جب رقص کا دور شروع ہوا تو اسے میمونہ کو رقص کرتے دیکھ کر بھی حیرت ہوئی۔ کبھی کوئی کسی کے ساتھ اور کبھی کسی کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔ اس ہنگامے میں خود خالد کو بھی کھینچ کھانچ کر شریک کر لیا گیا تھا لیکن اسے احساس تھا کہ وہ بس یونہی الٹے سیدھے پاؤں مار رہا تھا یا اچھل کود کر رہا تھا لیکن میمونہ تو ہر ایک کے ساتھ یوں مہارت اور بے تکلفی سے رقص کرتی دکھائی دے رہی تھی جیسے اسے اس قسم کی تقریبات کا برسوں کا تجربہ تھا۔

حیدر آباد کے اس چھوٹے سے گھر میں خالد کو وہ ہمیشہ ایک عام سی عورت دکھائی دی تھی جو نسبتاً خوبصورت ضرور تھی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اتنی جلدی اس کی کایا بھی پلٹ سکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کراچی آنے کے بعد وہ جس جاں فشانی اور تندہی سے باہر کی دنیا میں اپنے پیشے میں اپنا مقام بنانے اور جمشید مختار کی توقعات پر پورا اترنے کے سلسلے میں محنت اور کوشش میں لگا رہتا تھا' اس تمام عرصے میں گھر پر اسی جاں فشانی اور تندہی سے میمونہ خود کو بدلنے میں لگی رہتی تھی اور سعدیہ و عالیہ اس سلسلے میں اس کی بھرپور مدد کر رہی تھیں۔

جمشید مختار اس محفل میں بھی اس کے لئے حیرت کا باعث بن رہے تھے۔ وہ جوانوں سے زیادہ پرجوش' توانا اور پھرتیلے نظر آ رہے تھے۔ وہ تو گویا پورے اپارٹمنٹ میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک اڑتے پھر رہے تھے۔ ہر ایک ہی کی دلداری کر رہے تھے اور

کوشش کر رہے تھے کہ سب اس محفل سے پوری طرح لطف اندوز ہوں لیکن میمونہ کے سامنے تو وہ گویا بچھے جا رہے تھے۔

رقص کے دور میں بھی وہ صرف میمونہ ہی کے گرد پروانے کی طرح طواف کر رہے تھے اور میمونہ بھی گویا ان کی رفاقت میں بہت خوش تھی۔ خالد نے ایسا خوش اسے صرف اپنی شادی کے ابتدائی دنوں میں دیکھا تھا۔ خالد کو ان سب باتوں پر حیرت ضرور تھی لیکن کچھ ایسی تشویش یا پریشانی نہیں تھی۔ سب کچھ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ بس تحت الشعور کے اندھیرے میں کہیں کوئی کنکھجورا تھا۔ اس کے بارے میں خالد دل ہی دل میں خود کو یہی سمجھاتا تھا کہ شاید وہ حالات اور ماحول کی تبدیلیوں سے اتنی تیزی اور کامیابی سے خود کو ایڈجسٹ نہیں کر سکا تھا جتنی تیزی اور عمدگی سے میمونہ نے ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ بعض معاملات میں عورت زیادہ باصلاحیت اور تیز رفتار ثابت ہوتی تھی۔

پارٹی سے دوسرے روز ایک اور عجیب سا واقعہ پیش آیا جو بظاہر اتنا اہم اور پریشان کن بھی نہیں تھا مگر اس سے بھی خالد کے تحت الشعور میں رینگتا ہوا کنکھجورا کچھ بے چین ہوا۔ دوسرے روز وہ عدالت سے فارغ ہو کر آفس پہنچا تو اسے اپنے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہی ملا۔ کاغذات اور فائلوں وغیرہ کی ضرورت کے سلسلے میں غالباً کوئی اس کے کمرے میں آیا تھا اور دروازہ کھلا ہی چھوڑ گیا تھا۔

دروازہ بند کر کے اپنی کرسی پر جا بیٹھنے اور چند گہری گہری سانسیں لینے کے بعد اس کی توجہ میز پر رکھی ہوئی دو فائلوں پر گئی۔ فائلیں اوپر نیچے رکھی تھیں۔ اوپر کی فائل کھلی تھی۔ یہ فائلیں یقیناً اسی کے مطالعے کے لئے رکھی گئی تھیں۔ اس نے کھلی فائل کو اٹھا کر دیکھا۔ اس میں لگے ہوئے وکالت نامے کے مطابق اسے ایک شخص کے وکیل صفائی کے طور پر پیش ہونا تھا جس پر آٹھ افراد کو انتہائی بہیمانہ طریقے سے قتل کرنے کا الزام تھا لیکن جب اس نے پیشی کی تاریخ پڑھی تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ دو سال بعد کی تاریخ تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے سر کو جھٹکا دیا کہ شاید اس کی نظر اسے دھوکا دے رہی تھی لیکن جب اس نے آنکھیں کھول کر دوبارہ فائل دیکھی اس کے کاغذات میں تاریخ دو سال ڈیڑھ ماہ بعد کی تھی۔ کاغذات ہر لحاظ سے مکمل تھے اور ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ مقدموں کا چالان عدالت میں پیش کیا جا چکا تھا۔

"خدا کی پناہ۔۔۔!" اس نے سوچا اور اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ آ گئی۔ "کیا یہ مستقبل کے مقدمات ہیں؟ کیا واقعی یہ واقعات اس طرح پیش آئیں گے؟ کیا واقعی میں ان مقدمات میں وکیل صفائی ہوں گا؟ کیا یہ سب کچھ طے ہو چکا ہے؟ لیکن کسی کو بھلا اس کا علم کیسے ہو سکتا ہے؟"

اس نے کئی بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان تاریخوں کو دیکھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ



اس کی آنکھیں اسے دھوکا نہیں دے رہی تھیں۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا لیکن خود کو سنبھالتے ہوئے وہ اٹھا۔ اس کے خیال میں جمشید مختار ہی اس سلسلے میں صحیح طور پر کوئی وضاحت کر سکتے تھے۔ وہ فائلیں اٹھائے ذرا لڑکھڑاتے سے قدموں سے کمرے سے نکلا اور جمشید کے کمرے کی طرف چل دیا۔

وہ بغیر دستک دیئے اور جمشید مختار کی حسین' نوجوان اور سفید فام سیکرٹری مس لوئیس پیٹرسن سے اجازت لئے بغیر ان کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اسے یہ خصوصی رعایت حاصل تھی کہ وہ ان تکلفات میں پڑے بغیر سیدھا جمشید کے کمرے میں جا سکتا تھا۔ جمشید اپنے کمرے میں موجود تھے اور میز پر رکھے ایک کمپیوٹر کی روشن اسکرین کو کچھ اس طرح تک رہے تھے جیسے وہ جام جم ہو اور وہ اس میں دنیا بھر کا منظر دیکھ رہے ہوں۔ کمپیوٹر کی اسکرین پر کچھ اعداد و شمار متحرک تھے۔

جمشید نے صرف ایک نظر اس کی طرف اور اس کے ہاتھوں میں موجود فائلوں کی طرف دیکھا اور وہ گویا اس کا مسئلہ سمجھ گئے لیکن انہوں نے شاید اسے فوری توجہ کے قابل نہیں سمجھا اور بدستور کمپیوٹر کی طرف متوجہ رہے البتہ انہوں نے خالد کو اپنے مقابل کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ ضرور کر دیا۔

چند لمحے وہ مختلف بٹن دباتے رہے اور اسکرین پر مختلف اعداد و شمار اور الفاظ نمودار ہوتے رہے۔ جمشید مختار اسکرین سے نظر ہٹائے بغیر بولے۔ "میں تو محسوس کرتا ہوں کہ آج کل کی زیادہ تر ایجادات خاصی شیطانی قسم کی چیزیں ہیں۔ یہ انسان کو دھیرے دھیرے ایسے چکر میں پھنسائے جا رہی ہیں کہ آگے جا کر اسے واپسی کا راستہ نہیں ملے گا۔"

پھر اچانک ہی انہوں نے ایک بٹن دبایا۔ اسکرین سادہ ہو گئی اور وہ خالد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔ "تم کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو۔" وہ ایک نظر میں ہی انسان کی کیفیت بھانپ لیتے تھے۔

"میں یہ فائلیں آپ کو دکھانے لایا تھا۔ یہ دو مقدموں کی فائلیں ہیں۔ میرے کمرے میں شاید میرے لئے ہی رکھی گئی ہیں لیکن ان میں تاریخ دو سال اور اس سے بھی آگے کی ہے۔۔۔" خالد نے فائلیں ان کی طرف بڑھائیں۔

وہ گویا اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرائے اور فائلیں انہوں نے اس کے ہاتھ سے لے لیں۔ انہوں نے فائلیں یوں چند سیکنڈ کے لئے اپنے چہرے کے سامنے کر لیں کہ ان کے کاغذات خالد کی نظروں سے چھپ گئے۔ پھر انہوں نے فائلیں دوبارہ خالد کے سامنے رکھ دیں اور ملائمت سے بولے۔ "شاید تمہاری نظریں تمہیں دھوکا دے رہی تھیں یا پھر تم مجھ سے مذاق کے موڈ میں ہو۔"

خالد نے کاغذات پر نظر دوڑائی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ کاغذات ان مقدمات

کے نہیں تھے جو اس نے چند لمحے پہلے دیکھے تھے۔ وہ تو وہ ایسے مقدمات کے تھے جو ختم ہو
چکے تھے۔ ان میں وکیل بھی وہ نہیں بلکہ سعید پاشا تھا۔ یعنی وہ کاغذات سرے سے اس کے
لئے تھے ہی نہیں۔۔۔ اور ان کا تعلق مستقبل سے بھی نہیں تھا۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا
تھا کہ جمشید نے کاغذات تبدیل کر دیئے ہوں گے۔ وہ خود سامنے کھڑا تھا۔ جمشید نے تو
کاغذات کا ایک ورق بھی نہیں پلٹا تھا۔ انہوں نے تو فائلوں پر ایک نظر ہی ڈالی تھی۔ خالد
ایک بار پھر چکرا کر رہ گیا۔ یہ کیا گورکھ دھندا تھا؟

جمشید مختار گویا اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے ملائمت سے بولے۔ "یہ فائلیں شاید غلطی
سے تمہارے کمرے میں رکھ دی گئی تھیں۔ یہ سعید پاشا کے کمرے میں جانی تھیں۔ ہم
چونکہ اپنے تمام مقدمات کا ریکارڈ کمپیوٹرائز کرتے ہیں اس لئے ان دو تازہ ترین مقدمات کی
بھی سمری تیار کی گئی ہے۔ یہ کمپیوٹر میں فیڈ کی جائے گی۔ تمہیں ان کے بارے میں پریشان
ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔"

خالد کا گلا خشک تھا۔ وہ تھوک نگل کر بولا۔ "میں اس لئے پریشان نہیں تھا سر! میں
تو وہ مستقبل کی تاریخ دیکھ کر۔۔۔"

جمشید مشفقانہ انداز میں مسکرائے اور اس کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔ "ایسا ہو جاتا
ہے۔۔۔ کبھی کبھی خود میرے ساتھ ایسا ہو جاتا ہے۔ کام کی زیادتی کے باعث حواس کبھی
کبھی دھوکا دینے لگتے ہیں۔ میرا خیال ہے آج عدالت میں تمہارا دن بہت مصروف گزرا
ہے۔ اب تمہیں یہاں زیادہ سر کھپانے کی ضرورت نہیں گھر جا کر آرام کرو۔ اپنی آج کی
کاغذی کارروائی بھی کل ہی فائل کر دینا۔۔۔"

خالد نے اس روز ان کے سامنے خاموشی تو اختیار کر لی تھی اور ان کے مشورے پر
عمل بھی کر لیا تھا لیکن اس کا دل اس قسم کے جواز اور وضاحتوں سے مطمئن نہیں تھا۔
اسے یقین تھا کہ اس کے حواس نے اسے دھوکا نہیں دیا تھا لیکن اس کے پاس اپنی بات کو
ثابت کرنے کے لئے بھی کوئی دلیل یا جواز نہیں تھا۔ بہرحال اس نے مصروفیات میں الجھ کر
اس بات کو بھی بھول جانے کی کوشش کی تھی۔

خود اپنے خیال میں وہ مضبوط اعصاب کا آدمی تھا اس لئے کوشش کرتا تھا کہ حیران
کن یا پریشان کن باتوں کا زیادہ اثر نہ لے۔ اس قسم کے واقعات کو تو وہ چھوٹی موٹی اور
اہم باتیں سمجھ کر جھٹکنے میں کافی حد تک کامیاب رہا تھا لیکن جو چیز اس کے لئے درحقیقت
پریشانی کا باعث بن رہی تھی اور جس کی وجہ سے اس کے تحت الشعور میں اضطراب کا
کنکھجورا رینگتا رہتا تھا وہ کچھ اور ہی تھی۔

وہ مسئلہ ایک اور خالد تیموری کا تھا۔

جس رات ٹائی والا واقعہ پیش آیا تھا اس کے بعد خالد نے اس کی کئی لنگڑی لولی



توجیہات تراش کر اس بات کو بھولنے کی کوشش کی تھی لیکن بات وہیں ختم نہیں ہوئی
تھی۔ اس کے بعد تو ہر دوسرے تیسرے دن۔۔۔ خصوصاً جب کسی مصروفیت کی وجہ سے
خالد تاخیر سے گھر پہنچتا تو اسے کسی نہ کسی پر میمونہ سے یہ سننے کو ملتا کہ وہ اس سے پہلے بھی
گھر کا چکر لگا کر جا چکا تھا جبکہ خالد قسم کھانے کو تیار رہتا تھا کہ وہ اس سے پہلے نہیں آیا
تھا۔۔۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے میمونہ کی بات کی تردید کرنا چھوڑ دی اور اس مسئلے کے
بارے میں سوچ سوچ کر اندر ہی اندر تشویش میں مبتلا رہنے لگا تھا۔

اسے کچھ ایسے آثار بھی نہ صرف گھر میں بلکہ میمونہ کے وجود اور اس کے طرز عمل
میں بھی دیکھنے کو مل جاتے جن سے ظاہر ہوتا کہ وہ واقعی اس سے پہلے بھی گھر آیا تھا۔ ایسی
نشانیاں کوئی شوہر ہی چھوڑ کر جا سکتا تھا۔ کبھی کبھی تو میمونہ اسے بالکل تھکی ہاری سی بے
سدھ پڑی سوتی ملتی اور وہ اس کی حالت دیکھ کر حیران رہ جاتا۔ اس کے بیدار ہونے پر اسے
وہی کہانی سننے کو ملتی۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو آپ گئے تھے۔۔۔"

خالد کا اپنے بال نوچنے کو دل چاہنے لگتا۔ کیا اس کا اپنا وجود دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو
گیا تھا اور اسے اس کا علم بھی نہیں تھا؟ یا پھر اس کا کوئی ہمزاد پیدا ہو گیا تھا؟ اس کا آنا
خالی از علت بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک خاص مقصد سے آتا تھا اور
مقصد پورا ہونے پر مزید کچھ دیر ایک نہایت شوخ و شنگ اور زندگی کی توانائیوں سے کچھ
زیادہ ہی نوازے گئے انسان کی طرح بہت سی شرارتیں اور چہلیں کرنے کے بعد رخصت
ہو جاتا تھا۔ وہ ایک شوہر اور گھر کے مالک کے طور پر اپنی حیثیت سے خوب خوب استفادہ
کر رہا تھا اور ستم ظریفی یہ تھی کہ میمونہ اس سے بہت خوش معلوم ہوتی تھی۔

اس کے اپنے حساب کے مطابق جب خالد دوبارہ گھر آتا تھا تو وہ پہلا سا خالد نہیں
ہوتا تھا۔ خالد کو یہ اعتراف کرتے ہوئے بھی شرم آنے لگی تھی کہ جسے وہ بہتر درجے کا
خالد قرار دیتی تھی وہ تو خالد ہی نہیں ہوتا تھا مگر سوال یہ تھا کہ پھر وہ کون تھا؟ اس سوال کا
خود خالد کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور اس سوال کو زیادہ شدومد کے ساتھ میمونہ کے
سامنے زیر بحث لا کر وہ اپنی ازدواجی زندگی میں زہر نہیں گھولنا چاہتا تھا۔ زہر تو اس کی زندگی
میں ویسے بھی گھلنے لگا تھا لیکن سردست اس کا کرب اس کی اپنی ذات تک محدود تھا۔

وہ میمونہ کو منع کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس خالد کے سامنے خود سپردگی کا مظاہرہ کرنا تو
درکنار' اس کے لئے گھر کا دروازہ بھی نہ کھولا کرے۔۔۔ لیکن اسے تو دروازہ کھلوانے کی
ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ اصل خالد کی طرح اس کے پاس بھی گھر کی چابی ہوتی
تھی۔۔۔ اور پھر مسئلہ یہ تھا کہ اصل اور نقل کی پہچان ہی کیا تھی؟ وہ نقل کے دھوکے میں
اصل خالد کو بھی تو اندر آنے سے۔۔۔ اپنے قریب آنے سے روک سکتی تھی۔ ابھی تو خالد

نے صحیح طور پر اس کے سامنے اصلی اور نقلی کا مسئلہ ہی نہیں اٹھایا تھا۔۔۔۔ اٹھاتا بھی کس منہ سے؟ اگر وہ واقعی میمونہ کو اس بات کا قائل کر لیتا کہ اتنی مرتبہ اس سے پہلے گھر آنے والا درحقیقت وہ نہیں تھا۔۔۔۔ تو پھر ایک دوسرے کی نظر میں ان کی کیا عزت رہ جاتی؟ ویسے بھی صحیح معنوں میں اس کا دل اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ وہ اب بھی اکثر اپنے آپ کو اسی خیال سے بہلانے کی کوشش کرتا تھا کہ میمونہ کسی واہمے کا شکار تھی اور ایک دن آخر کار وہ اس واہمے سے نکل آئے گی۔

مگر ہوا یہ کہ واہمہ اور بھی شدید تر ہو گیا۔ اب تو میمونہ کبھی کبھی صبح اٹھ کر ناشتے کے دوران میں باتوں باتوں میں کہتی۔ "رات تو آپ نے حد ہی کر دی۔۔۔۔ بہت سی شرارتیں سوجھ رہی تھیں آپ کو۔۔۔!" اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتما اٹھتا۔

خالد حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ جاتا کیونکہ اسے اچھی طرح یاد ہوتا تھا کہ اس رات تو وہ سونے کے بعد صبح ہی کی خبر لایا تھا اور جس روز وہ اس قسم کی کوئی بات سننے کی توقع رکھتا تھا اس روز میمونہ ایسی کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ اس روز اس کا موڈ کچھ خراب ہی دکھائی دیتا تھا اور وہ گویا بات کرنے سے ہی کتراتی تھی۔

ایک روز جمشید نے شاید اس کی پریشانی بھانپ کر اس سے پوچھ ہی لیا کہ کیا اسے کوئی مسئلہ درپیش تھا؟ خالد اس وقت ایک کیس کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے کے لئے ان کے کمرے میں ہی بیٹھا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "میں نہیں چاہتا کہ میرا کوئی بھی ساتھی کوئی بھی مسئلہ اپنے ساتھ لئے پھرے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ مکمل یکسوئی سے صرف اور صرف اپنا کام کریں۔ اپنے مسائل اور تفکرات وہ میرے لئے چھوڑ دیں۔ میرے خیال میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جسے میں حل نہ کر سکوں۔"

خالد نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ ایک ٹک اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تب وہ غیر ارادی انداز میں اپنا مسئلہ بیان کرتا چلا گیا تاہم اس نے بات گول مول سی ہی رکھی تھی۔ وہ اس کی زیادہ گہرائی اور جزئیات میں نہیں گیا تھا۔ جمشید اس کی بات سن کر بہت ہنسے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ننھا بچہ اپنے کسی مسئلے کو نہایت سنگین سمجھتے ہوئے کسی بڑے کے سامنے بیان کرتا ہے اور وہ اسے نہایت بچگانہ بلکہ احمقانہ محسوس کرتے ہوئے ہنسنے لگتا ہے۔

ان کی ہنسی تھمی تو وہ مشفقانہ لہجے میں بولے۔ "مائی ڈیئر بوائے! یہ درحقیقت کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اسے اپنے ذہن سے جھٹک دو۔ دراصل تمہارے حالات اور لائف اسٹائل میں اچانک جو اتنی بڑی تبدیلی آئی ہے اس نے تمہاری بیوی کے ذہن پر کچھ زیادہ ہی اثرات مرتب کئے ہیں اور وہ تمہارے مقابلے میں زیادہ تخیل پرست بھی معلوم ہوتی



ہے۔ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ تم اس مسئلے کو مسئلہ ہی نہ سمجھو۔ تمہارا خیال درست ہے۔۔۔۔ وہ محض واہمے کا شکار ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی نارمل ہو جائے گی۔ تم اس معاملے کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دو۔ بعض معاملات محض ہمارے اہمیت دینے کی وجہ سے واقعی مسئلہ بن جاتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ مسئلہ نہیں ہوتے۔"

جمشید کا سمجھانے کا انداز بھی نہایت دل نشین ہوتا تھا۔ ان کی باتیں گویا سیدھی خالد کے دل میں اترتی چلی گئیں۔ اسے بڑی ڈھارس ہوئی۔ ذہن سے یکدم ہی جیسے کوئی بوجھ سا اتر گیا۔

جمشید بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "اگر خدانخواستہ تمہاری بیوی کے اس واہمے نے سچ مچ کسی نفسیاتی مسئلے کی صورت اختیار کی تو ہم اس کا علاج بھی کرا لیں گے۔ شہر کا ایک بہت اچھا نفسیاتی اسپتال ہمارے پینل پر ہے۔ اس کے مالک باہر کے تعلیم یافتہ ہیں اور میرے دوست بھی ہیں۔ ہمارے معاملات کو وہ ذاتی مسائل سمجھ کر دیکھتے ہیں۔ ہم ان کے ہاں تمہاری بیوی کا خصوصی علاج کرا لیں گے۔۔۔۔ لیکن فی الحال تم اس معاملے کو ذرا بھی اہمیت نہ دو۔"

جمشید کا مشورہ خالد کو بہت اچھا لگا۔ یہ ایک طرح سے اس کے اپنے ہی دل کی آواز تھی۔ اس نے اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اس روز اسے کافی مصروفیت رہی۔ رات تک تو وہ دفتر میں ہی مصروف رہا۔ اس کے بعد ایک ہوٹل میں ایک سرکاری وکیل سے اس کی خفیہ ملاقات طے تھی جو کافی طول کھینچ گئی۔ وہ سرکاری وکیل کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنے کی غرض سے جس طرح شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہا تھا وہ اس طرح قابو میں نہیں آ رہا تھا اور کوئی بھی پیشکش قبول نہیں کر رہا تھا لیکن آخرکار کسی نہ کسی حد تک بات بن ہی گئی۔

ان تمام مصروفیات کے باوجود وہ رات کو کافی دیر سے گھر پہنچا تب بھی اپنے آپ کو تھکا ہوا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہ لفٹ میں اپنے اپارٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر آج بھی میمونہ نے اس قسم کی کوئی بات کی کہ وہ اس سے پہلے گھر کا چکر لگا کر جا چکا ہے تو وہ یا تو اس بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دے گا یا پھر تسلیم کر لے گا کہ ہاں وہ واقعی اس سے پہلے بھی آیا تھا۔

ان خیالات میں الجھا ہوا وہ اپنے فلور پر لفٹ سے نکلا تو حسب معمول سامنے بڑے سے ہال نما حصے میں خوابناک سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اچانک ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک ستون کے عقب سے اچانک ہی ایک ہیولا سا نکل کر اس کے سامنے آ گیا تھا۔

ایک لمحے کے لئے وہ خوفزدہ سا ہو گیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس عمارت میں حفاظتی انتظامات زبردست تھے۔ مکینوں کی مرضی کے بغیر باہر کا کوئی آدمی اندر آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے یہی اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ کوئی اس کی گھات میں تو نہیں بیٹھا تھا۔ وہ جس قسم کے مقدمے لڑ رہا تھا اور جن خطوط پر کام کر رہا تھا ان کی وجہ سے بہت سے لوگ اس کے دشمن ہو سکتے تھے۔

ایک بار اس نے جمشید مختار کے سامنے بھی اس خدشے کا اظہار کیا تھا۔ وہ کچھ اس طرح ہنس دیئے تھے جیسے انہوں نے کوئی بچکانہ سی بات سن لی ہو۔ پھر انہوں نے اپنے مخصوص پراعتماد لہجے میں کہا تھا۔ "تمہیں اس قسم کے اندیشوں کو دل میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں۔۔۔ اس قسم کے خطرات عام لوگوں کے لئے ہوتے ہیں اور تم اب عام آدمی نہیں رہے۔ تمہارا جہاں دل چاہے گھومو پھرو۔۔۔ کسی بھی کام سے کہیں جانا ضروری ہو تو وہاں چلے جاؤ۔۔۔ تمہارا دل چاہے تو کسی شیر کی کچھار میں بھی گھس سکتے ہو۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی۔ تمہیں کسی ہتھیار، کسی محافظ کی ضرورت نہیں۔ کیا سمجھے؟؟"

خالد بے یقینی سے ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ تب وہ مشفقانہ انداز میں مسکرائے اور ملائمت سے بولے۔ "شاید تمہیں یقین نہیں آیا۔۔۔ خیر۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ رفتہ رفتہ آ جائے گا۔ خوف تمہارے دل سے نکل ہی جائے گا۔ اب تم کوئی عام سے آدمی یا معمولی وکیل نہیں۔۔۔ اب تم جمشید مختار کے آدمی ہو۔"

اس وقت انہی الفاظ کی بازگشت خالد کے ذہن میں گونجی اور اس نے خود کو یکدم بڑا پراعتماد محسوس کیا۔ اس کا خوف دور ہو گیا۔ اس دوران میں ہیولا کچھ اور قریب آ چکا تھا۔ خالد بارعب انداز میں اس سے پوچھنے ہی لگا تھا کہ وہ کون تھا مگر اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ ہیولا نسوانی تھا۔ پھر کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ ہیولے نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر قریبی ستون میں نصب بٹن دبا دیا اور ہال نما بڑی سی راہداری میں عین ان کے سروں پر چھت میں ایک خوبصورت سی لائٹ آن ہو گئی جس نے بہت بڑے حصے کو منور کر دیا۔ اس کے سامنے فرم کے سینئر پارٹنر سعید پاشا کی بیوی نسرین کھڑی تھی۔



حسب معمول اس کا چہرہ ستا ہوا سا تھا اور بڑی بڑی غزالی آنکھوں میں وحشت تھی لیکن خالد کو دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ اس عالم میں بھی وہ خوبصورت نظر آتی تھی۔ گو کہ اب وہ کچھ ایسی نوجوان بھی نہیں رہی تھی لیکن اس کے خدوخال میں کشش کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کے حسن و کشش کے باوجود اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر بس کچھ عجیب لگتا تھا۔ روشنی میں اس کے چہرے پر کچھ ایسی چکنائی زدہ سی چمک دکھائی دینے لگی تھی جیسے اس کا چہرہ کسی زندہ انسان کا نہیں بلکہ کسی موی مجسمے کا چہرہ ہو۔ اس کے پتلے پتلے سے ہونٹ عجیب سے انداز میں کھنچے ہوئے تھے۔ شاید وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ خالد کا راستہ روکے کھڑی تھی اور پھٹی پھٹی وحشت زدہ سی آنکھوں سے ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ خالد نے اب تک یہی محسوس کیا تھا کہ وہ ایک محتاط قسم کی عورت تھی لیکن اس وقت اس کے انداز سے کچھ بے تکلفی عیاں تھی۔ دوسرے ہی لمحے خالد نے خود ہی دل ہی دل میں اپنی تصحیح کی۔ شاید یہ بے تکلفی بھی نہیں تھی بلکہ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نسرین کو اپنی حرکات و سکنات پر اختیار نہیں تھا۔

"کیا بات ہے مسز پاشا؟ کیا آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں؟" وہ ملائمت سے بولا۔

"نسرین اس وقت عجیب سے کپڑے کا ایک لمبا سا گاؤن پہنے ہوئے تھی جو چھت سے پھوٹتی ہوئی تیز روشنی میں کچھ اور بھی عجیب دکھائی دے رہا تھا۔ خالد کو اس کے سراپا سے نظر ہٹا کر بات کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ آخر وہ ایک مرد تھا اور وہ اس احترام کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

"ہاں۔۔۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" نسرین عجیب کھرکھراتی سی آواز میں بولی۔ اس آواز کا تاثر کچھ ایسا تھا جیسے لوہے کے کسی زنگ آلود برتن کو کوئی چھری سے کھرچ رہا ہو۔ خالد کے اعصاب میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے نسرین کو پہلے کبھی ایسی آواز میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔

نسرین نے خوفزدہ سے انداز میں ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کوئی انہیں اس طرح وہاں کھڑے دیکھ لے گا یا ان کی باتیں سن لے گا۔ اس نے اپارٹمنٹ کے دروازے کی طرف دیکھا جس میں خالد اور میمونہ رہتے تھے۔ دروازے میں میجک آئی بھی فٹ تھی۔ ایک لمحے کے لئے خالد کو اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں میمونہ اس ننھے سے عدسے کے عقب سے انہیں نہ دیکھ رہی ہو لیکن پھر اس نے اس اندیشے کو ذہن سے جھٹک دیا۔ میمونہ کو اگر علم ہو جاتا کہ وہ باہر ہال میں پہنچ چکا تھا تو وہ بھی گھر سے باہر آئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

نسرین اس کے کچھ اور قریب ہوتے ہوئے پہلے سے بھی دھیمی آواز میں بولی۔ "اگر

آپ برا محسوس نہ کریں تو میرے اپارٹمنٹ میں چلیں۔۔۔ پاشا اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔ یہاں کھڑے ہو کر بات کرنا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"

خالد نے ایک لمحے سوچا پھر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے۔۔۔ اگر کوئی ضروری بات ہے تو چلے چلتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ میرے خیال میں تو بہت ضروری ہے۔۔۔ معلوم نہیں آپ کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت ہو یا نہیں۔۔۔" وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی اور سیڑھیوں کی طرف چل دی۔ خالد قدرے الجھن کے سے عالم میں اس کے پیچھے تھا۔ بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔

ہال کے فرش اور سیڑھیوں پر سرخ دبیز قالین تھا۔ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے وہ ایک منزل نیچے پہنچے۔ نسرین کے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ خالد کو ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ وہ ایک شاندار اور آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم تھا۔ سازو سامان تقریباً خالد ہی کے اپارٹمنٹ جیسا تھا۔ تھوڑی بہت چیزوں کا فرق تھا۔ سب سے بڑا فرق تاثر کا تھا۔ خالد اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتا تھا تو اسے صفائی ستھرائی' زندگی کی حرارت اور آرام و تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ اگر میمونہ سامنے نہیں ہوتی تھی تب بھی رونق کا سا تاثر ملتا تھا لیکن یہاں ایک عجیب ویرانی اور وحشت کا عالم تھا۔ حالانکہ ہر چیز قرینے سلیقے سے اپنی جگہ رکھی ہوئی تھی۔ کسی چیز پر گرد کی ہلکی سی تہہ بھی نہیں تھی اور خالد کو یہ بھی معلوم تھا کہ سعید پاشا اور نسرین اسی اپارٹمنٹ میں مستقل رہ رہے تھے' اس کے باوجود ویرانی کا تاثر اپنی جگہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کوئی نہیں رہتا تھا۔ وہ ایک اجڑا ہوا گھر تھا۔ خالد اس تاثر پر دل ہی دل میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اسے اپنی حسیات کا فریب قرار دیا۔

وہ ایک شاندار صوفے پر بیٹھ چکا تو نسرین بولی۔ "آپ تھکے ہوئے ہوں گے۔ میں آپ کے لئے چائے لاتی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ خالد اسے اس تکلف سے باز رکھتا وہ ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے رخصت ہو گئی۔ خالد پہلی بار اس گھر میں آیا تھا۔ وہ دلچسپی آمیز نظروں سے طویل و عریض ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا ابھی وہ صحیح طور پر دو چار چیزوں کا ہی جائزہ لے پایا تھا کہ نسرین لوٹ آئی۔ وہ ایک ٹرالی دھکیلتی ہوئی آ رہی تھی۔ شاید اسے خالد کی آمد کا اندازہ تھا اور وہ پہلے ہی چائے و دیگر لوازمات کا انتظام کئے ہوئے تھی۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ اس نے مقفل کر دیا تھا۔

وہ خالد کے قریب ہی بیٹھ کر اس کے لئے چائے تیار کرتے ہوئے بولی۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔۔۔ شاید سعید پاشا جلد آ جائیں۔ ان کے سامنے اسی طرح بیٹھ



کر دوسری باتیں اور عام سی گپ شپ کرنے میں تو کوئی حرج نہیں لیکن جو بات میں کرنا چاہتی ہوں وہ نہیں ہو سکے گی۔۔۔"

اس نے کپ تیار کر کے خالد کو تھما دیا تو اس کے خوبصورت مگر قدرے استخوانی اور زرد سے ہاتھ میں ہلکی سی لرزش تھی۔ خالد کی نظر ایک بار پھر اس سے ملی۔ اسے نسرین کی آنکھوں میں کھنڈروں کی سی ویرانی نظر آئی۔ اب اسے احساس ہوا کہ نسرین کی آنکھوں میں کوئی دعوت یا ترغیب نہیں تھی۔ وہ تو اپنے کسی خیال میں الجھی ہوئی تھی۔ کسی تشویش میں مبتلا تھی۔ اسے شاید یاد بھی نہیں تھا کہ وہ شب خوابی کے گاؤن میں تھی۔

وہ اپنے مخصوص مضطربانہ انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں آپ سے جو بات کرنے جا رہی ہوں۔۔۔ کسی عورت کا کسی مرد سے ایسی بات کرنا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔۔۔ خصوصاً جبکہ ان کے درمیان بے تکلفی بھی نہ ہو۔۔۔ لیکن میں چونکہ آپ کی بھلائی چاہتی ہوں اس لئے خود کو مجبور محسوس کر رہی ہوں کہ آپ سے یہ بات کر ہی لوں۔۔۔ اس سے پہلے کہ تاخیر ہو جائے۔۔۔ تاخیر آپ کے حق میں اور بھی زیادہ نقصان دہ ہو گی۔۔۔"

اس کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے خیال میں کچھ نقصان تو خالد کو پہنچ ہی چکا تھا اب وہ اسے مزید نقصان سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خالد اس پر دل ہی دل میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ نسرین کی بات جاری تھی۔ "درحقیقت مجھے یہ بات آپ کی بیوی سے کرنی چاہئے تھی لیکن مجھے معلوم ہے وہ میری بات پر کان نہیں دھرے گی۔ اس وقت وہ ایک عجیب ہی دور سے گزر رہی ہو گی۔۔۔ وہ گویا کسی اور ہی فضا میں بلندیوں پر پرواز کر رہی ہو گی۔ کچھ بعید نہیں کہ میری بات سن کر وہ برا ہی منا جائے اور اس عمارت میں رہنے والے دوسرے افراد کی نظر میں بھی مجھے مزید بری بنا دے۔۔۔ ان کی نظر میں میں پہلے ہی کچھ اچھی نہیں ہوں۔۔۔" وہ کچھ عجیب تکلیف زدہ انداز میں مسکرائی اور مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملنے لگی۔

چائے کا کپ خالد کے ہاتھ میں تھا اور وہ منتظر سی نظروں سے نسرین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے سکوت کے بعد وہ بولا۔ "تمہید کچھ لمبی نہیں ہو گئی مسز پاشا؟"

"بات ہی کچھ ایسی ہے۔۔۔" نسرین بدستور مضطربانہ انداز میں اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔ اتنی لمبی تمہید باندھنے کے بعد اب گویا اس میں اصل بات کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

آخر اس نے تپائی پر سے اپنا کپ اٹھا کر چائے کی ایک چسکی لی اور شاید گلا تر ہونے پر کچھ آسانی محسوس کرتے ہوئے بولی۔ "آپ یوں سمجھ لیجئے جیسے میں آپ کی بیوی کی ڈاکٹر کی حیثیت سے آپ کو مشورہ دے رہی ہوں۔۔۔ کہ آپ کوشش کریں کہ جب

تک آپ یہاں۔۔۔ اس عمارت میں رہ رہے ہیں تب تک آپ کی بیوی ماں نہ بننے پائے۔۔۔" الفاظ اس کے منہ کچھ یوں نکلے جیسے اس نے اپنے حلق میں پھنسا ہوا کوئی بڑا سا گولا اگل دیا ہو اور اس سے اس کو بڑا سکون محسوس ہوا ہو۔

خالد بری طرح چونکا اور سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے حیرت سے بولا۔ "لیکن کیوں؟"

"یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔۔۔" وہ بے بسی آمیز سے انداز میں بولی۔ "میں نے جتنی بات آپ سے کر دی ہے یہی بہت ہے۔۔۔ یہ کہہ کر بھی میں نے درحقیقت اپنی زندگی کے لئے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔۔۔"

اس نے خوفزدہ سی نظروں سے درودیوار کی طرف دیکھا گویا اسے خطرہ ہو کہ ان سے چپکی ہوئی کوئی نادیدہ مخلوق اس کی باتیں سن رہی ہو یا پھر ان دیواروں میں خفیہ مائیک نصب ہوں جن کے ذریعے اس کی آواز کہیں پہنچ رہی ہو۔

پھر جیسے اس میں جرات عود کر آئی اور وہ اپنی اسی تکلیف زدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "ویسے مجھے اپنی زندگی کی کچھ ایسی خاص پروا نہیں رہی۔۔۔ زندگی سے اب مجھے کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہیں رہی۔۔۔ زندگی میں اب میرے لئے رہ ہی کیا گیا ہے؟ میں تو ایک حادثے کے نتیجے میں ماں بننے کے قابل بھی نہیں رہی۔۔۔ لیکن یہ میرے لئے افسوس یا غم کی نہیں۔۔۔ بلکہ خوشی کی بات ہے۔۔۔ میں اس پر بہت خوش ہوں۔۔۔ لیکن میری زندگی بہرحال کھوکھلی۔۔۔ بے ثمر۔۔۔ بے مقصد اور رائیگاں ہے۔ مجھ جیسا انسان زندہ رہے یا مرجائے اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔۔۔ خود اس کے اپنے لئے بھی۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اچانک ہی ہنس دی۔ یہ ہنسی بھی عجیب تھی' خالد کو ایک بار پھر جھرجھری سی آگئی لیکن وہ بظاہر پرسکون انداز میں بیٹھا رہا۔ اس کے ذہنی کل پرزے البتہ تیزی سے حرکت میں تھے۔ اس کے ذہن میں گویا مشین سی چل رہی تھی۔

ابھی کل ہی تو میمونہ نے اسے بتا دیا تھا کہ اسے شبہ ہو رہا تھا کہ وہ امید سے تھی لیکن تصدیق کے لئے وہ ابھی ڈاکٹر کے پاس جانے اور ٹیسٹ کرانے کو تیار نہیں تھی۔ وہ ابھی کچھ اور انتظار کرنا چاہتی تھی۔ بات ابھی مصدقہ نہیں تھی اور حالات بھی خالد کے لئے کچھ زیادہ راحت افزاء نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ یہ سن کر بہت خوش ہوا تھا۔ وہ باپ بننے جا رہا تھا۔ گویا زندگی کا ایک انوکھا تجربہ اس کا منتظر تھا۔ اس کے خیال میں ہر نوجوان زندگی میں تین حسین ترین خواب دیکھتا تھا اور ان کی تعبیروں کی تلاش میں رہتا تھا۔ پہلا خواب بہترین روزگار اور روشن مستقبل کا ہوتا تھا۔ دوسرا خواب اپنی من پسند یا پھر کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کا ہوتا اور تیسرا خواب باپ بننے کا تھا۔ اسے دو خوابوں کی تعبیر مل چکی تھی اور تیسرے خواب کی تعبیر کا انتظار تھا۔۔۔ مگر یہ نسرین کیا کہہ رہی تھی؟ وہ اسے اس خواب کی تعبیر سے دستبردار ہونے کا مشورہ دے رہی تھی۔



وہ اس کی صحیح وجہ بھی تو نہیں بتا رہی تھی۔ اسے یہ اعتراف بھی تھا کہ اس کی اپنی زندگی میں یہ باب بند ہو چکا تھا۔۔۔ مگر وہ اس پر خوش تھی۔۔۔ کہیں وہ جھوٹ تو نہیں بول رہی تھی؟ یہی کمی کہیں اس کی زندگی کی سب سے بڑی محرومی تو نہیں تھی؟ کہیں اسی نے تو اسے نفسیاتی مریضہ نہیں بنا دیا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ جو خوشی اس کی اپنی زندگی میں نہیں آسکتی تھی اسے وہ کسی دوسرے کی زندگی میں بھی آتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

خالد چند لمحوں کے لئے اپنے خیالوں میں کھو گیا تھا۔ اس کی نظر نسرین کے چہرے سے ہٹ گئی تھی۔ اچانک ہی اس نے گردن گھما کر دوبارہ نسرین کی طرف دیکھا تو بے اختیار اس کی چیخ نکل گئی اور وہ صوفے پر اچھل پڑا۔ نسرین کا جسم تو وہی تھا مگر اس کے شانوں پر گویا کسی چڑیل کا سر رکھ دیا گیا تھا گدھ کی طرح سوکھی ہوئی سیاہی مائل اور شکنوں سے بھری ہوئی گردن۔ بغیر گوشت کے رخسار۔۔۔ آنکھوں کی جگہ دو تاریک گڑھے مگر ان کی گہرائیوں سے شعاعیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ دہانے کی جگہ ایک بڑا سا تاریک گڑھا جس میں لمبے لمبے نوکیلے' زرد اور گھناؤنے دانت یوں جھول رہے تھے جیسے دھاگوں سے باندھ کر لٹکائے گئے ہوں۔ کھوپڑی پر کہیں کہیں گندے' مٹیالے اور رنگ برنگے بالوں کی چھوٹی بڑی لٹیں جو گھاس پھونس کی طرح ادھر ادھر کو لٹکی ہوئی تھیں۔ ناک کی جگہ بھی محض ایک تاریک گڑھا تھا مگریوں لگ رہا تھا جیسے اس میں کوئی چیز کلبلا رہی تھی۔

خالد کو شبہ ہوا کہ وہ خوف سے بے ہوش ہو جائے گا لیکن اسی لمحے وہ چہرہ غائب ہو گیا۔ اس کے سامنے ایک بار پھر وہی نسرین کا چہرہ تھا اور وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے خالد کے تاثرات میں اس اچانک تبدیلی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔

وہ معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولی۔ "اگر میرے مشورے کا آپ پر اتنا ہی برا اثر ہوا ہے تو میں معذرت چاہتی ہوں اور اپنا مشورہ واپس لے لیتی ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ بات نہیں۔۔۔ وہ دراصل آپ کا چہرہ۔۔۔" وہ ہکلا کر رہ گیا۔ جملہ مکمل نہ کر سکا۔

"کیا ہوا میرے چہرے کو؟" نسرین نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سادگی سے پوچھا۔ خالد کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ اٹھ کر ایک آرائشی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور اس میں اپنی صورت دیکھتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے بھئی۔۔۔ مجھے حسین عورتوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ اور مجھے حسین ہونے کا دعویٰ بھی نہیں ہے لیکن اب میں ایسی بدشکل بھی نہیں ہوں کہ مرد مجھے دیکھ کر چیخیں مارنے لگیں۔" وہ واپس صوفے پر آ بیٹھی۔

خالد کے خیال میں یہ اس کی کسر نفسی تھی کہ اس نے خود کو حسین عورتوں میں شمار نہیں کیا تھا حالانکہ وہ اس اجڑی اجڑی سی حالت اور خراب صحت کے باوجود نہ جانے کتنی

عورتوں سے بہتر تھی۔ اور چند برس پہلے تک تو وہ یقیناً بے حد حسین رہی ہو گی۔ مگر چند لمحے پہلے اس نے جو چہرہ دیکھا وہ کس کا تھا؟"

"وہ —— دراصل —— ذرا دیر پہلے آپ کا چہرہ ——" وہ ایک بار پھر ہکلا کر رہ گیا۔ اس کا صحیح طور پر یہ بتانے کو جی نہ چاہا کہ اسے نسرین کا چہرہ کیسا نظر آیا تھا؟ ویسے بھی وہ شک میں پڑ گیا تھا۔ شاید وہ اس کا وہم تھا۔ نسرین نے چونکہ ایک ایسی بات کی تھی جو اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ شاید اس لئے اس کے تحت الشعور نے اسے نسرین کے چہرے کے بارے میں ایک لمحے کا تماشا دکھایا تھا۔

"کیا ذرا دیر پہلے میرا چہرہ بدل گیا تھا؟" نسرین نے اب ذرا تشویش سے پوچھا۔

"جی ہاں ——" خالد صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"اوہ —— یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ——" وہ یکدم ہی گویا غیر ارادی طور پر خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑا کر رہ گئی۔ اس لمحے خالد کو احساس ہوا کہ نسرین کو اس بات کا یقین تو آ گیا تھا اور اسے اس بارے میں تشوش بھی ہوئی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور تھا لیکن دوسرے ہی لمحے نسرین کھوکھلے سے انداز میں ہنس کر بولی۔ "آپ کو وہم ہوا ہو گا۔ ہمارا ذہن اور ہماری نظر کبھی کبھی ہمارے ساتھ بڑی شرارت کرتی ہے ——"

پھر وہ گویا اس موضوع سے کتراتے ہوئے بولی۔ "اچھا —— خیر —— چھوڑیئے ان باتوں کو —— میں آپ کو جو یہاں بلا کر لائی ہوں اس کی ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ میں کل آپ کے گھر گئی تھی۔ میں نے دیکھا میمونہ نے گھر بہت اچھا سیٹ کر لیا ہے۔ گھر تو خیر پہلے یہ بہت اچھا سیٹ تھا لیکن اس نے جو اضافے کئے ہیں وہ بھی عمدہ ہیں البتہ میں نے ایک کمی محسوس کی —— اور وہ یہ کہ آپ کے گھر میں کوئی ڈھنگ کی پینٹنگ نہیں ہے —— اور پینٹنگ کے بغیر گھر کی آرائش مکمل نہیں ہوتی۔ آپ کو شاید علم نہ ہو کہ میں پینٹنگ بھی کرتی ہوں۔ میں آپ کو اپنی ایک پینٹنگ "تحفتاً" پیش کرنا چاہتی تھی لیکن ابھی میں اس کی گفٹ پیکنگ نہیں کر سکی ہوں ——"

"ارے بھئی ان تکلفات کی کیا ضرورت ہے ——" خالد اپنے خوف اور الجھن کو بھولتے ہوئے ذرا خوش ہو کر بولا۔ "آپ مجھے ویسے ہی دے دیجئے۔ کہاں ہے وہ۔"

"دوسرے کمرے میں رکھی ہے جسے میں اسٹوڈیو کے طور پر استعمال کرتی ہوں۔ ابھی لے آتی ہوں۔" نسرین اٹھتے ہوئے بولی۔

وہ جا چکی تو خالد نے ازسر نو ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا اور تب اسے احساس ہوا کہ اس طویل و عریض کمرے کی دیواروں پر کئی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ وہ سب نسرین کی اپنی ہی تھیں۔ ان کے کونوں پر اسے نسرین کا نام بھی نظر آ گیا۔ خالد کو آرٹ سے تھوڑا بہت



شغف تھا لیکن بہت جدت پسند ہونے کا اسے دعویٰ نہیں تھا۔ تجریدی آرٹ اسے پسند نہیں تھا اور وہ محفلوں میں برملا اس کا اعتراف بھی کر لیتا تھا۔ اسے اس کی پرواہ نہیں تھی کہ لوگ اسے بدذوق یا آرٹ کے معاملے میں کم فہم سمجھیں گے۔ اسے معلوم تھا مصوروں کا دعویٰ یہی تھا کہ 'تجریدیت' آرٹ کی زیادہ ترقی یافتہ شکل تھی لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ ایسا آرٹ کس قسم کا جو نظروں کو ہی بھلا نہ لگے۔

اس نے یہ دیکھ کر سکون کی سانس لی کہ ڈرائنگ روم میں آویزاں نسرین کی پینٹنگز تجریدی نہیں تھیں لیکن انہیں مکمل طور پر حقیقت پسندانہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ خالد کو ان کے بارے میں سب سے پہلا احساس یہ ہوا کہ ان میں سرخ رنگ کا بہت زیادہ استعمال کیا گیا تھا۔ اسے معلوم تھا بعض رنگ بعض مصوروں کے زیادہ پسندیدہ ہوتے تھے اور ان کی پینٹنگز میں وہ حاوی نظر آتے تھے لیکن جب اس نے ذرا زیادہ غور سے دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ ان پینٹنگز میں سرخ رنگ کا استعمال ایک خاص اہمیت کا حامل تھا اور اسی رنگ کی وجہ سے ان پینٹنگز کو دیکھ کر ایک عجیب سا احساس ہوتا تھا جسے چند سیکنڈ تک وہ کوئی نام نہ دے سکا لیکن جب اسے اپنے وجود میں سر سے پاؤں تک ایک سرد سی لہر دوڑتی محسوس ہوئی تب اس پر واضح ہوا کہ وہ دہشت کا احساس تھا۔

عجیب بات تھی کہ ان تصویروں کو دیکھ کر ایک انجانی وحشت کا احساس ہوتا تھا حالانکہ ان میں کسی ایسے دہشت ناک منظر کی عکاسی نہیں کی گئی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ ان سب میں کسی نہ کسی انداز میں خون ضرور دکھایا گیا تھا جس کے لئے سرخ رنگ استعمال کیا گیا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ محض سرخ رنگ نہیں بلکہ سچ مچ خون محسوس ہوتا تھا۔ جیتا جاگتا سا سرخ لہو —— جیسے ابھی وہ فریم کے شیشے سے بھی رس کر باہر آ جائے گا اور قالین پر ٹپک پڑے گا۔

مثلاً ایک تصویر میں ایک بھیڑیا دکھایا گیا تھا جس نے بڑا سا ایک جنگلی خرگوش شکار کیا ہوا تھا۔ وہ مردہ خرگوش کو ایک پنجے تلے دبائے، گردن ترچھی کئے ایک درخت کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی باچھوں سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ ادھر خرگوش کی کٹی پھٹی گردن سے بھی بھل بھل خون بہہ رہا تھا —— اور خالد جتنا زیادہ غور سے دیکھ رہا تھا اتنا ہی یہ تاثر مزید گہرا ہو رہا تھا جیسے خون سچ مچ بہہ رہا تھا —— سچ مچ بھیڑیئے کی باچھوں سے ٹپک رہا تھا۔

دوسری تصویر میں ایک رومن اکھاڑہ دکھایا گیا تھا جس کے وسط میں ایک عورت ستون سے جکڑی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر محض چند دھجیاں تھیں۔ ایک رومن سپاہی اس کے جسم پر خاردار کوڑا برسا رہا تھا۔ عورت کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ اس کا خوبصورت جسم جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ خون کی لکیریں اس

کے جسم پر بہہ رہی تھیں اور اس کے پیروں کے قریب خون کا چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔

اسی طرح دوسری تصویروں میں بھی کہیں نہ کہیں خون کی عکاسی ضرور کی گئی تھی اور یہ خون اس قدر حقیقی معلوم ہوتا تھا کہ ساکت بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساکت سچ مچ بہہ رہا ہو۔ خالد نے محسوس کیا کہ خون کے اسی تاثر کی وجہ سے جسم میں دہشت کی سی لہر دوڑتی تھی۔ اسی اثنا میں نسرین بڑی سی ایک فریم شدہ پینٹنگ اٹھائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ پینٹنگ اس نے خالد کے سامنے نہایت احتیاط سے تپائی پر رکھ دی۔

پہلی نظر میں تو وہ خالد کو کافی خوبصورت دکھائی دی۔ اس میں تجریدیت نہ ہونے کے برابر تھی لیکن جونہی اس نے ذرا توجہ سے پینٹنگ کی طرف دیکھا' ایک خفیف سی دہشت سے اس کا جسم ہولے ہولے سنسنانے لگا۔ اس تصویر میں تو سرخ رنگ کچھ زیادہ ہی غالب تھا۔ اس میں تو گویا لہو کا ایک سمندر دکھایا گیا تھا اور سمندر بھی ایسا جو ابل رہا تھا' کھول رہا تھا۔ کھولتے ہوئے اس لہو کے سمندر پر قوس قزح کی کمان سی تنی ہوئی تھی اور اس کمان کے اوپر اسے ایک آبشار سا اس سمندر میں گر رہا تھا مگر درحقیقت وہ آبشار نہیں ایک عورت تھی۔ وہ گویا موم سے بنی ہوئی عورت تھی جو پگھل رہی تھی اور اس حالت میں آبشار بن کر لہو کے سمندر میں گر رہی تھی۔ خود اس عورت کا اپنا تقریباً سارا وجود بھی لہو رنگ تھا۔

ایک لمحے کے لئے تو خالد کو یہ شبہ بھی ہوا کہ شاید وہ عورت میمونہ تھی مگر اس نے فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ ایک عجیب پینٹنگ تھی۔ خالد نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے تمام تر دہشت انگیز تاثر کے باوجود اس کے لئے تصویر پر سے نظر ہٹانا دشوار ہو گیا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ نسرین کو مصوری پر عبور حاصل تھا۔ وہ ان خوشحال اور فارغ البال بیگمات کی طرح نہیں تھی جو یونہی شوقیہ طور پر تھوڑی بہت مصوری سیکھ کر الٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگتی تھیں اور اپنے فن کے کھوکھلے پن کو تجریدیت کی آڑ میں چھپا کر اپنی بے سروپا پینٹنگز فخر سے دکھاتی رہتی تھیں۔

تاہم یہ ضرور تھا کہ نسرین نے شاید اپنے فن کو کسی ایک سمت میں محدود کر دیا تھا۔ اس کی سب تصویروں کا تاثر ایک سا تھا۔ ان سب سے گویا دہشت کی لہریں سی پھوٹ رہی تھیں جو دیکھنے والے کے جسم میں سرایت کر جاتی تھیں۔ خالد نے اسی وقت دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ اس پینٹنگ کو اس کی تمام تر خوبصورتی کے باوجود اپنے گھر میں آویزاں نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ بات وہ نسرین سے کہنے کی اخلاقی جرات اپنے اندر محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہ اگر خلوص سے ایک تحفہ اس کی نذر کر رہی تھی تو اسے شکریے کے ساتھ قبول کر لینا ہی بہتر تھا۔ اخلاقیات کا تقاضا یہی تھا۔



"کیسی لگی آپ کو یہ پینٹنگ؟" نسرین کے لہجے میں معصومانہ سا اشتیاق تھا۔

"بہت اچھی ہے۔" خالد نے اخلاقی تقاضے کے تحت کہا۔۔۔ یہ کہتے ہوئے وہ پینٹنگ پر سے نظر ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔

"اور میری یہ پینٹنگز آپ کو کیسی لگیں؟" نسرین نے ڈرائنگ روم کی دیواروں پر آویزاں دوسری تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ بھی بہت اچھی ہیں۔ آپ کی غیر موجودگی میں میں نے ان کا بہت اچھی طرح جائزہ لیا ہے۔" خالد بدستور اخلاقیات کے تقاضے نبھا رہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے ہلکا سا پچھتاوا محسوس ہوا کہ کبھی کبھی اخلاقیات کا مظاہرہ کسی چھوٹی یا بڑی پریشانی کا باعث بھی بن سکتا تھا کیونکہ اس کی مسکراہٹ اور خوش خلقی سے معمور لہجے سے شاید کچھ زیادہ ہی حوصلہ پا کر نسرین کا بچکانہ سا اشتیاق بہت ہی بڑھ گیا۔

وہ پرجوش لہجے میں بولی۔ "آپ میرا اسٹوڈیو دیکھنا پسند کریں گے؟"

خالد اس وقت اسٹوڈیو وغیرہ دیکھنے کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تھکا ہوا تھا اور گھر جانا چاہتا تھا۔ نسرین کی جتنی پینٹنگز وہ دیکھ چکا تھا ان سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسٹوڈیو میں کیا ہو گا لیکن وہ مروت میں انکار نہ کر سکا۔ ذہن کے کسی گوشے میں تھوڑا بہت تجسس بھی تھا۔ نسرین کی ہر پینٹنگ دوسری سے مختلف ضرور تھی اور ان میں پراسراریت اور دہشت انگیزی کا جو ایک ناقابل وضاحت سا عنصر تھا وہ انسان کے جسم میں خوف کی لہر دوڑانے کے باوجود اسے وہ پینٹنگز دیکھنے پر مجبور ضرور کرتا تھا۔

وہ معذرت کرنا چاہتا تھا کہ اسٹوڈیو پھر کسی وقت دیکھ لے گا لیکن اس کے منہ سے نکلا۔ "جی ضرور۔۔۔ کسی اچھے آرٹسٹ کا اسٹوڈیو دیکھنا تو گویا ایک اعزاز ہوتا ہے۔"

"بہت خوب۔۔ تو گویا آپ نے مجھے اچھے آرٹسٹوں میں شمار کر لیا۔" نسرین کے ستے ہوئے چہرے پر ہلکی سی مسرت کی لہر ابھری۔

"جی ہاں۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ آپ میں ایک اچھے آرٹسٹ کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں۔ آپ کو اپنے کام میں مہارت حاصل ہے۔۔۔ آپ کا اپنا ایک اسٹائل ہے۔۔۔ اس میں بڑی انفرادیت ہے۔۔۔" الفاظ خودبخود گویا خالد کی زبان سے لڑھکتے جا رہے تھے۔ عدالت میں تو وہ مبالغہ آرائی میں بے حد ماہر ہو چکا تھا لیکن شاید اب نجی زندگی میں بھی ہوتا جا رہا تھا۔

"انفرادیت۔۔۔؟" خلاف توقع نسرین کچھ استہزائیہ سے انداز میں ہنسی۔ یکدم جیسے اسے کوئی خیال آیا اور اس کی خوشی معدوم ہو گئی۔ وہ کچھ افسردہ اور کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔ "اس انفرادیت ہی نے تو مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔۔۔ یہ گویا میری خوبی کے بجائے خامی بن گئی ہے۔ شاید اسی کی وجہ سے تمام آرٹ گیلریز والے میری پینٹنگز نمائش

کے لئے رکھنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کوئی مجھے کرائے پر بھی نمائش کے لئے جگہ نہیں دیتا اور جب کوشش کر کے میں نے ایک دو اچھی جگہوں پر تصویریں رکھوا بھی دیں تو کسی نے کوئی تصویر نہیں خریدی حالانکہ میں نے قیمتیں برائے نام رکھی تھیں۔ درحقیقت تصویریں بیچنا یا روپیہ کمانا میرا مقصد نہیں تھا۔ میں تو تھوڑی بہت شہرت' اپنے فن کی شناخت اور تھوڑی سی قبولیت چاہتی تھی لیکن مجھے کچھ بھی نہ مل سکا۔ میری محنت رائیگاں ہی جاتی رہی۔ آخر تھک ہار کر میں نے کوشش ہی چھوڑ دی——"

وہ افسردگی سے مسکرائی پھر خود اپنا مذاق اڑانے کے سے انداز میں بولی۔ "حد تو یہ ہے کہ کوئی مفت میں بھی میری پینٹنگ نہیں لیتا۔ تحفتاً" بھی قبول نہیں کرتا۔ منہ پر ہی صاف انکار کر دیتے ہیں—— اور اگر لے بھی جاتے ہیں تو کبھی اپنے گھر یا آفس میں آویزاں نہیں کرتے——"

خالد کو دل ہی دل میں شرمندگی ہوئی۔ ارادہ تو اس کا بھی یہی تھا۔ اسے کچھ یوں لگا جیسے نسرین نے اس کے خیالات پڑھ لئے تھے اور وہ اسے سنانے کے لئے ہی یہ بات کر رہی تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "آپ پہلے آدمی ہیں جس نے اتنی محبت اور قدردانی سے میری پینٹنگ کا تحفہ قبول کیا ہے۔ اسے اپنے لاؤنج میں لگائیے گا۔ یہ وہاں بہت جچے گی۔ مجھے اس کو وہاں آویزاں دیکھ کر بہت خوشی ہو گی۔"

"آپ کی یہ خواہش تو شاید میں کبھی پوری نہ کر سکوں۔" خالد قدرے شرمندگی سے دل ہی دل میں سوچے بغیر نہ رہ سکا لیکن اسے امید تھی کہ وہ بعد میں اس کے لئے کوئی معقول بہانہ سوچ لے گا۔

نسرین اٹھتے ہوئے بولی۔ "آیئے—— میں آپ کو اپنا اسٹوڈیو دکھاؤں۔"

خالد اس کی رہنمائی میں جس طویل و عریض کمرے تک پہنچا وہ پہلی نظر میں اسے کسی آرٹسٹ کے اسٹوڈیو کے بجائے بھوت خانہ دکھائی دیا۔ کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا کیونکہ اس کی کھڑکیاں بند تھیں۔ ان پر موٹے موٹے سیاہ پردے پھیلے ہوئے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ دیواروں اور چھت پر پینٹ بھی سیاہ تھا جو یقیناً خصوصی طور پر کرایا گیا تھا۔ خالد نے آج تک کسی گھر کے کسی کمرے میں سیاہ پینٹ نہیں دیکھا تھا۔ خواہ کمرہ کسی بھی مقصد کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

نسرین نے اس ماتم کدے کی لائٹیں آن کیں تو ان کی روشنی بھی موم بتیوں سے زیادہ نہیں تھیں۔ ملگجی روشنی میں خالد اس کے ہمراہ آگے بڑھا تو اس نے خود کو کسی اور ہی دنیا کا ایک پراسرار کردار محسوس کیا۔ اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کے اپنے اندر کوئی عجیب سی تبدیلی آئی تھی۔ اسے کچھ یوں لگا تھا جیسے اس کے اپنے وجود میں خوابیدہ کوئی کمزور سا درندہ انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا۔



"یہ آپ نے یہاں لائٹیں اتنی مدھم کیوں رکھی ہیں—— اور اس کمرے میں سیاہ پینٹ کیوں کرایا ہے؟" اسے خود اپنی آواز کچھ بھاری اور بدلی بدلی محسوس ہوئی۔

اس نے گردن گھما کر ملگجے اندھیرے میں ایک ہیولے کی طرح کھڑی نسرین کی طرف دیکھا۔ عجیب بات تھی کہ اس کا ستا ہوا سا چہرہ جو اکثر بیمار اور مضمحل افراد کی طرح زرد نظر آتا تھا۔ اس وقت کمزور روشنی میں عجیب سے انداز میں تمتما رہا تھا۔ اس نے آنکھوں کو ذرا حرکت دی تو ان سے شعاعیں سی پھوٹتی محسوس ہوئیں۔ پھر اس کے پتلے پتلے ہونٹ کھنچ کر رہ گئے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے سفید چمکیلے اور ہموار دانت ان ہونٹوں کے عقب سے جھانکنے لگے لیکن اس وقت وہ کچھ زیادہ ہی باریک اور نوکیلے محسوس ہو رہے تھے۔ شاید کچھ زیادہ لمبے بھی ہو گئے تھے۔ ہونٹوں سے نکلے پڑ رہے تھے۔

وہ اس کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ خالد اس کے سانسوں کی حرارت اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ ان سانسوں میں اسے کچے گوشت کی سی مہک محسوس ہوئی لیکن عجیب بات تھی کہ اسے اس مہک سے کراہت محسوس نہیں ہوئی۔ ایک لمحے کے لئے اسے یہ خیال بھی آیا کہ اگر اس وقت سعید پاشا آ جائے تو اس نیم تاریک کمرے میں انہیں یوں آمنے سامنے کھڑے دیکھ کر کیا سوچے گا؟ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس تصور کو ذہن سے جھٹک دیا۔ سعید پاشا کا خیال گویا اسے قطعی غیر ضروری اور غیر اہم محسوس ہوا تھا۔

نسرین جب بولی تو اس کی آواز بھی کچھ بدلی بدلی اور بھاری بھاری سی تھی۔ نہایت دھیمے لہجے میں وہ کہہ رہی تھی۔ "یہ مدھم لائٹیں—— یہ سیاہ پینٹ میرے فن کی اہم ضروریات میں سے ہے—— میں نے یہاں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے—— اپنی مرضی کا—— اور ایک الگ ہی ماحول تخلیق کیا ہے——

خالد کو اپنا سر کچھ بھاری محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کوئی نشہ آور چیز پی لی ہو لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اپنا وجود اسے ہلکا لگ رہا تھا۔ اسے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوشش کرے تو فرش سے ایک آدھ فٹ اوپر رہتے ہوئے بھی چل سکتا ہے۔ اس نے دیکھا نسرین کی آنکھیں کچھ اور دہکنے لگی تھیں۔ اس کے دانت کچھ اور نوکیلے' کچھ اور لمبے' کچھ اور نمایاں ہو گئے تھے۔ اچانک اسے گویا کوئی بھولا بسرا سا خیال آیا۔ اسے گویا کوئی بہت پرانی سی بات یاد آئی کہ وہ تو یہاں نسرین کی پینٹنگز دیکھنے آیا تھا۔

"پینٹنگز کہاں ہیں؟" اس نے بھاری گھرگھراتی سی آواز میں پوچھا۔

"تمام دیواروں پر پینٹنگز ہی پینٹنگز ہیں۔ آرام سے دیکھتے رہنا—— ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" نسرین نے کچھ ویسی ہی آواز میں جواب دیا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر ایک ٹک خالد کی طرف دیکھ رہی تھی اور خالد کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں سے نادیدہ سی شعاعیں نکل کر اس کی اپنی آنکھوں میں جذب ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ بت سا بن کر رہ

گیا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہی مگر نہ کر سکا۔

پھر اسے کچھ یوں لگا جیسے نسرین قد میں اس سے بھی کچھ لمبی ہو گئی تھی۔ وہ پہلے ہی سروقد عورت تھی۔ دبلی ہونے کی وجہ سے کچھ اور بھی لمبی لگتی تھی لیکن اس کا قد خالد جیسے دراز قد آدمی سے بھی اونچا ہو گیا تو وہ عجیب نظر آنے لگی۔ خالد نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ اس کا وہم تھا۔ فریب تھا۔۔۔ یوں بھلا کھڑے کھڑے کس کا قد لمبا ہو سکتا تھا؟

ابھی وہ اس ضمن میں اپنی غنودگی زدہ سے ذہن میں تاویلیں ہی گھڑ رہا تھا کہ بلندی کی طرف سے اسے نسرین کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ دو بڑے بڑے استخوانی پنجوں کی طرح ایک جھٹکے سے نیچے آتے دکھائی دیئے۔ دوسرے ہی لمحے اس کے بال اس کی مٹھیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ایک جھٹکے سے اس نے اس طرح خالد کا چہرہ اوپر کیا کہ اس کی گردن پیچھے کو مڑ کر رہ گئی۔ اس لمحے خالد کو اس دبلی سی عورت میں بے پناہ طاقت کا احساس ہوا۔ وہ اس کے سامنے خود کو جس طرح بے بس محسوس کر رہا تھا اس طرح شاید اس خرگوش نے بھی بھیڑیئے کے پنجوں میں خود کو محسوس کیا ہو گا جسے کچھ دیر پہلے خالد نے پینٹنگ میں دیکھا تھا۔ نسرین نے صرف اس کے بال مٹھیوں میں جکڑے تھے مگر وہ ہلنے سے بھی قاصر تھا۔

دوسرے ہی لمحے نسرین اس کے نرخرے پر جھک رہی تھی جو نمایاں ہو چکا تھا۔ خالد نے صرف ایک بار نہایت قریب سے لمبے لمبے نوکیلے دانتوں کی جھلک دیکھی پھر اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ عجیب بات تھی کہ اسے ان دانتوں سے قطعاً کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ غیر ارادی طور پر دھیرے دھیرے آنکھیں بند کرتا جا رہا تھا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اس کے حلقوم میں دو سوئیاں سی اتر گئی تھیں۔

تکلیف کچھ زیادہ نہیں تھی پھر جیسے اس کے سارے جسم سے جان سی کھنچ کر حلق کی طرف آنے اور پھر وہاں سے دھیرے دھیرے کہیں باہر جانے لگی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس سے اسے تکلیف کے بجائے ایک عجیب سی راحت۔۔۔ بلکہ شاید کسی حد تک لذت کا احساس ہو رہا تھا۔ کوئی ایسی چیز جس نے اس کی رگ و پے میں اضطراب کی آگ لگائی ہوئی تھی، وہ گویا دھیرے دھیرے اس اس کے جسم سے نکلتی جا رہی تھی۔

اس کی یہ کیفیت زیادہ دیر نہ رہی۔ جلد ہی اس نے اپنے بالوں کو ان استخوانی پنجوں فولاد کی طرح مضبوط ہاتھوں کی گرفت سے آزاد محسوس کیا۔ سوئیوں کی چبھن اس کے حلق سے دور ہو گئی۔ اس کی گردن سیدھی ہو گئی اور پھر دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں بھی کھل گئیں۔



نسرین اس کے سامنے کھڑی اپنی مخصوص کشیدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی شکل صورت، قد کاٹھ سب کچھ پہلے ہی کی طرح تھا۔ دانت بھی پہلے ہی کی طرح پتلے پتلے ہونٹوں کے عقب میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کی محض ایک معمولی سی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ سب کچھ پہلے ہی کی طرح تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ بس وہ کچھ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ اس کا لیٹنے اور آرام کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔

"آپ کیا کھڑے کھڑے ہی آنکھیں بند کر کے کوئی خواب دیکھنے لگے تھے؟" نسرین نہایت شیریں لہجے میں بولی۔ اس کی آواز میں پہلا سا اضطراب نہیں تھا۔

اس وقت خالد کو بھی یہی گماں گزرا کہ شاید چند سیکنڈ کے لئے اس کی آنکھیں بند ہوئی تھیں اور اس دوران میں ہی اس کا تصور اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیل گیا تھا۔ شاید اسے واہمے کچھ زیادہ ہی ستانے لگے تھے ورنہ جو کچھ اس نے اپنی دانست میں دیکھا تھا وہ بھلا کیسے ممکن تھا۔ وہ اور نسرین اس حقیقی دنیا کے باسی تھے، کسی ڈراؤنی فلم کے کردار نہیں تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر اس نے نسرین سے تذکرہ کیا کہ اس کی دانست میں چند لمحے پہلے اس نے کیا کچھ دیکھا تھا اور اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔۔۔ تو وہ بہت ہنسے گی۔ اس کے ذہنی توازن پر شبہ کرے گی وہ خاموش ہی رہا۔

"آپ میری تصویریں نہیں دیکھیں گے؟" نسرین نے اسے خاموش پا کر اسی شیریں لہجے میں پوچھا۔

"کیوں نہیں۔۔۔" وہ ذرا بے دلی سے بولا۔ تھکن کے باعث اب گویا اسے پینٹنگز سے بالکل دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن محض مروتاً" وہ نسرین کے ساتھ ایک دیوار کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے محسوس کیا کہ کم روشنی کے باوجود اسے تصویریں دیکھنے میں قطعاً" کوئی دقت پیش نہیں آ رہی تھی۔ تمام تصویریں اپنی تمام تر باریک ترین جزئیات کے ساتھ اس کی نظروں کے سامنے واضح تھیں۔ ان میں کچھ تو اسی قسم کی تھیں جیسی وہ ڈرائنگ روم میں دیکھ چکا تھا۔ خون ان کا نمایاں جزو تھا۔ کہیں جلاد نے کسی قیدی کا سر قلم کیا ہوا تھا۔ کہیں درندے کسی انسان یا جانور کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ ان سب میں خون بالکل حقیقی دکھائی دے رہا تھا۔ جن تصویروں پر فریم میں شیشہ نہیں تھا انہیں تو اس نے اس یقین کے ساتھ انگلی سے ذرا سا چھوا کہ اس کی انگلی پر خون لگ جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

ان کے علاوہ بعض تصویریں ایسے بھیانک جانوروں کی تھیں جنہیں خالد نے حقیقی زندگی میں تو کیا، تصویروں یا فلموں میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ نہ جانے کن سیاروں کی مخلوق تھے لیکن ان سب میں قدر مشترک یہی تھی کہ سب کے سب بے حد ڈراؤنے تھے اور ان کے سامنے کھڑے ہونے پر خالد کو یہی محسوس ہوا جیسے وہ فریم سے نکل کر ابھی اس

پر جھپٹ پڑیں گے۔

ملگجی روشنی میں ایک پراسرار سائے کی طرح نسرین اس کی رہنمائی کرتے ہوئے ا
مختلف تصویروں کے بارے میں بتا رہی تھی کہ فلاں تصویر کا خیال اس نے فلاں جگہ
حاصل کیا۔ فلاں تصویر اس نے فلاں واقعے سے متاثر ہو کر بنائی لیکن خالد کا دھیان اس
گفتگو کی طرف کم ہی تھا۔ اس پر تھکن اور غنودگی غالب آتی جا رہی تھی۔

شاید یہ تھکن، غنودگی اور کم روشنی ہی کا نتیجہ تھا کہ اس کا ہاتھ ایک کونے
اسٹول پر رکھے ہوئے بڑے سے پیالے سے ٹکرا گیا اور پیالہ الٹ گیا۔ اس میں کوئی گا
سیال موجود تھا جو اسٹول پر سے ہوتا ہوا فرش پر گرنے لگا۔ خالد کا ہاتھ بھی جوڑ تک ا
سیال میں لتھڑ گیا۔ اسے کچھ چپ چپاہٹ کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ آنکھوں کے قر
لا کر دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ کیا سیال تھا مگر اپنے ہاتھ پر نظر پڑتے ہی اس کے حلق
بے اختیار چیخ نکل گئی۔

جہاں تک اس کا ہاتھ اس سیال میں لتھڑا تھا وہاں تک تیزی سے اس کی
تبدیل ہو رہی تھی۔



خالد نے دیکھا کہ جس سیال میں اس کا ہاتھ لتھڑا تھا وہ خون معلوم ہوتا تھا۔ وہ
گاڑھا چپ چپا اور گہرا سرخ..... بلکہ عنابی تھا۔ اس کے ہاتھ کی ساخت اس کی آنکھوں کے
سامنے یوں تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی جس طرح بعض فلموں میں کمپیوٹر کے کمالات اور
کیمرہ ٹرک کے ذریعے بعض چیزوں کی شکل بدلتے دکھایا جاتا تھا لیکن فلموں میں کسی چیز کی
ساخت کو تبدیل ہوتے دیکھنا اور بات تھی اور اپنے ہی جسم کے کسی حصے کی شکل بدلتے
دیکھنا کچھ اور بات ..... اس کے باوجود اس کے حلق سے شاید خوفزدہ چیخ نہ نکلتی لیکن یہ
ایک اضطراری اور غیر ارادی چیخ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا ہاتھ جو نئی شکل اختیار
کر رہا تھا وہ بہت ہی ڈراؤنی اور خوفناک تھی۔

چند لمحے بعد تبدیلی کا عمل رک گیا۔ خالد کا ہاتھ کہنے کو تو اب بھی ہاتھ ہی تھا لیکن
اب اسے کسی انسان کا ہاتھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اب وہ ایک بھیانک ہاتھ تھا۔ بالکل سیاہ،
خشک اور جھریوں بھری کھال ... سوکھی سوکھی مخروطی اور لمبے نوکیلے ناخنوں والی انگلیاں .....!
مجموعی طور پر وہ ہاتھ کے بجائے کسی بڑے سے پرندے کا سیاہ پنجہ معلوم ہوتا تھا۔

بات صرف یہیں تک محدود نہیں رہی۔ خالد نے گھبراہٹ زدہ انداز میں جلدی سے
ایک کپڑا تلاش کر کے اپنا ہاتھ پونچھ لیا۔ وہ گاڑھا سرخ سیال بالکل صاف ہو گیا۔ اس کے
باوجود اسے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے ان نوکیلے ناخنوں سے دھیرے دھیرے خون کی بوندیں
ٹپک رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ ..... یا پنجہ اب بالکل خشک تھا لیکن لہو کی یہ بوندیں گویا ان
ناخنوں کی نوکوں سے ہی پھوٹ رہی تھیں۔

اس نے بے اختیار نیچے فرش کی طرف دیکھا مگر وہ بوندیں فرش پر نہیں ٹپک رہی
تھیں۔ راستے ہی میں غائب ہو جاتی تھیں، ہوا میں تحلیل ہو جاتی تھیں۔ اس کے باوجود
یہ خوفناک منظر تھا اور اپنی دلکش وجیہہ شخصیت کے ساتھ اس قسم کے ہاتھ کی موجودگی
اس کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا بایاں ہاتھ دیکھا۔
وہ پہلے ہی کی طرح صاف ستھرا، گورا چٹا اور مضبوط تھا۔ وہ مکمل طور پر اسی قسم کا ہاتھ تھا
جیسا ایک صحت مند اور وجیہہ شخص کا ہونا چاہئے۔ تبدیلی صرف اسی ہاتھ میں آئی تھی جو
اس سرخ سیال میں لتھڑا تھا اور وہ بھی صرف جوڑ تک ..... اس سے اوپر کلائی اور باقی بازو
بالکل ٹھیک تھا۔ خالد نے اسے بے تابی سے ٹٹول کر دیکھ لیا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا تھا اور کیوں ہو گیا تھا۔ اس قسم کے ہاتھ کے ساتھ زندگی گزارنا تو بڑا صبر آزما کام تھا۔ ہاتھ بھی دایاں تھا۔ قدم قدم پر اس سے کوئی کام کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ لوگوں سے مصافحہ کرنا پڑتا تھا۔ یوں بھی ہاتھ ہر وقت لوگوں کی نظروں میں رہتے تھے۔ خالد تو عدالت میں بھی ہمیشہ ہاتھ لہرا لہرا کر متاثر کن دلائل دیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اسی ہاتھ کی انگلی وہ اسی طرح کسی گواہ کی طرف کر لیتا تھا جیسے پستول سے اس کا نشانہ لے رہا ہو۔ اس کی متاثر کن حرکات و سکنات میں اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کے ہاتھ کے اشارے ہی سب سے اہم کردار ادا کرتے تھے۔ کیا اب اسے یہ سب کچھ ترک کرنا پڑے گا؟ کیا اسے لوگوں سے مصافحہ بھی ترک کرنا پڑے گا؟ جب وہ کسی سے تعارف کرائے جانے پر ہاتھ بڑھا کر مصافحہ نہیں کرے گا تو وہ شخص کیا سوچے گا؟ کیا وہ گرمی سردی ہر موسم میں' ہر وقت اس ہاتھ پر دستانہ چڑھائے رکھا کرے گا ...... یا اسے پتلون کی جیب میں چھپا کر رکھا کرے گا؟ ہاتھ کی ساخت تو اب ایسی ہو گئی تھی کہ دستانے میں بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔

"خدایا! اس ہاتھ کے ساتھ زندگی کیونکر گزرے گی؟" اس نے دل ہی دل میں سوچا اور بے اختیار اس کے حلق سے رو دینے کی سی آواز نکل گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ اس کا ہاتھ عمر بھر کے لئے ایسا نہیں ہوا تھا۔ جس طرح چند لمحوں کے اندر اندر اس کا کوئی علاج بھی ممکن ہو سکتا تھا۔ یہ ضرور کوئی اسرار تھا ...... کوئی بھید تھا ...... اور نسرین یقیناً" اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکتی تھی۔

اس نے امید بھرے انداز میں گھوم کر نسرین کی طرف دیکھا تو اسے ایک جھٹکا لگا۔ اس نے دیکھا کہ نسرین کے تاثرات اس حد تک خونخوار ہو چکے تھے کہ ان کی وجہ سے اس کی شکل ہی بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کے دانت ایک بار پھر سفاکانہ سے انداز میں اس کے پتلے پتلے ہونٹوں کے عقب سے جھانکنے لگے تھے اور کچھ نوکیلے سے دکھائی دینے لگے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نسرین کی اندرونی کیفیات کے ساتھ اس کے چہرے کی ساخت میں بھی کچھ تبدیلیاں آتی رہتی تھیں۔

اس کی آنکھوں سے گویا شعلے نکل رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے تک وہ خالد پر اس قدر مہربان نظر آ رہی تھی اور اب گویا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کا خون پی جائے۔ ایک خواب یا واہمے کی طرح خالد کو کچھ کچھ یاد پڑتا تھا جیسے چند لمحے پہلے اس نے اس کا خون پیا بھی تھا ...... لیکن وہ اس پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ یقیناً" اس کے حواس نے اسے دھوکہ دیا تھا۔ ایسی باتیں تو صرف فلموں اور کہانیوں میں تفریح طبع کے لئے ہوتی تھیں۔ جدید اور حقیقی زندگی میں بھلا ایسا کہاں ہوتا تھا ...... لیکن پھر غیر ارادی سے انداز میں اس کا بایاں ہاتھ اپنے حلقوم پر چلا گیا۔



اس نے انگلیوں سے نرخرے اور اس کے آس پاس کی جگہ کو ٹٹول کر دیکھا۔ اسے اپنے حلقوم پر دو باریک باریک سے ابھاروں کا احساس ہوا جیسے عموماً" موٹی سوئی سے انجکشن لگانے پر بازو وغیرہ پر سوراخ ایک ننھے سے ابھار کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ خالد کو ان ابھاروں میں ہلکا سا درد بھی محسوس ہوا لیکن خالد نے خود کو یہی سمجھا کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ اس کی وجہ یقیناً" کچھ اور تھی۔ ممکن ہے کہیں باہر آتے جاتے وقت اس کے حلقوم پر مچھروں نے کاٹ لیا ہو۔

بہرحال اس نے چند لمحے پہلے واہمے کی صورت میں جو کچھ دیکھا تھا' جو کچھ محسوس کیا تھا اس سے تو اسے راحت ملی تھی۔ ایک عجیب سی آسودگی کا احساس ہوا تھا۔ بس وہ ذرا سی تھکن اور معمولی سی نقاہت محسوس کر رہا تھا لیکن اس میں بھی ایک خفیف سی لذت پنہاں تھی اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ تھوڑی سی نیند سے اس کی یہ کیفیت ٹھیک ہو جائے گی۔ اصل میں یہ صرف نیند اور آرام کی طلب ہی تھی۔

اس واہمے کے دوران میں اسے نسرین بہت اچھی' بہت مہربان اور بہت دلکش دکھائی دی تھی اور نسرین کا رویہ بھی کچھ ایسا ہی محبت بھرا تھا جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی چاکلیٹ میں سے ذرا سا حصہ لینے کے لئے اسے بہلا پھسلا رہا ہو۔ اس وقت اس نے نسرین کو کوئی بات کرتے نہیں سنا تھا لیکن اس مدہوشی کی سی کیفیت میں اسے تاثر کچھ ایسا ہی ملا تھا۔

وہی نسرین اس وقت شعلہ جوالا دکھائی دے رہی تھی۔ اگر وہ اب مجاوراً" نہیں بلکہ حقیقتاً" خالد کا خون پینے کی کوشش کرتی تو یقیناً" بے رحمی سے نرخرہ ادھیڑ کر کسی درندے کی طرح پیتی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی آگ تھی جو شاید اپنے گرد و پیش کی ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دینے کے لئے بے تاب تھی۔

"احمق آدمی ......!" وہ پھنکارنے کے سے انداز میں بولی۔ "تم نے ایک لاکھ سال عمر پانے والے مقدس گدھ کا خون ضائع کر دیا ...... میری مصوری میں جو کمال پوشیدہ تھا تم نے اسے مجھ سے چھین لیا ...... میرے فن کو برباد کر دیا۔ کاش میں تمہیں اپنے سٹوڈیو میں لائی ہی نہ ہوتی ......! تم اس قابل ہی نہیں تھے۔"

اس کی آنکھیں بدستور دہک رہی تھیں اور اس وقت وہ کمزور و مضمحل بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دبلی پتلی مگر متناسب اور دلکش خدوخال کی مالک عورت اس وقت غصے میں بھنچی ہوئی اپنی مٹھیوں سے بڑے بڑے پتھروں کو بھی توڑ سکتی تھی۔ خالد اپنی مصیبت کو بھول کر اس کے غیظ و غضب سے سہم کر بولا۔ "دیکھئے ...... اگر میری غلطی سے آپ کا پینٹنگ کا کوئی قیمتی رنگ ضائع ہو گیا ہے تو اس کے لئے میں بے حد شرمندہ ہوں۔ جس طرح بھی اس نقصان کا ازالہ ہو سکتا ہے میں اس کے لئے تیار ہوں۔ یہ پینٹ جہاں کہیں بھی ملتا ہو میں لا کر دینے کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں اور اگر

آپ چاہیں تو میں اس کی قیمت ......"

"خاموش رہو ...... بے وقوف' گدھے ......! ایک لاکھ سالہ مقدس گدھ کے خون کی توہین مت کرو ......" نسرین گھٹی گھٹی مگر غضبناک آواز میں بولی۔ پھر اس کی آواز میں بے پناہ تاسف اور پچھتاوا سمٹ آیا۔ "مجھ سے کیسی بھیانک غلطی ہوئی۔ میں آج اس پیالے کو سٹول پر ہی رکھا چھوڑ گئی ...... بھول گئی۔ آج میں اس کی حفاظت کی طرف سے غافل ہو گئی اور آج ہی اس سے محروم ہو گئی ....."

اس کا انداز کسی حد تک خود کلامی کا سا ہو گیا تھا اور لہجے میں غیظ و غضب کچھ کم ہو گیا تھا لیکن اس کے دل میں گویا پھر غصے کا ابال سا اٹھا اور وہ ایک بار پھر مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ "تم ...... احمق ...... خبیث ......! تم اسے پینٹ سمجھ رہے ہو۔ اس کی تو ایک بوند بھی ہزاروں گیلن پینٹ سے کہیں زیادہ قیمتی تھی۔ استعمال کرنے سے تو یہ کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں برسوں سے اسے استعمال کر رہی تھی۔ شرط صرف یہ تھی کہ اس کا پیالہ الٹنا نہیں چاہئے تھا ...... لیکن تم نے پیالہ الٹ دیا ...... بدبخت ...... جاہل ...!"

خالد نے جب نسرین کو دیکھا تھا' اس کے بارے میں یہی رائے قائم کی تھی کہ وہ ایک کم آمیز' کم گو' اپنی ذات میں محدود رہنے والی مگر مہذب اور شائستہ عورت تھی لیکن اس وقت وہ اس کے انداز گفتگو پر حیران رہ گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک بھی وہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ نسرین اس سے اس انداز میں گفتگو کر سکتی تھی۔ اب بھی شاید وہ خود پر کچھ ضبط کر رہی تھی ورنہ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کا خالد کو ان سے زیادہ برے القابات سے نوازنے کو جی چاہ رہا تھا۔

اچانک ہی خالد کو احساس ہوا کہ اس کی اب تک گفتگو واقعی احمقانہ تھی۔ وہ اس سیال کو پینٹ قرار دے رہا تھا اور اس نقصان کی تلافی کرنے کی باتیں کر رہا تھا۔ اگر وہ عام پینٹ ہوتا تو اس میں لتھڑنے کے بعد اس کے ہاتھ کی یہ حالت بھلا کیسے ہو سکتی تھی؟ لیکن یہ ایک لاکھ سالہ گدھ کے خون کی بات ..... اور پھر اس گدھ کو مقدس قرار دینے کی بات .....؟ یہ نسرین کیا اول فول بک رہی تھی؟

پھر اس نے ذرا ٹھنڈے دل سے سوچنے کی کوشش کی تو اسے احساس ہوا کہ شاید نسرین اپنے غیظ و غضب کی روانی میں اصلی بات کر گئی تھی ورنہ یہ شاید اس کی زندگی کا کوئی قیمتی راز تھا۔ وہ پینٹ نہیں' یقیناً" کسی قسم کا خون ہی تھا اور نسرین اپنی پینٹنگز میں خون کی عکاسی کے لئے وہی استعمال کرتی تھی۔ اس کے پاس وہی ایک پیالہ تھا لیکن وہ کبھی خالی نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے اس کی پینٹنگز میں خون کا تاثر اصل سے بھی کچھ بڑھ کر ملتا تھا۔ وہ منجمد یا خشک خون دکھائی نہیں دیتا تھا بلکہ واقعی تازہ' سرخ اور ابلتا ہوا خون دکھائی دیتا تھا۔



لیکن کیا اس خون نے کبھی نسرین کو کوئی گزند نہیں پہنچائی تھی؟ یہ تو ممکن تھا کہ وہ خون کبھی اس کے ہاتھ یا جسم کے کسی اور حصے پر نہ گرا ہو لیکن اگر انسان اتنے عرصے تک کسی پینٹ کو بھی استعمال کرے تو وہ بھی اس کے ہاتھ وغیرہ پر کہیں نہ کہیں لگ ہی جاتا ہے۔ کیا اس سے نسرین کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا؟ لگتا تو یہی تھا کہ وہ اس کے اس قسم کے اثرات سے محفوظ تھی۔

"تو پھر میرے ہاتھ کا یہ حشر کیوں ہو گیا؟" خالد نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔ اس کا ایک ہی جواب ممکن نظر آتا تھا کہ شاید اس میں کچھ ایسی خصوصیات موجود نہیں تھیں جو نسرین میں موجود تھیں۔ اسے اپنے سیاہ' مکروہ' پنجہ نما ہاتھ کے ناخنوں سے مسلسل خون کی بوندیں ٹپکتی دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ اچانک اس ہاتھ کو نسرین کے چہرے کے سامنے کرتے ہوئے گلوگیر سی آواز میں بولا۔ "بڑے افسوس کی بات ہے نسرین صاحبہ! آپ اس لاکھ دو لاکھ سالہ منحوس گدھ کے خون کے غم میں آپے سے باہر ہو رہی ہیں اور نہ جانے کس خیال کے تحت اس بے ہودہ جانور کو مقدس قرار دے رہی ہیں ...... لیکن آپ کو میرے ہاتھ کی اس حالت کی ذرا بھی فکر نہیں ...... آپ دیکھ رہی ہیں کہ ایک صحت مند اور نارمل آدمی کے ہاتھ کی کیا شکل ہو گئی ہے؟ اگر خدانخواستہ یہ حالت مستقل ہوئی تو میں زندگی کیسے گزاروں گا؟ میں تو معاشرے میں تماشا بن کر رہ جاؤں گا....."

اپنے آپ پر ضبط کرتے کرتے بھی اس کے حلق سے سسکی سی نکل گئی۔ "خدا کی پناہ ......!" معلوم نہیں کس شیطانی چکر میں پھنس گیا ہوں ......!"

نسرین گو کہ پہلے ہی اس کا ہاتھ دیکھ چکی تھی لیکن اس نے گویا اس کی ساخت میں تبدیلی کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی البتہ اب خالد نے ہاتھ عین اس کی آنکھوں کے سامنے کیا تو اس نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ اس کے تاثرات میں کچھ تبدیلی آ گئی۔ چہرے سے کچھ نرمی کا اظہار ہونے لگا۔

وہ جب بولی تو اس کے لہجے سے غیظ و غضب کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ "ایسا نہ کہو ...... تم شیطانی چکر میں نہیں پھنسے بلکہ بہت طاقتور لوگوں کے حلقے میں شامل ہو گئے ہو۔ دھیرے دھیرے تم خود بھی بہت طاقتور ہو جاؤ گے۔ لوگ تو ایسی طاقت حاصل کرنے کے لئے ترستے ہیں۔ نہ جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں مگر وہ اس طاقت کا ایک معمولی سا حصہ بھی حاصل نہیں کر پاتے۔"

"کون طاقتور لوگ ......؟ کیسی طاقت ......؟" خالد وحشت زدہ سے لہجے میں بولا۔

نسرین عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ خالد کو اس کے دلکش نین نقش کے باوجود اس وقت اس کی مسکراہٹ نہایت شیطانی سی لگی۔ وہ اس وقت سرتاپا خباثت دکھائی دے رہی

تھی۔ وہ خالد کی طرف جھکتے ہوئے ذرا دھیمی اور سرسراتی سی آواز میں بولی۔ "اگر تم نے صبر و تحمل سے کام لیا تو رفتہ رفتہ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اسی دنیا میں ایک اور چھوٹی سی ..... مگر بہت طاقتور ..... الگ تھلگ سی دنیا آباد ہے ..... جو لوگوں کی نظروں کے سامنے موجود ہے مگر انہیں اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہو پاتا۔ انہیں پتہ نہیں چلتا کہ ی ایک الگ دنیا ہے۔ وہ اسے اپنی ہی دنیا کا حصہ سمجھتے ہیں مگر یہ اس دنیا کا حصہ نہیں ہے البتہ ہم نے جان بوجھ کر اسے اس دنیا میں گڈمڈ کر رکھا ہے تاکہ لوگ ہمارے وجود کے بارے میں زیادہ خبردار نہ ہو سکیں ..... کہیں وہ ہمارے خلاف منظم نہ ہو جائیں ..... ہمارے خلاف کسی کارروائی پر نہ تل جائیں ..... رفتہ رفتہ تم اسی چھوٹی مگر طاقتور دنیا کا ایک حصہ بن جاؤ گے اور اپنے آپ پر ناز کرو گے۔"

"میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آ رہیں ..... اور فی الحال میں انہیں سمجھنا بھ نہیں چاہتا ....." خالد الجھن سے بولا۔ "اس وقت تو مجھے صرف اس ہاتھ کی فکر ہے میرا ہاتھ کیسا ہو گیا ہے۔ مجھے خود اس کو دیکھ کر گھن آ رہی ہے۔ لوگ دیکھیں گے تو کیا محسو کریں گے۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ اسے ٹھیک کرنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی ہے یا نہیں؟"

"کتنے بے وقوف ہو تم ....." نسرین گویا اس پر ترس کھاتے ہوئے بولی۔ "تم ا ہاتھ سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں ..... اگر مجھے اس کو صحیح حالت پر لانے کی کوئی تدبیر معلوم نہ ہو سکی ..... آ آپ نے بھی اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہ کی ..... تو میں ہاتھ کو کٹوا دوں گا۔ اپنے ج سے جدا کر دوں گا۔ آپریشن کروا لوں گا ..... بلکہ نہیں ..... آپریشن کرانے کے لئے بھ مجھے نہ جانے کتنے لوگوں کے سامنے تماشا بننا پڑے گا۔ میں اسے خود ہی کاٹ کر پھینک دو گا ..... یا میں اپنا ہاتھ کسی ایسی چلتی ہوئی مشین میں دے لوں گا جس میں یہ مکمل طور کچلا جائے گا۔" خالد فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"تم لاعلمی کی وجہ سے ایسی بیوقوفانہ اور ناشکرے پن کی باتیں کر رہے ہو ..... نسرین نے ترحم آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ اس ہاتھ کی صورت تمہیں کیسی طاقت حاصل ہو چکی ہے تو تم اس سے محروم ہونے کا تصور بھی نہیں کر گے بلکہ تمہیں یہ سوچ کر بھی خوف محسوس ہوا کرے گا کہ کہیں اس پر کوئی خراش نہ جائے۔ تم اپنے پورے جسم سے زیادہ اپنی جان سے زیادہ اس ہاتھ کی حفاظت کرو گے۔"

"کیسی طاقت؟" خالد تجسس کے تحت پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

نسرین نے ادھر ادھر دیکھا گویا کچھ تلاش کر رہی ہو پھر اس کی نظر لکڑی کی ایک تپائی پر جا ٹکی جس پر کچھ پینٹنگز دیوار کے سہارے کھڑی تھیں۔ اس نے وہ پینٹنگز ا کر نیچے رکھ دیں۔ تپائی ٹھوس اور مضبوط لکڑی کی معلوم ہوتی تھی۔ اس پر سیاہ پالش کی



تھی۔

"اس پر اپنے اسی بدصورت ہاتھ سے اس طرح چاپ مارو جس طرح جوڈو کراٹے جاننے والے مارتے ہیں۔" نسرین نے تپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے سامنے اپنی بات کا ثبوت پیش کرنے کے لئے میں اس تپائی کی قربانی دے رہی ہوں حالانکہ یہ کافی مہنگی چیز ہے۔"

خالد کو نہیں معلوم تھا کہ نسرین جو کچھ کہہ رہی تھی اس پر عمل درآمد کا نتیجہ کیا ہو گا لیکن محض تجسس کے تحت اس نے تپائی پر اپنے پنجہ نما ہاتھ سے وار کر دیا۔ وہ نہ تو جوڈو کراٹے جانتا تھا اور نہ اس نے اس وار میں اپنی پوری طاقت صرف کی تھی۔ وہ اپنے آپ کو کچھ ایسا زیادہ طاقتور آدمی سمجھتا بھی نہیں تھا۔ صرف طالب علمی کے زمانے میں اسے تھوڑا بہت ورزش کا شوق رہا تھا جس طرح اکثر لوگوں کو ہوتا ہے اور نوجوانی کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ عملی زندگی میں آنے کے بعد اس نے کبھی کوئی سخت یا پرمشقت کام نہیں کیا تھا۔ وہ کمزور یا گیا گزرا تو نہیں تھا لیکن کوئی باڈی بلڈر قسم کی چیز بھی بہرحال نہیں تھا اور اس وقت تو ویسے ہی اس کی حالت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ وہ تپائی دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ اسے گویا بہت بڑے جناتی قسم کے کلہاڑے سے بیچ میں سے کاٹ دیا گیا تھا۔

نسرین نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اس نے تپائی کے آدھے حصے کو اٹھا کر دوسرے آدھے حصے پر رکھ دیا اور بولی۔ "اب اس پر ایک وار اور کر دو۔" وہ خود بھی گویا اس عمل سے محظوظ ہونے لگی تھی۔

خالد نے ایک وار اور کر ڈالا۔ اب وہ واقعی خود کو کچھ طاقتور اور پراعتماد محسوس کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ تپائی کے وہ دو ٹکڑے چار ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئے۔ اس نے حیرت سے اپنے اس مکروہ ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اس پر خراش تک نہیں آئی تھی۔ نہ جانے یوں اسے دیکھتے ہوئے خالد کو یقین سا محسوس ہوا کہ اس ہاتھ کو کوئی گزند پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔

نسرین نے گویا اس کے خیالات کو پڑھتے ہوئے اس کی تصدیق کر دی۔ "تم اسے کاٹنے یا مشین میں کچل دینے کی بات کر رہے تھے۔ تم ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ یہ ہاتھ اب تمہارے جسم سے جدا نہیں ہو گا۔ تم اسے کاٹ بھی دو تب بھی یہ خود بخود تمہارے بازو سے جڑ جائے گا۔ تم اسے مشین میں ڈالو گے تب بھی یہ کچلا نہیں جائے گا۔ ممکن ہے مشین ٹوٹ جائے۔ یہ اب ہمیشہ کے لئے تمہارا ساتھی بن چکا ہے اور یہ ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ ابھی تمہیں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہے۔" اس نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ ایک کونے میں ماربل کا تقریباً ایک فٹ اونچا آرائشی مجسمہ سٹینڈ پر رکھا تھا۔

نسرین اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "تم اس مجسمے کو اس ہاتھ میں لے کر ذرا زور سے دباؤ۔"

خالد نے اس مجسمے کو مکروہ ہاتھ میں اٹھانے سے پہلے دوسرے ہاتھ میں اچھی طرح تول کر' ٹٹول کر اور دبا کر دیکھا۔ وہ واقعی ٹھوس ماربل کا مجسمہ تھا لیکن اس نے اسے اپنے مکروہ پنجہ نما ہاتھ میں پکڑ کر ذرا زور سے بھینچا تو وہ نہایت بھربھری مٹی کے مجسمے کی طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر بکھر گیا۔ خالد نے خوفزدہ سی نظروں سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا لیکن نسرین گویا اس کے خوف سے بے نیاز تھی۔

اس نے ایک اور چیز منتخب کر لی تھی۔ وہ دروازے کی ناب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "میں اس کی بھی قربانی دے دیتی ہوں۔ یہ نایاب اور خالص سٹیل کی ہے۔ تم اسے مٹھی میں دبا کر ذرا زور سے بھینچو۔"

خالد نے اس کی اس ہدایت پر بھی عمل کیا۔ ٹھوس اور اعلیٰ قسم کی سٹیل کی وہ ناب اس کی مٹھی میں یوں پچک کر اپنی ساخت کھو بیٹھی جیسے وہ گارے کی بنی ہوئی تھی۔ خالد کو اپنے تمام جسم سے پسینہ پھوٹتا محسوس ہوا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اسے کوئی مشقت کرنا پڑی تھی۔ ان کاموں میں تو اس کی بہت ہی معمولی سی طاقت صرف ہوئی تھی۔ اس کے جسم سے پسینہ تو خوف کے باعث پھوٹ رہا تھا۔ وہ ہاتھ اس کا اپنا تھا لیکن وہ اس سے خوف اور نفرت محسوس کر رہا تھا۔ لوگ اپنے کسی جسمانی عضو کی غیر معمولی طاقت کے مظاہرے پر خوشی اور فخر سے پھولے نہیں سماتے تھے لیکن اس قسم کے ہر مظاہرے پر اس کا دل خوف سے بیٹھتا سا جا رہا تھا۔ اسے اس طاقت پر کوئی خوشی نہیں تھی۔ شاید اس لئے کہ اسے اس کی کوئی طلب نہیں تھی۔ کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ طاقت گو کہ اس کی اپنی تھی لیکن اسے اس سے بھی خوف آ رہا تھا۔

"یوں سمجھو کہ اس وقت تم دنیا کے سب سے طاقتور آدمی ہو۔" نسرین نے گویا اسے فخر کا احساس دلانے کے لئے کہا۔ "دنیا بھر کے وہ جو بڑے بڑے طاقتور اور جناتی قسم کی شخصیتوں کے مالک ریسلر جو رنگ میں اپنے قد کاٹھ اور شاندار جسم پر اکڑتے ہیں ---- اپنے مسلز پھلا پھلا کر دکھاتے ہیں ---- اپنے پٹھوں کی خوبصورتی اور مضبوطی پر اتراتے ہیں ---- اگر تم ان میں سے کسی کی بھی گردن پکڑ کر ذرا مروڑ دو تو دوسرے ہی لمحے وہ مرا پڑا ہو گا۔ اگر اس ہاتھ سے تم ہاتھی کی بھی کمر پر ایک چانپ رسید کر دو تو اس کی کمر ٹوٹ جائے گی اور وہ وہیں تڑپ کر مر جائے گا۔ اگر کوئی عمارت ستونوں پر کھڑی ہو تو تم ایک وار میں اس کے ستون توڑ سکتے ہو۔ وہ عمارت نیچے آ رہے گی ---- اور تمہیں کیا چاہئے؟ کوئی ایسی طاقت حاصل کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"لیکن مجھے ایسی طاقت نہیں چاہئے۔ میں نے کب تم سے ایسی کسی طاقت



فرمائش کی تھی؟" خالد رو دینے والی آواز میں بولا۔

"فرمائش تو واقعی نہیں کی تھی ----" نسرین نے ناپسندیدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں کب کہہ رہی ہوں کہ میں نے تمہیں تمہاری فرمائش کے تحت یہ طاقت دی ہے ---- میں تو کسی کو کوئی طاقت دینے کی اہلیت بھی نہیں رکھتی ---- یہ تو ایک حادثہ تھا ---- حادثاتی طور پر تمہیں یہ طاقت مل گئی ہے۔ نقصان میرا ہوا ہے۔ میں ایک انمول اثاثے سے محروم ہو گئی ہوں۔ میں اس پر صبر کرنے کی کوشش کروں گی ---- لیکن کم از کم تم تو اتنی آہ و فغاں مت کرو۔ تمہارا تو کچھ نقصان نہیں ہوا۔ تمہیں تو بہت بڑا فائدہ پہنچا ہے۔"

"اسے تم فائدہ کہتی ہو؟" خالد نے ایک بار پھر مکروہ صورت ہاتھ اس کے سامنے نچایا۔

"ہر فائدہ مند چیز کی کچھ نہ کچھ قیمت تو ادا کرنی ہی پڑتی ہے۔" نسرین اطمینان سے بولی۔ "ابھی شاید تمہارا ذہن اس تبدیلی سے مانوس نہیں ہو پا رہا ---- اس لئے تمہیں اس انمول چیز کی قدر محسوس نہیں ہو رہی ورنہ طاقت کا تو اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔ میں خود اس نشے کی عادی ہو چکی ہوں۔ میں جس دنیا کی باسی ہوں' اس دنیا میں رہنا نہیں چاہتی ---- اس سے فرار چاہتی ہوں ---- نکل بھاگنا چاہتی ہوں۔ جو کچھ مجھے دیا گیا ہے وہ میں واپس کر دینا چاہتی ہوں ---- جن خصوصیات سے مجھے نواز دیا گیا ہے میں ان سے محروم ہو جانا چاہتی ہوں۔ جب مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو میں تم جیسے کسی شخص کو ---- جو یہاں نووارد ہوتا ہے ---- راستے میں روک کر مشورہ دیتی ہوں جو یقیناً" تمہیں برا لگا ہو گا لیکن جو تمہاری بھلائی کے لئے تھا ----"

"وہی ---- کہ میں اپنے گھر میں کسی ننھے مہمان کی آمد کو روکنے کی کوشش کروں؟" خالد نے تصدیق چاہی۔

"ہاں ----" نسرین نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس وقت میں یہاں سے ---- اس جگہ سے ---- اس ماحول سے ---- اس چھوٹی سی دنیا سے نفرت میں مبتلا ہوتی ہوں جس نے مجھے انسان نہیں رہنے دیا ---- نہ جانے مجھے کیا بنا دیا ہے ---- لیکن یہ کیفیت گزر جاتی ہے تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں یہاں رہ کر شاید زیادہ فائدے میں ہوں۔ مجھے کچھ مافوق الفطرت طاقت حاصل ہے ---- اور طاقت کسی بھی قسم کی ہو' بہرحال بڑی فائدہ مند چیز ہے۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ اس میں ایک نشہ ہوتا ہے ---- منہ کو لگ جائے تو چھوٹتا نہیں ہے۔ تمہارے بھی منہ کو لگ جائے گا۔ پھر تم یہاں سے نکلنا بھی چاہو گے تو نہیں نکل سکو گے۔ خواہشوں کے غلام بن جاؤ گے۔"

ایک طویل سانس لے کر اس نے ایک جھرجھری سی لی اور سلسلہ کلام جوڑا۔

"بہر حال ..... انسان کو کسی ایک طرف کا ہو کر رہنا چاہئے۔ اگر وہ یہاں رہے تو پھر اسے خوش رہنا چاہئے کہ وہ ایک شاندار دنیا کا باسی ہے ..... یا پھر اسے یہاں سے نکل جانا چاہئے ..... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہاں سے نکلنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کی سزا موت سے بدتر ہوتی ہے ....."

"موت سے بدتر بھلا کون سی سزا ہو سکتی ہے؟" خالد بول اٹھا۔

"ہوتی ہیں ..... بہت سی سزائیں موت سے بدتر ہوتی ہیں۔" نسرین کا لہجہ ایک بار پھر خود کلامی میں ڈھل گیا۔ "جب آپ کا رواں رواں ایک ناقابل بیان اذیت میں گرفتار رہتا ہے ..... ہر روز آپ کو ایک نئی اور مسلسل اذیت سے واسطہ پڑتا ہے ..... کوئی جان بھی نہیں پاتا کہ آپ پر کیا گزر رہی ہے۔ دنیا بھر کی ذلتیں آپ کا مقدر ہوتی ہیں ..... آپ موت کی دعا کرتے ہیں لیکن آپ کو موت نہیں آتی ..... آپ خود کو ہلاک کر لیتے ہیں لیکن پتہ چلتا ہے کہ آپ ہلاک نہیں ہوئے۔ آپ بار بار خود کو ہلاک کرتے ہیں لیکن آپ ہلاک نہیں ہوتے' ہر بار زندہ ہو جاتے ہیں۔ اپنی سزائے مسلسل کو بھگتنے کے لئے ....."

اگر خالد اس وقت اپنی پریشانی میں مبتلا نہ ہوتا تو شاید ہنس دیتا۔ اس عورت کی کھوپڑی یقیناً" اپنی جگہ سے کھسکی ہوئی تھی۔ اس کی بیشتر باتیں بے سروپا معلوم ہوتی تھیں لیکن ایک بات بہرحال تھی کہ وہ اپنی ذات اور کسی الگ تھلگ پراسرار دنیا کے بارے میں جو باتیں کر رہی تھی ان میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور تھی۔ بہت سی پراسرار باتیں خود خالد کے سامنے آ چکی تھیں' کچھ واقعات اس کے ساتھ پیش آ رہے تھے جن کے بارے میں وہ الجھن میں تھا' جن کی کوئی وضاحت' کوئی توجیہہ اس کے پاس نہیں تھی اور نہ ہی ممکن نظر آتی تھی لیکن اس وقت وہ اتنا پریشان تھا کہ ان میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے سامنے ا فوری نوعیت کا مسئلہ تھا۔ وہ اپنے ہاتھ کو درست حالت میں دیکھنا چاہتا تھا۔

نسرین گویا اپنی دھن میں بات جاری رکھے ہوئے تھی۔ "لیکن میں وہ بدنصیب ہوں جو یکسو نہیں ہو پا رہی ..... بیچ میں پھنس گئی ہوں۔ اسی لئے زیادہ اذیت میں ہوں۔ بند۔ کو یا تو رحمان کی طرف ہو جانا چاہئے یا شیطان کی طرف ..... ہم میں سے زیادہ ترتیح مل معلق ہیں۔ آدھے شیطان کی طرف ..... آدھے رحمان کی طرف ..... کبھی جسم رحمان کے سامنے جھکا ہوا ہے تو روح شیطان کے حضور میں کھڑی ہے ..... کبھی روح رحمان کی طرف جانے کے لئے پھڑک رہی ہے تو جسم شیطان کی پیروی کر رہا ہے ..... میں ..... اور مجھ جیسے بہت سے افراد تو خیر شیطان ہی کے پیروکار ہیں لیکن میری ذات کا کوئی گوشہ ادھر سے ہم باغی ہو گیا ہے۔ اس لئے میں بڑی پریشانی میں ہوں ....."

"تمہاری پریشانی اپنی جگہ ہے ..... لیکن میری پریشانی کا بھی تو کچھ کرو۔" خا مضطربانہ لہجے میں بولا۔ "میں اس ہاتھ کو اصلی حالت پر دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے کراہ



سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔

"تم بہت نرگسیت پسند معلوم ہوتے ہو۔ اپنی وجاہت میں کوئی نقصان پڑتے نہیں دیکھ سکتے ....." نسرین اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ اس کی آنکھیں خمار زدہ سی ہو رہی تھیں۔

"یہی سمجھ لو۔" خالد جلدی سے بولا۔

"تمہیں اس طاقت سے کوئی دلچسپی نہیں جو اس ہاتھ کی صورت میں تمہیں حاصل ہو چکی ہے اور ابھی جس کے کچھ معمولی سے مظاہرے تم نے خود ہی کئے اور دیکھے ہیں؟" نسرین نے دریافت کیا۔

"نہیں ..... مجھے اس طاقت سے کوئی دلچسپی نہیں۔" خالد نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے کسی کی گردن نہیں توڑنی ہے ..... کوئی عمارت نہیں گرانی ہے اور نہ ہی چیزوں کے ٹکڑے کرنے ہیں۔"

"تم واقعی عجیب آدمی ہو۔ قدر ناشناس ہو۔ ابھی تمہیں ایسی چیزوں کی قدر نہیں ہے۔ شاید کوئی وقت آئے جب تم ایسی طاقتوں کی تلاش میں ہلکان ہوتے پھرو اور ان کے لئے ہر قیمت ادا کرنے پر تیار ہو جاؤ۔" نسرین ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"اگر وہ وقت آیا تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال میں اس ہاتھ کو اپنے وجود کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر اسے درست کرنے کا کوئی طریقہ ہے تو پلیز ..... مجھے ضرور بتا دو۔" خالد نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"یہ لو جو عجیب و غریب خصوصیات کا حامل تھا' مجھے جمشید صاحب نے "تحفتاً" دیا تھا ....." نسرین بولی۔

"جمشید صاحب نے .....؟" خالد نے حیرت سے اس کی بات کاٹتے ہوئے تصدیق چاہی۔ اس کے چہرے پر بے یقینی تھی۔

"ہاں ..... جمشید صاحب نے ....." نسرین ہلکی سی ناگواری سے بولی۔ "تمہارے چہرے پر کچھ ایسی بے یقینی پھیلی ہوئی ہے جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ شاید تمہیں ابھی تک جمشید صاحب کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔"

خالد ایک بار پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "مجھے معلوم ہے وہ بہت بڑے وکیل ہیں ..... بہت دولت مند ہیں ..... بہت بارسوخ ہیں ....."

نسرین نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ خالد کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس کا قہقہہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کسی ویران کھنڈر میں کسی بدروح کی اذیت زدہ سی پکار ابھری ہو تاہم خالد کے خیال میں یہی غنیمت تھا کہ نسرین کا غیظ و غضب دور ہو چکا تھا۔ وہ اسے اس کے مسئلے کا کوئی حل بتانے پر آمادہ دکھائی دیتی تھی۔

"ان کی وکالت ..... دولت اور اثر و رسوخ کی بات چھوڑو۔ یہ تو معمولی چیزیں ہیں۔" نسرین بولی۔ "میں کسی اور طرح کی طاقت کی بات کر رہی ہوں ..... لیکن اگر تم مجھ سے ان باتوں کی وضاحت چاہو گے تو وہ میں نہیں کر سکوں گی۔ جمشید صاحب کافی دنوں سے ویسے ہی مجھ سے کچھ خوش نہیں ہیں۔ میری غیر ضروری باتیں کرنے کی عادت اور نامکمل اطاعت گزاری اکثر ان کی برہمی کا باعث بنتی رہتی ہے۔ کئی بار وہ مجھے معاف کر چکے ہیں لیکن آخر کب تک کریں گے؟ مجھے اپنے انجام کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں اپنے آپ کو باز نہیں رکھ پاتی ..... مکمل طور پر اپنے آپ کو ان کی مرضی کے مطابق ڈھال نہیں پاتی۔ میری شخصیت کے کسی گوشے میں کوئی چیز گھس آئی ہے جو مجھے بغاوت پر مجبور کرتی رہتی ہے۔"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں مسز پاشا .....! اور آپ کوئی وضاحت بھی نہیں کر رہیں ..... بس مبہم سے انداز میں باتیں کئے چلی جا رہی ہیں۔" خالد نے اپنے لہجے میں بیزاری کے عنصر کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

"آ جائیں گی ..... سب باتیں سمجھ میں آ جائیں گی ....." نسرین نے مربیانہ انداز میں سر ہلایا۔ "اب تم اس قبیلے میں شامل ہو ہی گئے ہو تو رفتہ رفتہ سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ویسے تو آج کل جمشید صاحب مجھ سے ناخوش ہیں' مجھے کافی حد تک باغیوں میں شمار کرتے ہیں' ان کا خیال ہے کہ میں ان کی روایات اور ہدایات کی خلاف ورزی کرتی رہتی ہوں لیکن تمہیں باضابطہ طور پر اس قبیلے میں شامل کرنے کی رسم میں نے ہی انجام دی ہے۔ ہو سکتا ہے جمشید صاحب کو میری یہ حرکت بھی پسند نہ آئے۔ شاید ان کے خیال میں ابھی اس کام کا وقت نہ آیا ہو اور میں نے یہ کام کر کے جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہو ..... لیکن میں کیا کرتی ..... میں رہ نہیں سکی ..... مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ بہت دنوں سے میری روح پیاسی تھی ....."

خالد کا ہاتھ بے اختیار اپنے حلقوم پر چلا گیا۔ دو باریک سے ابھاروں کی موجودگی اور ان میں درد کا احساس اب بھی موجود تھا لیکن خالد کو وہ منظر ایک دھندلے اور بھولے بسرے سے خواب کی طرح یاد تھا کہ نسرین اس کی مڑی ہوئی گردن پر جھکی تھی اور دو باریک سوئیاں سی اس کے نرخرے میں اترتی چلی گئی تھیں۔ لیکن وہ اب بھی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ وہ اس کا واہمہ تھا یا حقیقت؟ ایک مختصر خواب تھا یا سچ مچ ایسا ہوا تھا۔

نسرین خوابناک سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "مبارک ہو ..... اب تم بھی اس قبیلے کے ایک فرد بن گئے ہو۔ باضابطہ طور پر اس میں شامل ہو گئے ہو۔ اس زنجیر کی ایک کڑی بن گئے ہو۔ یہ فریضہ جمشید صاحب کو انجام دینا تھا لیکن میں نے انجام دے ڈالا ہے۔"

"کیا کچھ دیر پہلے آپ نے میرا خون پیا تھا؟" خالد نے نہایت سادگی سے یکدم



ارادی سے انداز میں پوچھ لیا۔

نسرین ایک بار پھر ہنس دی۔ اس کی ہنسی خالد کے اعصاب میں ایک تکلیف دہ سی سنسنی دوڑاتی تھی۔ یہ احساس اسے آج پہلی بار ہی ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی اسے کئی بار نسرین سے بات کرنے اور اس کی ہنسی سننے کا اتفاق ہوا لیکن آج پہلی بار یہ سب کچھ محسوس ہو رہا تھا آج تو نسرین ہی گویا کوئی اور نسرین لگ رہی تھی۔

"ایسی بچگانہ باتیں نہیں کیا کرتے خالد صاحب!" وہ خوشدلی سے بولی۔ "آج کل کے زمانے میں محاورتاً" انسان انسان کا خون پی رہا ہے لیکن جس طرح آپ کہہ رہے ہیں اس طرح بھلا کون کسی کا خون پیتا ہے؟ میں ایک معزز اور باکمال عورت ہوں ..... کوئی خون آشام چمگادڑ نہیں ....."

خالد اپنا بدہیئت ہاتھ ایک بار پھر اونچا کرتے ہوئے بولا۔ "اگر میرے ہاتھ پر لگنے والے گاڑھے عنابی سیال کو آپ ایک لاکھ سالہ گدھ کا کبھی ختم نہ ہونے والا خون کہہ سکتی ہیں اور اس کی وجہ سے چند لمحوں کے اندر اندر میرا نارمل اور صحت مند ہاتھ ایسا ہو سکتا ہے ..... صرف یہی نہیں بلکہ اس میں ایک ناقابل یقین طاقت بھی آ سکتی ہے ..... یہ پتھروں کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہے ..... ٹھوس لکڑی کو چیر سکتا ہے ..... ٹھوس سٹیل کو پچکا سکتا ہے ..... تو ..... تو پھر آپ جیسی معزز اور باکمال عورت میرا خون بھی پی سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بھی آپ کے عظیم کمالات میں سے ایک کمال ہو۔"

اس بار نسرین گویا اس کی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنسی۔ "لگتا ہے اب تمہارے ہواس ٹھکانے آ رہے ہیں اور وکیلوں والی حساسیت بھی بیدار ہو رہی ہیں۔ باقی باتیں تو ٹھیک ہیں لیکن یہ جو آپ خون پینے والی بات کر رہے ہیں یہ آپ کا واہمہ ہو گی ..... خواب ہو گی۔"

خالد نے اس سے بحث میں الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا ذہن پہلے ہی الجھا ہوا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ کی پڑی ہوئی تھی۔ وہ نرم لہجے میں بولا۔ "آپ میرے ہاتھ کے اصلی حالت میں آنے کے بارے میں کچھ بتانے لگی تھیں۔ بات کہیں سے کہیں چلی گئی۔"

"انسان خود کٹی پتنگ کی طرح کہیں سے کہیں چلا جاتا ہے۔ اس کی زندگی کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے۔" نسرین فلسفیانہ لہجے میں بولی۔ "بہرحال میں بتا رہی تھی گدھ کا وہ خون مجھے جمشید صاحب نے بہت پہلے تحفے میں دیا تھا۔ وہی اس کے اچھے اور برے دونوں قسم کے اثرات دور کرنے یا انہیں گھٹانے بڑھانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ تم ان کے پاس چلے جاؤ۔ وہ ایک لاکھ سالہ گدھ کا خون ضائع ہونے کا سن کر تم پر اور مجھ پر شاید بہت خفا ہوں لیکن تم ان کی منت سماجت کرنا' اپنی غلطی تسلیم کر لینا۔ امید ہے وہ اس سلسلے میں ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔ آج کل وہ تم پر ہی سب سے زیادہ مہربان معلوم ہوتے ہیں۔"

یہ سن کر خالد کے دل کو کچھ اطمینان ہوا کہ ایسی کوئی ہستی موجود تھی جو اس سلسلے میں کچھ کر سکتی تھی۔ اسے امید کی روشنی نظر آئی تو سٹوڈیو کے ملگجے اندھیرے میں اسے وحشت ہونے لگی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے ...... تو پھر مجھے اجازت دیجئے۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے ......" نسرین اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔ "اپنے مسئلے کا حل معلوم ہوتے ہی آپ تو دوڑ پڑے۔"

خالد ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی بولا۔ "پہلے تو میں اپنے گھر جاؤں گا۔ بریف کیس وہاں رکھوں گا' لباس تبدیل کروں گا' پھر جمشید صاحب کے پاس جاؤں گا۔"

اس نے صوفے سے اپنا بریف کیس اٹھایا اور اجازت طلب نظروں سے نسرین کی طرف دیکھا۔ وہ تپائی سے اپنی پینٹنگ اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "میرا یہ تحفہ لے کر نہیں جائیں گے؟"

"ضرور ...... ضرور ......" خالد نے جلدی سے پینٹنگ اس کے ہاتھ سے لے کر احتیاط سے بغل میں دبا لی اور ایک ہاتھ سے اسے پکڑے رکھا۔ "میں تو اسے بھول ہی گیا تھا۔" حالانکہ وہ بھولا نہیں تھا۔ وہ تو دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ نسرین اسے بھول گئی ہو تاکہ وہ اسے وہیں چھوڑ جائے لیکن وہ اب اس کے گلے پڑ ہی گئی تھی بہرحال اس کا ارادہ اسے گھر میں لگانے کا قطعاً" نہیں تھا۔ وہ صرف مروتاً" اسے لے جا رہا تھا۔ دل ہی دل میں اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے سٹور میں رکھ کر بھول جانے کی کوشش کرے گا۔ وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ پینٹنگ گھر میں لگانے کے قابل نہیں تھی۔

نسرین اسے دروازے تک چھوڑنے آئی اور وہ کچھ یوں عجلت کے سے عالم میں وہاں سے رخصت ہوا جیسے قید سے چھوٹ کر بھاگ رہا ہو۔ اوپر پہنچ کر اس نے چابی سے اپارٹمنٹ کا تالا کھولا۔ اپنی آمد کے وقت وہ نہ تو کال بیل بجاتا تھا اور نہ ہی دستک دے کر میمونہ کو اپنی آمد سے مطلع کرتا تھا۔ دونوں میاں بیوی کے پاس چابی رہتی تھی۔ جب بھی کوئی باہر سے آتا تھا تالا کھول کر اندر پہنچ جاتا تھا۔ اس طرح کسی کو دروازہ کھولنے کی زحمت نہیں کرنا پڑتی تھی۔

اس رات وہ بڑے دھچکے برداشت کر کے گھر پہنچا تھا لیکن گھر میں ایک نیا دھچکا اس کا منتظر تھا۔ وہ نسرین کی پینٹنگ کو دیوار کے سہارے لاؤنج میں کھڑا کر کے اور بریف کیس ایک کرسی پر پھینک کر آگے بڑھا تو اس نے بیڈ روم کا دروازہ کھلتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنی جگہ بت بن کر رہ گیا۔

بیڈ روم سے وہ خود ہی برآمد ہو رہا تھا۔ وہ باہر سے گھر میں داخل بھی ہو رہا تھا اور بیڈ روم سے نکل بھی رہا تھا۔ باہر سے آنے والا بھی خالد تھا اور بیڈ روم سے برآمد ہونے



والا بھی ...... خالد ایک تک اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مکمل طور پر اس کا اپنا عکس تھا۔ حتیٰ کہ اس کے جسم پر لباس بھی وہی تھا جو خالد جو خالد کے جسم پر تھا۔ خالد نے اس کے پیچھے میمونہ کو بھی برآمد ہوتے دیکھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرہ بہت سی ان کہی کہانیاں سنا رہا تھا۔

اس کی نظر باہر سے آنے والے خالد پر پڑی تو وہ بھی اپنی جگہ بت بن کر رہ گئی۔ دونوں خالد آمنے سامنے تھے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہے تھے۔ میمونہ ان دونوں کے درمیان آ گئی۔ وہ کبھی ایک کی طرف اور کبھی دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

○

آخر میمونہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔ "آپ دونوں میں سے اصل خالد کون ہے؟"

خالد تلخ لہجے میں بولا۔ "اچھی بیوی ہو ......! اپنے شوہر کو بھی نہیں پہچانتیں۔"
میمونہ گویا کسی خواب سے بیدار ہونے کی کوشش کرتے ہوئے بڑبڑانے ہی کے سے انداز میں بولی۔ "کیسے پہچانوں؟ فرق کیا ہے؟ میں بیوی ہوں' کوئی جادوگر یا فرشتہ تو نہیں کہ وہ باتیں بھی جان لوں جو انسانی عقل سے بالاتر ہیں۔"
خالد کا عکس اپنی جگہ اطمینان سے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ گویا میمونہ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "تمہیں گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اصل خالد میں ہی ہوں۔"

"ہاں ...... میرا بھی یہی خیال ہے۔" میمونہ اس کے کندھے سے لگ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

خالد اس وقت غم و غصے اور ایک بے بسی آمیز سے اشتعال کے عالم میں بھی دو باتیں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک تو یہ کہ میمونہ خواہ دھیمی آواز میں' خوابناک لہجے میں اور خود کلامی کے سے انداز میں بات کر رہی تھی' اس کے باوجود اس کے لہجے میں ایک عجیب دبی دبی سی سرکشی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پوری طرح نقلی خالد کے زیر اثر تھی۔ اس نے گویا میمونہ پر کوئی جادو سا کیا ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ نہ جانے کتنا وقت گزار کر ابھی کمرے سے برآمد ہوئی تھی اس کے باوجود وہ اب بھی گویا اسی کی طرف کھنچی جا رہی تھی۔ ابھی تو وہ شاید اصلی خالد کی موجودگی کی وجہ سے کچھ تکلف اور احتیاط کر رہی تھی ورنہ شاید نقلی خالد کی مقناطیسی کشش کے سامنے اس کے انداز کچھ اور عجیب ہوتے۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ اصلی خالد کو نقلی سمجھ رہی تھی۔
خالد کی اس وقت عجیب حالت تھی تاہم وہ اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "تمہیں ہم دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟ لو ...... میں تمہیں فرق دکھاتا ہوں ...... اور یہ فرق مجھ میں کچھ ہی دیر پہلے یہاں کے پراسرار ماحول اور یہاں پائی جانے والی عجیب و غریب چیزوں کی وجہ سے واقع ہوا ہے ......"



یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا جسے اب تک وہ نہ جانے کس احساس کے تحت اپنے پیچھے چھپائے کھڑا تھا۔ میمونہ یکدم خوفزدہ ہو کر ہلکی سی چیخ مار کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بڑے سے سیاہ پنجے سے مشابہہ وہ گھناؤنا اور مکروہ سا ہاتھ کسی کو بھی ڈرانے کے لئے کافی تھا۔ میمونہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس ہاتھ کی طرف دیکھ رہی تھی اور گویا اس پر سے نظر ہٹا نہیں پا رہی تھی۔ تاہم نیا یا نقلی خالد دلچسپی آمیز سی نظروں سے اس ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر خوف' گھبراہٹ یا حیرت کے تاثرات نہیں تھے۔ محض دلچسپی تھی جیسے حشرات الارض پر تجربات کرنے والے کسی سائنس دان کے سامنے کوئی نئی قسم کا کیڑا مکوڑا آگیا ہو اور وہ سوچ رہا ہو کہ اسے اٹھا کر خوردبین کے نیچے رکھا جائے یا نہیں؟

خالد اس ہاتھ کو لہراتے ہوئے اور میمونہ کی طرف دیکھتے ہوئے تقریباً" چیخ اٹھا ...... یہ تبدیلی یہ نحوست جب تک میرے مقدر میں لکھی ہے کم از کم تب تک کے لئے تو تم اسے میری نشانی مقرر کر لو۔ میری پہچان بنا لو۔ جس کا ہاتھ ایسا ہو گا وہ تمہارا اصلی خالد ہو گا ...... تمہارا شوہر...... جس کے بارے میں تمہیں دعویٰ ہے کہ وہ تمہیں دنیا میں سب سے زیادہ پیارا ہے۔"

خالد کو خود بھی احساس تھا کہ اس وقت شاید مختلف جذبات کی یلغار اور وحشت سے اس کا چہرہ بگڑا ہوا ہے ...... اوپر سے وہ اپنے صحیح اور خالص انسانی وجود کے ساتھ اس ہاتھ کو لہراتے ہوئے عجیب لگ رہا تھا۔ میمونہ کچھ اور خوفزدہ ہو کر ایک قدم اور پیچھے ہٹ گئی۔
خالد کا عکس یا نقلی خالد بھی پیچھے ہٹ کر اس کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے بولا۔ "تمہیں اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ڈارلنگ! کم از کم میرے ہوتے ہوئے تمہیں اس قسم کی کسی چیز سے نہیں گھبرانا چاہئے۔ یہ سب دنیا کے کھیل تماشے کا ایک حصہ ہیں۔"

میمونہ نے اس کی طرف دیکھا تو وہ دلکش انداز میں مسکرایا۔ میمونہ گویا سحرزدہ سی ہو گئی۔ وہ آہستگی سے خالد کی طرف گردن گھماتے ہوئے بولی۔ "تم اس مکروہ ہاتھ کو اپنے اصلی خالد ہونے کی نشانی بتا رہے ہو ...... عین ممکن ہے یہی تمہارے نقلی خالد ہونے کی نشانی ہو ...... میرا خالد تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے ...... اس کا ہاتھ تو ایسا نہیں ہے ...... اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔"

اس نے جلدی سے نقلی خالد کا ہاتھ یوں دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام لیا جیسے ڈوبتا ہوا کوئی انسان سہارا تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ ایک سسکی لے کر وہ بولی۔ "ضرور تم ہی نقلی خالد ہو ...... کوئی بدروح ...... کوئی آسیب ہو ...... جو نہ جانے کس طرح میرے خالد کا روپ چرا کر میرے پاس آ جاتا ہے۔ تم واقعی بڑے ڈھیٹ ہو جو آج

میرے شوہر کی موجودگی میں بھی سامنے آ گئے اور اپنے آپ کو اصلی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

تب نقلی خالد یا خالد کا عکس طمانیت سے مسکرا دیا۔ میمونہ کا ردعمل گویا اس کی مرضی کے عین مطابق تھا اور وہ وہی کچھ کہہ رہی تھی جو وہ چاہتا تھا۔ خالد کا غصے سے برا حال ہو گیا مگر اب بھی مجبور سا غصہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح خود کو اصلی خالد ثابت کر سکتا تھا اس کی جیب میں اس کے شناختی کاغذات' اس کا پرس وغیرہ سب کچھ موجود تھا لیکن اس وقت اسے یہ چیزیں بالکل بے وقعت محسوس ہو رہی تھیں۔ جس شخص کی شکل صورت بالکل اس جیسی تھی' جو اس جیسا لباس پہنے کھڑا تھا' جو کسی بھی لحاظ سے اس سے بال برابر مختلف نہیں تھا' اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ جواباً" وہ بھی اپنی جیب سے ویسے ہی شناختی کاغذات اور بٹوا وغیرہ نکال کر پھینک دیتا۔ خالد کو وہ صرف اس اعتبار سے خود سے تھوڑا سا مختلف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ زیادہ شگفتہ' زیادہ تازہ دم' زیادہ پراعتماد اور زیادہ پرسکون دکھائی دے رہا تھا اور یہی چیزیں اس کے اصلی خالد ہونے کی زیادہ گواہی دے رہی تھیں۔ درحقیقت خالد کو ایسا ہی نظر آنا چاہئے تھا لیکن وہ چکراتے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ جن تجربات سے وہ گزر کر آ رہا تھا اور اس سے پہلے وہ جس طرح دن بھر عدالتی کارروائیوں اور کچھ گواہوں کو تلاش کر کے ان سے ملاقات کے چکر میں تھک چکا تھا' اس کے بعد اس کے لئے کیونکر ممکن تھا کہ وہ ایسا تازہ دم' پراعتماد اور پرسکون دکھائی دیتا۔

اس کا غصہ' جھنجلاہٹ اور بے بسی جب نقطہ عروج پر پہنچی تو اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اسے اپنی بے بسی سے نجات کا ایک راستہ دکھائی دیا۔ اس کی نظر اس بار خود اپنے ہاتھ پر پڑی تھی اور اچانک ہی اسے احساس ہوا تھا کہ وہ کیسا بے وقوف تھا کہ اس ہاتھ کو استعمال نہیں کر رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ اس کی طاقت کے کرشمے دیکھ کر آ رہا تھا۔ اس ہاتھ سے اس نے ٹھوس لکڑی کی تپائیوں کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ ٹھوس لوہے کو پچکا دیا تھا۔ کیا اس ہاتھ سے وہ اس شخص کی گردن نہیں مروڑ سکتا تھا جو اس کی زندگی میں زہر گھول رہا تھا؟

وہ یقیناً" پراسرار قوتوں کا مالک تھا تبھی یہ کھیل اتنی صفائی سے کھیل رہا تھا لیکن خالد کو یاد آ گیا تھا کہ اس کا اپنا ہاتھ بھی تو نہ جانے کس پراسرار قوت کا مالک تھا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر فاتحانہ سے انداز میں مسکرایا۔ وہ نقلی خالد یقیناً" اس کا مستحق تھا کہ اس کی گردن مروڑ دی جاتی۔ خالد کا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے لپک کر اس خالد کی گردن دبوچ لی جو اس کی بیوی کے کندھے سے کندھا جوڑے کھڑا تھا۔ کم از کم اسے خود بھی محسوس ہوا کہ اس نے نقلی خالد



کی گردن دبوچی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ یہ تو صرف اس کی خوش فہمی تھی۔ اس نے تو گویا ہوا میں مٹھی بھینچی تھی۔ ہوا کو گرفت میں لینے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ کیا نقلی خالد کی گردن کہیں غائب ہو گئی تھی یا اس کا ہاتھ ٹھیک جگہ پر نہیں پڑا تھا؟

یہ سوچتے ہوئے اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھا۔ درحقیقت نقلی خالد کی صرف گردن ہی نہیں بلکہ وہ پورا کا پورا جسم ہی غائب ہو چکا تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ گویا ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ خالد دیکھ بھی نہیں سکا تھا کہ وہ کس طرح غائب ہوا تھا۔ بس پلک جھپکنے سے پہلے وہ وہاں موجود تھا اور پلک جھپکتے ہی وہاں نہیں تھا۔ اس نے اپنے مکروہ ہاتھ کی مٹھی کھول کر دیکھا۔ اس میں واقعی کچھ بھی تو نہیں تھا۔ میمونہ بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس جگہ کو دیکھ رہی تھی جہاں ایک لمحہ پہلے وہ خالد کھڑا تھا جسے وہ اصلی قرار دے رہی تھی اور جس کی پناہ میں وہ کھنچی جا رہی تھی۔

پھر اس نے اسی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے خالد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت کی پرچھائیاں ساکت ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہ دہشت اس واقعے کے باعث تو تھی جو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی لیکن شاید وہ اصلی شوہر سے بھی ابھی تک خوفزدہ تھی۔ اس نے اب بھی خالد کی طرف بڑھنے یا کوئی مختلف ردعمل ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی جس کی خالد توقع کر رہا تھا۔

"کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں آیا کہ وہ خالد نقلی تھا ......؟" خالد جذبات سے گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ "کیا تمہیں اب بھی اس پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے کہ وہ نامعلوم شخص ..... وہ بدروح ..... وہ آسیب میرا ہم شکل ہونے کا کیا کیا فائدہ اٹھا کر ..... کیا کیا خراج وصول کر کے جا چکا ہے؟"

میمونہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ خالد کو اس وقت اس پر بھی غصہ آ رہا تھا گو کہ ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی موجود تھا کہ جو کچھ ہوا اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کے باوجود خالد بہرحال اس وقت مختلف جذبات کے بہاؤ کی لپیٹ میں تھا۔ اس کا وہ مکروہ ہاتھ بلند ہوا جس سے اس نے نقلی خالد کی گردن پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس ہاتھ سے وہ میمونہ کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیتا۔ صرف اس خیال نے اسے ایک لمحے کے لئے روک دیا کہ شاید اس تھپڑ سے میمونہ کی کھوپڑی پاش پاش ہو جائے۔ شاید اس کا چہرہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ ہچکچاہٹ کا وہ لمحہ شاید میمونہ کو نئی زندگی دے گیا کیونکہ اسی لمحے وہ آگے پیچھے جھولنے لگی۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ چکرا رہی تھی۔ خالد نے اسی بدہیئت ہاتھ سے اسے تھام لیا جس سے وہ اسے تھپڑ رسید کرتے کرتے رہ گیا تھا۔

پھر اس نے دونوں بازوؤں پر اسے سنبھالا اور اٹھا کر بیڈ پر لٹا دیا۔ میمونہ واقعی بے ہوش ہو چکی تھی اور اس وقت اس کے چہرے پر اتنی معصومیت تھی کہ خالد اپنا غصہ' اپنی نفرت' سب کچھ بھول گیا۔ وہ خود ہی اپنے آپ کو دلیلیں دینے لگا۔ جو کچھ ہوا اس میں واقعی اس بے چاری کا کیا قصور تھا؟ ایسی طاقتوں کے سامنے عام انسانوں کی بھلا کیا چلتی ہے؟ اب اس کا اپنا ہاتھ کیا سے کیا ہو گیا' کیسی شکل اختیار کر گیا۔ کیا وہ اسے روک سکا؟

وہ اپنی تمام کیفیات کو بھول گیا۔ اس کے سینے میں گداز کا چشمہ سا پھوٹ پڑا۔ وہ محبت سے میمونہ کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگا۔ ان کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا مگر اس ہستی کے ساتھ ..... اپنی بیوی کے ساتھ اس نے گویا زندگی کی حسین ترین ساعتیں گزاری تھیں۔ ان گنت خواب دیکھے تھے۔ خصوصاً" شادی کے شروع کے دن تو بہت ہی خوبصورت تھے جب ان کے خواب' تعبیریں' خیال اور خواہشیں سبھی کچھ مشترک تھا۔ اپنی تمام تر کم مائیگی اور محدود وسائل کے باوجود انہوں نے اس دور سے پوری طرح لطف اٹھایا تھا۔ ہر لمحے کو یادگار بنایا تھا۔ خوب گھومے پھرے تھے۔ خوب سیر کی تھی' فلمیں دیکھی تھیں' سٹیج ڈرامے دیکھے تھے۔

وہ ہنی مون منانے کسی خوبصورت پہاڑی مقام پر یا کسی دوسرے شہر نہیں جا سکے تھے لیکن انہوں نے اس محرومی کو روگ بنا کر سینے سے نہیں لگایا تھا۔ ایک دوسرے کے سامنے محرومی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اپنے ہی شہر کو ایک نئے زاویہ نظر سے دیکھا تھا۔ اسی کے گلی کوچوں کو نئے سرے سے دیکھنا شروع کیا تھا اور تب انہیں احساس ہوا تھا کہ برسوں سے اس شہر میں رہتے ہوئے بھی کئی علاقے انہوں نے نہیں دیکھے تھے جبکہ حیدر آباد کوئی بہت بڑا شہر بھی نہیں تھا۔

انہوں نے اسی کی تفریح گاہوں کو دنیا کی بہترین تفریح گاہیں سمجھ کر دیکھنا شروع کیا اور بہت لطف اٹھایا۔ وہ گویا پہلی بار اپنے شہر کو دریافت کر رہے تھے۔ درحقیقت وہ خود اپنے آپ کو دریافت کر رہے تھے۔ تبھی انہیں یہ بھی احساس ہوا تھا کہ خوشی انسان کے اپنے اندر کہیں چھپی ہوتی ہے' خزانے کی طرح مدفون ہوتی ہے۔ اسے تلاش کرنا پڑتا ہے' کھوجنا پڑتا ہے۔

انہوں نے محرومیوں کو اپنا مسئلہ نہیں بنایا۔ کوئی چیز نہیں ملی تو کسی اور چیز کو اس کا متبادل بنا لیا۔ اس سے بھی اتنا ہی لطف اٹھایا جس کی تمنا تھی۔ پھر انہوں نے تفریح کی غرض سے کراچی کے بھی کئی چکر لگائے۔ یہ شہر قریب تھا' رسائی میں تھا۔ یہاں آنا جانا زیادہ مہنگا نہیں پڑتا تھا۔ یہیں انہوں نے کچھ خواب دیکھنے شروع کئے تھے۔ جب وہ کلفٹن کی صاف ستھری سڑکوں سے گزرتے تھے' بلند و بالا خوبصورت عمارتوں کو دیکھتے تھے' سرسبز باغیچوں سے مزین طویل و عریض اور طرح طرح کی خوبصورت ساخت کے بنگلوں کو دیکھتے



تھے تو سوچتے تھے' زندگی تو یہ ہے ..... اس طرح رہنے کا بھی ایک الگ ہی لطف ہو گا۔

تاہم یہ محض ایک سوچ تھی۔ ایک دھندلا سا خیال تھا۔ کوئی ایسی حسرت نہیں تھی کہ جو زخم بن کر دل میں بیٹھ جاتی۔ خواہش کا کوئی ایسا ناگ نہیں تھا جو کنڈلی مار کر سینے پر بیٹھ جاتا اور زندگی کی ساری خوشیوں کو ڈس لیتا۔ یہ کوئی ایسی منزل نہیں تھی کہ جس تک پہنچنے کی دھن میں وہ آنکھیں بند کر کے زندگی کی باقی ساری چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو روندتے ہوئے' دیوانوں کی طرح گرتے پڑتے چلتے رہتے۔ وہ تو نہ جانے کس گھڑی کی دعا قبول ہو گئی تھی کہ سب کچھ خود بخود ان کی جھولی میں آن گرا تھا ..... لیکن یہ سب کیا شروع ہو گیا تھا؟ یہ تو ان کے خوابوں کی تعبیر نہیں تھی۔ شاید انہیں یہ تبدیلی راس نہیں آئی تھی۔ شاید انہیں اپنے چھوٹے شہر میں ..... اپنی محدود سی دنیا میں واپس چلے جانا چاہئے تھا۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔ ابھی وقت تھا۔ آثار بتاتے تھے کہ صورت حال اس سے بھی بدتر ہو سکتی تھی۔ انہوں نے جو کچھ کھو دیا تھا ..... جو داغ دل پر لگا لیا تھا ..... جو سیاہی دامن میں سمیٹ لی تھی وہ اپنی جگہ تھی لیکن زیاں اس سے بھی بڑھ سکتا تھا۔ الجھنیں اس سے بھی پیچیدہ ہو سکتی تھیں' دکھ اس سے بھی گھمبیر ہو سکتے تھے۔

وہ یہ سب کچھ سوچتا رہا اور اس کے دل کی رقت بڑھتی رہی۔ سردی گو کہ اچھی خاصی تھی مگر اس نے اے سی آن کر دیا کہ شاید ٹھنڈ سے میمونہ کو ہوش میں آنے میں مدد ملے۔ پھر وہ باتھ روم سے ایک گلاس میں پانی بھر لایا اور اپنے بگڑے ہوئے ہاتھ سے میمونہ کے چہرے پر چھینٹے مارنے لگا۔ اس ہاتھ میں جہاں تباہ کاری کی ناقابل یقین قوت تھی وہیں شاید کچھ طاقت مسیحائی بھی تھی کہ میمونہ نے فوراً" آنکھیں کھول دیں اور چند سیکنڈ میں ہی وہ اٹھ بھی بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ اور چہرے پر دحشت نہیں تھی۔ اب وہ کافی پرسکون نظر آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ذرا سی دیر کے لئے بے ہوشی کی تاریکی میں اتر کر اسے شعور کی روشنی مل گئی تھی۔ وہ سنبھل گئی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" خالد نے پوچھا۔ اب اس کے لہجے میں محبت تھی۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ ذرا کمزور اور مضمحل لہجے میں بولی لیکن انداز اب مختلف تھا۔ آنکھیں اب کچھ اور جذبوں کا پتہ دے رہی تھیں۔ اب وہ خالد کی طرف نفرت یا اجنبیت سے نہیں دیکھ رہی تھی۔ خالد چند لمحے پہلے جو کچھ سوچ رہا تھا' اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فوراً" میمونہ سے کہہ ڈالے لیکن پھر اس نے خود کو سمجھایا کہ کچھ انتظار کر لینا ہی بہتر تھا۔ میمونہ کو اتنی جلدی جلدی مختلف نوعیت کے دھچکے پہنچانا ٹھیک نہیں تھا۔ اس ماحول کو یہاں کی زندگی کو خیرباد کہنا اور جمشید مختار صاحب سے قطع تعلق کرنا اتنا آسان نہیں تھا کہ ذہن میں خیال آتے ہی وہ اس پر عمل درآمد کے بارے میں سوچنے لگے۔ اس پر ابھی بہت غور و خوض کی ضرورت تھی۔

"اب تو تمہیں یقین آگیا نا کہ وہ کسی اور خالد کا وجود تھا؟" وہ ملائمت سے بولا۔

"ہاں ....." میمونہ نے آہستگی سے اثبات میں سرہلاتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے اسے اصلی خالد تسلیم کر لیا تھا۔ خالد کے دل کو اطمینان ہوا۔

وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے محبت سے بولا۔ "آئندہ اگر وہ آیا بھی تو تم اسے گھر میں گھسنے کی اجازت نہیں دو گی۔"

وہ بے روح سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "وہ اجازت لے کر کب آتا ہے۔ میں تو اسے اچانک ہی گھر میں ..... بلکہ بیڈ روم میں موجود پاتی ہوں۔ اجازت لے کر تو ظاہر ہے تم بھی نہیں آتے۔ تمہارے پاس بھی گھر کی چابی موجود ہے۔"

"میں آئندہ بیل بجا کر آیا کروں گا اور تم دروازہ کھولا کرو گی۔" خالد نے گویا اپنی پہچان مقرر کرتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ بھی ایسا ہی کرنے لگے ....." میمونہ کے ہونٹوں پر بے روح سی مسکراہٹ برقرار تھی۔ اس کے علاوہ میرے پاس بھلا اس کی کیا پہچان ہے جو میں اسے کسی بات سے منع کر سکوں؟ اگر مجھے اس کی پہچان ہوتی کہ وہ اصلی خالد نہیں ہے تو کیا میں اسے گھر میں آنے دیا کرتی؟"

بات تو درست تھی۔ اس لمحے خالد نے اپنے گھناؤنے ہاتھ کی طرف دیکھا اور اس کا جی چاہا کہ اسے اسی طرح اپنے جسم کا ایک حصہ رہنے دے۔ یہ اس کی پہچان' اس کی شناخت بن سکتا تھا۔ اس کے اور نقلی خالد کے درمیان خط امتیاز کا کام دے سکتا تھا لیکن یہ سوچتے ہوئے اسے جھرجھری سی آگئی۔ وہ اس ہاتھ کو اپنے جسم کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ہاتھ اس کی زندگی اجیرن کر سکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس ہاتھ سے اسے بہرحال نجات حاصل کرنا تھی۔ اسے امید تھی کہ اصلی اور نقلی خالد کے مسئلے کا کوئی اور حل نکل آئے گا۔

نسرین نے بتایا تھا کہ صرف جمشید مختار ہی اس ہاتھ کو اصلی حالت پر لانے میں اس کی مدد کر سکتے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ان سے فوراً" ہی مل لینا بہتر تھا۔ عین ممکن تھا کہ تاخیر اس معاملے میں نقصان دہ ہوتی۔ وہ میمونہ کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔ "تم اپنے آپ کو سنبھالو ..... چائے یا کافی بنا کر پیو ..... اپنا حلیہ درست کرو ..... میں ذرا جمشید صاحب سے مل کر آتا ہوں۔ مجھے اس ہاتھ کے سلسلے میں ان سے ملنا ہے۔" اس نے ایک بار پھر ہاتھ میمونہ کے سامنے کر دیا۔

اس بار بھی وہ اس سے خوفزدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اپنی جگہ سمٹ کر رہ گئی جیسے اسے اندیشہ ہو کہ وہ ہاتھ اسے دبوچ لے گا۔ وہ تھوک نگل کر بولی۔ "یہ تمہارے ہاتھ کو



کیا ہوا ہے؟"

"یہ ایک الگ عجیب و غریب قصہ ہے جو میں واپس آکر تمہیں سناؤں گا۔ صحیح طور پر تو مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ یہ کیا چکر ہے ..... لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ جمشید صاحب اسے ٹھیک کرنے میں میری مدد کر سکتے ہیں اس لئے اب میں مزید وقت ضائع کئے بغیر ان کے پاس جا رہا ہوں۔ تاخیر سے کہیں کوئی اور گڑبڑ نہ ہو جائے۔" دروازے کی طرف جاتے جاتے وہ رک کر بولا۔ "البتہ اگر تمہاری حالت اس قابل نہیں ہے کہ اکیلی رہ سکو تو میں کچھ دیر اور رک جاتا ہوں۔"

"نہیں ..... میں اب ٹھیک ہوں ..... میں خود کو سنبھال لوں گی ..... تم جاؤ ..... یہ تو بہت سنگین معاملہ معلوم ہوتا ہے۔" وہ ہاتھ کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی پھر بھی اسے جھرجھری سی آگئی۔

خالد نے ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیا اور گھر سے نکل کر ایک منزل کی سیڑھیاں چڑھ کر جمشید صاحب کے پینٹ ہاؤس کے دروازے پر جا پہنچا۔ اس سے پہلے کہ وہ کال بیل کا بٹن دباتا' کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ انٹرکام بول اٹھا۔ "آ جاؤ ..... آ جاؤ خالد! دروازہ غیر مقفل ہی ہے۔ سیدھے اندر آ جاؤ۔ تم یقیناً" کسی خاص کام کے سلسلے میں میرے پاس آئے ہو اس لئے تمہارا وقت ضائع نہیں ہونا چاہئے۔"

یہ جمشید صاحب کی آواز تھی۔ خالد کو جھٹکا سا لگا۔ انہیں اندر بیٹھے بیٹھے کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ دروازے پر آیا ہے۔ انٹرکام پر کچھ بولنا تو درکنار' ابھی تو اس نے کال بیل کا بٹن بھی نہیں دبایا تھا۔ یہ جمشید مختار بھی واقعی پراسرار قوتوں کے مالک تھے۔ دھیرے دھیرے گویا ان کی شخصیت اور ان کی اس راجدھانی کے اسرار خالد پر کھل رہے تھے لیکن اس وقت ان کی پراسراریت کا تاثر خالد کو اچھا ہی محسوس ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس کے ہاتھ کے سلسلے میں واقعی کچھ کر سکتے تھے۔ خالد کو اس وقت صرف اس کی فکر تھی۔

اس نے اسی ہاتھ سے ناب گھما کر دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ اندر چاروں طرف کمروں اور لاؤنج وغیرہ کے دروازے کھلے نظر آ رہے تھے مگر خاموشی اور سکوت کا راج تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں جھانکا' لاؤنج عبور کیا لیکن اسے جمشید مختار کہیں دکھائی نہ دیئے۔ کہنے کو وہ ایک اپارٹمنٹ تھا لیکن کشادگی' آسائشوں اور شان و شوکت کے اعتبار سے کسی جدید محل سے کم نہیں تھا مگر اس وقت یہ محل سرا جیسے ویران پڑی تھی۔

"سر! آپ کہاں ہیں؟" خالد با آواز بلند بولا۔ "اس کی آواز جیسے بڑے بڑے گنبدوں والی کسی ویران حویلی میں گونج کر رہ گئی۔ ایک لمحے کے لئے وہ خود بھی اپنی آواز سے خوفزدہ ہو گیا۔

نہ جانے، کس طرف سے جمشید مختار کی آواز بھی اسی طرح گونجیلے سے انداز میں ابھری۔ "بس تم چلتے رہو۔ تمہارے قدم تمہیں خود بخود وہاں لے آئیں گے جہاں میں موجود ہوں۔ آج تمہیں میرے خاص الخاص کمرے میں آنے کا شرف حاصل ہو گا۔"

خالد چل پڑا۔ اس نے محسوس کیا کہ واقعی جیسے کوئی غیبی طاقت اس کا ہاتھ تھامے اسے ایک طرف لئے جا رہی تھی۔ وہ کشادہ راہداریوں سے گزرنے کے بعد ایک تنگ سی راہداری میں داخل ہوا۔ اب تک وہ سرخ دبیز قالین پر چلتا ہوا آیا تھا لیکن اس مختصر اور تنگ سی راہداری میں قالین نہیں تھا۔ اس کا سیاہ ماربل کا فرش چھت کی چمکیلی و دودھیا روشنی میں جھلملا رہا تھا۔ خالد کا خیال تھا کہ وہ جمشید صاحب کے ہاں منعقد ہونے والی پارٹیوں میں شرکت کے دوران پورا اپارٹمنٹ دیکھ چکا تھا لیکن آج اسے پتہ چلا کہ یہ حصہ تو اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ آج تو اسے اپارٹمنٹ کا نقشہ پہلے سے زیادہ بھول بھلیاں قسم کا لگ رہا تھا۔

اس تنگ راہداری کے اختتام پر منقش لکڑی کا ایک محرابی دروازہ تھا۔ دروازہ دیکھنے میں ہی ٹھوس اور نہایت مضبوط لگ رہا تھا۔ اس کے دونوں طرف ماربل کے دو خوبصورت ستون تھے اور عجیب بات یہ تھی کہ دونوں ستونوں پر دو چراغ روشن نظر آ رہے تھے۔ جدید ساخت کے ان درودیوار کے درمیان اس ماڈرن اپارٹمنٹ کے اس گوشے میں ان دو چراغوں کی موجودگی عجیب لگ رہی تھی اور اس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ ان دونوں چراغوں کی لویں گہرے سرخ رنگ کی تھیں جیسے دو انگارے دہک رہے ہوں۔ ایک لمحے کے لئے تو خالد کو گمان گزرا جیسے وہ دو غضبناک آنکھیں تھیں جن کا رخ صحیح نہیں تھا۔ وہ عمودی رخ پر یوں نظر آ رہی تھیں جیسے کسی نے انہیں ان کی جگہ کھڑا کر دیا ہو۔

خالد ایک لمحے کے لئے ہچکچاہٹ کا شکار ہوا مگر اسی وقت نہ جانے کس طرف سے جمشید مختار کی آواز ابھری۔ "آجاؤ ..... چلے آؤ ..... ہچکچاؤ مت ..... اب تم ہم میں سے ہی ایک ہو۔ رفتہ رفتہ یہاں کا کوئی راز تمہارے لئے راز نہیں رہے گا ..... سب بھید تم پر کھل جائیں گے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جمشید مختار کسی پبلک ایڈریس سسٹم پر اسے خطاب کر رہے تھے لیکن خالد کوئی اندازہ نہ لگا سکا کہ اگر در و دیوار میں کہیں لاؤڈ سپیکر پنہاں تھے تو وہ کہاں تھے؟ وہ آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ لکڑی کے منقش دروازے پر جو تصویریں کندہ تھیں وہ درحقیقت چوب کاری کے شاہکاروں کا درجہ رکھتی تھیں۔

دروازہ کی لکڑی میں اوپر سے نیچے تک انسانی شکلیں ابھاری گئی تھیں۔ بعض تو صرف شکلیں ہی نہیں، پورے انسانی وجود تھے۔ کوئی لہرا رہا تھا، بل کھا رہا تھا۔ کوئی گویا حالت رقص میں تھا اور کوئی گویا پانی یا ہوا میں تیر رہا تھا اور کوئی جیسے کسی مذہبی عقیدے



کے مطابق پوجا پاٹ یا پرستش میں مصروف تھا۔ ہر شبیہہ صرف اس لحاظ سے ہنرمندی کا اعلیٰ نمونہ نہیں تھی کہ وہ بہت خوبصورتی سے تراشی گئی تھی بلکہ عجیب بات یہ تھی کہ وہ سب چھوٹے چھوٹے زندہ انسان معلوم ہو رہے تھے اور گویا سلوموشن میں دکھائی جانے والی فلم کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ وہ سب اس دروازے تک ہی محدود تھے اور اپنی سطح یا دروازے کے فریم سے باہر نہیں آ رہے تھے مگر مسلسل حرکت میں تھے۔

ان کی یہ حرکت کچھ ایسی تھی جیسے کیچوؤں سے بھری ٹوکری میں کیچوے اوپر نیچے ہو رہے ہوں، آہستگی سے حرکت کرتے ہوئے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے ہوں، کلبلا رہے ہوں لیکن اس ساری حرکت میں جیسے ایک خاص قسم کا ردھم تھا، ایک ترتیب تھی۔ کہیں جیسے کوئی خاص قسم کی موسیقی بج رہی تھی جسے صرف وہی چوبی ہیولے سن سکتے تھے، وہ خالد کی سماعت تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن اسی کی دھن پر ہر شبیہہ حرکت کر رہی تھی، لہرا رہی تھی، کلبلا رہی تھی۔ کبھی کسی کے عقب میں چلی جاتی تھی، کبھی سامنے آ جاتی تھی، کبھی گویا کسی نادیدہ جھیل میں اتر جاتی تھی، کبھی سطح آب پر ابھر آتی تھی۔ یہ سارا عمل نہایت خاموشی سے اور بڑے تواتر سے جاری تھا۔

ذرا دور کھڑے ہوئے کسی شخص کو شاید اس مسلسل حرکت کا احساس بھی نہ ہوتا لیکن خالد نے قریب سے اس سارے عمل کو دیکھا تو وہ سحر زدہ سا ہو کر رہ گیا۔ ان چوبی شکلوں میں زیادہ تر عورتیں تھیں۔ کوئی یونانی معلوم ہوتی تھی اور کوئی اپسرا معلوم ہوتی تھی۔ ان کی حرکات و سکنات ایک عجیب شاعرانہ سا حسن لئے ہوئے تھیں۔ ان میں سے کئی خالد کی طرف دیکھ کر مسکرائیں، پھر کہیں ڈوب گئیں، کسی اور کی اوٹ میں چلی گئیں، پھر کسی اور زاویئے سے سامنے آ گئیں۔ کچھ نے یوں خالد کی طرف دیکھ کر خوابناک کے سے انداز میں پلکیں جھپکائیں جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر قوت گویائی سے محروم ہونے کی وجہ سے نہ کہہ سکی ہوں۔ وہ سب کی سب بے پناہ خوبصورت اور افسانوی حسن کی مالک تھیں۔ خالد انہیں تین تین چار چار انچ کی شبیہوں کی صورت میں دیکھ رہا تھا لیکن اس عالم میں بھی ان کی مخمور آنکھیں، یاقوتی ہونٹ اور خوبصورت جسموں کے لہریئے گویا اس کے دل کو اتھل پتھل کر رہے تھے۔ یہ سارا عمل نہایت خاموشی سے، غیر محسوس سے انداز میں جاری تھا مگر خالد جیسے اپنی جگہ بت بن کر رہ گیا تھا۔

دفعتاً وہ بری طرح چونکا اور اچھل پڑا۔ اس کے کان کے عین قریب ہی جمشید مختار کا قہقہہ گونجا تھا۔ اس نے ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا کہ شاید اس کی محویت اور انہماک کے عالم میں جمشید مختار کسی طرف سے آ کر اس کے برابر میں کھڑے ہو گئے تھے اور اسے علم نہیں ہو سکا تھا مگر جمشید مختار اسے اپنے آس پاس کہیں نظر نہیں آئے۔ ایک بار پھر کسی نادیدہ جگہ سے جمشید مختار کی آواز گونجی۔ "اب آ بھی جاؤ ..... یا وہیں بت بنے کھڑے رہو

گے؟" یہ آواز گویا کسی در و دیوار سے نہیں بلکہ ہوا ہی میں کہیں سے ابھرتی تھی۔

وہ جھرجھری سی لے کر اپنی سحرزدہ سی کیفیت سے باہر آیا اور ڈرتے ڈرتے اس نے دروازے کی ناب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسے یوں لگا جیسے دروازے پر حرکت کرتی اور ڈوبتی ابھرتی سی شبیہیں اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا رہی ہوں مگر ان مسکراہٹوں میں بھی ایک طرح کا نشیلا پن تھا۔ پھر اچانک اسے یوں لگا جیسے ان میں سے ایک شبیہہ بالکل میمونہ جیسی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اس کلبلاتے ہجوم میں کہیں غائب ہو گئی۔

اس نے چند لمحے توقف کیا کہ شاید وہ شبیہہ دوبارہ نظر آئے لیکن وہ گویا چوبی مورتیوں کے اس سمندر میں غائب ہو چکی تھی۔ آخر خالد نے سر جھٹک کر اسے اپنا واہمہ قرار دیتے ہوئے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ اندر گویا ایک اور ہی جہان حیرت اس کا منتظر تھا۔

وہ ایک بہت ہی بڑا اور طویل و عریض کمرہ تھا۔ اگر اس میں مخصوص انداز کی نشستیں موجود ہوتیں تو شاید وہ ایک سینما ہال معلوم ہوتا لیکن اس میں نشستوں کے بجائے دوسری بہت سی چیزیں موجود تھیں جن کا خالد فوری طور پر جائزہ نہیں لے سکا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہاں روشنی کم تھی۔ دوسرے اس کی نظریں سب سے پہلے جمشید مختار کو تلاش کرنے لگی تھیں۔

جمشید مختار اسے فوراً ہی نظر آ گئے کیونکہ جہاں وہ موجود تھے وہاں روشنی ذرا زیادہ تھی۔ وہ اس کمرے کا سٹیج نما حصہ تھا۔ وہ بھی خاصا بڑا تھا۔ اس کے عین وسط میں ایک کافی اونچی اور بالکل شاہانہ طرز کی طلائی کرسی پر جمشید مختار ایک خاص اور نہایت بارعب انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے جسم پر گوتھری پیس سوٹ تھا اور پیروں میں جدید قسم کے نفیس اور بیش قیمت جوتے تھے' اس کے باوجود وہ نہ جانے کیوں پرانے وقتوں کے کوئی شہنشاہ دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے جسم پر نہ تو خلعت فاخرہ تھی' نہ ہی سر پر تاج تھا اور نہ ہی پیروں میں زرتار جوتیاں تھیں۔ کمر کے ساتھ نیام دار تلوار بھی نہیں بندھی ہوئی تھی۔ ان کے دائیں بائیں کنیزیں کھڑی مورچھل بھی نہیں ہلا رہی تھیں۔ دائیں بائیں قطاروں میں درباری بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ ان کے قدموں کے قریب وزراء باتدبیر کی نشستیں بھی نہیں تھیں۔ اس کے باوجود وہ مکمل اور بھرپور قسم کی شخصیت کے مالک شہنشاہ دکھائی دے رہے تھے۔ گمان یہی گزرتا تھا کہ کسی بہت بڑی مملکت پر ان کا حکم چلتا تھا' نہ جانے کہاں سے کہاں تک ان کی فرماں روائی تھی' نہ جانے کس گوشے سے کس گوشے تک ان کا سکہ چلتا تھا۔ خود خالد کا بے اختیار جی چاہا کہ کسی نووارد درباری کی طرح رکوع کی سی حالت میں چلا جائے اور کورنش بجا لائے لیکن اس نے بہ مشکل خود کو اس سے باز رکھا اور صرف ہاتھ کے اشارے سے سلام کرنے پر اکتفا کیا۔ جمشید مختار نے سلام کا جواب نہیں



دیا۔ شاید ان تک اس کی دھیمی آواز پہنچی ہی نہیں تھی۔ البتہ اس کے ہاتھ کے اشارے کے جواب میں انہوں نے بھی آہستگی سے سرہلا دیا تھا۔

خالد ہچکچاہٹ آمیز انداز میں دروازے کے قریب ہی رک گیا تھا لیکن جمشید مختار نے اشارے سے اسے قریب بلاتے ہوئے مہربان مسکراہٹ کے ساتھ کہا ..... "یہاں آؤ نا ..... وہاں کیوں رک گئے ہو۔" انہوں نے اپنے قریب پڑی ہوئی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا جو ذرا نیچی اور عام سی تھی۔

خالد آگے بڑھا تو اسے یوں لگا جیسے اس کے پاؤں کے نیچے کچھ چھوٹی موٹی سی چیزیں آ کر کچلی جا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی آہ و بکا کا سا شور بپا ہو گیا لیکن یہ شور نہایت ہی مدھم تھا۔ نہایت ہی باریک اور گھٹی گھٹی سی آوازیں جیسے کہیں دور سے آ رہی تھیں لیکن ان میں بلا کا درد اور اذیت بھری پکار تھی۔ خالد کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت دور کہیں کچھ انسانوں کو وزنی چیزوں کے نیچے کچلا جا رہا تھا' ان کی ہڈیاں توڑی جا رہی تھیں اور وہ درد و اذیت سے چلا رہے تھے۔ یہ آوازیں گو کہ بہت ہی مدھم تھیں' کان لگا کر ہی انہیں سنا جا سکتا تھا لیکن ان کا تاثر بہرحال وہی تھا جو قریب سے سننے پر ہو سکتا تھا۔

خالد کو شبہ سا ہوا جیسے یہ آوازیں اس کے پیروں کے قریب سے آ رہی تھیں۔ وہ چلتے چلتے یک دم رک گیا اور جھک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فرش کی طرف دیکھنے لگا۔ فرش پر روشنی اور بھی کم تھی تاہم اس نے اتنا ضرور دیکھ لیا کہ چھوٹی چھوٹی کچھ جاندار چیزیں ادھر ادھر رینگتی پھر رہی تھیں جن کی موجودگی کا اسے احساس نہیں ہو سکا تھا اور ان میں سے کچھ کو شاید اس نے پیروں تلے کچل ڈالا تھا۔ وہ کچھ خوف زدہ سا ہو گیا اور ایک عجیب سے احساس جرم نے بھی اس پر غلبہ پا لیا۔ وہ خواہ کسی بھی قسم کے جاندار تھے' انہیں اس طرح پیروں تلے روندنا اسے اچھا معلوم نہیں ہوا۔

پھر اسے حیرت ہوئی کہ کیا انسانوں جیسی چیخ و پکار انہی کی تھی؟ وہ اذیت بھری اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی باریک اور مدھم سی چیخیں کیا وہی بلند کر رہے تھے؟ وہ مخلوق خواہ چھوٹی تھی لیکن پھر ان کی وہ آوازیں کچھ زیادہ ہی مدھم تھیں۔ اگر وہ جاندار اتنے قریب موجود تھے تو ان کی آواز کچھ اور بلند اور واضح ہونی چاہئے تھیں۔

اسی اثناء میں جمشید مختار کی آواز گونجی۔ "تم ان منحوس خبیثوں کی پرواہ مت کرو۔ یہ پیروں تلے کچلے بھی جائیں گے تو مریں گے نہیں ..... صرف اذیت اٹھائیں گے اور یہ اذیتیں ان کا مقدر ہیں ..... میں نے انہیں امر کر دیا ہے ..... یہ ہزاروں سال زندہ رہیں گے مگر اسی طرح اذیتیں اور تکلیفیں اٹھاتے رہیں گے ..... ان کی نہایت طویل عمروں کا ہر لمحہ ان گنت اذیتوں میں گزرے گا۔ یہی ان کی سزا ہے۔ انہوں نے میرا حکم ماننے سے انکار

کیا تھا اور کسی نہ کسی انداز میں میرے خلاف مہمات چلاتے رہے تھے لیکن آخر کار میرے چنگل میں آن پھنسے اور اب میں ان سے حساب برابر کر رہا ہوں۔"

خالد کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کیا اب چھوٹے چھوٹے جانوروں سے بھی جمشید مختار کی ٹھن گئی تھی؟ کیا ان سے بھی کسی قسم کی دشمنی اور مخالفت چل رہی تھی؟ اس نے کچھ اور جھک کر فرش پر ادھر ادھر دوڑتی بھاگتی' رینگتی اور کلبلاتی اس مخلوق کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اسی لمحے اس طویل و عریض ہال نما کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی۔ شاید اس کی سہولت کے لئے جمشید مختار نے کوئی بٹن دبایا تھا۔

اب خالد سٹیج سے نیچے کے حصے میں بکھری ہوئی اس مخلوق کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا اور انہیں دیکھ کر اسے لہو اپنی رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی اپنی بھی سمجھ میں نہ آیا کہ اس میں دہشت زدہ ہونے کی کیا بات تھی۔ وہ مخلوق کچھ اور نہیں' انسان ہی تھے مگر ان میں سے کوئی بھی تین چار انچ سے بڑا نہیں تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے گڈوں کی طرح تھے مگر گڈے گڑیوں میں ایک خاص قسم کا مصنوعی پن دیکھنے میں آتا ہے خواہ انہیں کتنی ہی خوبصورتی اور صفائی سے تیار کیا گیا ہو مگر ان میں وہ مصنوعی پن نہیں تھا۔ وہ سچ مچ کے انسان تھے مگر جسامت میں انتہائی چھوٹے تھے۔

خالد کو اسکول کے زمانے میں پڑھا ہوا ناول "گلیورز ٹریولز" یاد آگیا۔ اس میں تو گلیور اتفاق سے زیر زمین دنیا میں جا نکلا تھا جہاں نہایت مختصر الوجود انسان آباد تھے لیکن یہ تو زمین سے دس منزل اوپر عین اسی بلڈنگ میں واقع ایک کمرہ تھا جہاں وہ خود رہتا تھا۔ اسی کمرے میں سامنے اس کا باس اس شاہانہ کرسی پر ایک شہنشاہ کی سی نخوت اور رعب سے بیٹھا تھا۔

ایک اور چیز ان ننھے ننھے انسانوں کے حقیقی ہونے کی گواہی دے رہی تھی اور وہ یہ کہ ان میں سے بیشتر بری طرح زخمی تھے اور ان کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ کسی کے ننھے سے چہرے پر نیل اور زخم تھے۔ کسی کا چہرہ بالکل ہی کٹا پھٹا تھا۔ کسی کے ہونٹ غائب تھے اور دانت سامنے ہی نظر آ رہے تھے جو نہایت چھوٹے چھوٹے تھے مگر ہونٹوں کے بغیر بھیانک لگ رہے تھے۔ کسی کا چہرہ جھلسا ہوا تھا اور کہیں کہیں سے سوختہ کھال اکھڑ کر لٹک رہی تھی۔

ایک ننھا سا انسان ایسا بھی تھا جس کی دونوں آنکھیں اس کے حلقوں سے نکل کر باہر لٹکی ہوئی تھیں اور اس کے باقی چہرے پر بھی جا بجا چیرے پڑے ہوئے تھے جن سے خون ابل رہا تھا۔ پیشانی پر نیلے گومڑ تھے۔ سر کے بال جگہ جگہ سے اکھڑے ہوئے تھے اور ان جگہوں سے خون رس رہا تھا۔ چند انچ کے ایک انسان کا تو سر ہی تن سے جدا تھا اور وہ خود ہی اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں اٹھائے ننھی ننھی ٹانگوں کو تیزی سے حرکت دیتا ادھر سے



ادھر دوڑا پھر رہا تھا۔

خالد نے یہ بھی دیکھا کہ ان میں سے بعض خود ایک دوسرے پر تشدد کر رہے تھے۔ اس نے دیکھا ایک طرف دیوار کے قریب دو تین ننھے ننھے انسان ایک اپنے ہی جیسے ننھے انسان کو دبوچ اور زمین پر گرائے' اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے تھے۔ ایک اور چھوٹا سا انسان چھوٹی چھوٹی دو دہکتی سلاخیں اس کی آنکھوں میں اتار رہا تھا۔ اسی طرح کسی اور جگہ کوئی ٹولی کسی اور انسان کے اعضاء کاٹنے اور دوسرے ہولناک طریقوں سے اذیتیں دینے میں مصروف تھی۔ ان کی بھیانک چیخیں نہایت مدہم ہونے کے باوجود اعصاب کو کند آری کی طرح کاٹتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

ان کی جو حالت نظر آ رہی تھی شاید وہ انہوں نے خود ہی ایک دوسرے کی بنائی تھی اور اس وقت بھی ان میں سے کچھ دوسروں کا تعاقب کر رہے تھے' انہیں قابو میں کرنے کی فکر میں تھے۔ کسی کے ہاتھ میں ننھی سی آری تھی' کسی کے ہاتھ میں خنجر' کسی کے ہاتھ میں زنجیر' کسی کے ہاتھ میں ہتھوڑا اور نوکیلی سلاخیں ..... سب چیزیں ان کی جسامت کی مناسبت سے تھیں۔ ان کے جسموں پر چیتھڑے جھول رہے تھے اور ان کے ننھے ننھے جسم بھی ان گنت اذیتوں کی کہانیاں سنا رہے تھے۔

کمرے کا فرش ماربل کا تھا اور یوں جھلملا رہا تھا جیسے اس پر ابھی پالش کی گئی ہو۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان ننھے ننھے انسانوں کے جسموں سے بہتا ہوا لہو اس فرش پر گرتا تھا تو یوں بخارات بن کر ہوا میں غائب ہو جاتا تھا جیسے تپتے ہوئے توے پر پانی کا چھینٹا پڑا ہو۔ انہی میں سے کئی خالد کے پیروں تلے آ کر کچلے گئے تھے لیکن ان کی وجہ سے بھی فرش گندہ نہیں ہوا تھا۔ ان میں سے کچھ تو اپنے پامال جسموں کے ساتھ فرش پر پڑے سسک رہے تھے اور کچھ اپنے شکستہ اعضاء کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے گرتے پڑتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے' بین کر رہے تھے یا حلق سے اذیت زدہ سی آوازیں نکال رہے تھے۔

خالد اس تماشے میں الجھ کر رہ گیا۔ دروازے سے لے کر سٹیج کی اونچائی تک وہ ننھے ننھے انسان سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کہرام سا بپا تھا' ایک بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی لیکن نہ جانے کیوں کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی' صرف آج ہی کا قصہ نہیں تھا۔ یہ سلسلہ مستقل اسی طرح چلتا رہتا تھا اور درحقیقت ان میں سے کوئی بھی مرتا نہیں تھا۔ درحقیقت یہ بس عذاب و اذیت کا ایک سلسلہ تھا جو اسی طرح چلتا رہتا تھا۔

"چلے آؤ خالد .....! تم تو انہی میں الجھ کر رہ گئے۔" جمشید صاحب کی بھاری گونجیلی آواز نے خالد کو چونکایا۔ "اس بات کی پرواہ مت کرو کہ یہ پیروں تلے کچلے جائیں گے۔ س کسی کو بھی میرے اس خاص کمرے میں آمد کا شرف حاصل ہوتا ہے وہ اسی طرح

انہیں کچلتا ہوا مجھ تک پہنچتا ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔"

یکدم ہی جیسے خالد کا دل مضبوط سا ہو گیا۔ وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دل سے ان کے لئے جذبہ ترحم نکل گیا۔ وہ سارا منظر اس کی نظر میں کوئی عام اور معمول کا سا منظر ہو کر رہ گیا۔ وہ نپے تلے انداز میں قدم اٹھاتا آگے بڑھنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے دریدہ بدن اور شکستہ حال انسان اس کے پیروں تک آ کر کچلے جانے کے خوف سے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

جمشید صاحب نے بات جاری رکھی۔ "ان میں کچھ میرے پیروکار بھی ہیں۔ میں نے انہیں دوسروں کو اذیتیں دینے کے لئے ان میں چھوڑا ہوا ہے اور کچھ یہ لوگ خود بھی اپنے آپ کو سزا دیتے رہتے ہیں۔ یہ ایک دلچسپ تماشا ہے جسے دیکھنے کے لئے میں کبھی کبھی یہاں آن بیٹھتا ہوں۔"

خالد سٹیج کے قریب جا پہنچا اور تب اس نے دیکھا کہ سٹیج بھی ایک عجیب و غریب جگہ تھا۔ اگر وسط میں جمشید مختار کی شاہانہ کرسی موجود نہ ہوتی تو اس پر کسی قسم کی کوالٹی کنٹرول لیبارٹری یا کسی قسم کی ورکشاپ کا گماں گزرتا جہاں زیادہ تر کام کمپیوٹروں کے ذریعے ہوتا تھا کیونکہ جمشید مختار کے عقب میں سٹیج کے تینوں اطراف میں قطار میں بہت سے کمپیوٹر نصب تھے۔ سب کی اسکرینیں جنہیں "سی ویو" کہا جاتا تھا' روشن تھیں۔ کسی پر کوئی تصویر متحرک تھی اور کسی پر اعداد و شمار رقصاں تھے۔

یہاں بھی جدت و قدامت کا ایک عجیب امتزاج موجود تھا۔ کمپیوٹر کی ہر اسکرین کے سامنے اسی طویل بنچ پر پرانی ساخت کا لکڑی یا مٹی کا ایک بڑا سا پیالہ موجود تھا۔ خالد جب سٹیج پر چڑھا تو اسے یہ بھی نظر آ گیا کہ ہر پیالے میں مختلف رنگ کا کوئی محلول بھرا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر اسکرین کے سامنے ایک پیالہ رکھ کر ان دونوں کا سیٹ بنایا گیا تھا۔ خالد ان کا مصرف سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ تو اس ضمن میں کوئی اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھا۔ کمپیوٹر اسکرینوں یعنی سی ویو اور ان کے سامنے رکھے ہوئے پیالوں کی جوڑیاں کم از کم بیس تھیں۔

خالد نے دیکھا کہ جمشید مختار کی نظر اس کے بدہیئت ہاتھ پر جمی ہوئی تھی پھر انہوں نے مسکراتے ہوئے یہ کہہ کر خالد کو مزید حیران کر دیا۔ "ہاتھ ٹھیک کرانے آئے ہو ... تم چاہتے ہو کہ یہ ہاتھ اصلی حالت میں واپس آ جائے .....؟"



خالد نے ان کی نظروں کی تقلید میں اپنے مکروہ اور بھیانک ہاتھ کی طرف دیکھا۔ ایک بار پھر اسے جھرجھری سی آ گئی۔ وہ جب بھی اس ہاتھ کو دیکھتا تھا' اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی تھی۔ جمشید مختار کی طرف دیکھ کر اس نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جمشید مختار نے اپنے برابر والی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔ "آؤ ...... یہاں آ جاؤ ...... اطمینان سے بیٹھو' پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' یہ ٹھیک ہو جائے گا' اس کمبخت نسرین کی بچی کو لازوال تحفے بھی حفاظت سے رکھنے نہیں آتے' اب بھلا ایک لاکھ سالہ گدھ کا خون بھی اس طرح بے پروائی سے رکھنے والی چیز تھی' جس طرح اس نے رکھا ہوا تھا۔"

خالد ایک بار پھر ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ جمشید مختار کو معلوم تھا خالد کے ہاتھ کی ہیئت کیسے تبدیل ہوئی تھی لیکن انہیں کیسے پتہ چلا تھا؟ اتنی جلد تو خود نسرین ہی آ کر انہیں بتا سکتی تھی اور خالد کو یقین تھا کہ نسرین ان کے پاس نہیں آئی تھی۔

وہ سٹیج پر چڑھنے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ کوئی چیز اس کے جوتوں پر چڑھ رہی تھی اور ٹخنوں سے بھی ٹکرا رہی تھی۔ اس نے جھک کر دیکھا' تین چار ننھے ننھے انسان درحقیقت اس کے پیروں سے لپٹنے کی کوشش کر رہے تھے' وہ بھی زخمی اور بدحال تھے' ان کی حالت قابل رحم تھی۔ انہوں نے خالد کو جھکتے دیکھا تو بازو پھیلا پھیلا کر کچھ کہنے لگا۔ خالد نے بھنبھناہٹ کی سی آوازوں میں کان لگا کر سنا۔

وہ انتہائی دردناک اور فریادی سے انداز میں اپنی دانست میں غالباً" چلا چلا کر فریاد کر رہے تھے۔ "ہمیں یہاں سے چھڑا دو ...... ہمیں یہاں سے نجات دلا دو ...... ہمیں یہاں سے رہائی دلا دو ......"

خالد نے دیکھا ان کے چھوٹے چھوٹے چہروں پر نیل اور زخم تھے' آنکھوں سے آنسو اور ایک کی آنکھوں سے تو خون بہہ رہا تھا' ان میں سے ایک کی صرف ایک ہی آنکھ تھی' دوسری آنکھ کی جگہ صرف ننھا سا تاریک گڑھا تھا جس سے خون کی لکیر چھوٹے سے رخسار پر بہہ رہی تھی' ان کی آوازیں گو کہ بہت مدہم تھیں لیکن ان کا تاثر وہی تھا جو کسی بھی

سمج قدوقامت کے انسان کی آواز کا ہو سکتا تھا۔ خالد کی رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

اس کے بعد اس سے قطعی غیرارادی سے انداز میں ایک حرکت سرزد ہوئی' اس نے یکے بعد دیگرے اپنے پاؤں جھٹک ڈالے۔ انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی کے پیروں پ چوہے یا رینگنے والے کوئی چھوٹے موٹے جانور چڑھنے لگے ہوں اور اس نے اضطراری سے انداز میں پاؤں جھٹکے ہوں۔ وہ مختصر الوجود' زخمی اور بدحال انسان دور جا کر گرے۔ خال نے ان کی دردناک چیخیں اور کراہیں سنیں' وہ کچھ اور خوفزدہ سا ہو گیا مگر اسی لمحے جمشی مختار کی ہنسی گونجی۔ خالد نے جلدی سے سیدھا ہوتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

وہ سفاکانہ بے پروائی سے بولے۔ "تم نے بہت اچھا کیا' یہ اسی سلوک کے مستح ہیں' تم ان کی طرف زیادہ توجہ مت دو اور یہاں آ کر بیٹھ جاؤ ......" انہوں نے ایک بار پھ کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

خالد تقریباً" اچھل کر اوپر سٹیج پر جا پہنچا اور کرسی پر تقریباً" ڈھیر ہو گیا۔ اس ک سانس تیز تیز چل رہی تھی اور پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ جمشید مختار اس کی طرف دیکھ کر کچھ یوں مسکرائے جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کو اس کی نادانی اور کم علمی وجہ سے خواہ مخواہ پریشان دیکھ کر محظوظ ہو رہا ہو۔

خالد قدرے ہکلاتے ہوئے بولا۔ "کیا نسرین یہاں آئی تھی؟ کیا ...... اس نے آپ بتایا ہے کہ میرے ہاتھ کی یہ حالت کس طرح ہوئی ہے؟"

جمشید مختار متانت سے مسکراتے ہوئے بولے۔ "اس قسم کی باتیں جاننے کے ہمیں نسرین کی خدمات کی ضرورت نہیں ...... ہمارے پاس اور بہت سے ذرائع ...... بہ سے طریقے ہیں' کبھی کبھی تو پرندے آ کر ہمارے کانوں میں سرگوشیاں کر جاتے ہیں کہ فلا جگہ کیا ہو رہا ہے ......؟"

پھر انہیں گویا کچھ خیال آیا اور وہ بغور خالد کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "تم پریشان اور تھکے ماندے لگ رہے ہو' میرا خیال ہے پہلے تمہیں کچھ پلانا چاہئے تاکہ میزبانی بھی ادا ہو اور تمہاری حالت بھی کچھ سنبھلے ......"

یہ کہہ کر انہوں نے ہوا میں ہاتھ بڑھایا اور ان کے ہاتھ میں شیشے کا ایک نہا خوبصورت قسم کا گلاس آ گیا جس میں نہایت خوش رنگ قسم کا مشروب بھرا ہوا تھا۔ خ نے زندگی میں کئی بار شعبدے بازوں کو اس طرح ہاتھ بڑھا کر ہوا میں سے کوئی چیز پکڑ دیکھا تھا۔ کیا جمشید مختار بھی کسی قسم کے شعبدہ باز تھے؟ خالد کے ذہن میں خیال ابھرا بات اس کے اپنے ہی دل کو نہیں لگی۔ اس عمارت میں جو کچھ وہ اب تک دیکھ چکا محض شعبدہ بازی نہیں ہو سکتی تھی۔



جمشید مختار نے گلاس اس کی طرف بڑھایا تو وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "یہ شراب تو نہیں ہے نا ......؟"

جمشید مختار نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ وہ ایک بار پھر اسی طرح محظوظ ہوئے تھے جیسے انہوں نے کسی بچے کی معصومانہ بلکہ شاید احمقانہ سی بات سن لی ہو۔

"شراب بھی اگر پی لوگے تو ایسی کون سی بڑی بات ہے' شراب تو بہت معمولی سی چیز ہے' یہ اس سے بہت آگے کی چیز ہے۔" انہوں نے کہا اور گلاس خالد کو تھما دیا۔ اس کا خنک سا لمس خالد کو بہت بھلا لگا اور اس کا دل چاہا کہ وہ مشروب خواہ کچھ بھی تھا' وہ اسے غٹا غٹ ایک ہی سانس میں پی جائے مگر نہ جانے کون سی غیبی طاقت کی وجہ سے وہ کچھ ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔

جمشید مختار گویا اسے تسلی دیتے ہوئے بولے۔ "میں مذاق کر رہا تھا' یہ کچھ بھی نہیں ...... محض ایک عام سا شربت ہے تاہم گلی کوچوں میں ملنے والے شربتوں سے بہتر ہے' بے فکر ہو کر پی جاؤ اور پھر اپنی حالت دیکھو۔"

خالد کو گویا بس اتنی سی تسلی ہی کی ضرورت تھی۔ اس نے گلاس منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جسم میں گویا ایک نئی زندگی اتر چلی آئی' اس کی تمام نقاہت' کمزوری اور درماندگی یکدم دور ہو گئی' اسے صرف اپنی جسمانی ہی نہیں ذہنی کیفیات میں بھی زبردست تبدیلی محسوس ہوئی' اب وہ شکوک و شبہات میں مبتلا ایک حیران پریشان شخص نہیں بلکہ ایک نہایت پراعتماد اور پرسکون آدمی تھا' اس کا دل گویا ایک نئے جوش و خروش اور امنگوں سے بھر گیا تھا۔

اس نے حیرت سے خالی گلاس کی طرف دیکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی حالت میں یہ سارا انقلاب محض اس شربت کے گلاس سے آیا تھا۔ وہ تو واقعی کوئی جادوئی سا مشروب تھا۔ اگر ایسے ہی طلسمی سے اثرات رکھنے والا مشروب تھا پھر تو بہتر تھا کہ اس کا ایک اور گلاس پی لیا جائے۔

جمشید مختار نے گویا اس کے خیالات پڑھتے ہوئے اسے ایک مرتبہ اور حیران کر دیا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے نفی میں انگلی ہلا کر بولے۔ "فی الحال صرف ایک ہی گلاس کافی ہے' اسے ہضم کرنے کا بھی' تو ہر ایک کا ظرف نہیں ہوتا' ابھی تم صرف ایک ہی گلاس ہضم کرنے کے قابل ہوئے ہو' وہ بھی صرف اس لئے کہ تمہیں اس کی اشد ضرورت تھی۔"

سٹیج سے نیچے اب بھی گویا ایک میدان حشر سا پھیلا ہوا تھا جس میں بدستور حشر بپا تھا۔ وہی چیخ و پکار' وہی فریادیں' وہی آہ و بکا جاری تھی۔ نہایت مدہم سی آوازیں اب بھی اس تک پہنچ رہی تھیں' لیکن اب جیسے اسے ان کی ذرا بھی پرواہ نہیں رہی تھی اور نہ ہی

وہ اس پر ذرا بھی اثر انداز ہو رہی تھیں۔ اب اس کے جسم میں قطعاً" جھرجھری نہیں دو
رہی تھی۔ سب کچھ بالکل بے اثر ہو چکا تھا۔ شاید یکایک ہی اس کے اعصاب فولاد کی
طرح مضبوط ہو گئے تھے ...... یا پھر شاید وہ بے حس ہو گیا تھا۔ بات خواہ کوئی سی بھی درست
تھی لیکن اس کے لئے یہ تجربہ خوشگوار تھا۔ یہاں کے ماحول میں انسان کو جو کچھ دیکھنے
مل سکتا تھا' جو کچھ اس کے ساتھ پیش آ سکتا تھا اور جیسے جھٹکے اسے لگ سکتے تھے' انہیں
مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ایسا ہو جانا ہی بہتر تھا۔

جمشید مختار بغور اس کی طرف دیکھ کر طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "ہا
...... اب ٹھیک ہے' اب تمہارے چہرے پر بشاشت آ گئی ہے۔" انہوں نے اس کے ہا
سے گلاس لے کر دور ہوا میں پھینک دیا' وہ نہ جانے کہاں چلا گیا۔

خالد اس پر صرف ایک لمحے کے لئے حیران ہوا لیکن اس نے حیرت کا اظہار نہیں
البتہ مشروب پر وہ اظہار خیال کئے بغیر نہ رہ سکا۔ "یہ تو واقعی بہت ہی حیرت انگیز مشرو
تھا۔" پھر اس نے اپنی دانست میں مذاق کیا۔ "کہیں یہ آب حیات تو نہیں تھا؟"

جمشید مختار اب نہایت متانت سے بولے۔ "یہی سمجھ لو۔"

خالد نے اسے مذاق پر محمول کیا اور اصل مسئلے کی طرف آتے ہوئے اپنا ہاتھ
اونچا کر کے بولا۔ "یہ میرا ہاتھ ......!"

جمشید مختار بے پروائی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔ "بھئی کیا ہاتھ ہا
رکھی ہے' ہم نے تمہیں یہاں نہ جانے کیا کچھ دکھانے کے لئے بلایا ہوا ہے' تمہیں ہا
پڑی ہوئی ہے۔"

خالد کی سمجھ میں نہ آیا کہ انہیں کیسے بتائے اس کے لئے تو فی الوقت اس کا ہا
سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ جمشید مختار کو گویا یکدم خیال آیا کہ ان کے لہجے سے اس کی
تشفی نہ ہوئی ہو۔ فوراً" نرمی اور شفقت سے بولے۔ "ویسے تم ہو بے وقوف آدمی! تم
جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس ہاتھ کو سینے سے لگا کر رکھتا' تمہیں کافی حد تک تو اندازہ
چکا ہے کہ اس ہاتھ سے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے' اس ہاتھ سے تو نہ جانے کس کس
حشر کیا جا سکتا ہے' کس کس کا تختہ الٹا جا سکتا ہے' شہر کے گلی کوچوں میں کیا قیامت
جا سکتی ہے' یہ صحیح معنوں میں ایک شیطانی ہاتھ ہے۔"

"لیکن اسے جسم سے منسلک رکھنے کے لئے بڑے حوصلے کی ضرورت ہے
ذرا ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا۔ "شاید وہ فی الحال مجھ میں نہیں ہے۔"

"چلو خیر ...... کوئی بات نہیں ...... حوصلہ بھی رفتہ رفتہ آ جائے گا۔" جمشید
طمانیت سے سر ہلایا۔ "فی الحال ہم تمہیں اس ہاتھ سے نجات دلا دیں گے ......
کتنا زیادہ صحیح ہو گا کہ فی الحال ہم تمہیں اس ہاتھ سے محروم کر دیں گے ......



سے پہلے ہم تمہیں کچھ دکھانا چاہتے ہیں۔"

ان کی شاہانہ طرز کی طلائی کرسی حالانکہ ریوالونگ نہیں تھی لیکن وہ اس پر بیٹھے
بیٹھے گھوم گئے اور اس کے ساتھ ہی خالد کی کرسی بھی گھوم گئی حالانکہ وہ بھی ریوالونگ
نہیں تھی۔ اب ان کا رخ کمپیوٹروں کی اسکرینوں کی طرف تھا۔ ان کے سامنے بھی ان کی
قطار تھی اور دائیں بائیں بھی انہی کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا' ہر اسکرین کے سامنے قدیم ساخت
کا بڑا سا لکڑی کا پیالا موجود تھا جس میں کسی نہ کسی رنگ کا کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔

جمشید صاحب اپنی کرسی اسکرینوں کی قطار کے قریب لے گئے' اس کے ساتھ ہی
خالد کی کرسی بھی خود بخود کھسک گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دونوں ایک ہی نظام سے
منسلک تھیں لیکن خالد سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ نظام کس طرح کام کرتا تھا۔

ان کے سامنے اسکرینیں تو بہت سی تھیں لیکن کنسول یا کی بورڈ ایک ہی تھا۔ جمشید
صاحب نے ایک بٹن دبایا اور ان کے سامنے ایک اسکرین روشن ہو گئی' دوسرے ہی لمحے
خالد بری طرح چونک اٹھا کیونکہ اسکرین پر وہ خود موجود تھا' وہ لفٹ سے نکل کر اپنے
اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک نسرین ایک ستون کی اوٹ سے نکل کر اس کے
سامنے آ گئی اور پھر سرگوشی سے مشابہ اس کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔

خالد اپنی جگہ ساکت بیٹھا تھا' یہ سب کچھ بالکل اس طرح تھا جیسے کچھ دیر پہلے تک
خالد کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اور وہ جن حالات سے بھی گزرا تھا' کسی نادیدہ ویڈیو کیمرے کی
آنکھ انہیں دیکھ رہی تھی اور ان کی ویڈیو فلم تیار ہو رہی تھی جو اب وی سی آر کے ذریعے
دیکھی جا رہی تھی' سارا منظر اسی ترتیب سے چل رہا تھا جس ترتیب سے خالد کے ساتھ
واقعات پیش آئے تھے' اس کی اور نسرین کی تمام گفتگو بھی سنائی دے رہی تھی۔

"کیا ہماری لاعلمی میں ہماری ویڈیو بن رہی تھی؟" آخر خالد سرسراتی سی آواز میں
پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

جمشید مختار گویا اس کی سادگی سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنس کر بولے۔ "ارے نہیں
بے وقوف! یہ ویڈیو نہیں ہے اور نہ ہی کسی کمپیوٹر میں کوئی ہارڈ ڈسک وغیرہ چل رہی ہے'
میں نے تم سے کہا تھا نا کہ نئے دور کی ان شیطانی سی ایجادوں کو استعمال کرنے میں ہمیں
بھی بڑا لطف آتا ہے یوں تو یہ اس قسم کی چیزیں خود بھی جدید ایجادات میں شمار ہوتی ہیں
لیکن ان کے ساتھ جب ہماری کچھ خفیہ طاقتیں مل جاتی ہیں تو پھر ہم انہیں اور بھی زیادہ
دلچسپ' حیرت انگیز اور کار آمد طریقوں سے استعمال کرتے ہیں' یہ چیزیں بے شمار ایسے کام
دکھانے لگتی ہیں جو ان کے دائرہ کار میں ابھی تو کیا شاید آئندہ سو دو سو سال تک بھی شامل
نہ ہو سکیں۔"

خالد کبھی اسکرین کی طرف اور کبھی جمشید مختار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جمشید گویا اسے

طالب علم فرض کر کے ایک استاد کی طرح سمجھانے لگے۔ "تمہیں شاید معلوم ہو کہ کائنات میں جاندار مخلوق یا بے جان اشیاء کی جو بھی نقل و حرکت ہوتی ہے، جو بھی تصویر بنتی ہے جو بھی فلم بنتی ہے اور کسی بھی سسٹم کے ذریعے نشر ہوتی ہے، فضا میں ان سب کی لہریں باقی رہ جاتی ہیں، اگر اس دنیا کے سائنس دان ان لہروں کو تلاش کر سکیں اور انہیں دوبارہ تصویری شکل میں منتقل کرنے کا کوئی طریقہ ایجاد کر سکیں تو وہ اب بھی ہر گزرے ہوئے واقعے کی تصویر یا فلم حاصل کر سکتے ہیں مثلاً" ایک سال پہلے نیچے والی سڑک پر کوئی حادثہ ہوا تھا ہم اس وقت یہاں موجود نہیں تھے ہم نے وہ حادثہ نہیں دیکھا اس کی کوئی تصویر نہیں بنی لیکن فضا میں آج بھی اس کی کچھ خاص لہریں موجود ہوں گی، اب ہمارے پاس کوئی ایسا آلہ ہونا چاہئے جو صرف ایک سال پہلے کے ایک مخصوص وقت کی لہریں تلاش کر سکے کیونکہ فضا میں لہریں تو ازل سے ہونے والے ہر واقعے اور ہر نقل و حرکت کی موجود ہیں پھر وہ آلہ ان لہروں کو تصویر یا فلم کی صورت میں منتقل کر سکے، سائنس دان اس تھیوری آج کل سر کھپا رہے ہیں اور ماضی کے واقعات کی تصویر یا آواز حاصل کرنے کی کوششوں میں مرے جا رہے ہیں، انہیں معمولی سی کامیابی ہوئی ہے۔"

خالد کمپیوٹر اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے یقینی سے بولا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ یہ جو کچھ ہوا تھا، اس کی کوئی فلم یا ویڈیو وغیرہ نہیں بنی تھی بلکہ یہ سارے مناظر ... کے بعد آپ کے اس کمپیوٹر پر آ رہے ہیں؟"

"ہاں ....." جمشید صاحب نے جواب دیا۔ "یہ مناظر تو میں نے چند لمحے پہلے ہی ... کمرے میں آ کر ری پروڈیوس کر کے دیکھے تھے اور اب تمہیں دکھانے کے لئے دوبارہ ... رہا ہوں ..... اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ ویڈیو، ڈسک یا کسی بھی اور شکل میں ... نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے بس اسی کمپیوٹر میں ہے۔ اگر تم اسے ویڈیو فرض کر لو تو یہ ... ویڈیو ہے جو یہ واقعہ رونما ہو چکنے کے بعد شوٹ ہوئی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے آپ کہیں بھی رونما ہونے والا کوئی واقعہ ..... خواہ وہ کتنا عرصہ پہلے رونما ہوا ہو، یہاں بیٹھ کر دیکھ سکتے ہیں ..... خواہ اس وقت اس واقعے کی ... تصویر تک نہ بنی ہو اور وقوعے کے وقت آپ اس جگہ سے میلوں دور رہے ہوں؟" ... کے لہجے میں اب بھی بے یقینی تھی۔

"بے شک ....." جمشید صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔ "بلکہ ہمارا معاملہ تو ... سے بھی بہت آگے کا ہے۔ ہم تو وہ واقعہ بھی دیکھ سکتے ہیں جو ابھی رونما ہی نہیں ہوا مگر جسے بہرحال رونما ہونا ہے۔ ہم نے ان شیطانی آلات کو صرف ماضی کے مناظر ... کرنے کے قابل ہی نہیں بنایا بلکہ مستقبل میں جھانکنے کے قابل بھی بنا دیا ہے۔ ا... کے سائنس دان یہ کام شاید ہزاروں سال میں بھی نہ کر سکیں کیونکہ سائنسی ترقی کی



حد ہے۔ ایک مقام آئے گا جہاں پہنچ کر سائنسی ترقی رک جائے گی۔ اس سے آگے سائنس دانوں کو راستہ نہیں ملے گا۔ وہ ایک بند گلی میں کھڑے ہوں گے لیکن کچھ قوتیں ایسی ہیں جن کی کوئی حدود نہیں ہیں۔"

خالد پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون سی قوتیں ہیں ..... لیکن نہ پوچھ سکا ..... نہ جانے، کون سی قوت نے اسے احساس دلایا کہ جمشید مختار شاید اس کے سوال کا فی الحال جواب نہ دیں بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس کے سوال کو پسند ہی نہ کریں۔ ویسے بھی اس وقت اس کی نظریں اسکرین پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اسکرین پر اس وقت نسرین اس عالم میں دکھائی دے رہی تھی جب خالد کو اس کا قد اپنے قد سے بھی کہیں لمبا ہوتے محسوس ہوا تھا اور پھر وہ آ کر اس کی گردن پر جھک گئی تھی۔

اس منظر کو خالد خود بھی اب توجہ اور باریک بینی سے دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ جب یہ مرحلہ اس پر گزرا تھا اس وقت اس کے حواس کچھ صحیح طور پر کام نہیں کر رہے تھے ویسے بھی اس وقت وہ سب کچھ اس پر گزر رہا تھا، اب ایک تماشائی کے طور پر اسے دیکھنا کچھ اور بات تھی۔ وہ ابھی تک اس سلسلے میں شبے میں بھی مبتلا تھا۔ کیا واقعی نسرین نے اس کے حلقوم میں دانت پیوست کئے تھے؟ کیا واقعی اس نے اس کا خون پیا تھا؟ کیا وہ انسان کے بجائے ویمپائر قسم کی مخلوق تھی؟ ان سوالوں کا ابھی تک اس کے پاس کوئی یقینی جواب نہیں تھا ..... یا پھر شاید وہ یقین کرنا نہیں چاہتا تھا۔ خود کو شک میں رکھنا ہی اسے بہتر محسوس ہو رہا تھا لیکن اب اسکرین پر سب کچھ دیکھ کر اسے یقینی جواب مل سکتا تھا۔

مگر عین اس وقت جب نسرین اپنے پتلے پتلے سفاک ہونٹوں پر ایک خوابناک سی مسکراہٹ لئے اس کی طرف بڑھ رہی تھی اور ہونٹوں کے عقب سے جھانکتے ہوئے اس کے دانت معمول سے کچھ زیادہ نوکیلے دکھائی دے رہے تھے، اسکرین دھندلانے لگی اور پھر منظر مکمل طور پر ہی اسکرین سے غائب ہو گیا جیسے اگر کوئی کیمرہ ویڈیو بنا رہا تھا تو اس کے لینز کے سامنے کچھ آ گیا تھا۔ شاید کوئی موٹا اور دھندلا سا پردہ .....

خالد نے مایوسی سے جمشید مختار کی طرف دیکھا تو وہ معذرت خواہانہ سے انداز میں بولے۔ "شاید ہماری خفیہ قوتیں بھی بعض جگہ ناکام ہو جاتی ہیں۔ وہ بعض مناظر ہمیں نہیں دکھا سکتیں۔"

خالد کو کچھ یوں لگا جیسے جمشید مختار خود ہی وہ منظر اسے دکھانا نہیں چاہ رہے تھے۔ شاید اس میں کوئی مصلحت تھی۔ گو کہ انہوں نے کوئی بٹن نہیں دبایا تھا، منظر خود بخود ہی اسکرین پر بتدریج دھندلاتے ہوئے غائب ہو گیا تھا لیکن کوئی بعید نہیں تھا کہ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنی طاقت استعمال کی ہو۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ چیزیں کس حد تک سائنسی اصولوں کے تابع تھیں اور کس حد تک جمشید کی پراسرار قوتوں کے تحت کام کرتی تھیں۔

حدود کا کچھ تعین تو تھا نہیں۔

جمشید مختار گویا اس کا دھیان اسکرین کی طرف سے ہٹانے کے لئے گپ شپ کے سے انداز میں بولے۔ "یہ نسرین ویسے تو اچھی عورت ہے۔ کبھی یہ ہمارے خاص آدمیوں میں سے تھی لیکن کچھ عرصے سے یہ گویا پٹڑی سے اتر گئی ہے۔ کبھی کبھی یہ ہمارے مفادات کے خلاف بھی بات کرنے لگتی ہے۔ ایک طرح سے چھوٹی موٹی غداری پر اتر آتی ہے ..... اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی کوئی بات ہم سے چھپی نہیں رہ سکتی ..... اس کے باوجود کبھی کبھار یہ کسی نہ کسی سے کوئی بات کئے بغیر رہ نہیں سکتی۔ بس اس میں یہی ایک خرابی پیدا ہو گئی ہے جس کا علاج ہم سے بھی نہیں ہو رہا۔ قصور اس بے چاری کا بھی نہیں ہے۔ یہ مجبور ہے۔ اس کے ذہن ..... اس کی روح میں کچھ ایسی دراڑیں پیدا ہو گئی ہیں جہاں سے کچھ دوسری قوتوں کے اثرات داخل ہو جاتے ہیں جس طرح قرنطینہ میں کبھی کبھی ذرا سی بے احتیاطی کی وجہ سے بیرونی جراثیم داخل ہو جاتے ہیں یا اندر کے جراثیم باہر پہنچ جاتے ہیں۔ ہم نے بڑی محنت سے اس کے ذہن کا قرنطینہ بنایا تھا مگر اب یہ قرنطینہ ناکارہ ہوتا جا رہا ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئے تو خالد کی نظر اس دوران ایک بار پھر اپنے ہاتھ پر پڑ گئی۔ اس کے دل میں ایک بار پھر جیسے کوئی زخم ٹیس دے اٹھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

"سر وہ میرا ہاتھ ....."

جمشید مختار ہلکی سی بیزاری سے بولے۔ "ارے بھئی تمہیں کیوں اپنے ہاتھ کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ جب ہم نے کہہ دیا ہے کہ تمہارا ہاتھ ٹھیک ہو جائے گا تو تم کیوں پریشان ہو؟ ہم جو کہہ دیتے ہیں وہ کر کے ضرور دکھاتے ہیں ....."

ان کے نزدیک گویا یہ قطعاً" کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا اور ان کے خیال میں اس پر فوری توجہ دینا ضروری نہیں تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "ابھی تو ہم تمہیں کچھ اور دکھانا چاہ رہے ہیں۔ آج صحیح معنوں میں تم سے ہمارا تعارف ہو رہا ہے ..... لیکن یہ بھی ابتدائی تعارف ہے۔ اس سے پہلے تو ہماری تمہاری واقفیت بہت ہی سطحی سی ..... بہت ہی رسمی سی تھی۔"

خالد ان کے ان الفاظ پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے ان کی فرم میں ایک سینئر پوزیشن پر کام کرتے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے۔ وہ انہی کی بلڈنگ میں انہی کے زیر سایہ رہ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ان کے قریبی لوگوں میں شامل ہو چکا تھا لیکن وہ کہہ رہے تھے کہ آج ان سے ابتدائی تعارف ہو رہا تھا ..... لیکن شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ خالد جو کچھ آج دیکھ رہا تھا اور جو کچھ اس کے ساتھ آج پیش آ رہا تھا اس کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے تو جمشید مختار کے اپارٹمنٹ میں اس قسم کے کسی کمرے کی



موجودگی کا بھی تصور نہیں کیا تھا۔ شاید اس دنیا کے دروازے صحیح معنوں میں اس کے لئے آج ہی کھل رہے تھے۔

جمشید مختار اپنی کرسی کھسکا کر ایک اور اسکرین کے قریب لے گئے۔ ان کی کرسی کے ساتھ ساتھ خالد کی کرسی خود بخود کھسک گئی۔ جمشید مختار ایک بٹن دباتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر بولے۔ "اس اسکرین پر ہم کسی بھی جگہ کے وہ واقعات دیکھ سکتے ہیں جو اس وقت جاری ہیں۔"

سکرین پر یکدم کلوز اپ میں ایک چہرہ نمودار ہوا جسے دیکھ کر خالد چونک اٹھا۔ وہ ایک شناسا چہرہ تھا اور کچھ ایسا قابل دید نہیں تھا۔ تاریک سی رنگت' موٹے موٹے نقش' گھنی' نوکیلی اور بچھو کی دم کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھوں کے نیچے سے جھانکتے ہوئے بھدے سیاہ ہونٹ' چیچک کے گہرے داغ اور سرخ سرخ آنکھیں۔ عام حالت میں بھی یہ چہرہ اچانک دیکھ کر انسان ایک لمحے کے لئے تو ڈر جاتا تھا لیکن اس وقت تو یہ چہرہ اور بھی بھیانک لگ رہا تھا۔

بڑی سی پگڑی پیشانی پر جھکی ہوئی تھی۔ موٹی موٹی ابھری ہوئی آنکھیں خمار زدہ ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ سرخ لگ رہی تھیں اور ان میں کچھ زیادہ ہی خباثت و سفاکی ناچ رہی تھی۔ یہ آنکھیں شاید اس وقت کوئی دلچسپ تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ اس سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

"اسے پہچانتے ہو؟" جمشید صاحب نے فوراً" ہی پوچھا۔

"کیوں نہیں ....." خالد مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس کو دیکھے اتنا عرصہ تو نہیں گزرا کہ بھول جاتا۔ ویسے بھی یہ تو میرا وہ کلائنٹ ہے جس کی وجہ سے درحقیقت میں آپ تک پہنچا تھا۔"

"یا یوں کہو کہ ہم تم تک پہنچے تھے۔" جمشید نے مسکراتے ہوئے تصحیح کی۔ اسکرین پر منظر یوں دھیرے دھیرے تبدیل ہو رہا تھا جیسے اس جگہ کوئی کیمرہ کام کر رہا ہو جو کلوز اپ دکھانے کے بعد اب دوسری سمت میں جا رہا ہو۔ ساتھ ہی کسی درندے کی اذیت بھری غراہٹیں اور کتوں کے غضبناک انداز میں بھونکنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

خالد گویا مزید وضاحت کے لئے بولا۔ "یہ نشاط نگر کے شریف وڈیرے کا خبیث بیٹا نیاز علی ہے۔"

"بالکل ٹھیک پہچانا تم نے ..... شاید ایسے ہی لوگوں کے لئے وہ ضرب المثل بنی ہے ..... "ولی کے گھر میں شیطان" ..... "لیکن خیر..... ہمیں تو ایسا نہیں کہنا چاہئے۔ یہ تو ہر طرح سے ہمارا اپنا آدمی ہے۔"

"اپنا آدمی ..... کیا مطلب؟" خالد نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ ذرا اسکرین پر یہ منظر تو دیکھو۔ کیا دلچسپ تماشا چل رہا ہے۔" جمشید مختار ذرا جوش سے بولے۔

خالد دوبارہ پوری طرح اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسکرین پر اس وقت جو منظر دکھائی دے رہا تھا غالباً" نیاز علی وہی دیکھ رہا تھا تاہم اب وہ اسکرین پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ منظر بڑا صاف اور واضح دکھائی دے رہا تھا۔ ایک میدان میں بلیاں اور بانس وغیرہ نصب کر کے بڑی بڑی لائٹیں لگائی گئی تھیں جنہوں نے میدان کے ایک خاصے بڑے مرکزی حصے کو بقعہ نور بنا رکھا تھا۔

اس حصے میں زمین پر ہی گویا ایک طرح کا رنگ تیار کیا گیا تھا جس میں چھ سات رنگا رنگ کتوں نے ایک جسیم ریچھ کو زمین پر ڈھیر کر رکھا تھا اور اس کی بوٹیاں ادھیڑنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ اب بھی ان کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ چاروں طرف لوگ جمع تھے اور شاید دم سادھے بڑے اشتیاق اور انہماک سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ایک طرف ذرا اونچا سٹیج بنا ہوا تھا جس پر چند کرسیاں سجی ہوئی تھیں۔ نیاز علی شاید انہی میں سے ایک کرسی پر موجود تھا لیکن اسکرین پر اس وقت جتنا منظر دکھائی دے رہا تھا اس میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے صرف پاؤں دکھائی دے رہے تھے۔ باقاعدہ فلم ہی کی ٹیکنیک کے ساتھ منظر فریم ٹو فریم چل رہا تھا۔ کتوں اور ریچھ کی بھیانک آوازوں سے فضا مرتعش تھی۔

خالد کے لئے یہ تماشا نیا نہیں تھا۔ حیدر آباد میں وہ دیہی علاقوں سے زیادہ دور نہیں تھا اور اسے کئی مرتبہ ادھر ادھر جانے اور قیام کرنے کا موقع ملا تھا۔ دو تین مرتبہ اس نے کتوں اور ریچھ کی لڑائی بھی دیکھی تھی تاہم اس کا خیال یہی تھا کہ دن کی روشنی میں ہی اس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ لیکن آج وہ پہلی بار یہ لڑائی فلڈ لائٹس کے دائرے میں رات کے وقت دیکھ رہا تھا۔ لڑائی یقیناً" آخری مرحلے پر تھی۔ اس میں کتوں کا پلہ بھاری رہا تھا اور انہوں نے ریچھ کو ڈھیر کر لیا تھا۔ خالد نے جو دو تین لڑائیں دیکھی تھیں ان میں کتے بھی مریل قسم کے تھے اور ریچھ بھی کچھ ایسے جسیم نہیں تھے لیکن اس لڑائی میں کتے بھی اچھی نسلوں اور خوب پلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے جبکہ ریچھ بھی کمزور اور فاقوں کا مارا معلوم نہیں ہوتا تھا مگر لگتا تھا کہ بے چارہ زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔

میدان کی مٹی بتا رہی تھی کہ اس نے زندگی اور موت کی یہ جنگ بہرحال بڑی جگری سے لڑی تھی۔ مٹی جا بجا خون سے تر تھی۔ کتے بھی شدید زخمی حالت میں دکھائی دے رہے تھے۔ ایک کتا تو ایک طرف پڑا سسک رہا تھا۔ اس کی آنتیں اور اوجھڑی وغیرہ نکل کر زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا جبڑا بھی چرا ہوا تھا اور وہ زمین پر پڑا جھٹکے سے رہا تھا۔ یقیناً" وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ کہیں کہیں ریچھ کی کھال کے ٹکڑے بھی پڑے دکھائی دے رہے تھے جو کچھ گوشت سمیت کتوں نے ادھیڑ ڈالے تھے۔ ریچھ کے



جسم پر کہیں کہیں سرخ گڑھے سے دکھائی دے رہے تھے جن سے خون بہہ رہا تھا۔ کتے اسے بھنبھوڑ رہے تھے اور وہ شاید اب بے دم ہو چکا تھا مگر پھر اس عالم میں بھی ایک کتا اس کے قابو میں آ گیا اور وہ اسے بازوؤں میں دبوچ کر قلا بازی کھا گیا۔ وہ کتا اس کے اور باقی کتوں کے نیچے چھپ گیا۔ نہ جانے اس کا کیا حشر ہو رہا تھا۔ باقی کتے اب اسے ایک نئے جوش و خروش سے بھنبھوڑ کر شاید اپنے ساتھی کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

آخر کار دو کتے جو سب سے طاقتور اور مضبوط دکھائی دیتے تھے' دو طرف سے ریچھ کی گردن دبوچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ باقی کتوں کی نسبت زخمی بھی کم تھے۔ انہوں نے ریچھ کی گردن ایسی پکڑی کہ پھر وہ بہت لوٹ پوٹ ہوا' اس نے پنجے بھی مارے اور کتوں کو دبوچنے کی بھی کوشش کی مگر وہ نہ تو اس کے قابو میں آئے اور نہ ہی انہوں نے اس کی گردن چھوڑی۔ اس دوران میں دوسرے کتے بھی اپنا کام دکھاتے رہے۔ انہوں نے ریچھ کا باقی جسم جگہ جگہ سے مزید ادھیڑ ڈالا تھا۔ ریچھ پہلے ہی بے دم تھا۔ آخر کار اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس کا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ اس کی گھٹی گھٹی سی کربناک آوازیں مدہم پڑتی جا رہی تھیں اور جسم کو تشنجی سے انداز میں جھٹکے لگنے لگے تھے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ دم توڑ رہا تھا۔ زمین اس کے خون سے مزید رنگین ہوتی جا رہی تھی۔

اس دوران میں کئی بار نیاز علی کا چہرہ بھی اسکرین پر آیا۔ اس کا اشتیاق اور انہماک دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ اس منظر سے گویا کوئی انجانی لذت کشید کر رہا تھا۔ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا تھا۔ جمشید مختار شاید بار بار اس چہرے کو دیکھنا چاہ رہے تھے جبھی وہ اسکرین پر نمودار ہو رہا تھا۔ یہ آلات کسی سسٹم سے زیادہ جمشید کی خواہشات کے تابع معلوم ہوتے تھے۔ نیاز علی کا چہرہ اور اس کے عجیب و غریب تاثرات دیکھ کر جمشید مختار کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔

جس وقت وہ عجیب و غریب شیطانی سا کمپیوٹر آن کیا گیا اس وقت ریچھ اور کتوں کی لڑائی آخری مراحل میں ہی تھی۔ چند منٹ میں اس کا فیصلہ ہو گیا۔ زندگی اور موت کی اس جنگ میں کتے جیت گئے۔ ریچھ زندگی کی بازی ہار گیا۔ میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔ کتوں کو ..... یا پھر شاید ان کے مالکوں کو داد مل رہی تھی۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ ریچھ اور کتوں یعنی جنگ کے دونوں فریقوں کا مالک نیاز علی ہی رہا ہو۔

کچھ لوگ میدان میں آئے اور مردہ کتے اور ریچھ کی لاش کو اٹھا کر لے گئے۔ باقی کتوں کو بھی پٹے اور زنجیریں ڈال کر لے جایا جانے لگا۔ ان کی حالت ابھی تک غیر تھی۔ نیاز علی کا چہرہ ایک بار پھر اسکرین پر آیا تو اس کی آنکھوں میں خمار' خباثت اور ایک عجیب سی درندگی بڑھ چکی تھی۔ جمشید مختار خالد کی طرف دیکھ کر فخریہ سے انداز میں بولے۔ "یہ آدمی بھی خوب میری نظر میں آیا۔ یہ صحیح معنوں میں ہمارے قبیلے کا آدمی ہے۔"

"قبیلے کا آدمی .....؟" خالد نے آہستگی سے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

"ہاں ..... اس سے مراد ایسا آدمی ہے جس میں ہم جیسی خصوصیات پائی جاتی ہوں ..... یا کم از کم بنیادی عناصر موجود ہوں۔ آگے چل کر ان کے پھلنے پھولنے کی امید ہوتی ہے۔ جیسے کہیں زمین میں بیج موجود ہو تو کچھ مدت کے بعد اس کے پھوٹنے اور پھر رفتہ رفتہ تناور درخت بننے کی امید ہوتی ہے۔ ہمیں دنیا بھر میں ایسے آدمیوں کی تلاش رہتی ہے جن میں ہمارے بنیادی خصائل پائے جاتے ہوں۔ خواہ وہ ابھی چھپے ہوئے ہوں۔ ان میں سے جس جس کو ہم مناسب سمجھتے ہیں' ایک ایک کر کے اپنی سرپرستی میں لے لیتے ہیں۔ بعض کو ہم اپنے قریب بلا لیتے ہیں اور بعض دور ہی ہوتے ہیں لیکن وہ ہماری سرپرستی میں ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو خود بھی اس بات کا پتہ نہیں ہوتا کہ وہ ہماری سرپرستی میں ہیں۔ بہرحال وہ ہمارے زیر اثر ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کے بہت سے کام' ان کی بہت سی مصروفیات ہماری مرضی اور منشاء کے مطابق ہوتی ہیں۔ وہ لاعلمی میں بھی ہمارے ہی مشن کی تکمیل کے لئے کام کر رہے ہوتے ہیں۔"

خالد ایک ٹک جمشید مختار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جیسے کہیں کوئی آگ سی دہک رہی تھی۔ خالد نے اپنے آپ کو سحر زدہ محسوس کیا۔ وہ آنکھیں جیسے چند سیکنڈ میں ہی دوسرے کو ہپناٹائز کرنے کی طاقت رکھتی تھیں۔ اس بار وہ بولا تو اسے خود بھی اپنی آواز بہت مدہم اور سرسراتی سی محسوس ہوئی۔ "آپ کون ہیں جمشید صاحب ..... اور آپ کا مشن کیا ہے؟"

جمشید مختار نے گونجیلا سا قہقہہ لگایا اور گویا کچھ ترنگ میں آ کر بولے۔ "اس سادگی پر کون نہ مرجائے اے خدا .....! تم ہمارے لئے کام کر رہے ہو۔ ہمارے مشن کی تکمیل میں شریک ہو ..... اور تم بھی پوچھ رہے ہو کہ ہم کون ہیں اور ہمارا مشن کیا ہے کوئی سن لے گا تو ہنسے گا۔"

پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ "خیر..... یہ تو میں مذاق کر رہا تھا۔ مجھے کہنا اصل میں یہ تھا کہ رفتہ رفتہ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا ..... سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔ آخر تم بھی ہم میں سے ہو۔ اسی لئے ہماری خفیہ قوتوں نے ہمیں تمہارے بارے میں خبردار کیا اور ہم نے تمہیں ڈھونڈ نکالا۔ تمہاری فطرت میں ہماری خصلتوں کا بیج موجود لیکن تمہیں خود اس بیج کا علم نہیں تھا۔ وہ عام اور شریفانہ سے معمولات کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اس کی نشوونما کے لئے حالات سازگار نہیں تھے۔ اس لئے ہم تمہیں اپنے پاس لے آئے۔ اب وہ بیج پھوٹ چکا ہے' پروان چڑھ رہا ہے۔ جلد ہی وہ خوب پھلے پھولے گا۔ مجھے امید ہے کہ تم ہمارے قابل فخر ساتھی ثابت ہو گے۔ اس دوران میں تمہیں بخود معلوم ہو جائے گا کہ ہم کون ہیں اور ہمارا مشن کیا ہے؟"



خالد نے سعادت مندانہ سے انداز میں سر ہلایا۔ اس دوران میں اسکرین پر منظر تبدیل ہو چکا تھا۔ جگہ وہی تھا لیکن اب رنگ نما حصے کو صاف کیا جا چکا تھا۔ اچانک ایک طرف سے چار مسلح افراد نمودار ہوئے۔ انہوں نے ایک نوجوان کو پکڑا ہوا تھا جس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے خون بہہ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں تک پہنچنے سے پہلے اسے مارا پیٹا گیا تھا۔ وہ شلوار قمیض میں تھا اور اس کا گریبان پھٹا ہوا تھا۔ وہ ایک وجیہہ' دراز قد اور خوبرو نوجوان تھا لیکن اس وقت اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔

مسلح افراد اسے کھینچتے' گھسیٹتے اور دھکے دیتے ہوئے لا رہے تھے۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی اسے گھونسا' تھپڑ یا لات بھی رسید کر دیتا تھا یا گن کے دستے سے کہیں ضرب لگا دیتا تھا۔ وہ ان کے نرغے میں گرتا پڑتا چلا آ رہا تھا۔ مسلح افراد نے سٹیج کے سامنے پہنچ کر اسے زور سے دھکا دیا اور وہ نیاز علی کے سامنے اوندھا جا گرا۔ خالد کو یہ سب کچھ اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے وہ موقع پر موجود ہو اور ہر زاویئے سے ہر فرد کو دیکھ سکتا ہو۔

"سائیں! یہ بھاگا ہوا تھا ..... ہائی وے کے پاس سے ابھی ہمارے ہاتھ لگا ہے تو ہم اس کو لے کر سیدھے آپ کے پاس آ گئے ہیں۔" مسلح افراد میں سے ایک نے نیاز علی کو مطلع کیا۔

نیاز علی کے چہرے پر چند منٹ پہلے تک ریچھ اور کتوں کی لڑائی کے دوران میں جو تاثرات موجود تھے وہ ابھی تک معدوم نہیں ہوئے تھے۔ نوجوان کو دیکھ کر یہ تاثرات کچھ اور گہرے ہو گئے۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے تماشا اس کی آنکھوں کے سامنے اب بھی جاری تھا بلکہ شاید اب اس میں کسی نے نئی روح پھونک دی تھی۔ اوندھے پڑے نوجوان کو دیکھ کر اس نے گویا ایک انجانی سی لذت محسوس کرتے ہوئے مونچھ کو بل دیتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

نوجوان ایک تو نہ جانے کتنی مار پیٹ سہہ کر آ رہا تھا۔ دوسرے اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اس لئے اس حالت میں گر جانے کے بعد اٹھنا اس کے لئے یقیناً" ایک بہت مشکل کام تھا اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ایک رخسار مٹی میں لتھڑ چکا تھا مگر اب بھی اس کی خوبروئی خاک میں نہیں ملی تھی۔ چہرے پر دو تین نیل اور سرخ نشان بھی نظر آ رہے تھے مگر وہ اس حالت میں بھی وہاں موجود سب لوگوں میں نمایاں اور وجیہہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے حتی الامکان وقار اور متانت سے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔

اسے ذرا تن کر کھڑے ہوتے دیکھ کر نیاز علی کی خمار زدہ اور سرخ سرخ آنکھوں میں گویا کچھ اور خون اتر آیا۔ اس نے نوجوان کو موٹی موٹی گالیاں دیں اور بھیڑیئے کی غراہٹ

سے ملتی جلتی آواز میں بولا۔ "ہماری رشتے دار لڑکی کو راستے میں روک کر بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا.....؟" جملے کے آخر میں اس نے چند مغلظات اور جڑ دیں۔

نوجوان مرتعش مگر بلند آواز میں بے بسی آمیز غصے سے بولا۔ "میں نے تمہارے آدمیوں کو بھی بتایا تھا اور تمہیں بھی بتا رہا ہوں کہ شہلا نے مجھے خود راستے میں روکا تھا ..... اور کوئی ایسی ویسی بات نہیں تھی۔ اس وقت کوئی نوکر وغیرہ اس کے ساتھ نہیں تھا ..... اور وہ ایک چھوٹا سا کام مجھے بتا رہی تھی جب تمہارے آدمیوں نے مجھے دیکھ لیا اور بھاگ کر تمہارے پاس پہنچ کر تمہارے کان میں نہ جانے کیا پھونک دیا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی سی بات پر تم نے میری تلاش میں آدمی دوڑا دیئے ہوں گے۔ میں اس وقت بھاگ تو نہیں رہا تھا۔ میں تو اپنے کام سے شہر جانے کے لئے سڑک کے کنارے بس کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا' جب ان لوگوں نے آ کر مجھے پکڑ لیا اور بری طرح مارنا پیٹنا شروع کر دیا ....."

اس کی آواز ایک مجبور سے اشتعال کی شدت سے حلق میں اٹکنے لگی۔ وہ چند لمحے ہانپنے کے سے انداز میں سانسیں لیتا رہا پھر ذرا نیچی آواز میں بولا۔ "تم شہلا کو بلا کر کیوں نہیں پوچھ لیتے؟ وہ خود تمہیں ساری بات بتا دے گی۔ ایسا لگتا ہے تم صرف بہانہ ڈھونڈ رہے تھے ....."

نیاز علی نے اسے مزید چند موٹی موٹی گالیوں سے نوازا پھر غضبناک لہجے میں بولا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ ہمارے خاندان اور ہمارے رشتہ داروں کی لڑکیاں اب میلے ٹھیلے کے موقعوں پر میدان میں آ کر ..... مجمع عام کے سامنے گواہی دیا کریں گی .....؟"

"نہیں ..... نہیں ....." نوجوان جلدی سے بولا۔ "میرا مطلب تھا کہ کسی کو اس کے گھر بھیج کر پچھوا لو ..... بات کچھ بھی نہیں تھی ..... اس نے خود مجھے آواز دے کر روکا تھا ....."

"آدمی بھیج کر تو میں نے سب کچھ پچھوا لیا ہے ....." نیاز علی اس کی بات کاٹتے ہوئے گرجا۔ "تو بار بار ہمارے خاندان کی لڑکی پر الزام لگانے سے باز نہیں آ رہا ..... اوپر سے اتنی بکواس کر رہا ہے ..... اتنی اکڑ دکھا رہا ہے۔"

اس نے چند اور گالیاں دیتے ہوئے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے نوجوان کو قربانی کے بکرے کی طرح زمین پر گرا دیا۔ فرق یہ تھا کہ نوجوان کو اوندھا گرایا گیا تھا۔ ایک طرف سے دو آدمی آگے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں سیاہ کوڑے تھے۔ انہوں نے نوجوان کی قمیض پھاڑ کر اس کے تن سے جدا کر دی اور پھر وہ دونوں دائیں بائیں کھڑے ہو کر باری باری اس کی پیٹھ پر کوڑے برسانے لگے۔

ہر کوڑے پر وہ تڑپ کر اچھلتا اور اٹھنے کی کوشش کرتا مگر دوسرا کوڑا اسے اٹھنے کی



مہلت نہ دیتا۔ شڑاپ کی ہر آواز کے ساتھ اس کی پیٹھ پر موٹی سی ایک سرخ لکیر ابھر آتی۔ اس کے چونکہ بازو پشت پر بندھے ہوئے تھے اس لئے وہ بھی کوڑوں کی زد میں آ رہے تھے اور زخمی سے ہوتے جا رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے بازوؤں اور پیٹھ کی کھال اور وہاں گوشت اور خون کا ملغوبہ سا دکھائی دینے لگا۔ اب اس میں ہلنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی یا پھر شاید وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ ساکت ہو چکا تھا اور اب ہر کوڑے کے ساتھ خون کے چھینٹے بھی اڑ رہے تھے مگر ابھی تک کوڑے برسانے والوں نے ہاتھ نہیں روکا تھا۔ شاید اس لئے کہ انہیں نیاز علی کی طرف سے حکم نہیں ملا تھا۔ نوجوان کا ایک رخسار مٹی پر ٹکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور نیم وا منہ سے خون بہہ بہہ کر مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ شاید یہ پہلے کی لگی ہوئی اندرونی چوٹوں کا اثر تھا کہ اسے خون کی الٹی آ رہی تھی۔

یہ سب کچھ دیکھ کر نیاز علی کی آنکھوں میں گویا خمار بڑھ رہا تھا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر اس ساری کارروائی کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ آخر کار اس نے شاہانہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر اپنے آدمیوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ کوڑے برساتے برساتے ہانپنے لگے تھے۔ اس کے باوجود ان کی تندہی کا یہ عالم تھا کہ لگتا تھا وہ کوڑوں سے ہی اس نوجوان کا قیمہ بنا ڈالیں گے۔

ایک شخص نے آگے بڑھ کر نوجوان کی نبض دیکھی' اس کے نتھنوں پر انگلیاں رکھ کر دیکھیں پھر نیاز علی کی طرف مڑ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "ابھی کچھ سانس باقی ہے۔"

"بس ..... ٹھیک ہے ..... پھنکوا دو اس بدمعاش کو کہیں ....." نیاز علی نے بے پروائی سے کہا۔ اب گویا اس تماشے میں اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ شاید وہ تھک گیا تھا۔ بازو اٹھا کر اس نے بھاڑ سا منہ کھول کر جماہی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی گویا مجلس برخاست ہو گئی۔ اس کے ساتھ جتنے بھی لوگ بیٹھے تھے' اب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نوجوان کو ڈنڈا ڈولی کر کے یوں اٹھا کر لے جایا جا رہا تھا جیسے وہ کچرے کی بوری ہو اور وہ اسے کوڑے دان پر پھینکنے لے جا رہے ہوں۔ اس کے جسم سے خون کی موٹی موٹی بوندیں ٹپکتی جا رہی تھیں۔ خالد کو یاد آیا کچھ دیر پہلے اس ریچھ کو بھی اسی طرح اٹھا کر لے جایا گیا تھا جس کو کتوں نے آخر کار ہلاک کر دیا تھا۔

دفعتاً جمشید صاحب خالد کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔ "تمہیں معلوم ہے یہ نوجوان کون ہے؟"

خالد نے نفی میں سر ہلایا۔

○

جمشید صاحب خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "نیاز علی پر سکول کی ایک دس سالہ بچی پر مجرمانہ حملے کے مقدمہ چلا تھا نا.....؟"

"جی ہاں ..... شاہدہ نام تھا اس بچی کا ....." خالد جلدی سے بولا۔ بات کچھ زیادہ پرانی نہیں تھی۔ تمام تفصیلات اسے زبانی یاد تھیں۔ فائلیں دیکھے بغیر وہ سب کچھ بتا سکتا تھا۔ تمام متعلقہ افراد اور گواہوں کے نام گنوا سکتا تھا۔

"بالکل ٹھیک ....." جمشید صاحب سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "شاہدہ جس سکول میں پڑھتی تھی، یہ نوجوان وہاں ٹیچر تھا۔ اس واقعے پر درحقیقت یہی سب سے زیادہ سیخ پا ہ تھا۔ اسی نے شاہدہ کے ماں باپ کی ہمت بندھائی تھی کہ وہ نیاز علی کے خلاف پرچہ در کرائیں ورنہ ان بے چاروں میں کہاں ہمت تھی۔ وہ تو نسل در نسل ہاری چلے آ ر ہیں۔ اس قسم کے بہت سے ظلم اور زیادتیاں سہتے آ رہے ہیں۔ ان میں بغاوت کی رو اس نے پھونکی تھی۔ اس کا نام ریاض ہے۔ یہ بظاہر تو نوجوان ہے لیکن خود اس کے ا اندر شاید کسی بوڑھے کی روح گھسی ہوئی ہے۔ اس میں نوجوانوں والی کوئی بات نہیں سکول میں بھی یہ اسلامیات پڑھاتا ہے اور بچوں کو ہر وقت نیکی، دیانتداری، اخلاق، مرو اور دنیا کی نہ جانے کون کون سی اچھائیوں کا درس دیتا رہتا ہے۔"

یہ کہتے وقت جمشید مختار نے پوری نفرت و حقارت سے ناک سکیڑلی تھی جیسے وہ کی بہت ہی بری اور قابل نفرت خصلتوں کا ذکر کر رہے تھے۔ وہ بات جاری رکھتے ہو بولے۔ "مجرمانہ حملے کا نشانہ بننے والی لڑکی شاہدہ کا ایک نوجوان بھائی بھی ہے۔ اس کا شمشیر علی ہے۔ وہ مشکل سے اٹھارہ انیس سال کا ہے۔"

"وہ تو مجھے یاد ہے ....." خالد ان کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "اسے تو میں نے کئی عدالت میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے ایسی غضبناک نظروں سے گھورتا رہتا تھا جیسے اصلی مجرم ہی ہوں۔ اس کا بس چلتا تو شاید مجھے بھری عدالت میں قتل کر دیتا۔ پتلا دبلا سا نوجوان لیکن خونخوار اور بارعب نظر آنے کی پوری پوری کوشش کرتا تھا۔ کندھے پر ایک پران زنگ آلود کلہاڑی بھی لٹکائے ہوتا تھا جس کی وجہ سے پولیس والے اسے عدالت کے کم میں گھسنے نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ وہ دروازے پر ہی کھڑا اپنی کلہاڑی کے پھل پر د



دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورتا رہتا تھا۔"

جمشید مختار دھیرے سے ہنسا اور بولا۔ "جوان خون ہے نا..... ابال تو بہت اٹھتا ہے ایسے نوجوان کے خون میں ..... لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ ایسی مفلس اور بے وسیلہ نوجوانی کسی کام کی نہیں ہوتی۔ یہ شمشیر علی بھی دراصل ریاض ہی کی باتوں سے زیادہ بھڑکا تھا اور پھر اس نے باپ پر زور دیا تھا کہ انہیں نیاز علی کے خلاف عدالت میں ضرور پیش ہونا چاہئے۔"

"لیکن ریاض خود تو گواہ کے طور پر عدالت میں پیش نہیں ہوا۔ میں نے اسے وہاں کبھی نہیں دیکھا ورنہ شاید مجھے اس کا چہرہ یاد ہوتا....." خالد بولا۔

"اس نے سامنے آنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ اس نے خود کو پس منظر میں ہی رکھا تھا البتہ بھڑکانے کا فریضہ اس نے بہت اچھی طرح انجام دیا تھا۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر فدا حسین کی بھی اس نے ہمت بندھائی تھی کہ انہیں نیاز علی کے خلاف گواہ کے طور پر پیش ہونا چاہئے۔"

"حیرت ہے کہ آپ کو یہاں بیٹھ کر یہ سب باتیں معلوم ہیں جبکہ میں وہاں موجود تھا ..... یہ مقدمہ لڑ رہا تھا اور اپنی دانست میں میں نے پس پردہ قسم کی بہت سی معلومات جمع کی تھیں لیکن مجھے نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ پس منظر میں ریاض نامی یہ نوجوان بھی کام کر رہا تھا۔" یہ کہتے ہوئے خالد نے تحسین آمیز سی نظروں سے جمشید مختار کی طرف دیکھا۔

جمشید مختار دھیرے سے ایک بار پھر ہنسے اور بولے۔ "یہ ہمارے ادنیٰ ترین کمالات میں سے ایک کمال ہے۔ خود نیاز علی کو بھی اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ اس کے خلاف فضا تیار کرنے میں سب سے زیادہ ریاض کا ہاتھ تھا۔"

"جوں ہی اسے معلوم ہوا ہو گا اس نے ریاض کو سبق سکھانے کی منصوبہ بندی کر لی ہو گی جس کے نتیجے میں آج اس کا یہ حشر ہوا ہے۔" خالد نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا جس پر ریاض تو اب غائب ہو چکا تھا البتہ نیاز علی پجیرو میں بیٹھ کر میدان سے رخصت ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

جمشید مختار نے اثبات میں سر ہلایا اور بولے۔ "تمہیں یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ سکول کے ہیڈ ماسٹر فدا حسین بھی اپنا تبادلہ کروا کر سندھ کے ایک دور افتادہ علاقے میں جا چکے ہیں ورنہ شاید نیاز علی ان سے بھی اسی انداز میں حساب برابر کرنے کا کوئی طریقہ سوچ چکا ہوتا۔"

"یہ تو واقعی کچھ حیرت کی بات ہے!" خالد بولا۔ "وہ بظاہر منحنی اور مختصر الوجود ہونے کے باوجود بڑی مضبوط شخصیت کے مالک دکھائی دیتے تھے اور لگتا نہیں تھا کہ ایک جائز لڑائی لڑنے کے بعد وہ نتائج کے خوف سے راہ فرار اختیار کر سکتے ہیں۔"

"جان اور عزت سب کو پیاری ہوتی ہے۔" جمشید مختار مسکراتے ہوئے بولے۔ "اب وہ بے چارے اس عمر میں اپنا حشر ریاض جیسا تو نہیں کروا سکتے تھے۔"

"ہاں ..... یہ بات تو ہے۔" خالد بھی تائید میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا دیا۔ جمشید مختار کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسکرین پر انہوں نے جو تماشا دیکھا تھا اس سے وہ بہت محظوظ ہوئے تھے۔ خالد کو یہ محسوس کر کے خفیف سی حیرت ہوئی کہ وہ بھی ان سارے مناظر سے خاصا لطف اندوز ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مزید تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ اس کا دل ایک عجیب سی خوشی سے معمور تھا اور وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے بہت اچھی تفریح میں وقت گزارا ہو۔ کتوں اور ریچھ کی خونیں لڑائی یا ریاض کے عبرت آموز حشر کے نظارے کے دوران میں اس کے دل میں ایک لمحے کے لئے بھی کراہیت' تاسف' خوف یا ناپسندیدگی کی لہر تک نہیں ابھری تھی۔ شاید اس کے اندر دھیرے دھیرے کچھ تبدیلیاں آ چکی تھیں جن کا اسے احساس نہیں ہوا تھا۔ اسے یاد تھا کہ نیاز علی کا کیس لڑنے سے پہلے وہ ایسا نہیں ہوا کرتا تھا۔ بہت سی ایسی باتیں تھیں جن پر اسے پہلے نفرت و کراہیت محسوس ہوتی تھی یا غصہ آتا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہوتا تھا۔

اسکرین پر ایک بار پھر نیاز علی کا چہرہ کلوز اپ میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنی پجیرو میں تھا اور خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے برابر اور پچھلی سیٹوں پر اس کے بندوق بردار موجود تھے۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں تاہم اس کی نظر راستے پر جمی ہوئی تھی۔

جمشید مختار کچھ عجیب والہانہ سی نظروں سے نیاز علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "یہ شخص میرے پسندیدہ لوگوں میں سرفہرست آ چکا ہے۔ اس میں میرا جانشین بننے کی پوری پوری صلاحیتیں موجود ہیں۔ اسی لئے میں نے تمہارے ذریعے اسے مجرمانہ حملے کے مقدمے میں کوئی گزند پہنچنے یا سزا ہونے سے بچا لیا ہے۔ میں نے اسے اپنا جانشین بنانے کے لئے تیاریاں بھی شروع کر دی ہیں۔ آج کل میں اس کی ذات پر کام کر رہا ہوں لیکن اسے خود اس بات کا علم نہیں ہے۔ یہ اپنی شیطانی طاقتوں میں اضافہ کرنے کے لئے جگ محنت کر رہا ہے لیکن یہ بھی سمجھتا ہے کہ وہ سارے کام یہ ازخود کر رہا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ ان میں سے زیادہ تر کام یہ میرے اشارے پر ..... میرے زیر اثر رہتے ہوئے کر رہا ہے ..... لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس میں میری مرضی کے مطابق کام کرنے کی اہلیت پائی جاتی تھی۔ اسی لئے میری نظر انتخاب اس پر پڑی تھی۔ یہ زرخیز مٹی ہے ..... امید ہے فصل اچھی آئے گی۔"

خالد سحر زدہ سے انداز میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔ دفعتاً" وہ چونکا۔ اسے اپ یاد آ گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر غیر ارادی طور پر تیزی سے بول اٹھا۔ "سر.....! وہ مے ....."



جمشید مختار نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "بھئی تم کیوں ہاتھ دھو کر اپنے ہاتھ کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ جب میں نے کہہ دیا ہے کہ تمہارا ہاتھ ٹھیک ہو جائے گا تو پھر اتنے بے چین کیوں ہو؟ کیا تمہیں میری طاقت پر اعتماد نہیں ہے؟"

"اعتماد تو ہے سر!" خالد اپنا ہاتھ ایک بار پھر نیچے کرتے ہوئے بولا۔ اضطراری انداز میں اس نے اپنا بدہیئت ہاتھ اونچا کر لیا تھا۔

"اعتماد ہے تو پھر اطمینان رکھو۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ آج تمہاری معلومات میں اتنا اضافہ ہو رہا ہے ..... لیکن تمہیں اس پر خوشی نہیں ہے؟"

"خوشی تو ہے .....!" خالد قدرے بے چارگی سے بولا۔

جمشید مختار ایک بار پھر سکرین پر موجود نیاز علی کے چہرے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس وقت بھی ان کی نظروں میں ایسا ہی والہانہ پن تھا جیسے کوئی باپ اپنی ہونہار اولاد کی طرف دیکھ رہا ہو۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ پرخیال سے لہجے میں بولے۔ "مجھے تشویش صرف اس کے چہرے مہرے کے بارے میں ہے۔ آدمی اندر سے خواہ کیسا ہی خبیث اور شیطان ہو لیکن اسے صورت سے شیطان صفت دکھائی نہیں دینا چاہئے تاکہ لوگ اس کی صورت دیکھ کر ہی اس سے دور نہ بھاگیں۔ وہ اگر خوبصورت' دلکش اور جاذب نظر شخصیت کا مالک ہو تو زیادہ بہتر رہتا ہے تاکہ لوگ اس کی طرف کھنچے آئیں۔ وہ اپنے اردگرد کے لوگوں میں مقبول ہو ..... کیا خیال ہے؟"

"جی ہاں ..... وہ تو ٹھیک ہے ....." خالد ذرا گڑبڑا کر بولا۔ "لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟ یہ شکل تو جیسی بننی تھی بن چکی۔ اب اسے تبدیل تو نہیں کیا جا سکتا۔"

"مجھے تم سے ایسی بے وقوفانہ بات کی توقع نہیں تھی۔" جمشید مختار ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر ترحم آمیز سے لہجے میں بولے پھر انہوں نے اس کے مکروہ صورت ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ "اگر یہ ہاتھ اصلی شکل میں واپس آ سکتا ہے تو نیاز علی کی صورت کیوں تبدیل نہیں ہو سکتی؟"

دلیل معقول تھی۔ خالد ایک لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "لیکن اگر نیاز علی کی شکل تبدیل ہوئی تو اس سے تو اس کے لئے بڑے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ وہ خود بھی پریشان ہو جائے گا خواہ شکل بہت بہتر ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ایک پریشانی یہ بھی ہو گی کہ لوگ اسے پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔"

"میرا ارادہ اس کی شکل یکدم تبدیل کر دینے کا ہرگز نہیں ہے۔ اس میں نہایت آہستگی سے تبدیلیاں آئیں گی۔ تبدیلیاں بظاہر بہت چھوٹی چھوٹی اور معمولی ہوں گی لیکن ان سے اس کا چہرہ غیر محسوس طور پر بہت بہتر ہوتا جائے گا۔ کسی کو بھی ان تبدیلیوں کا احساس نہیں ہو سکے گا۔ خصوصاً" ان لوگوں کو جو اسے روزانہ دیکھتے رہتے ہیں۔ بعض لوگ وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ نکھرتے جاتے ہیں۔ اس کا تاثر بھی کچھ اسی قسم کا ہو گا۔ یہ ہرگز محسوس نہیں ہو گا کہ اس کی شکل بہت زیادہ بدل چکی ہے۔ ضروری ہوا تو میں اسے جسم ہی کوئی اور دے دوں گا۔ اس کی روح کسی اور جسم میں ڈال دوں گا۔ جب بھی اس کے لئے کوئی مناسب جسم ملا' میں اسے اس کے لئے محفوظ کرلوں گا۔"

گو کہ اب خالد کو لاشعوری سے انداز میں یہ احساس ہو چکا تھا کہ اسے جشید مختار کی کسی بھی بات پر حیران نہیں ہونا چاہئے اس کے باوجود وہ ایک ٹک ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کچھ اس طرح بات کر رہے تھے جیسے کسی کا لباس تبدیل کرانے کی کر رہے ہوں کہ وہ فلاں کے جسم سے فلاں کپڑے اتار کر اسے فلاں کپڑے پہنا دیں گے۔

جشید مختار اس کی طرف دیکھے بغیر ہی بولے۔ "اس طرح حیرت سے میری طرف مت دیکھو۔ کیا تمہارے خیال میں میرے لئے یہ کوئی مشکل کام ہے؟"

"ہرگز نہیں۔" خالد سنبھل کر جلدی سے بولا۔

"اب تم ہم میں شامل ہو چکے ہو۔ اب تم مکمل طور پر ہم میں سے ہی ایک ہو۔ اب تمہیں ہماری کسی بھی بات پر حیران نہیں ہونا چاہئے۔" جشید مختار دھیمی آواز میں بولے۔

"میں حیران نہیں ہوں سر!" خالد نے کہا پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد ذرا ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا۔ "میں پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کیا ہم عام انسانوں سے الگ کوئی مخلوق ہیں؟ کیا ہم کسی اور ہی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں؟ کیا ہم کہیں اور سے آئے ہیں؟"

"ہرگز نہیں ......" جشید مختار نے تیزی سے جواب دیا۔ "شاید تمہارے ذہن مي کچھ بے سروپا قسم کی سائنسی کہانیاں گھوم رہی ہیں جن میں بعض دوسرے سیاروں سے کو مخلوق آ کر زمین پر رہنے لگتی ہے' انسانوں کا سا قالب اختیار کرلیتی ہے' انسانوں میں گھل مل جاتی ہے لیکن وہ اپنی کچھ خاص طاقتوں کی مالک ہوتی ہے جنہیں وہ لوگوں کی نظروں سے مخفی رکھتی ہے۔ ہمارا معاملہ ایسا ہرگز نہیں ......" وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئے پھر بولے۔ "ہم اسی سرزمین کی مخلوق ہیں ...... بلکہ مجھے صرف اپنی بات کرنی چاہئے۔ میں ا زمین کی مخلوق ہوں مگر برسوں پہلے میرے وجود میں کوئی اور حلول کر گیا۔ میں فی الحال ا کا نام نہیں لینا چاہتا۔ رفتہ رفتہ تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کون ہے۔ وہ سینکڑو برس سے میرے وجود میں ہے۔ اس نے مجھے یا میں نے اسے اپنا لیا ہے۔ میری روح ا کے پاس گروی رکھی ہے اور میں سینکڑوں برس سے زندہ ہوں اور مجھے ابھی مزید ان گن برسوں تک زندہ رہنا ہے لیکن میں اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ بہت سی قوتیں ایسی ہیں جو مجھے ختم کر دینے کے درپے رہتی ہیں لیکن میں ان کے ہاتھوں مرنے والا نہیں ......"



وہ فاتحانہ سے انداز میں مسکرائے اور ذرا توقف سے بولے۔ "مجھے اپنی نسل بھی تیزی سے بڑھانے کا مسئلہ درپیش ہے۔ اگر مجھے اس دنیا پر حکومت کرنی ہے ...... اس پر قبضہ کرنا ہے تو دنیا میں میری نسل کے لوگ ...... میرے پیروکار ...... میرے چیلے بہت بڑی تعداد میں ہونے چاہئیں۔ ان کی تعداد اب بھی کچھ کم نہیں ہے۔ میں سینکڑوں برس سے انہیں دنیا میں پھیلانے میں مصروف ہوں لیکن پھر بھی وہ مطلوبہ تعداد کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں کیونکہ دنیا بہت بڑی ہے اور اس میں میری مخالف قوتوں کی بھی کمی نہیں ......"

وہ پہلی بار اپنی کرسی پر ذرا کسمسائے گویا مخالف قوتوں کا تذکرہ زبان پر آتے ہی انہیں سخت تکلیف پہنچی ہو۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گویا اعتدال پر آتے ہوئے بولے۔ "بہرحال ...... میری نسل اور میرے پیروکاروں کی تعداد بڑھنے کا عمل دنیا کے ہر گوشے میں جاری ہے۔ اس کے مختلف طریقے ہیں۔ ہر طریقہ میرے حق میں مفید ہے ......"

"مقصد یہ کہ طریقہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن دنیا میں آپ کے نقش قدم پر چلنے والوں اور آپ کے فلسفوں پر یقین رکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور دنیا پر ان کے غالب آنے کے آثار پیدا ہو رہے ہیں؟" خالد بولا۔

"غالب آنے کا مرحلہ تو ابھی بہت دور ہے لیکن بہرحال امید اور آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ یہی بہت ہے۔ جنگی جنون' انسان دشمنی کی سیاست' روپے پیسے کی پرستش' سنگدلی' سفاکی' انتقام' نفاق' تعصب' کسی بھی قسم کا حسد' مکاری' مبالغہ' حد سے زیادہ جھوٹ' حرص و ہوس' بدگمانی' خواہشوں کی پوجا' اپنے حال پر قناعت نہ کرنا' کبھی اپنے گریبان میں نہ جھانکنا اور ساری دنیا کو برا بھلا کہتے رہنا ...... ان سب راستوں پر چلتے ہوئے لوگ رفتہ رفتہ میرے قریب آ رہے ہیں۔ میرے مقاصد پورے کر رہے ہیں۔ انہیں خود بھی یہ بات معلوم نہیں ہے لیکن وہ نادانستگی میں میرے قبیلے میں شامل ہو رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ میرے اتنے زیادہ زیر اثر آ جائیں گے کہ میں ان سے جو کام چاہوں گا' لوں گا۔ تم بھی اب انہی میں سے ایک ہو اور تمہیں اس پر فخر ہونا چاہئے۔ ہمیں اس دنیا میں اپنا مشن پورا کرنا ہے۔"

خالد کو یہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ وہ مشن کیا تھا؟ اس کے تحت الشعور میں گویا کہیں اس کا دھندلا سا جواب موجود تھا اور وہی کافی تھا۔ کوئی کوڑھ مغز بھی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ دنیا پر اگر ایسے خصائل رکھنے والے لوگ غالب آ جاتے جن کا جشید مختار نے ذکر کیا تھا تو پھر نتیجہ بنی نوع انسان اور دنیا کی تباہی کے سوا کیا نکل سکتا تھا؟ عجیب بات تھی کہ خالد کو اس تصور سے خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ دنیا اور انسانیت کی تباہی کا تصور اس کے لئے بے حد لذت انگیز سا تھا۔ اس خیال سے اس کے دل میں گدگدیاں سی اٹھنے

لگی تھیں گویا یہ کسی پرانے اور تشنہ تعبیر خواب کے پورا ہونے کا تصور تھا۔ اسے یاد آیا کہ کبھی وہ کسی گلی کوچے میں معمولی سا لڑائی جھگڑا ہونے کی خبر سن کر بھی افسوس اور پریشانی میں مبتلا ہو جاتا تھا کہ یہ کیسی جہالت تھی' لوگ اس سے بچنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے تھے؟ لیکن اب اسے یہ تصور بھی بڑا دل فریب اور تسکین بخش محسوس ہو رہا تھا کہ پوری دنیا میں ایک بے مقصد اور مجنونانہ قتل و غارت گری برپا ہو ..... لوگ بغیر سوچے سمجھے ایک دوسرے کو مار رہے ہوں ..... اخلاقی اقدار تباہ ہو چکی ہوں ..... مذہب سے لوگوں کو کوئی واسطہ نہ رہا ہو ..... ہر طرف ایک عجیب و غریب افراتفری مچی ہو ..... انسانیت سسک رہی ہو ..... اور آخر کار سب کچھ ختم ہو جائے ..... آگ' دھوئیں اور لہو میں تحلیل ہو جائے ..... دنیا پر ایک بھیانک سناٹا چھا جائے ..... لیکن ہمہ گیر اور ہولناک تباہی کی یادگاروں کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہے ..... نہ جانے کیوں یہ تصور خالد کو بڑا جاں فزا محسوس ہو رہا تھا اسے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے کہ ارض کی اس تباہی میں اس کی اپنی ذات کو کوئی گزند پہنچے گی۔ وہ کسی بلند چوٹی پر کھڑا اس ساری تباہی کا نظارہ کر رہا ہو گا۔

جمشید مختار اب گویا کمپیوٹر والے کھیل سے اکتا گئے تھے۔ ویسے بھی اسکرین پر ان پسند کے تماشے ختم ہو چکے تھے۔ انہوں نے ایک بٹن پر آہستگی سے انگلی ماری اور اسکرین تاریک ہو گئی۔ وہ خالد کی طرف گھومتے ہوئے بولے۔ "یہ بتاؤ ..... تم شرافت سے ملے تھے؟ پولیس نے اس سے تمہاری ملاقات کرانے میں حیل حجت تو نہیں کی تھی؟"

"تھوڑی بہت حیل حجت تو کی تھی لیکن ان سے نمٹنا میرے لئے مشکل نہیں تھا" خالد نے یکدم ہی گویا ایک دنیا سے دوسری دنیا میں واپس آتے ہوئے کہا۔ شرافت کا تعلق ان کی پیشہ ورانہ زندگی سے تھا۔ وہ ان کا نیا کلائنٹ تھا۔ جمشید مختار نے اس کا کیس لیا اور اس کے معاملات سے نمٹنے کی ذمے داری مکمل طور پر خالد کے سپرد کی تھی۔ وہ گرفتار ہو چکا تھا۔ حوالات میں تھا۔ خالد وہیں جا کر اس سے ملا تھا۔

شرافت کا نام شرافت ہونا بھی ایک بہت بڑی ستم ظریفی تھی کیونکہ شرافت اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ وہ ساڑھے چھ فٹ قد اور فولاد کی طرح مضبوط جسم رکھنے والا ایک دیو زاد قسم کا نوجوان تھا۔ یہ صحت اور مضبوطی خالصتاً" خدا ہی کی دین تھی ورنہ اس نے جیسی غربت میں پرورش پائی تھی۔ عام طور پر مختلف بیماریاں اور کمزوریاں ہی ایسے حالات میں پرورش پانے والوں کا مقدر ہوتی تھیں۔

اس نے ایک انتہائی غریب گھرانے میں جنم لیا تھا جہاں بیشتر غریب گھرانوں کی روایات کے عین مطابق کثیر تعداد میں بچے موجود تھے۔ شرافت سے پہلے اس کے بھائی اور بہنیں موجود تھیں۔ سب ایک دوسرے کو مارتے پیٹتے' کوستے کاٹتے جیسے رہے تھے مگر شرافت ابھی کم عمر ہی تھا کہ ایک حادثے میں اس کے ماں باپ کا



انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد کی یادیں اس کے ذہن میں کچھ واضح نہیں تھیں۔ سب بہن بھائی ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ایک کو دوسرے کے حال کی کچھ خبر نہ رہی تھی۔

شرافت جسمانی طور پر جتنا مضبوط اور لمبا تڑنگا نکلا تھا' ذہنی طور پر اتنا ہی کمزور تھا۔ بہت سی باتیں اسے یاد نہیں رہتی تھیں اور بہت سی باتوں کی اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ طبیعت میں بلا کی بے حسی تھی۔ کبھی کہیں کوئی کام کر کے اور کبھی کہیں رہتے ہوئے' کام اور ٹھکانا دونوں ہی چیزیں آئے دن بدلتے ہوئے اس کی زندگی گزری تھی۔

تاہم ان میں سے کوئی بھی بات عجیب نہیں تھی۔ دنیا میں بہت سے انسانوں کی کہانی یہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ پولیس نے اسے رات کی تاریکی میں آدھے تعمیر شدہ ایک مکان میں ایک شخص کو نہایت ہی بہیمانہ انداز میں قتل کرتے ہوئے محاورتاً" نہیں' حقیقتاً" رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ یعنی اس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے تھے۔

پکڑے جانے پر وہ حیران' پریشان یا پشیمان ..... کچھ بھی نہیں ہوا بلکہ جب پولیس والوں نے پہلی فرصت میں اسے "ڈرائنگ روم" کی سیر کرائی تو اس نے فوراً" ہی یہ اقرار بھی کر لیا کہ وہ تو اس سے پہلے بھی دس آدمیوں کو اسی انداز میں قتل کر چکا تھا۔ اس وقت وہ گیارہویں آدمی کی لاش کا برا حشر کر رہا تھا جب پولیس نے اسے پکڑا۔ وہ اپنے مقتولوں کی ایک درجن پوری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس کا اس سلسلے میں آگے مزید کچھ سوچنے کا ارادہ تھا۔

ابھی اس کی گرفتاری کی خبر اخبارات میں بھی نہیں آئی تھی جب جمشید مختار نے خالد کو اس سے ملنے کے لئے حوالات بھیج دیا تھا۔ خالد حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ جمشید کو اس کے بارے میں کیونکر پتہ چلا تھا؟ لیکن پھر اس نے خود کو سمجھایا تھا کہ اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں تھی۔ جمشید کو پہلے بھی ایسی بہت سی باتوں کا علم ہوتا رہتا تھا جن کے بارے میں دوسروں کو کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا ..... اور آج رات کی اس ملاقات کے بعد تو جمشید کے بارے میں خالد کا کسی بھی بات پر حیران ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ پہلے تو اسے صرف شبہ تھا لیکن آج رات تصدیق ہو گئی تھی کہ جمشید مختار بہت سی پراسرار طاقتوں کے مالک تھے۔

وہ جب شرافت سے ملنے پہنچا تھا تو پولیس والے حیران رہ گئے تھے۔ وہ تو شرافت کا تعلق کسی دہشت گرد گروہ سے جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں کسی گروہ کی طرف سے دھمکیاں ملیں گی کہ شرافت کو چھوڑ دیا جائے ورنہ یہ ہو جائے گا' وہ ہو جائے گا ..... یا پھر کوئی ایسا وکیل سامنے آئے گا جو اپنے مخصوص مفادات کے تحت اس قسم کے لوگوں کی وکالت میں سرگرم رہتا ہو گا۔ ایسے وکیل بھی کافی تعداد میں پائے جاتے تھے۔

اسی دوران جب پولیس نے اپنے مخصوص انداز میں "تفتیش" کی اور ابتدائی چھان بین کی تو یہ حیرت انگیز حقیقت سامنے آئی کہ شرافت تو بالکل ہی لاوارث آدمی تھا۔ اس کے تو آگے پیچھے کوئی تھا ہی نہیں ..... وہ تو کسی کا کارندہ بھی نہیں تھا۔ کرائے کا قاتل بھی نہیں تھا۔ عجیب احمق تھا .....! اتنا خطرناک کام محض اپنی تسکین طبع کے لئے کئے جا رہا تھا۔ پولیس کو یہ جان کر بھی مایوسی ہوئی تھی کہ اس سے تعلق رکھنے والا کوئی ایسا آدمی بھی نہیں تھا جو اسے چھڑانے' ذرا نرم قسم کی ایف آئی ار لکھوانے یا اسے "ڈرائنگ روم" کے مختلف مرحلوں سے بچانے کے لئے کچھ رقم خرچ کر سکتا۔ شرافت خود بھی کنگال تھا۔ بس جنہیں وہ قتل کرتا تھا انہی کو لوٹتا تھا۔ اسی سے اس کی گزر اوقات چلتی تھی۔ اس طرف سے ہاتھ تنگ ہوتا تھا تو وہ کوئی محنت مزدوری کا کام بھی کر لیتا تھا۔

جب ایک بڑا نام رکھنے والی اور بہت اونچی سمجھی جانے والی فرم کا وکیل اس سے ملاقات کرنے پہنچا تو متعلقہ تھانے کا عملہ بجا طور پر حیران ہوا تھا۔ ایس ایچ او نے پہلے تو ملاقات کرانے سے صاف انکار کردیا تھا لیکن جب خالد نے دو چار بڑے بڑے لوگوں اور ایک آدھ بڑے پولیس آفیسر کا حوالہ دیا تو وہ نرم پڑ گیا لیکن پھر بھی پہلے وہ خود خالد سے کچھ تفتیش کرنے پر تل گیا تھا۔

"پہلے تو آپ مجھے بتائیں جناب .....! آپ کو اس کے بارے میں کیسے پتہ چل گیا؟ ابھی تو ہم نے اس خبیث کو پریس سے بھی چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ ابھی ہم نے اس کی گرفتاری کی خبر منظر عام پر آنے نہیں دی ہے اور ہم نے اسے کہیں کوئی ٹیلیفون بھی نہیں کرنے دیا۔ اس نے فون وغیرہ کرنے کی یا کسی سے ملنے کی فرمائش ہی نہیں کی ..... اس کے باوجود آپ آن پہنچے ہیں۔ پہلی حیرت تو ہمیں اس بات پر ہے۔ دوسری حیرت اس بات پر ہے کہ آپ کو اس سے کیا ملنے کی امید ہے؟ ہم نے اچھی طرح تصدیق کر لی ہے اس کا کسی گروہ سے ..... کسی بڑی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں ..... اس کوٹھری پر بھی ہم چھاپہ مار چکے ہیں جہاں وہ رہتا تھا۔ وہ تو واقعی بالکل کنگلا آدمی ہے۔ آپ لوگ تو لاکھوں کی فیسیں لینے والے وکیل ہیں۔ آپ کس چکر میں اس سے ملنے آ گئے ہیں؟ مجھے تو لگتا ہے اس چکر کے پیچھے بھی کوئی چکر ہو گا۔" ایس ایچ او اپنی چھڑی ہاتھوں میں گھماتے ہوئے ٹٹولنے والی نظروں سے خالد کو گھورتے ہوئے روانی سے یہ سب کچھ کہتا چلا گیا تھا۔ خالد اب بھی اپنی سماعتوں میں کہیں اس کی آواز کی بازگشت محسوس کر رہا تھا۔

اس وقت تک اسے خود بھی شرافت کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں اور نہ ہی اسے معلوم تھا کہ اس معاملے میں جمشید مختار کے دلچسپی لینے میں ان کا اپنا کیا مفاد تھا؟ عام طور پر جمشید اسے کسی بھی کلائنٹ کے پاس روانہ کرتے وقت کلائنٹ ابھی حراست میں نہیں ہوتا تو اسے آفس بلانے سے پہلے اس وکیل کو بریف



دیتے تھے جس کے سپرد وہ اس کا کیس کرتے تھے لیکن شرافت کے سلسلے میں انہوں نے ہنگامی انداز میں خالد کو بھیجا تھا۔ شاید انہیں اچانک ہی اس کے بارے میں معلوم ہوا تھا اور وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

خالد اپنے معاملات میں کسی بھی منجھے ہوئے اور شاطر وکیل سے کم نہیں تھا۔ وہ اندھیرے میں ہونے کے باوجود اپنے بریف کیس پر انگلیاں نچاتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے نہایت خود اعتمادی اور خوش مزاجی سے بولا۔ "آپ کی پہلی حیرت دور کرنے کے لئے تو میں یہ عرض کروں گا کہ ہماری معلومات کا ذریعہ صرف اخبارات نہیں ہوتے۔ ضروری نہیں کہ جب کوئی بات اخباروں میں آئے تبھی ہمیں اس کا پتا چلے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی کلائنٹ کا بھی ہم سے رابطہ کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ ہمارے باخبر ہونے کے اور بھی کئی ذرائع ہیں۔ آپ کا اور ہمارا یعنی پولیس کا اور وکیلوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں کے پیشوں میں کچھ باتیں مشترک بھی ہیں۔ آپ لوگوں کے بھی معلومات کے کئی ذرائع ہوتے ہیں جنہیں آپ خفیہ رکھتے ہیں۔ ہم بھی اپنی معلومات کے ہر ذریعے کو بے نقاب نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی تو خود آپ کے پیٹی بند بھائی بھی ہمیں بہت سی باتوں کی اطلاع دیتے ہیں ..... بلکہ ہمیں ہی کیا ..... بعض اوقات کئی دوسرے لوگوں کو بھی دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو اپنی دوسری وفاداریوں کے تحت محکمے کے راز بھی ادھر سے ادھر کر دیتے ہیں۔ اس لئے معلومات کے ذرائع کی بات تو آپ جانے ہی دیجئے ....."

اس نے دیکھا ایس ایچ او کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ مسکرا دیا اور دوستانہ انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کی دوسری حیرت دور کرنے کے لئے میں یہ عرض کروں گا کہ ہم ہمیشہ صرف کروڑ پتیوں کے کیس نہیں لڑتے اور ہمیشہ صرف لاکھوں کی فیس کی فکر میں نہیں رہتے۔ کبھی کبھار ہم مالی فائدے کو بالائے طاق بھی رکھ دیتے ہیں۔ کسی غریب آدمی کا کیس بھی لڑ لیتے ہیں۔ اس طرح گویا ہم اپنے پیشے کی زکوۃ نکالتے ہیں۔"

اس نے داد طلب سی نظروں سے ایس ایچ او کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے کی کرختگی میں ذرا بھی فرق نہ آیا اور وہ قدرے سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ کو واقعی اپنے پیشے کی زکوۃ نکالنے کا شوق ہے تو پھر کسی مستحق اور مظلوم کا کیس لڑنے کی کوشش کیا کریں وکیل صاحب! یہ ٹھیک ہے کہ ہم بہت برے اور بدنام ہوتے ہیں۔ ہم پر ظلم و تشدد کے بڑے الزامات آتے ہیں جن میں سے بعض درست بھی ہوتے ہیں لیکن ہمارا دل خوف خدا سے بالکل ہی خالی نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہماری سننے والا کوئی نہیں ہے۔ ہماری تو سچی بات پر بھی کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ بعض اوقات ہم سے زیادہ برے لوگ مختلف ہتھکنڈوں کی وجہ سے دنیا کے سامنے مظلوم بن جاتے ہیں۔ کیا

شرافت کو بھی آپ مظلوم سمجھ کر اس کی مفت وکالت کے لئے آ گئے ہیں؟"

"ابھی میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ....." خالد نے بڑے وقار سے اپنی لاعلمی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "حقائق جاننے کے لئے ہی تو میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہی ہم کوئی فیصلہ کریں گے۔"

"بہرحال ہم نے اس معاملے میں بہت ہی جلدی فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ شاید میری اور میرے ماتحتوں کی زندگی کا پہلا کیس ہے جس میں ہم اتنے کم وقت میں کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہیں۔" ایس ایچ او بھی خالد ہی کی طرح پراعتماد لہجے میں بولا۔ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ شخص آپ کی ہمدردی کا مستحق نہیں ہے۔ یہ انسان نہیں درندہ ہے ..... اور درندہ بھی ایسا جسے خود بھی اپنی درندگی پر اختیار نہیں ..... اس کا آزاد ہونا اس معاشرے کے لئے ایک بلا کے آزاد ہو جانے کے برابر ہو گا۔ اگر آپ اپنی وکالت اور مختلف ترکیبوں کے زور پر اس کو رہا کرانے میں کامیاب ہو گئے تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ انسانیت آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔"

"ایک پولیس انسپکٹر کے منہ سے انسانیت کی بات سن کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔" خالد مسکراتے ہوئے بظاہر ملائمت سے بولا لیکن درحقیقت اس کے الفاظ میں زہریلی کاٹ تھی۔

"اگر ہم لوگ کبھی انسانیت کے مفاد کی بات کرتے بھی ہیں تو انسانیت کے ٹھیکیدار اسے سنتے نہیں ہیں۔" انسپکٹر جو اس تھانے کا ایس او تھا' تلخ لہجے میں بولا۔

"آپ پہلے میری اس سے ملاقات تو کرائیں۔ یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔" خالد نے بحث سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

مزید تھوڑی سی رد و قدح کے بعد اسے حوالات میں شرافت سے ملنے کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔ شرافت کو ایک خطرناک ملزم سمجھتے ہوئے ایک الگ کوٹھری میں تنہا رکھا گیا تھا جبکہ باقی دو کوٹھریوں میں حوالاتی بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔ شرافت کو دیکھ کر خالد کو زبردست جھٹکا لگا تھا۔ اسے اس قسم کے دیوزاد سے سامنا ہونے کی قطعاً" توقع نہیں تھی۔

لمبا تڑنگا اور مضبوط تو وہ تھا ہی ..... لیکن اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی وحشت بھی تھی جو عام طور پر ان لوگوں میں نظر آتی تھی جو ذہنی طور پر کمزور ہوتے تھے۔ اس دیوزاد کے چہرے پر اس وقت کئی ابھار اور نیل موجود تھے جنہوں نے اسے کچھ بدنما بنا دیا تھا۔ ویسے وہ شکل و صورت کا کچھ برا نہیں تھا۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد متورم نیلے حلقے تھے۔ وہ اپنے میلے کچیلے کپڑوں میں چھپے ہوئے جسم کے بعض حصوں کو سہلا رہا تھا جس کے دوران اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ دردناک سی کراہ نکل جاتی



اس کے باوجود نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اسے اپنی حالت کی کوئی خاص پرواہ نہیں تھی۔ وہ زبردست قوت برداشت کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ پولیس نے اس کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کیا تھا اس کے باوجود وہ نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑا تھا بلکہ کسی زخمی درندے کی طرح حوالات کی کوٹھری میں ٹہل رہا تھا۔

مسلح ہیڈ کانسٹیبل نے کوٹھری کا تالا کھول دیا تھا۔ خالد کو اندر جاتے ہوئے ایک لمحے کے لئے خفیف سے خوف کا احساس ہوا۔ وہ واقعی جیسے کسی درندے کے پنجرے میں داخل ہونے جا رہا تھا تاہم اسے یہ دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا کہ شرافت کے چہرے پر خطرناک تاثرات نہیں تھے۔ وہ کچھ ایسے دلچسپی آمیز انداز میں اس کا جائزہ لے رہا تھا جیسے ایک جانور اپنے پنجرے میں آنے والے دوسرے جانور کو دیکھ رہا ہو۔ اس کے علاوہ مسلح ہیڈ کانسٹیبل بھی حوالات کے سلاخ دار دروازے سے کچھ دور ہی سٹول کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔ باہر سے اس نے دروازے کا بولٹ لگا دیا تھا۔ اس کی موجودگی سے بھی خالد کو حوصلہ رہا اور وہ بریف کیس اٹھائے پراعتماد انداز میں شرافت کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کون ہو تم؟" شرافت کے سوجے ہوئے ہونٹ ہلے اور اس کے حلق سے کچھ ایسی آواز برآمد ہوئی جیسے کسی آہنی مشین میں پتھر پیسے جا رہے ہوں۔ یہ آواز سن کر خالد کے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔

وہ مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولا۔ "میں تمہارا وکیل ہوں۔ تمہیں چھڑانے آیا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ تمہاری ضمانت ہو جائے لیکن اگر نہ ہو سکی تو بھی میں تمہارا مقدمہ لڑوں گا اور تمہیں بری کرانے کی کوشش کروں گا۔ اب تم مجھے بتاؤ تم نے کیا کیا ہے؟"

اس کا استہزائیہ سا قہقہہ اس تنگ کوٹھری میں گونج اٹھا۔ یہ قہقہہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے ملتا جلتا تھا۔ "تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ میں نے کیا کیا ہے اور تم میرے وکیل بننے آ گئے ہو؟" وہ گویا محظوظ ہوتے ہوئے بولا لیکن فوراً" ہی کراہ اٹھا اور پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر ایک گندی سی گالی دے کر بولا۔ "بہت مارا منحوسوں نے ....."

خالد اس کی اصل بات کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ "وکیل کو تو سب کچھ تبھی معلوم ہوتا ہے جب موکل اسے بتاتا ہے۔ اب تم مجھے ساری بات بتاؤ گے تو پھر میں اس کی روشنی میں مقدمے کی تیاری کروں گا اور تمہیں بھی سمجھاؤں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے ..... کس سوال کا جواب کس طرح دینا ہے۔"

"مجھے لمبے چکروں میں مت ڈالو ....." وہ بیزاری سے بولا۔ "بس ..... پکڑے گئے تو پکڑے گئے ....." پھر وہ ادھر ادھر دیکھ کر بچوں کی طرح رازدارانہ انداز میں خالد کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "اب تو بس میں کوئی موقع دیکھ کر یہ سلاخیں موڑ کر یا دروازہ توڑ کر یہاں

سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔"

"یہ حماقت مت کرنا۔" خالد جلدی سے بولا۔ "یہ لوگ تم پر خار کھائے بیٹھے ہیں فوراً" تمہیں گولی مار دیں گے اور اس معاملے کو فرار کی کوشش کے ساتھ ساتھ پولیس مقابلہ بھی ظاہر کر دیں گے۔"

"اچھا ....؟ ایسی حرکتیں بھی کرتے ہیں یہ لوگ؟" وہ سر کھجاتے ہوئے اپنی متو آنکھیں پھیلانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "بڑے خبیث ہیں .... لیکن خیر۔ میں بھی بڑا چالاک ہوں۔ میں انہیں ایسا موقع نہیں دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس آنکھوں میں زیادہ بچگانہ پن جھلک آیا اور وہ چالاک کے بجائے زیادہ بے وقوف دکھ دینے لگا۔

پھر یکدم جیسے اسے کچھ خیال آیا اور وہ خالد کو گھورتے ہوئے بولا۔ "تمہیں کس بھیجا ہے؟"

"کسی نے بھی نہیں .... میں خود ہی آیا ہوں۔" خالد نے ایک لمحے سوچنے کے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے .... خود ہی آئے ہو تو پھر خود ہی چلے بھی جاؤ۔" وہ اچانک ہی گھوما اس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا۔

اس لمحے اس کا دل تو چاہا کہ وہ واقعی چلا جائے لیکن وہ خود پر ضبط کئے کھڑا ر جمشید مختار نے جب بھی اسے کسی کام سے بھیجا تھا اس نے پوری کوشش کی تھی کہ ان توقعات کے مطابق نتائج لے کر جائے۔ اس نے کبھی انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ فی الح اسے اندازہ نہیں تھا کہ جمشید اس ناپختہ .... بلکہ کسی حد تک فاترالعقل سے نوجوان پر کی مہربان ہو گئے تھے لیکن اسے یہ بہرحال یقینی طور پر معلوم تھا کہ وہ اسے جیل کی سلاخ سے باہر دیکھنا چاہتے تھے اور خالد کو اس سلسلے میں وہ سب کچھ کرنا تھا جو اس کے اختیار تھا۔

اس نے ایک اور زاویئے سے، بات شروع کرنے کی کوشش کی اور دوستانہ لہجے بولا۔ "اچھا .... یہ بتاؤ جب پولیس نے تمہیں پکڑا' اس وقت تم کیا کر رہے تھے؟"

خلاف توقع شرافت کا موڈ کچھ خوشگوار ہو گیا اور وہ دوبارہ اس کی طرف گھوم مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس وقت میں اس آدمی کو ذبح کرنے کے بعد چاپڑ سے اس کے پاؤں کاٹ رہا تھے جسے میں بڑی مشکل سے ایک گلی میں بے ہوش کرنے کے بعد اٹھا کر ادھورے اور ویران مکان میں لے گیا تھا۔ میں نے بڑی صفائی سے پہلے اس کی انگلیاں تھیں .... پھر اس کے ہاتھ کاٹے .... پھر اس کے بازو کہنیوں تک کاٹے .... پھر کاٹے .... اس طرح مجھے آہستہ آہستہ اس کے سارے جسم کے چھوٹے چھوٹے



کرنے تھے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بڑی محنت کا کام تھا لیکن میں تو اس کام میں زبردست ماہر ہوں۔ اس رات بھی میں بہت دل لگا کر اپنا یہ کام کر رہا تھا .... بڑا مزہ آ رہا تھا .... مجھے آدمی کو ذبح کرنے میں .... اور پھر اس طرح اس کے ٹکڑے کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ شاید میں مزے میں کچھ زیادہ ہی مگن ہو گیا تھا .... شاید کسی نے مکان میں جھانک کر مجھے یہ کام کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو اور جا کر پولیس کو اطلاع دی ہو .... لکڑی پر چاپڑ سے گوشت کاٹنے کی ٹھک ٹھک کی آواز تو خاصی ہوتی ہے .... اور میں بھول گیا تھا کہ رات کے سناٹے میں آوازیں کچھ زیادہ آسانی سے سنائی دیتی ہیں۔ شاید پولیس والوں نے خود ہی سن لی ہوں .... بہرحال مجھے کچھ پتہ نہیں .... مجھے تو بس اس وقت ہی پتہ چلا جب بہت سے پولیس والے بندوقیں لئے مجھے گھیرے کھڑے تھے ...."

خالد کو ایک اور جھرجھری آ گئی۔ شرافت نے خاموش ہو کر افسوس زدہ سے انداز میں ایک گہری سانس لی اور ایک بار پھر اپنے جسم کے بعض حصوں کو سہلاتے ہوئے کراہ اٹھا۔

خالد کو اندیشہ محسوس ہوا کہ اس کا ذہن کہیں پھر اس ڈگر سے بھٹک نہ جائے وہ جلدی سے بولا۔ "کیا یہ کام تم پہلے بھی کر چکے تھے؟"

"کیوں نہیں .... پورے دس مرتبہ کر چکا تھا۔" دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اٹھاتے ہوئے فخریہ لہجے میں بولا۔ "یہ میرا گیارہواں شکار تھا۔ بس ایک موقع اور مل جاتا .... درجن پوری ہو جاتی! پتہ نہیں یہ کمینے پولیس والے کہاں سے آن مرے تھے ...." اس نے دانت کچکچائے۔

"پہلی بار تمہیں ایسا کرنے کا خیال کب آیا تھا؟" خالد نے اب ایک عجیب و غریب دلچسپی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"شوق تو مجھے بچپن سے تھا ...." وہ اطمینان سے بولا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ہونہار اور باصلاحیت نوجوان بتا رہا ہو کہ اسے بچپن سے ہی انجینئر' ڈاکٹر' گلوکار' اداکار یا کھلاڑی بننے کا شوق تھا۔

"بچپن سے ....؟" خالد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں .... اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" شرافت گویا کچھ برا مناتے ہوئے بولا۔ "دراصل میرا باپ قصاب تھا۔ میں بچپن ہی سے اسے بیل' بکرے اور گائیں بھینسیں وغیرہ ذبح کرتے دیکھتا تھا۔ ان کے نرخروں سے بہتا ہوا خون دیکھ کر مجھے دلی خوشی

ہوتی تھی۔ میں نے بچپن ہی سے ..... شاید پانچ چھ برس کی عمر سے ہی ضد کرنی شروع کر دی کہ میں بھی جانور کاٹوں گا لیکن میرا باپ مجھے اجازت نہیں دیتا تھا ..... میرا باپ بہت شریف آدمی تھا۔ مویشی ذبح کرنے کے سوا اس نے کبھی مکھی بھی نہیں ماری تھی ....."

وہ ایک بار پھر عجیب سے انداز میں ہنسا۔ اس کے چہرے پر کسی حد تک بچکانہ رنگ چھلک آنے کے باوجود اس کی ہنسی بے حد بھیانک محسوس ہوئی۔

وہ اب کچھ ترنگ میں آ چکا تھا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "میرا باپ سلاٹر ہاؤس نہیں جاتا تھا۔ گلی محلے میں ہی گوشت بیچنے کے لئے خاموشی سے ایک جانور چھوٹے گوشت کے لئے اور ایک جانور بڑے گوشت کے لئے ذبح کر لیتا تھا۔ جانور ایک دو رات پہلے ہی لا کر گھر میں باندھ لئے جاتے تھے۔ ایک صبح اس کے اٹھنے سے پہلے ہی میں نے کسی نہ کسی طرح ایک بکرے کو گرایا اور ذبح کر ڈالا۔ کیا بتاؤں۔۔۔ کیسا مزہ آیا۔۔۔ بھل بھل کر کے بہتا خون دیکھ کر میرے جسم میں عجیب سی لذت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اس وقت میری عمر آٹھ نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ میرے باپ نے پہلے پہل تو غصہ کیا۔ دراصل وہ مجھے اس کام میں لگانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ میں اسکول جایا کروں اور پڑھ لکھ کر کسی اور طرح کا آدمی بنوں۔۔۔ کوئی اور پیشہ اختیار کروں۔ وہ اکثر مجھے مار پیٹ کر اسکول چھوڑ کر بھی آتا تھا لیکن میں موقع ملتے ہی وہاں سے بھاگ جاتا تھا۔۔۔"

پھر اچانک ہی اس نے باتوں کی روانی میں ہی کہا۔ "تم بیٹھ کیوں نہیں جاتے؟"

خالد ایک لمحے کے لئے تو گڑبڑا گیا پھر اس نے دیکھا شرافت دراصل فرش پر ایک چٹائی پر بچھے ہوئے میلے کچیلے اور پھٹے پرانے گدے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ خالد اپنے سوٹ کو سنبھالتے ہوئے بادل نخواستہ اس پر بیٹھ گیا۔ وہ کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔ شرافت اس کے سامنے فرش پر ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا لیکن اس دوران میں اس کا ذہن ٹریک سے کچھ ہٹ چکا تھا۔

سر کھجاتے ہوئے غائب دماغ لوگوں کے سے انداز میں بولا۔ "میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہ تم نے۔۔۔ باپ سے پوچھے بغیر ایک جانور ذبح کر ڈالا۔۔۔" خالد نے یاد دلایا

"ہاں۔۔۔" اس کی باچھیں کھل گئیں۔ "بڑا مزہ آیا تھا۔ وہ مزہ آج بھی نہیں بھولتا۔ باپ نے شروع شروع میں تو غصہ دکھایا لیکن آہستہ آہستہ اسے بھی آرام طلبی ہو گئی۔ وہ پڑا سوتا رہتا اور میں صبح صبح اٹھ کر جانور نہ صرف ذبح کر دیتا بلکہ ان کا گوشت



بھی بنا کر رکھ دیتا۔ مجھے یہ کام دنیا کا سب سے اچھا کام لگتا تھا۔ قسم سے بہت ہی مزہ آتا تھا۔ پھر ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جونہی میں نے گھر کے صحن میں بکرے کو ذبح کیا اور اس کے نرخرے سے خون کی پچکاری نکلی، میں نے اچانک ہی کٹے ہوئے نرخرے سے منہ لگا لیا اور غٹ غٹ کر کے وہ خون پینے لگا۔ مجھے افسوس ہوتا تھا کہ روز اتنا خون ضائع ہو جاتا تھا اور ہر تھوڑے دن بعد صحن کی مٹی کھود کر اس خون کو چھپانا پڑتا تھا۔ اس روز میں نے بہت معمولی سا خون ضائع ہونے دیا باقی سارا کا سارا پی گیا۔۔۔"

"تم بکرے کا خون پی گئے؟" خالد نے بے یقینی اور کراہیت سے پوچھا۔ اس کا دل متلانے لگا تھا۔

شرافت نے یوں حیرت سے خالد کی طرف دیکھا جیسے اسے خالد کا سوال سخت احمقانہ لگا ہو۔ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "جی ہاں ..... میں آپ کو یہی تو بتا رہا ہوں کہ میں بکرے کا خون پی گیا۔ قسم سے ..... بڑا مزہ آیا ....." اس نے گویا اس وقت کو یاد کرتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ جیسے کسی انتہائی لذیذ مشروب کا ذکر کر رہا تھا جس کی یاد آتے ہی اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔

خالد کی مجبوری یہ تھی کہ اسے شرافت کا کیس لڑنا تھا۔ وہ اس کی زبانی تمام تفصیلات سن لینا چاہتا تھا تاکہ کسی پہلو سے وہ اندھیرے میں نہ رہے اور سرکاری وکیل اس کی لاعلمی سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ویسے وہ اپنے کیسوں میں زیادہ تر وکیل سرکار سے پہلے ہی خفیہ معاہدہ کر لیتے تھے کہ وہ زیادہ جوش و خروش سے کیس نہیں لڑے گا اور زیادہ قابلیت دکھانے کی بھی کوشش نہیں کرے گا۔ نئے نئے نکتے ڈھونڈ کر نہیں لائے گا۔ پولیس افسران کو زیادہ باریک بینی سے تفتیش پر مجبور نہیں کرے گا۔

سرکاری وکیل کو کیس جیتنے سے یا اپنا موقف ثابت کرنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ اسے تو گلی بندھی فیس ہی ملتی تھی جو نہایت معمولی ہوتی تھی۔ اس کے حصے میں کچھ زیادہ داد و تحسین بھی نہیں آتی تھی کیونکہ اگر کوئی جرم ہوا تھا تو اسے ثابت کرنا تو پولیس اور سرکاری وکیل کا فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں کا نظریہ یہی تھا کہ اس میں بھلا داد و تحسین کی کیا بات تھی؟ کوئی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا تھا کہ وہ کتنے مشکل حالات میں اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ چنانچہ بددل ہو کر وہ بھی کرپشن کے اس سیلاب میں بہہ جانے میں ہی عافیت سمجھتے تھے جو معاشرے میں پہلے ہی سے رواں تھا۔

پولیس کو خریدنا جمشید مختار کی فرم کے لئے ویسے ہی زیادہ مشکل نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھار ہی کوئی ضدی اور اڑیل پولیس آفیسران کے راستے میں آتا تھا جو کسی قیمت پر بکنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ اس کا جمشید کوئی اور بندوبست کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ وکیل سرکار کو اتنی رقم کی پیشکش کی جاتی تھی کہ اس کی بچی کچی قوت مزاحمت بھی دم توڑ جاتی تھی اور وہ محض دکھانے کے لئے کیس کی پیروی کرتا تھا۔

جمشید جو دعویٰ کرتے تھے کہ وہ یا ان کی فرم کوئی کیس ہارتی نہیں تھی اس کے



اصل میں یہی نظام کام کرتا تھا۔ کیس جیتنے میں ان کی یا ان کے وکیلوں کی قابلیت کو کم ہی دخل ہوتا تھا کیونکہ وہ جن کے مقدمے لڑتے تھے درحقیقت وہ واقعی مجرم ہوتے تھے لیکن وہ کسی بھی ہتھکنڈے سے اسے قانون کی گرفت سے نکال لاتے تھے۔ اس کے لئے وہ کسی بھی کام کو ناجائز نہیں سمجھتے تھے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز تھا لیکن پس پردہ ہتھکنڈے تو سب کی نظر میں نہیں آتے تھے اس لئے دنیا اور پریس صرف کامیابیوں کو دیکھتا تھا اور ان کی ساکھ بہتر سے بہتر ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہ کہانی اب خالد کی سمجھ میں بھی اچھی طرح آ چکی تھی لیکن وہ دل میں اس پر کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ اس مشین کا ایک پرزہ بن چکا تھا اور اسے اس پر فخر محسوس ہونے لگا تھا۔

شرافت بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "وکیل صاحب! اس خون کی مجھے ایسی چاٹ پڑی کہ یہ میری خوراک بن گیا۔ میں اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ منگل بدھ کا ناغہ ہوتا تھا۔ اس روز جانور بھی نہیں کٹتا تھا تو مجھے خون بھی نہیں ملتا تھا۔ یہ دو دن بہت ہی برے گزرتے تھے۔ میری وہی حالت ہوتی تھی جو عادی شرابی یا کسی بھی نشئی کو اس کا نشہ نہ ملنے پر ہوتی ہے ....."

خالد کو احساس ہوا کہ جب وہ شرافت کی داستان سن رہا تھا تو اسے اس تذکرے پر کراہیت محسوس ہوئی تھی لیکن اب جبکہ وہ جمشید مختار کے سامنے بیٹھا تھا تو اسے یہ سب کچھ یاد کرتے ہوئے ذرا بھی کراہیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دوران میں خود اس کی اپنی ذات پر کچھ انقلابات گزر چکے تھے۔ شاید اس میں مزید کچھ تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ تبدیلیاں تو اس کی ذات میں اسی دن سے آنا شروع ہو گئی تھیں جس دن اس نے حیدر آباد میں نیاز علی کا کیس لڑنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ شاید مزید اور نت نئی تبدیلیاں آتی جا رہی تھی۔

اس کے ذہن میں شرافت سے ملاقات کی فلم بدستور چل رہی تھی۔ شرافت کی داستان جاری تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں نے کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا کہ میں کیا پی رہا ہوں۔ مجھے پتہ تھا لوگ اس بات کو اچھا نہیں سمجھیں گے ....." اس کی آنکھوں میں وہی بے وقوفانہ سی چمک نمودار ہوئی۔ اس نے گویا اس بات کو خفیہ رکھ کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے اپنے سراپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ جو آپ میری اتنی اچھی صحت ..... یہ شاندار جان دیکھ رہے ہیں اس کی وجہ وہی ہے۔ میں تو لڑکپن میں ہی شیر بن گیا تھا ..... شیر ....." اس نے داد طلب نظروں سے خالد کی طرف دیکھا۔

خالد کو کہنا پڑا۔ "بے شک ..... بے شک ..... وہ تو نظر آ رہا ہے ....." اس کا انداز

ہمت افزائی کرنے اور پچکارنے کا سا تھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

شرافت ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "پھر کچھ اچھا نہیں ہوا جی ..... یا شاید اچھا ہی ہوا ..... میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا ..... بہرحال ہوا یہ کہ آخر کار میں بکروں اور گائے بھینسوں کا خون پیتے پیتے اکتا گیا۔ اس خوراک سے میرا دل بھر گیا اور جانوروں کو ذبح کرنا بھی میرے نزدیک کوئی دلچسپ کام نہ رہا۔ میری نظر انسانوں پر ٹھہرنے لگی۔ کبھی کبھی تو کسی انسان کو ذبح کرنے کو اس بری طرح میرا دل چاہتا کہ ہاتھ پیروں میں اینٹھن سی ہونے لگتی۔ جانوروں کو تو اب میں صرف ابا کی خاطر بے دلی سے ذبح کرتا تھا۔ اسی زمانے میں اماں اور ابا کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ ہم بہن بھائی بھی بکھر گئے۔ مجھے پہلے سے بھی زیادہ ایک غریبانہ بستی میں رہائش اختیار کرنا پڑی۔ گزر اوقات کے لئے میں مختلف کام کرتا رہا۔ کبھی کبھی جانور ذبح کر کے گوشت بھی بیچ لیتا تھا۔ کبھی کسی کے صدقے' دعوت یا بقر عید کا جانور بھی ذبح کر دیتا تھا۔ گزر اوقات کے لئے پیسے مل جاتے تھے۔ اس دوران میں انسان کو ذبح کرنے کا شوق کچھ دب گیا تھا لیکن دل سے نکلا نہیں تھا۔ ایک رات میں کہیں آوارہ گردی سے واپس آ رہا تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ سڑکوں پر تاریکی اور سناٹا تھا۔ حالات بھی کچھ ٹھیک نہیں تھے۔ لوگ سردی سے بھی اور خوف سے بھی گھروں میں دبکے ہوئے تھے لیکن میرے ساتھ یہ دونوں ہی مسئلے نہیں تھے۔ مجھے نہ تو سردی کوئی خاص لگتی تھی اور نہ ہی حالات سے خوف آتا تھا۔ حالات چاہے کچھ بھی ہوتے' میں اپنی من مرضی کے مطابق آوارہ پھرتا رہتا تھا اور عجیب اتفاق ہے ..... یا قسمت کی بات ہے کہ مجھے کبھی کچھ ہوا بھی نہیں ....."

وہ جیسے کسی خوش کن تصور میں کھو کر اس سے آگے بات کرنا ہی بھول گیا بلکہ شاید یہ بھی بھول گیا کہ وہ کہاں بیٹھا تھا۔ اس کی ذہنی رو کبھی کسی انداز میں اور کبھی اس کی آنکھوں میں اب ایک خالی پن سا تھا۔ خالد نے اسے یاد دلایا۔ "تم سردیوں کی اس رات کی بات بتا رہے تھے ....."

"ہاں ....." شرافت کو یکدم ہی یاد آ گیا اور اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ "تو میں بتا رہا تھا کہ میں بے فکری سے کبھی سیٹی بجاتا اور کبھی گاتا جھومتا لہراتا سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ راستے میں ایک مزدور ٹائپ آدمی میرے ساتھ ہو لیا۔ وہ بے چارہ اکیلا جاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ میری بے فکری دیکھ کر وہ میرے ساتھ ہو لیا۔ شاید اس خیال سے اسے حوصلہ ملا کہ وہ ایک نڈر آدمی کے ساتھ تھا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ اس نے اچھا بھلا اپنا راستہ طے کرتے کرتے خود آگے بڑھ کر موت کو اپنا ہم سفر بنا لیا تھا ....."

خالد اس کے اس جملے پر قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ واقعی متضاد صفات کا حامل کردار تھا۔ دیکھنے میں بالکل اجڈ' جاہل اور اکھڑ آدمی دکھائی



تھا۔ کبھی کبھار بات بھی اسی طرح کرتا تھا لیکن زیادہ تر وہ اچھے خاصے سلجھے ہوئے اور سمجھدار آدمی کی طرح بات کرتا تھا جسے اپنا مفہوم بیان کرنے پر قدرت حاصل تھی لیکن کبھی بات کرتے کرتے پٹری سے اتر جاتا تھا۔ کبھی اس کا ذہن گویا بھٹک کر کہیں اور جا پہنچتا تھا۔ اب وہ ایک ایسا جملہ بول گیا تھا جس کے بارے میں یقین کرنا مشکل محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس جیسے آدمی کے منہ سے نکلا تھا۔

وہ اپنی اس بات سے محظوظ ہوتے ہوئے بے ڈھنگے انداز میں ہنس رہا تھا۔ ہنسی تھمی تو اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "میں ان دنوں ٹین کی چھت کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہ رہا تھا جس میں چھوٹا سا کچا صحن بھی تھا۔ میرا مکان تو راستے میں آ گیا لیکن اس شخص کو ابھی آگے بہت دور جانا تھا۔ ہو کا عالم تھا۔ کبھی کبھار کسی کتے کے بھونکنے کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس اثناء میں ذرا دور کہیں کلاشنکوف کی تڑتڑاہٹ گونج اٹھی۔ وہ شخص بے چارہ اور ڈر گیا۔ اسے اکیلے آگے جاتے ہوئے خوف آنے لگا۔ میں نے اسے دعوت دی کہ کچھ دیر کے لئے ..... اور اگر ضرورت پڑے تو صبح تک کے لئے میرے مکان میں رک جائے۔ وہ بے چارہ خوشی سے تیار ہو گیا۔ میں نے گھر میں لا کر اپنی حیثیت کے مطابق اس کی خاطر مدارت بھی کی۔ چائے وائے بنا کر پلائی اور تھوڑی سی ڈبل روٹی بھی کھلائی۔ قربانی کے بکرے پر بھی چھری پھیرنے سے پہلے اسے تھوڑا بہت دانہ پانی تو دیتے ہیں نا ....."

وہ ایک بار پھر ہنسا۔ اس بار اس نے سلسلہ کلام جوڑا تو اس کی آنکھوں میں درندگی کی چمک نمودار ہونے لگی تھی۔ "موقع پاتے ہی میں نے اسے دبوچ لیا اور کنپٹی پر ایک ہی گھونسا مار کر بے ہوش کر دیا اور اٹھا کر صحن میں لے گیا۔ اس کی گردن پر چھری پھیرنے اور پھر اس کا خون پینے میں جو لذت محسوس ہوئی اس کے سامنے میں اس سے پہلے کی تمام لذتوں کو بھول گیا ....."

خالد کو یاد تھا کہ اس بدبخت کی یہ بات سن کر ایک لمحے کے لئے اس کا دل چاہا تھا کہ کوئی بھاری چیز اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے اور اس کا مقدمہ لڑنے کا خیال دل سے نکال دے لیکن یہ خواہش محض ہوا کے جھونکے کی طرح تھی۔ آئی اور گزر گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو اس طرح پرسکون محسوس کیا جیسے وہ ایک عام کلائنٹ کے سامنے بیٹھا روزمرہ زندگی کا کوئی واقعہ سن رہا تھا۔

شرافت کی بات جاری تھی۔ "اس کے بعد میں نے اطمینان سے بیٹھ کر اس کی لاش کے اسی طرح ٹکڑے کئے جس طرح بیل بکرے وغیرہ کا گوشت بنانے کے لئے پہلے اس کے بڑے بڑے ٹکڑے کر لئے جاتے ہیں۔ ان ٹکڑوں کو میں نے بوری میں بند کیا اور ایک قریبی گندے نالے میں پھینک آیا۔"

"راستے میں تمہیں کسی نے نہیں روکا؟" خالد نے حیرت سے پوچھا۔

"توبہ کریں جی ..... راستے میں مجھے کہیں آدم زاد کی شکل تک نظر نہیں آئی۔ گلیوں میں جیسے صرف موت بال کھولے گھوم رہی تھی۔ میں بوری کمر پر لادے گاتا ہوا جا رہا تھا مگر کسی نے مجھے نہیں روکا۔ نالہ زیادہ دور بھی نہیں تھا۔"

"اس کے بعد تمہارا حوصلہ بڑھ گیا ہو گا؟" خالد نے تصدیق چاہی۔

"بے شک ....." شرافت نے تائید کی۔ "اتنا مزہ تو زندگی میں کسی کام میں نہیں آیا تھا۔ میں نے ایک اور عقلمندی کی۔ شہر میں دو تین اور ویران سی جگہوں پر ٹھکانے تلاش کیئے۔ ایک ادھ بنا مکان تھا جس کے مکمل ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے اور وہ کھنڈر ہو رہا تھا۔ اس کے آس پاس بھی کافی خالی پلاٹ تھے اور ویرانی سی رہتی تھی۔ اس طرح کے دو تین ٹھکانے اور ڈھونڈے۔ پھر پیسے جمع کر کے کچھ فالتو اوزار خریدے اور ان جگہوں پر لے جا کر چھپا دیئے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ کام صرف اپنے ٹھکانے پر ہی کرتا رہوں اور وہ ٹھکانہ کسی کی نظر میں آ جائے۔ اب میں یہ کرتا تھا کہ جو جگہیں میں نے تاڑی تھیں ان میں سے کسی نہ کسی کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ کوئی نہ کوئی شکار کبھی کبھار ہاتھ آ ہی جاتا تھا۔ دو چار مہینے میں ایک آدھ مرتبہ تو خون کی پیاس بجھ ہی جاتی تھی۔ لاش کے میں ٹکڑے کر کے اور بعض اوقات سالم ہی کہیں پھینک دیتا تھا۔ ایک آدھ لاش میں نے ان کھنڈرات کے فرش کھود کر بھی دفن کی۔"

"کسی کو تم پر شبہ نہیں ہوا اور تم کسی کی نظر میں نہیں آئے؟" خالد نے پوچھا۔

"قطعی نہیں ....." شرافت نے اطمینان سے جواب دیا۔ "شہر میں اور بھی بہت لوگ اس سے ملتے جلتے کام کر رہے ہیں۔ ان کی آڑ میں اپنا بھی کام چلتا رہا۔ ایک بار مجھے کافی خطرہ محسوس ہوا تھا کہ لو بھئی آج تو مارے گئے ..... مگر خیریت ہی رہی۔ ہوا یہ کہ وہ شکار ذرا تگڑا تھا۔ صحیح طرح میرے قابو میں نہیں آیا۔ عین اس وقت جب میں اس کے گلے پر چھری پھیرنے لگا اسے ہوش آ گیا اور اس نے بری طرح مچلنا اور چیخنا شروع کر دیا لیکن میں نے بھی اسے دو سے زیادہ چیخیں مارنے نہیں دیں اور چھری پھیر ہی دی۔ اس کی آواز خرخراہٹ میں تبدیل ہو گئی۔"

"آس پاس سے کوئی دیکھنے نہیں آیا کہ کیا معاملہ ہے؟" خالد نے دریافت کیا۔

وہ گویا اس کے سوال کو احمقانہ محسوس کرتے ہوئے زور سے ہنسا۔ "کیسی باتیں کرتے ہیں وکیل صاحب! آج کل گھروں میں دبکے ہوئے لوگ اس قسم کی آوازیں سن کر اور بھی زیادہ دبک جاتے ہیں۔ چاہے آوازیں برابر والے گھر سے آ رہی ہوں۔ اسی لئے مجھ جیسے بہت سے اذیت پسندوں اور انسانوں کے شکاریوں کا کام آسان ہو گیا ہے۔"

"لیکن ایک نہ ایک روز آخر کار ہر چیز اپنے انجام کو پہنچتی ہے ..... یا کم از کم



کی طرف بڑھتی ضرور ہے۔" خالد بولا۔

"ہاں ..... یہ بات تو ہے ....." شرافت نے تسلیم کیا۔ "پکڑا میں اس روز گیا جس روز میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ دور دور تک مجھے کسی خطرے کے آثار دکھائی نہیں دیئے تھے۔"

"اصل میں اس دنیا میں صرف ایک ہی قسم کی طاقتیں کام نہیں کر رہی ہیں نا ..... ایک طاقت ایسی بھی ہے جو ہم تم جیسے انسانوں کی خواہشوں اور کوشش کو ناکام بناتی ہے۔ ہم اپنے حساب سے دنیا کا نظام چلانا چاہتے ہیں۔ وہ طاقت اپنے حساب سے دنیا کا نظام چلاتی ہے۔" یہ الفاظ گویا خود بخود خالد کے منہ سے نکل گئے۔ اسے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے یہ کہنے کا اس کا ارادہ نہیں تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا۔ "تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے وہ سب پولیس کو بھی بتا دیا ہے؟"

"تفصیل سے تو نہیں بتایا ..... لیکن یہ بہرحال بتا دیا ہے کہ اسی طریقے سے میں نو آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں۔ اب میں کیا کرتا ..... وہ پوچھے جا رہے تھے نا ..... اور ساتھ ساتھ مارے بھی جا رہے تھے ..... کم بختوں نے بہت مارا ہے ....." اسے ایک بار پھر اپنی چوٹیں یاد آ گئیں اور وہ انہیں سہلاتے ہوئے کراہنے لگا۔

"خیر..... جو ہوا سو ہوا ..... اب تم ان کے سامنے کچھ نہیں بولو گے۔ اپنی مرضی سے کچھ نہیں بولو گے۔ یہ تشدد بھی شاید تمہارے حق میں اچھا ہی ثابت ہو جائے۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارا چالان جلد از جلد عدالت میں پیش ہو جائے تاکہ تمہارے جسم پر تشدد کے یہ نشانات جوں کے توں موجود ہوں۔ میں یہ نشانات عدالت اور پریس والوں کو دکھاؤں گا ....."

پھر خالد نے اس کے منہ پر ہی کہہ بھی دیا۔ "ویسے بھی تم ذہنی طور پر تھوڑے سے کھسکے ہوئے تو ہو ..... لیکن عدالت میں اور بھی زیادہ خبط الحواس سے بن جانا۔ زیادہ بہکی بہکی سی باتیں کرنا ..... قتل و خون کی باتیں ہرگز نہ کرنا ..... میں تمہیں تفصیل سے سمجھاؤں گا کہ تمہیں کیا باتیں کرنی ہوں گی اور کس قسم کے سوالوں کے جواب کس طرح دینے ہوں گے۔ میں اس بات کا بندوبست کر لوں گا کہ سرکاری وکیل تم سے بہت سیدھے سادے اور بے ضرر سے سوالات کرے گا۔ اس کے باوجود اگر کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو بچوں جیسا کوئی جواب دینا اور زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرنا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرح دہشت زدہ سی نظروں سے جج صاحب کی طرف نہ دیکھنا ..... میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور خالد نے محسوس کیا کہ اس کی

مسکراہٹ میں مکاری کی جھلک تھی۔ گویا وہ اتنا بھی بے وقوف نہیں تھا جتنا خالد سمجھ رہا تھا۔ وہ کچھ عجیب قسم کا ذہنی مریض تھا لیکن خالد کو بہرحال یہ امید نظر آنے لگی تھی کہ وہ اس کی ہدایات پر عمل کر سکتا تھا۔ اسے بچانے کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔

خالد اس سے مزید کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد واپس آگیا۔ پھر اس نے ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق شہر کے ایک اعلیٰ قسم کے ہوٹل میں سرکاری وکیل سے بھی ملاقات کی تھی۔ وہ ملاقات خاصی مایوس کن تھی۔ شرافت سے ملاقات کے بعد خالد اپنے دل میں جو امیدیں لے کر آیا تھا' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سرکاری وکیل ان پر پانی پھیرنے پر تلا ہوا تھا اور خالد اسے یا دوسرے سرکاری وکیلوں کو رام کرنے کے لئے اب تک جو ہتھکنڈے اور حربے استعمال کرتا آیا تھا وہ گویا ان سب کو ناکام بنانے پر تلا ہوا تھا۔

اب جمشید نے اس سلسلے میں دریافت کیا تو ان ملاقاتوں کی یاد تمام جزئیات کے ساتھ خالد کے ذہن میں ابھر آئی اور اس نے سب کچھ تفصیل سے جمشید کو بتا دیا۔ وہ نہایت انہماک سے سنتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چشم تصور سے ان ملاقاتوں کا منظر دیکھ بھی رہے تھے۔

آخر میں خالد بولا۔ "شرافت کو تو اس کی تمام تر ذہنی کج روی کے باوجود میں ہینڈل کر لوں گا۔ مجھے امید ہے کہ عدالت میں پیشیوں کے موقعوں پر وہ ہماری مرضی کے مطابق ایکٹنگ کر لے گا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ پولیس نے اس پر ایسا تشدد کیا ہے جس کے نشانات بالکل عیاں ہیں اور ان کے لئے کوئی میڈیکل چیک اپ بھی کرانے کی ضرورت نہیں۔ کوئی اندھا بھی انہیں دیکھ سکتا ہے ..... ورنہ پولیس کے پاس تو بعض ایسے حربے کار ہوتے ہیں کہ تشدد کے نشانات نظر نہیں آتے اور میڈیکل چیک اپ کے بعد بھی وہ جواز اختیار کر لیتی ہے کہ اگر کچھ علامتیں موجود بھی ہیں تو وہ حراست سے پہلے کی ہوں گی اور ممکن ہے کہ حادثاتی ہوں۔"

"اب تمہیں شرافت کو عدالت میں مظلوم ثابت کرنے میں آسانی رہے گی۔" جمشید نے تفہیمی انداز میں سرہلایا۔

"جی ہاں ..... میں شرافت کی اداکاری کی مدد سے ثابت کروں گا کہ وہ ایک سیدھا سادا ..... مخبوط الحواس سا ..... مگر بے ضرر نوجوان ہے۔ پولیس نے اس پر تشدد کر کے اس سے اپنی مرضی کی باتیں اگلوائی ہیں اور نہ جانے کس جنونی قاتل کی وارداتیں اس کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔" خالد بولا۔

"بالکل ٹھیک ہے ..... یہ کام زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔ اس قسم کے معاملات میں پولیس کی خراب شہرت ہم جیسے وکیلوں کے بڑا کام آتی ہے۔" جمشید مختار مسکراتے ہوئے بولے۔



"اس کے علاوہ پولیس نے اس کی آخری واردات کا جو وقت. ایف آئی آر میں درج کیا ہے اس کے سلسلے میں ہم کسی نہایت معزز اور ممتاز شہری کو گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کر دیں گے ..... یہ گواہ کوئی جانی پہچانی بیگم صاحبہ بھی ہو سکتی ہیں جو بتائیں گی کہ اس وقت تو شرافت ان کے بنگلے کے سرونٹ کوارٹر میں سو رہا تھا۔ دن بھر ان کے بنگلے پر کام کر کے وہ ان کے سامنے سرونٹ کوارٹر میں گیا تھا اور اس کے بعد انہوں نے بنگلے کو تالا لگوا دیا تھا۔ ان کا بنگلہ جائے واردات سے میلوں دور ہو گا اور وہ ظاہر کریں گی ..... یا ظاہر کریں گے کہ انہوں نے اپنے بنگلے میں رنگ و روغن یا مرمت وغیرہ کے کام کے لئے کچھ لوگوں کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ کام جلدی نمٹانے کے لئے وہ لوگ صبح جلدی کام شروع کر دیتے ہیں اور رات گئے تک کرتے رہتے ہیں اس لئے وہیں سرونٹ کوارٹر میں سو جاتے ہیں۔ بنگلے میں ایک سرونٹ کوارٹر خالی پڑا تھا اس لئے ان صاحب یا بیگم صاحبہ نے عارضی طور پر انہیں وہاں شب بسری کی اجازت دی ہوئی تھی۔ ایسے کچھ مزدور ٹائپ لوگوں کا بھی بندوبست کر لیا جائے گا جو صاحب یا بیگم صاحبہ کے بیان کی تصدیق کریں گے کہ شرافت واقعی ان کے ساتھ سرونٹ کوارٹر میں تھا۔ وہ تو علی الصبح کسی کام سے نکلا اور پھر واپس نہیں آیا۔ نہ جانے کس جگہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس قسم کی کوئی کہانی گھڑلی جائے گی۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" جمشید مختار نے طمانیت سے سرہلایا۔ "یہ طریقہ ہمارے کئی کیسوں میں کامیاب رہا ہے۔"

خالد دل میں دبی ہوئی ایک بات اس لمحے زبان پر لاتے ہوئے بولا۔ "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس قسم کے دولت مند کلائنٹس کے کیس لڑنا تو میری سمجھ میں آتا ہے کیونکہ ان سے ہمیں اتنی فیس ملتی ہے جس کی کوئی بڑے سے بڑا وکیل بھی توقع نہیں کر سکتا لیکن شرافت جیسے مفلس و قلاش کا کیس، لڑ کر ہمیں کیا ملے گا؟ اس کے سلسلے میں تو الٹا ہمیں پلے سے کافی رقم خرچ کرنا پڑے گی۔ وقت الگ ضائع ہو گا۔"

جمشید یوں تحمل سے مسکرائے گویا انہیں بہت پہلے اس سوال کی توقع تھی۔ پھر وہ رسان سے بولے۔ "تمہارا خیال ہے کہ ہم سارے کیس پیسے کے لئے لڑتے ہیں؟"

خالد کچھ گڑبڑا گیا۔ پہلے تو اس کا خیال یہی تھا لیکن آج رات جمشید کی شخصیت اور دیگر معاملات کے جو گوشے اس کے سامنے آئے تھے ان کی روشنی میں کچھ اور باتیں بھی سمجھ میں آتی تھیں۔ تاہم جمشید نے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی وضاحت شروع کر دی۔

"روپیہ پیسہ میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ بتایا ہے اور جس انداز میں ہم خرچ کرتے ہیں وہ سب کچھ صرف ہماری دولت کی کمائی سے پورا نہیں ہوتا۔ مانا کہ ہم لاکھوں میں فیس لیتے ہیں اس کے باوجود فرم کی کمائی سے یہ سب کچھ کرنا مشکل تھا کیونکہ

ہماری فرم مختصر ہے اور ایک ایک مقدمہ کافی وقت لے جاتا ہے حالانکہ ہم اپنے مخصوص حربوں کے ذریعے اپنے مقدموں کی سماعت تیزی سے مکمل کراتے ہیں۔ جلدی پیشیاں ڈلواتے ہیں۔ جلدی گواہوں کا بندوبست کرتے ہیں۔ سرکاری وکیل کو غائب نہیں ہونے دیتے۔ اس کے باوجود خاصا وقت لگ جاتا ہے۔ اس لئے ہماری آمدنی اتنی نہیں ہے جتنی ہمیں اپنے منصوبوں پر عمل درآمد کے لئے درکار ہوتی ہے لیکن روپے پیسے کی وجہ سے کبھی میرا کوئی کام نہیں رکتا۔ میں چٹکی بجاؤں تو رقمیں نہ جانے کن کن کونے کھدروں سے کھنچی چلی آتی ہیں۔ دنیا بھر میں جہاں جہاں جتنی بھی شیطانی قوتیں کام کر رہی ہیں ان کے لئے روپیہ پیسہ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے وسائل اور اپنے ذرائع خود بخود پیدا کر لیتی ہیں۔ ہمارے سامنے مسئلہ اپنے اچھے اور سچے پیروکار تلاش کرنے کا ہے جو دل و جان سے ہمارے ہوں یا رفتہ رفتہ ہمارے بن جائیں اور دل و جان سے ہی ہمارے مقاصد میں ہمارا ساتھ دیں۔ ان پر ہمیں پلے سے بھی خرچ کرنا پڑے ..... اور خواہ کتنا ہی خرچ کرنا پڑے ..... تو ہم کریں گے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئے پھر ڈرامائی سے انداز میں بولے۔ "مجھے یہ نوجوان ..... جس کا نام شرافت ہے ..... ہر حال میں آزاد چاہئے۔" انہوں نے انگلی سے یوں ایک طرف اشارہ کیا جیسے شرافت ادھر بیٹھا ہو۔ "یہ نوجوان میرے کچھ مقاصد کے لئے موزوں ترین ہے۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ میں نے کچھ دیر پہلے تمہیں بتایا ہی ہے کہ ہم اس دنیا میں ایک مشن کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اس مشن کی تکمیل کے لئے ہمیں بہت بڑی تعداد میں موزوں اور مناسب آدمی درکار ہیں۔ طرح طرح کی صلاحیتوں کے حامل مختلف لوگ ..... جن میں ہر ایک اپنی جگہ ایک ہیرا ہو۔ جتنی جلدی میرے مطلب کے لوگ جمع ہوتے جائیں' اتنا ہی اچھا ہے۔ اتنی ہی جلدی میں اپنے مشن میں کامیاب ہو سکوں گا۔ یہ نوجوان بھی میرے مطلب کا آدمی ہے اور مجھے جلدی اس کی ضرورت ہے۔ تم سب کام چھوڑ کر اس کیس کے پیچھے لگ جاؤ اور اسے رہا کراؤ۔"

"سر! یہ کام اتنا مشکل نہیں ہے ..... لیکن بس ایک بڑی رکاوٹ کھڑی ہو گئی ہے۔" خالد ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"وہ کیا؟" جمشید صاحب نے بھنوئیں اچکائیں۔ ان کی آنکھوں میں یک بیک ایک چمک نمودار ہوئی جیسے کسی درندے کو اچانک کسی خطرے کا احساس ہوا ہو۔

"سرکاری وکیل تعاون پر آمادہ نہیں ہے۔" خالد بولا۔

"کیوں .....؟" جمشید کے لہجے میں حیرت در آئی۔ "کیا تم نے اسے خاطر خواہ رقم کی پیشکش نہیں کی تھی؟"

"کی تھی سر.....! بہت بڑی رقم کی پیشکش کی تھی۔ اتنی بڑی رقم کا سن کر تو پولیس



کے کسی بڑے سے بڑے عہدیدار کے منہ میں بھی پانی آ سکتا تھا۔" خالد نے جواب دیا۔

"تو پھر انکار کیسے سننے کو ملا؟" جمشید صاحب کی آواز میں غصہ جھلک آیا۔ "پیسے کے عوض تو یہاں ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ لوگ اپنا ضمیر اور ایمان تک بیچنے کے لئے تیار پھرتے رہتے ہیں۔ صرف قیمت ان کے خواب و خیال کے مطابق ہونی چاہئے۔"

"میں نے تو اس کے سامنے بلینک چیک رکھ دیا تھا سر!" خالد بولا۔ "خاص موقعوں کے لئے آپ نے مجھے یہ اجازت دے رکھی ہے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ آج اس کے استعمال کا موقع آ گیا تھا لیکن وہ اپنے انکار پر قائم رہا۔ میں تو اس کی ثابت قدمی دیکھ کر حیرت سے بے ہوش ہونے لگا تھا۔"

"مجھے بھی حیرت ہے ..... واقعی حیرت ہے!" جمشید بڑبڑانے کے سے انداز میں بولے۔ ان کی آنکھیں گویا سلگنے لگی تھی۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ..... اس سے پہلے وہ چھوٹی رقموں کے عوض بھی ہم سے تعاون کرتا رہا ہے۔"

"جی ..... سر! اسی لئے تو مجھے زیادہ حیرت ہوئی تھی۔" خالد بولا۔ "آج تو اس کے دل میں انسانیت کا درد کچھ زیادہ ہی جاگ اٹھا تھا۔ وہ شرافت کی کہانی ..... بلکہ اس کا اعتراف جرم سن چکا ہے۔ اس کے بعد سے ہی اس کا دل یکدم کچھ پلٹا سا کھا گیا۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ شخص انسان نہیں درندہ ہے ..... انسانیت کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اسے جلد از جلد سزائے موت ہو جانی چاہئے ..... بلکہ وہ تو کوسنے کے سے انداز میں دعا بھی کر رہا تھا کہ اگر کسی قانونی مجبوری کے تحت وہ رہا بھی ہو جائے تو خدا کرے کوئی اسے گولی مار دے ..... یا اگر اسے اس کے جرائم کے مقابلے میں کم سزا ہو تو کوئی اسے جیل میں ہی ہلاک کر دے۔"

"بہت خوب .....!" جمشید پھنکارنے کے سے انداز میں بولے۔ "اس بدبخت کے خیالات میں اچانک ہی انقلاب آ گیا .....! سڑے ہوئے مردہ ضمیر میں بھی زندگی کی رمق بیدار ہو گئی!" پھر انہوں نے انتہائی تحقیر آمیز انداز میں دہرایا۔ "انسانیت کا درد .....! ہونہہ .....! ایک تو یہ لفظ "انسانیت" سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ میرا بس چلے تو میں اس دنیا سے انسانیت تو کیا ..... انسانیت کا تذکرہ بھی ختم کر دوں ..... یہی میرے مشن کا سب سے اہم نکتہ ہے۔"

پھر وہ گویا کسی مصلحت کے تحت یکدم ہی بدلے ہوئے سے لہجے میں بولے۔ "نواز نام ہے نا اس کا؟"

"جی ہاں ....." خالد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آؤ ..... دیکھ لیتے ہیں اسے بھی ....." انہوں نے کرسی ایک اور سکرین کے سامنے کھسکائی۔ اس سکرین کے سامنے قدیم طرز کا جو بڑا سا پیالہ رکھا تھا اس میں موجود گاڑھا

سیال خون کی طرح سرخ مگر پارے کی طرح چمکیلا تھا۔ خالد نے ایسے پینٹ بھی دیکھے تھے جن میں دھات کا رنگ جھلکتا تھا لیکن یہ ان سے بھی مختلف تھا۔ اسے سرخ رنگ کا پارہ کہا جا سکتا تھا۔ خالد نے اس قسم کا سیال اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

جمشید نے کنسول کا ایک بٹن دبایا اور کمپیوٹر کی سی ڈی یو یعنی سکرین روشن ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے خالد چونک اٹھا کیونکہ سکرین پر سرکاری وکیل نواز کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ پھر گویا کیمرہ دھیرے دھیرے دور جانے لگا۔ خالد نے دیکھا وہ فلیٹوں کی ایک بلڈنگ کے قریب فٹ پاتھ پر جا رہا تھا۔ وہ خاصی چوڑی سی سڑک تھی اور منظر رات کے بجائے دن کا معلوم ہو رہا تھا۔ خالد نے دیکھا کہ جمشید پلک جھپکائے بغیر نواز کو گھور رہے تھے اور ان آنکھوں میں گویا شعلے سے لرز رہے تھے۔

سڑک پر ٹریفک رواں تھا۔ نواز ایک جگہ رکا اور موقع مناسب دیکھ کر سڑک کرنے لگا۔ جمشید کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ سرگوشی کے انداز میں بولے۔ "خالد! ذرا غور سے دیکھنا ....." سرگوشی کیا تھی، گویا سانپ کی پھنکار تھی خالد کے اعصاب تن سے گئے تھے۔ وہ جمشید کے تاثرات بھی دیکھ رہا تھا اور سکرین پر نظر بھی رکھے ہوئے تھا۔

نواز نے اپنی دانست میں بہت مناسب موقع پر سڑک پار کرنی شروع کی تھی۔ اچانک جمشید نے پارہ نما اس سرخ سیال میں انگلی ڈبو دی اور خالد اپنی کرسی پر ذرا اچھل پڑا کیونکہ جمشید کے انگلی ڈبوتے ہی کچھ ایسی آواز آئی تھی جیسے آگ میں سرخ کیا گیا لوہا یکدم پانی میں ڈبو دیا گیا ہو۔ خالد کو یک لخت تشویش محسوس ہوئی کہ کہیں جمشید کی انگلی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ گیا تھا لیکن اس نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر تکلیف کے کوئی آثار نہیں تھے۔

اسی لمحے سکرین پر گویا بجلی سی کوند گئی اور خالد کو فوراً ادھر توجہ دینا پڑی۔ سڑک پر اچانک ہی ایک بڑی سی کھٹارا پک اپ جو ٹرک سے کچھ ہی چھوٹی تھی، نہایت تیز رفتاری سے نمودار ہوئی تھی اور نواز کے سر پر آن پہنچی تھی۔ وہ اس وقت سڑک کے وسط میں تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گیا۔ اس کی شاید سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آگے بھاگے یا پیچھے کی طرف دوڑے۔ خالد کو صرف ایک ثانیے کے لئے اس کا چہرہ نظر آیا جس پر دہشت گویا منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ کھٹارا بڑی پک اپ اتنی تیزی سے نواز سے ٹکرائی کہ وہ فضا میں تقریباً دس فٹ بلند ہو گیا۔

پک اپ کی رفتار میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسی مختصر سے لمحے میں اس کے نیچے سے گزرتی چلی گئی جب وہ فضا میں بلند تھا۔ وہ بڑے سے ایک مڑے تڑے گڈے کی شکل میں سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس گڈے کے سر سے تیزی سے خون نکلتا دکھائی دینے لگا تھا اور اس کا لباس بھی کئی جگہ سے خون میں تر ہوتا نظر آ رہا تھا۔ خالد نے



سکرین پر غائب ہوتی ہوئی پک اپ کے بارے میں یہ بات خاص طور پر نوٹ کر لی تھی کہ اس پر نمبر پلیٹیں یا تو تھیں ہی نہیں ..... اور اگر تھیں تو اتنی گندی، دھندلی اور گرد آلود تھیں کہ نظر نہیں آ سکی تھیں کیونکہ گاڑی کا نچلا حصہ سارا کا سارا ہی ایسا تھا۔

"اوہ .....!" خالد نے متاسفانہ سے انداز میں کہا اور اس کے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔

جمشید نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور سیال سے انگلی نکال لی۔ ان کی انگلی کو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اس پر وہ سیال بھی نہیں لگا تھا۔ انگلی پہلے ہی کی طرح بالکل صاف تھی البتہ پیالے میں جس جگہ انگلی ڈوبی تھی وہاں سیال کی سطح پر سے اب بھاپ کی لہریں سی بلند ہوتی دکھائی دے رہی تھیں جو جلد ہی معدوم ہو گئیں۔

"انسانیت کا ہمدرد ..... گدھا کہیں کا .....!" جمشید نے سکرین کی طرف دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا۔ جائے حادثہ پر اکا دکا گاڑیاں رکنے لگی تھیں۔ جمشید نے بٹن دبایا اور سکرین تاریک ہو گئی۔ ان کے چہرے پر نفرت و حقارت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ خالد کی طرف دیکھ کر زہریلے سے انداز میں مسکرائے۔

"نواز مر گیا .....؟" خالد نے دھیمی آواز میں تصدیق چاہی۔

"ابھی نہیں ....." جمشید نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "یہ آنے والی صبح کا منظر تھا۔ یہ حادثہ کل صبح پیش آئے گا جب نواز عدالت جانے کے لئے گھر سے نکلے گا۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ اس کے پاس ایک اچھی خاصی گاڑی ہے لیکن وہ سکوٹر پر عدالت جاتا ہے۔ کل اس کا سکوٹر خراب ہو جائے گا اور وہ ٹیکسی پکڑنے کے ارادے سے اگلے چوک کی طرف روانہ ہو جائے گا لیکن اسے اگلے چوک تک پہنچنا نصیب نہیں ہو گا۔ بندوبست ٹھیک ہے نا؟"

سوال انہوں نے کچھ اس طرح کیا تھا جیسے کوئی فلم یا ڈرامے کا ڈائریکٹر کسی سے مشورہ طلب کر رہا ہو کہ اگلا سین میں اس طرح شوٹ کروں گا ..... ٹھیک رہے گا نا؟

"آپ اگر ٹھیک سمجھ رہے ہیں تو پھر ٹھیک ہی ہو گا۔" خالد آہستگی سے بولا۔ اسے احساس تھا کہ نواز کے متوقع انجام کے بارے میں جان کر اسے صرف خفیف سا دھچکا لگا تھا۔ اس کیفیت میں بھی شاید حیرت غالب تھی۔ درحقیقت اسے کوئی افسوس نہیں تھا بلکہ دل کے کسی گوشے میں شاید خفیف سا یہ احساس بھی ابھر رہا تھا کہ کسی قسم کی فتح میں وہ بھی شریک تھا۔ اسے بھی کسی ایسے شخص پر برتری حاصل ہوئی تھی جو اسے نیچا دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

جمشید نہایت اعتماد سے بولے۔ "اس کی جگہ جس سرکاری وکیل کی ڈیوٹی لگے گی وہ ہم سے ضرور تعاون کرے گا..... اور وہ زیادہ لمبا چوڑا مطالبہ بھی نہیں کرے گا۔ کم خرچ

بالا نشیں والا معاملہ ہو گا۔"

خالد کو اپنی پیشانی پر پسینے کا احساس ہوا۔ ایک خفیف سی جھرجھری لے کر اس نے پسینہ پونچھنے کے لئے ہاتھ اونچا کیا تو ہاتھ کی بدصورتی ایک بار پھر اس کی نظروں کے سامنے آگئی۔ وہ ہاتھ جمشید کے سامنے پھیلاتے ہوئے بولا۔ "سر.....! یہ میرا ہاتھ .....!" پسینہ پونچھنا وہ گویا قطعی بھول گیا۔

"تمہارے اس ہاتھ کا بھی بندوبست کرنا ہی پڑے گا ورنہ تم بار بار یونہی اپنے ہاتھ کو روکتے رہو گے۔" جمشید ایک گہری سانس لے کر بولے۔ انہوں نے اپنی شاہانہ کرسی ایک طرف کو کھسکائی۔ خالد کی کرسی خود بخود اس کے ساتھ کھسکتی چلی گئی۔ اب وہ جس سکرین کے سامنے رکے اس کے سامنے کاؤنٹر پر پیالے میں سفید سیال موجود تھا۔ اس سیال میں بھی پارے کی سی چمک موجود تھی لیکن سفیدی بھی نمایاں تھی۔

"تمہارا ہاتھ جہاں تک خراب ہے وہاں تک اس پیالے میں ڈبو دو۔" جمشید صاحب نے ہدایت کی۔

خالد ذرا جھجکا لیکن پھر اس نے دل مضبوط کر کے ہاتھ اس سیال میں ڈبو دیا۔ پیالا کافی بڑا تھا۔ اس کا ہاتھ آسانی سے ڈوب گیا۔ بالکل اسی طرح زوردار سا چھناکا سنائی دیا جیسے سرخ لوہا پانی میں ڈال دیا گیا ہو۔ جمشید کے انگلی ڈبونے سے جو آواز ابھری تھی' یہ اس سے کہیں زیادہ زوردار تھی۔ خالد ایک لمحے کے لئے ڈر سا گیا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ صرف اپنے ہاتھ میں ایک خفیف سی جھنجھناہٹ محسوس ہوئی تھی جیسے اس میں سے بہت معمولی سا کرنٹ گزر رہا ہو لیکن اس کی لہریں صرف ہاتھ کے جوڑ تک محدود تھیں۔

جمشید نے اس دوران میں آنکھیں بند کر لی تھیں اور بالکل خاموش تھے۔ وہ جیسے تصور ہی تصور میں کہیں اور پہنچے ہوئے تھے۔ ایک بار خالد کو یہ بھی شبہ ہوا کہ شاید وہ کچھ پڑھ رہے تھے لیکن پھر اس نے دیکھا کہ ان کے ہونٹ ساکت تھے البتہ ان کی رنگت بار بار کچھ متغیر سی ہو رہی تھی لیکن پھر ان کی رنگت اپنی اصلی حالت پر ٹھہر گئی اور انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

"بس ..... اب ہاتھ نکال لو ....." انہوں نے ہدایت کی۔

خالد نے ہاتھ پیالے سے نکالا تو وفورِ مسرت سے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اس طرح اپنی اصلی حالت میں واپس آ چکا تھا جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ جذبات کی شدت سے چند لمحے کے لئے اس کے جسم میں لرزش سی آگئی۔

اس نے بے اختیار جمشید کا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے تھام کر عقیدت و احترام سے



چوم لیا۔ "سر! آپ واقعی انوکھی طاقتوں کے مالک ہیں۔" وہ گلوگیر سی آواز میں بولا۔ چند لمحے پہلے تک اسے یقین نہیں تھا کہ اس کا ہاتھ کبھی اصلی حالت پر آ سکے گا۔

جمشید مربیانہ انداز میں مسکرائے۔ "ان طاقتوں کی پناہ میں رہو گے تو بڑے آرام میں رہو گے۔ بہت سی مصیبتوں سے بچے رہو گے۔ ان طاقتوں سے بغاوت کرنے یا ٹکر لینے کی سوچو گے تو تمہارا انجام بھی یہی ہو گا ....." انہوں نے انگوٹھے سے اپنے عقب میں اشارہ کیا جہاں وہ چند چند انچ کے انسان اب بھی بری حالت میں گرتے پڑتے ادھر سے ادھر پھر رہے تھے اور ان کی آہ و بکا اب بھی جاری تھی مگر یہ آوازیں ایسی ہی تھیں جیسے کہیں پس منظر سے چوہوں یا جھینگروں وغیرہ کی آوازیں سنائی دے رہی ہوں۔

"مجھے بلا ٹکر لینے یا بغاوت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" خالد جھرجھری سی لے کر بولا۔

جمشید طمانیت سے مسکرائے۔ "اسی لئے میں نے تمہارا انتخاب کیا تھا۔ آدمی سمجھ دار ہو اور مجھے امید ہے تم دل و جان سے ہمارے رہو گے۔"

"ضرور ..... ضرور ....." خالد نے خلوص سے کہا پھر اسے کچھ یاد آیا اور وہ جلدی سے بولا۔ "آپ نے میرا ایک مسئلہ تو حل کر دیا۔ اب دوسرا بھی کر دیجئے۔"

"وہ کیا؟" انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بھنوئیں اچکائیں۔

"وہی میرے ہم شکل والا ....." خالد کراہنے کے سے انداز میں بولا۔ "وہ مردود اب بھی میری عدم موجودگی میں میرے گھر آ رہا ہے۔"

"میں نے کہا نا ..... وہ تمہاری بیوی کا وہم ہے۔" جمشید بے پروائی سے بولے۔

"نہیں سر .....! آج تو میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" خالد زور دے کر بولا۔ "میں نے اس بدصورت ہاتھ سے اس کی گردن دبوچنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن وہ غائب ہو گیا۔ یعنی وہ غائب ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے ..... لیکن وہ ہم دونوں کا واہمہ بہرحال نہیں ہو سکتا ہے۔"

"اچھا ..... تو اب تم نے خود اپنی آنکھوں سے بھی اسے دیکھ لیا ....." جمشید نے ترچھی نظروں سے شکی سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "کہیں تم بھی تو .....؟" انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"نہیں ..... نہیں سر .....! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" خالد صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں جلدی سے بولا۔ "میں بالکل صحیح الدماغ ہوں۔ بہکا ہوا بھی ہرگز نہیں ہوں۔ حالات و واقعات اور اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے تمام تر دباؤ کے باوجود میں نے اپنے اعصاب اور حواس کو قابو میں رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے کسی ہم شکل کا وجود ضرور ہے اور وہ بھی یقیناً کوئی ماورائی سی مخلوق ہے ..... مافوق الفطرت طاقت رکھتا ہے .....

لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ اس سے کہیں زیادہ طاقتوں کے مالک ہیں۔ آپ چاہیں تو مجھے اس سے نجات دلا سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے سامنے اس کی ایک نہیں چلے گی۔"

جمشید طمانیت سے مسکرا دیئے۔ انہیں یقیناً" خالد کی اس تعریف اور اظہار عقیدت سے خوشی ہوئی تھی۔ وہ سرہلاتے ہوئے بولے۔ "اچھا ..... اگر تمہیں اس کے وجود کا یقین ہے تو پھر اس سلسلے میں ضرور کچھ کریں گے ..... لیکن اس کے لئے تمہیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ یہ غائب ہو جانے والے شخص کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ یہ ایک طرح سے "ناموجود" ہے۔ موجود مخلوقات کی بات کچھ اور ہوتی ہے۔"

"انتظار تو میں کرلوں گا لیکن آپ اس سلسلے میں کچھ کوشش شروع تو کر دیجئے۔" خالد التجائیہ لہجے میں بولا۔

"مطمئن رہو ..... میں کوشش کروں گا کہ آئندہ وہ تمہیں یا تمہاری بیوی کو تنگ نہ کرے۔" جمشید نے اسے تسلی دی۔ وہ جمشید کو بتا نہ سکا کہ اس کی بیوی تو اس کے مشکل سے تنگ نہیں تھی۔ وہ تو شاید اس کی قربت میں زیادہ خوشی محسوس کرتی تھی۔ تنگ تو وہ خود تھا۔

"تو پھر اب، مجھے اجازت؟" خالد بولا۔

"ٹھیک ہے ..... اب تم جا کر آرام کرو اور کل سے شرافت کے کیس پر منصوبے کے مطابق کام شروع کر دو۔" جمشید اسے رخصت کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

جب خالد واپس اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچا تو میمونہ اسے کہیں دکھائی نہ دی۔ اس نے اسے پکارا تو میمونہ بیڈ روم کے باتھ روم سے نکلتی دکھائی دی۔ اس کی حالت خالد کو کچھ عجیب سی لگی۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی اور چہرہ سفید نظر آ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنی گردن پر تھا۔

"میمونہ .....! کیا ہوا تمہیں؟" خالد گھبرا کر اس کی طرف بڑھا۔

○



میمونہ چند لمحے تو یوں خالد کی طرف دیکھتی رہی جیسے اسے پہچان نہ پا رہی ہو۔ پھر اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور گویا ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آئی مگر اس کے چہرے پر خوف و دہشت کے تاثرات برقرار رہے۔ وہ باتھ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے ربط سے انداز میں بولی۔ "وہ ..... وہ ..... وہاں ہے۔"

"کون وہاں ہے؟" خالد نے تیزی سے پوچھا۔

مگر اس کے بعد گویا آواز میمونہ کے حلق میں اٹک گئی۔ وہ دھیرے دھیرے اپنا گلا سہلانے لگی۔ اس کا ہاتھ ادھر ادھر حرکت کرنے لگا تو خالد نے دیکھا کہ اس کے گلے پر ایک باریک سے دو گلابی نشان موجود تھے جیسے وہاں دو سوئیاں چبھو کر نکالی گئی ہوں۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے آج شام کا اپنا تجربہ یاد آگیا جب وہ نسرین کے اپارٹمنٹ میں تھا۔

"کیا باتھ روم میں نسرین ہے؟" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ حالانکہ باتھ روم سامنے ہی تھا اور اس کا دروازہ بھی کھلا تھا مگر اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ آگے بڑھ کر اس میں جھانک لیتا۔

میمونہ نے نفی میں سرہلایا اور بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔ "وہ ..... بچہ ....." وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ اس کا گویا گلا خشک تھا اور بولنا اس کے لئے مشکل ہوا جا رہا تھا۔ خوف و دہشت بھی اپنی جگہ تھی۔

"بچہ .....؟" خالد نے حیرت سے دہرایا۔ یہ گویا ایک نیا معمہ تھا۔ اب اس نے میمونہ سے سوال جواب میں وقت ضائع کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر باتھ روم میں جھانکنا ہی بہتر سمجھا۔

ہمت کر کے اس نے باتھ روم کے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ اس کے اعصاب وائلن کے تاروں کی طرح تنے ہوئے تھے۔ باتھ روم میں نہ جانے کون سی نئی مصیبت اس کی منتظر تھی لیکن اس وقت وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا جب اسے وہاں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ وہ نہایت کشادہ، شاندار اور جدید ترین سہولتوں سے آراستہ باتھ روم تھا بلکہ اس میں جکوزی اور سونا باتھ کے انتظامات بھی موجود تھے۔ شیشے کی طرح جھلملاتی

ٹائلز، امپورٹڈ فٹنگز، بیچ میں ٹب کے قریب لٹکا ہوا خوبصورت باریک پردہ، میڈیسن کیبنٹ، تولیوں کے یک اور نہ جانے کیا کچھ اس میں موجود تھا۔ خالد کی نظر ہر چیز پر سے پھسلتی ہوئی کونے کھدروں تک کا جائزہ لے چکی تھی مگر اسے کہیں کچھ نظر نہیں آیا تھا۔

آخر وہ میمونہ کی طرف مڑتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں بولا۔ "تم کس بچے کا ذکر کر رہی ہو؟ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

میمونہ کو گویا اس بات کا یقین نہ آیا۔ وہ جھجکتے ہوئے آگے آئی اور اس نے یوں خالد کی آڑ لیتے ہوئے خوفزدہ سے انداز میں جھانکا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کوئی اچانک اس پر حملہ کر دے گا۔ اس نے پنجوں کے بل اونچی ہو کر بھی اندر دیکھا لیکن جب اسے بھی اندر کوئی نظر نہ آیا تو وہ خالد کا ہاتھ تھام کر اسے بھی ساتھ لیتے ہوئے خوفزدہ سے انداز میں باتھ روم میں داخل ہوئی۔

ٹب کے قریب پہنچ کر اس نے اچھی طرح ٹب کا جائزہ لیا۔ ٹب خالی تھا۔ اسے گو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ خالی ٹب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اطمینان سے اس میں لیٹ گیا تھا۔"

"کون لیٹ گیا تھا؟" خالد کے لہجے میں اب ہلکی سی جھنجلاہٹ آ گئی تھی۔

"وہی بچہ ....." میمونہ کے حلق سے سرسراتی سی آواز نکلی پھر اس نے خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ باتھ روم میں دروازے کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے راستے کوئی بچہ بھی باہر جا سکتا اور دروازے سے خالد نے میمونہ کے سوا کسی کو نہیں دیکھا تھا۔

"تم مجھے صحیح طرح سے شروع سے ساری بات کیوں نہیں بتاتیں؟" خالد نے [illegible] سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ جھنجلانے سے حاصل نہیں ہو گا۔ میمونہ یقیناً خوفزدہ تھی اس لئے صحیح طور پر بات نہیں کر پا رہی تھی۔ اس میں غالباً اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ضرور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا۔

وہ اسے بیڈ روم میں لے آیا۔ بیڈ پر گاؤ تکیوں وغیرہ کے سہارے بٹھانے کے بعد خالد نے بیڈ روم فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر ایک گلاس اسے پلایا۔ میمونہ کی حالت ویسے بھی کچھ سنبھل چکی تھی۔ پانی پی کر وہ کافی حد تک پرسکون ہو گئی۔ باتھ روم خالی دیکھ کر اور خالد کو قریب پا کر اس کا خوف بھی کافی کم ہو گیا تھا۔

"آج میں نے اپنی زندگی کا حیرت انگیز ترین بچہ دیکھا ....." وہ کافی حد تک [illegible] لہجے میں بولی۔ "اور شاید وہ بہت خوفناک بھی تھا ..... حالانکہ بظاہر اس میں کوئی خوفناک



بات نہیں تھی .....!" اس نے خاموش ہو کر جھرجھری سی لی اور ایک بار پھر خوفزدہ سی نظروں سے باتھ روم کی طرف دیکھا۔

خالد خاموشی اور تحمل سے منتظر رہا کہ وہ بات آگے بڑھائے۔ آخر وہ بولی۔

"تمہارے جانے کے بعد میں ذرا آرام کے لئے یہیں بیڈ پر لیٹ گئی تھی اور شاید مجھے ہلکی سی غنودگی بھی آ گئی تھی۔ باتھ روم میں ہلکا سا کھٹکا سن کر میری آنکھ کھلی۔ میں نے سوچا اٹھ کر دیکھ ہی لوں شاید کوئی چیز گر گئی ہے۔ میں نے جا کر باتھ روم میں جھانکا تو وہ ایک کونے میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا ..... بالکل چھوٹا سا ایک بچہ تھا ..... جسمانی طور پر وہ زیادہ سے زیادہ چھ آٹھ ماہ کا معلوم ہوتا تھا ..... بالکل ننگ دھڑنگ تھا ..... اس کے جسم پر لنگوٹ بھی نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی ماں اسے نہلانے کے لئے وہاں بٹھا گئی تھی ....."

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ وہ تصور اس کے ذہن میں ابھی تازہ ہی تھا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "میرے لئے پہلے تو یہی خیال سخت خوفزدہ کر دینے والا تھا کہ آخر وہ باتھ روم میں کہاں سے آ گیا تھا؟ تمہارے جانے کے بعد سے باہر کا دروازہ مقفل تھا اور اس کے علاوہ فلیٹ میں داخلے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہنگامی زینے کی طرف کا چھوٹا سا دروازہ تو ہمیشہ ہی مقفل رہتا ہے۔ اس کے علاوہ مزید خوفزدہ کر دینے والی بات یہ تھی کہ وہ ننھا سا بچہ بظاہر تو بچہ ہی تھا اور اس کا چہرہ مہرہ ..... جسم ..... سب کچھ ایک شیر خوار بچے جیسا ہی تھا ..... لیکن اس کی آنکھیں ایک بچے کی آنکھیں ہرگز نہیں تھیں۔ اف خدایا .....! میں ان آنکھوں کو کبھی نہیں بھول سکوں گی ....."

میمونہ نے ایک بار پھر جھرجھری سی لی اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑا۔ "وہ آنکھیں ایک مکمل اور بھرپور مرد کی آنکھیں تھیں اور ان میں شیطانیت رقص کر رہی تھی۔ خالد! آپ تصور نہیں کر سکتے کہ ایک بچے کے چہرے پر ایسی آنکھیں کتنی عجیب لگ رہی تھیں اور یہ کیسی خوفزدہ کر دینے والی بات تھی۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے ننھے ننھے ہونٹوں پر ایک عجیب شیطانی سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ پھر وہ کسی بھرپور مرد کی سی بھاری اور گونجیلی آواز میں بولا۔ "کیسی ہو تم ..... کیا حال چال ہیں ..... کیا کر رہی ہو؟ پہلے تو مجھے یقین ہی نہ آیا کہ آواز اسی کے منہ سے نکل رہی تھی لیکن بہرحال ہونٹ اسی کے ہلے تھے اور اس گوشے میں اس کے سوا کوئی موجود بھی نہیں تھا جہاں سے آواز آئی تھی۔ جب مجھے یقین آیا کہ وہ اسی کی آواز تھی تو بے اختیار میرے حلق سے چیخ نکل گئی ....."

وہ یوں گہری گہری سانسیں لینے لگی جیسے بات نہیں کر رہی تھی بلکہ دوڑ رہی تھی۔

خالد متاسفانہ سے لہجے میں بولا۔ "یہ اپارٹمنٹ اچھے خاصے بنگلوں سے بھی بڑے اور ساؤنڈ پروف ہیں۔ ان کے اندر تو کوئی چیختا ہوا بھی مرجائے تو اس کی آواز باہر نہیں جا سکتی۔"

"ہاں ..... یہ بات تو ہے ....." میمونہ بولی۔ "عجیب بات یہ ہے کہ میں خوفزدہ تو تھی اور میرے حلق سے چیخ بھی نکل گئی تھی لیکن میں وہاں سے ہل نہیں سکی۔ باتھ روم کے دروازے میں ہی کھڑی رہی۔ اس ننھے سے بچے کی شیطانی آنکھوں نے گویا مجھ پر جادو کر دیا تھا اور میرے پاؤں باتھ روم کی ٹائلوں سے چپک کر رہ گئے تھے۔ میں اس سے خوفزدہ ہونے کے باوجود وہاں سے ہل نہیں پا رہی تھی تاہم نہ جانے کس طرح ہمت کر کے میں نے اس سے پوچھا۔ "تم کون ہو؟" تو اس نے اسی بھاری اور گونجیلے سے انداز میں قہقہہ لگایا ....."

وہ سانس درست کرنے کے لئے رک گئی۔ خالد بے تابی سے بولا۔ "کیا اس نے بتایا کہ وہ کون ہے؟"

میمونہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "ہاں ..... لیکن کاش میں نے نہ پوچھا ہوتا اور نہ ہی اس نے بتایا ہوتا۔ اس سوال کو جواب نہ ہی ملتا تو بہتر تھا۔ استہزائیہ انداز میں قہقہہ لگانے کے بعد وہ بولا۔ "کمال ہے .....! آپ مجھے نہیں پہچانتیں؟ میں تو آپ ہی کے وجود کا ایک حصہ ہوں۔ آپ کی کوکھ میں پرورش پا رہا ہوں۔ یوں تو میں کسی کی مدد' کسی کے سہاروں کا محتاج نہیں ہوں لیکن مجھ جیسی مخلوق بھی اگر کسی کے جسم کی پناہ میں رہ کر اور کسی کا لہو پی کر زندہ رہے یا نئی زندگی پائے تو اچھا رہتا ہے۔ اس کی صلاحیتیں کچھ اور نکھر آتی ہیں۔ اس کی طاقتوں میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ شیطانی سے انداز میں مسکرایا اور گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے صحیح طور پر یاد نہیں۔ شاید میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔"

"کیا تمہیں اس کے الفاظ صحیح طور پر یاد نہیں ہیں؟ تم اندازاً" انہیں دہرا رہی ہو؟" خالد نے قدرے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ..... میرا مطلب ہے کہ مجھے اپنی کیفیت کچھ صحیح طور پر یاد نہیں ....." میمونہ نے تصحیح کی۔ "اس کے الفاظ تو مجھے بالکل صحیح طور پر یاد ہیں۔ وہ جب بول رہا تھا تو اس کے الفاظ گویا میرے ذہن پر نقش ہوتے جا رہے تھے۔ آپ کو معلوم ہے مجھے زیادہ لفاظی تو نہیں آتی لیکن اس وقت مجھے اس کے بولنے اور اپنے سننے کے لئے ایک نہایت مناسب تشبیہ سوجھ رہی ہے کہ میرا ذہن شاید اس وقت پتھر کی ایک سل بن گیا تھا جس پر اس کی آواز کا تیشہ اپنے الفاظ کندہ کرتا جا رہا تھا ....." وہ کچھ بے چارگی آمیز سے انداز میں خاموش ہو گئی۔

خالد چند لمحے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے آج میمونہ کا انداز گفتگو بھی



کچھ مختلف لگ رہا تھا۔ آخر وہ ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں بولا۔ "گویا تمہیں یقین ہے کہ اس نے یہی بات کہی تھی؟" اس کے چہرے پر اندیشوں کے سائے لرزنے لگے تھے۔ اسے خود بھی احساس تھا کہ شاید وہ کچھ فکرمند دکھائی دینے لگا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ دل میں وہ خود کو اتنا فکرمند یا پریشان محسوس نہیں کر رہا تھا جتنا اس کے خیال میں اسے کرنا چاہئے تھا۔ ایک تشویش ضرور تھی اور رگ و پے میں ہیجان سا بھی برپا ہوا تھا لیکن اسے احساس تھا کہ کچھ عرصہ پہلے اگر اس نے اس قسم کی کوئی بات سنی ہوتی تو اس کے سر پہ گویا کوئی بم پھٹ پڑتا۔

"شاید وہ میری ذات میں ..... میرے باطن میں ..... میری سوچ میں کوئی تبدیلی آ چکی ہے ..... شاید میں پہلے والا خالد نہیں رہا۔" اس نے دل میں سوچا۔

اس کی نظریں میمونہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس لمحے اسے ایک اور عجیب سا احساس ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ اب میمونہ بھی درحقیقت اتنی پریشان اور وحشت زدہ نہیں تھی جتنی کہ وہ اسے باتھ روم کے دروازے سے پلٹتے وقت دکھائی دی تھی۔ مانا کہ اب وہ سنبھل چکی تھی' اس کے اعصاب پر سکون ہو چکے تھے' خالد کی آمد سے اسے حوصلہ مل چکا تھا۔ اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں ایک خاص بات ہونی چاہئے تھی جو نہیں تھی۔ خالد ان آنکھوں کی گہرائیوں میں تشویش اور پریشانی کے ایک خاص تاثر کی توقع کر رہا تھا جو وہاں نہیں تھا۔ کیا میمونہ بھی بدل چکی تھی؟ کیا اس کی سوچ' اس کے ذہن اور اس کے وجود میں بھی کوئی انقلاب آ چکا تھا؟ میمونہ نے اس کے یوں ٹک دیکھنے کے باوجود پلک نہیں جھپکائی اور دھیمے لہجے میں بولی۔ "ہاں ..... سب کچھ لفظ بہ لفظ اسی طرح کہا گیا تھا جس طرح میں بتا رہی ہوں۔ میں کچھ بھولی نہیں ہوں اور نہ ہی میرے ذہن میں کوئی بات گڈمڈ ہوئی ہے۔ تمام تر پریشانی' وحشت اور خوف کے باوجود سب کچھ مجھے ٹھیک ٹھیک یاد ہے ..... اور اصل بات تو میں نے ابھی آپ کو بتائی ہی نہیں ....."

"وہ کیا؟" خالد چونکا۔

"نہ جانے کس طرح میں نے ہمت کر کے اس سے کہا۔ "اگر میں تمہاری بات پر یقین کر لوں تو اس سے کچھ یوں ظاہر ہوتا ہے جیسے میں تمہاری ہونے والی ماں ہوں؟" اس پر وہ اپنے مخصوص خباثت بھرے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "ہاں ..... کہا تو یہی جا سکتا ہے لیکن ہمارے ہاں ماں کا کچھ اتنا احترام نہیں کیا جاتا جتنا اس دنیا میں رواج پڑ گیا ہے۔ ہمارے ہاں ماں کا تصور اتنا مقدس اتنا انوکھا نہیں جیسے وہ کسی اونچی مسند ..... کسی اونچے راج سنگھاسن پر بیٹھی ہوئی کوئی مخلوق ہو۔ وہ بھی بس دوسری عورتوں کی طرح ہی ایک عورت ہوتی ہے۔" اس کی یہ بات سن کر مجھے نہ جانے کیوں کچھ اور خوف محسوس ہوا۔ ویسے بھی یہ ایک ہولناک تجربہ تھا کہ ایک مختصر الوجود' شیر خوار نظر آنے والا بچہ اس بڑے

سے باتھ روم کے ایک کونے میں آلتی پالتی مارے بیٹھا ایسی بھاری اور مکمل مردانہ آواز میں مجھ سے بات کر رہا تھا ..... جس کی آنکھوں میں انتہائی خباثت اور شیطانیت رقص کر رہی تھی ..... اور جو میرے وجود میں پرورش پانے کا بھی دعویدار تھا..... لیکن اس کے لہجے میں میرے لئے کوئی احترام نہیں تھا۔ میں اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی لیکن وہ مجھ سے اس طرح بات کر رہا تھا جیسے مجھے برسوں سے جانتا تھا اور میرا ہم عمر' دوست یا ساتھی ..... بلکہ شاید عمر اور تجربے میں مجھ سے کہیں بڑا تھا .....“

خالد تصور کر سکتا تھا کہ میمونہ جب یہ سب کچھ دیکھ رہی ہو گی' سن رہی ہو گی تو اس پر کیا گزر رہی ہو گی۔ میمونہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”پھر اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے چھوٹے چھوٹے گول مٹول سے بازو اٹھا کر انگڑائی لی ..... اپنا ننھا سا پھولا پھولا ہاتھ منہ پر رکھ کر جماہی لی اور آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ویسے تو میں تمہارے خون پر پل ہی رہا ہوں اور ابھی مجھے چند ماہ اور پلنا ہے لیکن اس وقت میں دنیا کی سیر کے لئے آیا ہوا ہوں تو کیوں نہ باہر سے باہر ہی اپنی خوراک لیتا چلوں .....“ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے بالکل ایک پرندے کی طرح اڑا اور آ کر یکدم میری گردن سے چمٹ گیا۔ میرے ہاتھ پیروں سے گویا جان سی نکل گئی تھی۔ میں کچھ بھی نہ کر سکی ..... نہ تو میں اپنی جگہ سے ہلی اور نہ ہی میرے حلق سے کوئی آواز نکلی۔ حتیٰ کہ اسے اپنی گردن سے علیحدہ کرنے کے لئے میں اپنے ہاتھوں کو بھی حرکت نہیں دے سکی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ دو باریک سی سوئیاں میرے حلقوم میں اتر گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر ایک عجیب سا خمار اور غنودگی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ حالانکہ مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جسم کی جان کھنچ کر حلق کی طرف جا رہی تھی لیکن یہ عمل مجھے بڑا لذت انگیز محسوس ہو رہا تھا۔ میرا ہرگز دل نہیں چاہا کہ میں اسے اپنی گردن سے ہٹاؤں اور اس عمل کو روک دوں .....“

وہ ایک بار پھر آہستگی سے اپنے گلے پر ہاتھ پھیرنے لگی اور ان دو ننھے ننھے گلابی ابھاروں کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے ہلکی سی کراہ کے ساتھ بولی۔ ”لگ تو یہی رہا ہے جیسے میرے حلق میں دو ننھی ننھی سوئیاں چبھی تھیں۔ یہ میرا وہم نہیں تھا .....“

”نہیں ..... نہیں ..... یہ وہم یقیناً نہیں تھا .....“ خالد بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔ اسے خود اپنا تجربہ یاد تھا۔ نسرین کے اپارٹمنٹ میں وہ اسی تجربے سے گزرا تھا مگر میمونہ کا تجربہ تو اور بھی عجیب تر تھا۔

ایک گہری سانس لے کر وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ ”کچھ دیر بعد اس نے خود ہی میری گردن چھوڑ دی اور ٹب میں جا لیٹا۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ میری طرف دیکھ کر نہایت آسودہ سے انداز میں مسکرا رہا تھا لیکن اس کا



ذہن اس وقت بڑا خوفناک لگ رہا تھا کیونکہ اس کی باچھوں پر تھوڑا سا خون لگا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اتنا خوش اور مطمئن دکھائی دے رہا تھا جیسے اس نے میرے جسم سے آب حیات کشید کر لیا ہو ..... اور شاید حقیقت یہی تھی ..... میں اسی طرح اپنی جگہ سحر زدہ سی حالت میں کھڑی تھی لیکن چند لمحے بعد گویا مجھے ہوش آیا اور میں نے اپنے ہاتھ پیروں کو حرکت دینے کی کوشش کی تو میں اس میں کامیاب ہو گئی اور اچانک ہی پلٹ کر باہر کو بھاگی۔ اسی وقت سامنے سے مجھے تم آتے دکھائی دیئے۔ مجھے یہ بھی پتہ نہیں چل سکا کہ تم کب بیرونی دروازے کا تالا کھول کر اندر آئے تھے۔“

وہ خاموش ہو گئی اور کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا مگر خالد کا ذہن سنسنا رہا تھا۔ وہ ایک کشن کے سہارے کاؤچ پر نیم دراز ہو گیا۔ یک لخت ہی وہ خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ دن بھر کی مصروفیات کے بعد آج شام سے وہ خود جن تجربات سے گزر رہا تھا وہی اس کے اعصاب کو اتھل پتھل کر دینے کے لئے کافی تھے۔ اب میمونہ کی کہانی نے گویا اس کی اندرونی شکست و ریخت کچھ اور بڑھا دی تھی۔

”یہ سب کیا تھا خالد؟“ میمونہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

”میں کیا بتا سکتا ہوں .....“ وہ دھیمے اور کچھ شکست خوردہ سے لہجے میں بولا۔ ”بات کسی نہ کسی حد تک تو تمہاری بھی سمجھ میں آ رہی ہو گی۔ میں خود بھی کچھ عجیب و غریب تجربات سے گزرا ہوں۔ یوں تو ہمارے یہاں آتے ہی کچھ عجیب واقعات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا لیکن اپنے جوش اور ہیجان میں ہم نے ان کی پرواہ نہیں کی تھی۔ بعض اوقات کو ہم نے اپنا واہمہ بھی سمجھا تھا لیکن اب یہ بات طے ہو چکی ہے کہ کوئی بھی غیر معمولی واقعہ یا خلاف معمول بات ہمارا واہمہ نہیں تھی۔ ہم اسی دنیا میں رہتے ہوئے بھی درحقیقت ایک عجیب و غریب دنیا میں آ گئے ہیں۔ کسی اور ہی معاشرے کے فرد بن گئے ہیں۔“

اس نے میمونہ کو یہ نہیں بتایا کہ آج شام وہ کن تجربات سے گزرا تھا اور کچھ دیر پہلے جمشید مختار سے ملاقات کے دوران میں اس کی معلومات میں کیا کیا اضافہ ہوا تھا اور جمشید نے اس پر کیا کیا انکشافات کئے تھے۔ میمونہ نے اس سلسلے میں کچھ پوچھا بھی نہیں ..... شاید وہ خود اپنی جگہ بہت سے خیالات میں الجھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔ ان میں کچھ دھندلاہٹ سی تھی۔ جیسے وہ گہری نیند سے اٹھی ہو یا پھر خواب آور دوا کھانے کے باوجود سو نہ سکی ہو۔ بہرحال اس دھندلاہٹ کے باوجود اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں نمایاں تھیں۔

چند لمحے کمرے میں گہرا سکوت رہا پھر میمونہ بہت دھیمی آواز میں بولی۔ ”ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ خالد بے بسی سے بولا۔

"کیا ہم یہاں سے نکل چلیں؟" میمونہ کی آواز بالکل ہی سرگوشی میں ڈھل گئی۔
"نکل کر کہاں جائیں؟" غیر ارادی طور پر خالد کی آواز بھی سرگوشی میں ڈھل
حالانکہ بظاہر اس طویل و عریض اپارٹمنٹ میں ان کی بات سننے والا کوئی تیسرا فرد موجود
تھا۔ جس عجیب و غریب بچے کا میمونہ نے ذکر کیا تھا وہ بھی نہ جانے کس راستے سے غا
ہو گیا تھا۔ جو دروازے ان کی نظروں کے سامنے تھے ان میں سے تو کسی سے بھی ان
نے اسے نکلتے نہیں دیکھا تھا۔

"ہم واپس حیدر آباد چلتے ہیں۔" میمونہ اس کے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی
بولی۔ "ہماری زندگی بے شک وہاں محدود سی تھی ..... آمدنی بھی کم تھی ..... رہن سہن
بے حد سادہ ..... بلکہ کسی حد تک غریبانہ ہی تھا ..... لیکن اس زندگی میں کتنا سکون
رات کو ہم آرام کی نیند سوتے تھے۔ کوئی پراسرار یا عجیب و غریب واقعہ ہماری راتوں
نیند برباد نہیں کرتا تھا۔ تمہارے باس بھی کتنے شریف اور مہربان آدمی تھے۔ وہ وکالت
ایک خاص مقصد کے تحت کرتے تھے ....."

"ایک خاص مقصد کے تحت تو جمشید مختار اور ان کی فرم کے لوگ بھی کرتے
جن میں اب میں بھی شامل ہو چکا ہوں۔" خالد اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"لیکن ان کے اور ان کے مقاصد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" میمونہ بد
سرگوشی میں گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "ان کے ہر کام میں انسانیت کا پہلو پیش نظر
تھا۔ وہ وکالت کے ذریعے انسان کی خدمت کرتے تھے۔ وہ خود صحیح معنوں میں انسان
یہ لوگ تو مجھے شیطان یا کم از کم شیطان کے چیلے ضرور لگتے ہیں۔"

"آہستہ بولو ....." خالد غیر ارادی طور پر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں
"اب اس سے آہستہ کیا بولوں؟" میمونہ بولی۔ "سرگوشی میں تو بات کر رہی
کیا ہماری سرگوشی بھی کوئی سن لے گا؟"

"مجھے تو لگتا ہے کہ جمشید مختار چاہیں تو ہماری خوابگاہوں میں ابھرنے والی
سانسوں کی آوازیں بھی سن لیں۔ مجھے یہ لگتا ہے کہ ہمارا کوئی عمل ان کی آنکھوں سے
ہوا نہیں ہے اور ہماری کوئی بات ان کی سماعت سے دور نہیں ہے۔" خالد کے لہجے
اب بھی مدہم سا خوف چھپا ہوا تھا۔

"میں بھی محسوس کر چکی ہوں کہ وہ بے حد پراسرار اور ناقابل تشریح طاقتو
مالک ہیں ..... اور وہ کچھ اچھی طاقتیں نہیں ہیں۔ ان کے مقابلے میں تمہارے سا
صدر الدین صاحب صرف انسانیت کی طاقت کے مالک تھے۔ شاید اسی لئے ان کے
ہم کتنے سکون و عافیت میں تھے۔ جس دن سے ہم یہاں آئے ہیں' درحقیقت ہم
دن بھی سکون سے نہیں گزارا لیکن ہم درحقیقت خود کو دھوکا دیتے رہے ہیں کہ



خوش ہیں اور ہم نے یکدم چھلانگ مار کر ایک بہت بڑی خلیج عبور کر لی ہے۔ بدحالی کی
دلدل سے ہم یکدم دولت مندی کے خوبصورت جزیروں میں پہنچ گئے ہیں لیکن درحقیقت ہم
سکون و عافیت کے جزیروں سے اٹھ کر شیطانیت اور بربادی کے دلدل میں آ گرے ہیں اور
دن بہ دن گہرائی کی طرف جا رہے ہیں۔ ہمارا سفر اوپر کی طرف نہیں' نیچے کی طرف جاری
ہے۔ ایک روز ہم تباہی بربادی' خباثت اور شیطانیت کی پاتال میں جا پہنچیں گے۔"

میمونہ سرگوشی میں روانی سے بولتی جا رہی تھی اور خالد دم بخود اس کی طرف دیکھے
جا رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا کہ میمونہ اتنی بالغ نظری سے
معاملات کو دیکھنے اور اتنی گہرائی و گیرائی سے بات کرنے پر قادر تھی۔ اس میں اگر کچھ
دوسری حتی سی تبدیلیاں آئی تھیں تو اس کی بات چیت میں روانی اور سلاست بھی پیدا ہوئی
تھی۔

وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "اور یہ سب کچھ صرف لالچ کی بناء پر ہوا ہے۔
بزرگوں نے خواہ مخواہ نہیں کہا کہ انسان کو لالچ نہیں کرنا چاہئے' لالچ بری بلا ہے۔ بہت
سادہ سی بات ہے ..... بلکہ آج کے دور میں تو بچگانہ سی لگتی ہے۔ اکثر بچوں کی کہانیوں کا
عنوان ہوتا ہے "لالچ بری بلا ہے" ..... لیکن درحقیقت یہی ہم میں سے بیشتر انسانوں کی
زندگی کا خلاصہ ہے۔ ہمیں اپنی محدود سی اور سادہ سی زندگی میں بھی تمام نعمتیں حاصل ہوتی
ہیں مگر ہم ان پر قناعت نہیں کرتے۔ زیادہ سے زیادہ کی ہوس میں مبتلا رہتے ہیں۔ آگے
بڑھنے کا جو بھی راستہ نظر آتا ہے اس پر اندھا دھند دوڑ پڑتے ہیں۔ خواہ اس بھگدڑ میں
ہمیں دوسروں کو اپنے پیروں تلے کچلنا پڑے۔ ہم اس سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اسی کا نام
لالچ اور ہوس ہے۔ بنیادی بیماری یہی ہے۔ کہیں یہ کسی شکل میں اور کہیں کسی شکل میں
نظر آتی ہے۔ اسی نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے ..... یا یوں کہو کہ ہم نے خود اپنے آپ کو
اس بیماری میں الجھا کر دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے ....."

"لیکن ترقی کی لگن رکھنا کوئی جرم یا ناجائز بات تو نہیں۔" خالد مدافعانہ لہجے میں
بولا۔

"درست ہے ..... لیکن جائز ناجائز کا امتیاز ضرور رکھنا چاہئے۔ جب بھی ہمارے اندر
کسی قسم کی خباثت پیدا ہوتی ہے ..... شیطان ہمیں ورغلاتا ہے ..... تو ہم اس کا جواز پیدا
کرنے کے لئے طرح طرح کے فلسفے گھڑ لیتے ہیں۔ اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ ہم جو
کچھ کر رہے ہیں' ٹھیک کر رہے ہیں۔ ہم اپنے آپ سے اتنا جھوٹ بولتے ہیں کہ رفتہ رفتہ
وہی ہمیں سچ لگنے لگتا ہے۔" میمونہ نہایت متانت سے یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "آپ نے جب
گاؤں کی اس دس سالہ معصوم لڑکی کے ساتھ زیادتی کے کیس میں ملزم نیاز علی کے وکیل

صفائی کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہونے کی حامی بھری' اس وقت آپ کو معلوم ہو چکا تھا ناکہ نیاز علی واقعی مجرم تھا اور اس کا یہ جرم نہایت گھناؤنا تھا؟"

"ہاں ..... مجھے معلوم تھا۔" خالد نے ہچکچاتے ہوئے تسلیم کیا۔

"بجائے اس کے کہ آپ ان کے وکیل بن کر نیاز علی کو سزا دلانے کی کوشش کرتے' آپ نیاز علی کے وکیل صفائی بن گئے۔ صرف اس لئے کہ ان کی حمایت کرنا گھاٹے کا سودا تھا۔ اس طرح آپ کو بھاری فیس نہ ملتی۔ نیاز علی آپ کو اپنے دشمنوں میں شمار کرنے لگتا اور آپ کو اپنا بہت سا وقت ضائع کرنے کے بعد الجھن' پریشانیوں اور خطرات کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اس لئے آپ نے فائدے کا سودا کیا۔ یہ محض ایک دنیا دار انسان کی سوچ تھی۔ ممکن ہے آپ اس غریب بچی کا کیس لڑتے تو اللہ آپ کو نیاز علی کے شر سے محفوظ رکھتے' آپ کے مالی نقصان کی تلافی کرنے اور آپ کو بے تحاشہ نوازنے کے اسباب پیدا کر دیتا لیکن آپ چونکہ اندر سے ایک کمزور انسان تھے اس لئے اس پر آپ کا اعتقاد نہیں تھا اور چونکہ آپ کے اندر شیطانیت سرایت کرنے لگی تھی ..... آپ کے باطن میں کہیں خباثت کے جراثیم گھر کر چکے تھے اس لئے آپ نے اپنے اس عمل کے جواز بھی گھڑ لئے۔ اپنے کیس جیتنے پر فخر بھی کرنے لگے۔ وہیں سے آپ کی ترقی کا آغاز ہوا۔ جمشید مختار کا نمائندہ آپ کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے لئے آن پہنچا لیکن آپ خود سوچیں کہ جو بات آپ کی ترقی کی بنیاد بن رہی تھی ..... جو کیس آپ کو کسی کی نظر میں بہت قابل وکیل بنا رہا تھا جب وہی اتنا غیر منصفانہ تھا ..... جس کے دوران میں آپ نے نہ جانے کتنے مظلوموں کے زخموں پر نمک چھڑکا تھا ..... ان کی نہ جانے کتنی بددعائیں لی تھیں ..... اس کیس کی بناء پر ملنے والی ترقی آپ کے لئے کیونکر مبارک ثابت ہو سکتی تھی؟ آپ نے جیسا انسان ہونے کا ثبوت دیا تھا' آپ کا قدر دان بھی کوئی ویسا ہی شخص ہو سکتا تھا۔"

"کمال ہے .....!" خالد نے حیرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ "تم تو کچھ اس طرح باتیں کر رہی ہو جیسے تم بہت ہی نیک طینت' اچھائی اور برائی کے معاملے میں بہت ہی کڑا معیار رکھنے والی اور سچائی کے راستے پر بہت ثابت قدم رہنے والی عورت ہو۔"

"میں ایسا دعویٰ ہرگز نہیں کر رہی ....." میمونہ غیر متوقع طور پر مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں تو صرف کسی غیر جانبدار اور تیسرے فرد کی طرح حالات کا بے لاگ تجزیہ پیش کر رہی ہوں تاکہ بات ہماری سمجھ میں آ سکے۔ مجھے بھی ایسی نیک اور صالح ہونے کا دعویٰ کب ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ میں نے دبی دبی زبان میں اور آپ کی امی نے کافی زور و شور اور سختی سے آپ کو منع کیا تھا لیکن آپ اپنی دھن میں تھے۔ آپ نے کسی کی نہیں سنی تھی۔ میں تو بعد میں اپنے کمزور سے احتجاج کو بھی بھول بھال گئی تھی۔ میرے خیال میں یہ سب باتیں آپ کے پیشے کا حصہ تھیں۔ پھر جب میں نے آپ سے جمشید صاحب کی پیشکش



کی تفصیلات سنیں تو میں بھی خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو بری الذمہ نہیں ٹھہرا رہی ..... میں بھی آپ ہی جیسی ہوں۔ اسی لئے آپ کے ساتھ ہوں ..... اور میرا خیال ہے آپ ہی جیسے تجربات سے گزر رہی ہوں۔"

وہ خاموش ہو گئی لیکن ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقصاں رہی۔

خالد چند لمحے پرخیال سے انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "جو ہوا سو ہوا ..... اسے ہم بدل نہیں سکتے لیکن تمہاری باتیں سن کر مجھے خوشی ہوئی ..... میں ان سے متفق ہوں ..... اس کا مطلب ہے ابھی ہم میں کم از کم اتنا شعور باقی ہے کہ اپنے حالات کا اور اپنے اعمال کا تجزیہ کر سکیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے' ہمیں کم از کم اس کا ادراک تو ہے۔"

"ہاں ....." میمونہ ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں بولی۔ "لیکن اس کے باوجود شاید ہم کر کچھ نہیں سکتے۔ ہم کسی چیز کو بدل نہیں سکتے۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی نہیں۔ ہم ان حالات کے دھارے میں بہہ چکے ہیں۔ اب اپنے آپ کو واپس اس مقام پر لے جانا ہمارے بس کی بات نہیں' جہاں سے ہم آئے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہمارا شعور بھی مر جائے گا۔ ہم بھول جائیں گے کہ ہم کہاں سے آئے تھے ..... یا یہ کہ ہم کبھی اچھے بھی تھے۔ یہی ہماری زندگی ہو گی اور یہی ہمارا معاشرہ ..... اس فرم کے دوسرے وکیلوں سعید پاشا' حنیف قیصر اور تنویر کمال کی طرح آپ بھی ..... اور ان کی بیگمات کی طرح میں بھی یہاں نہایت مطمئن زندگی گزاریں گے اور کبھی پلٹ کر نہیں دیکھیں گے۔ میرا خیال ہے ہمارے اندر ہمارے نئے جنم کا بیج تو پھوٹ چکا ہے۔ اب صرف اس کا پھولنا پھلنا باقی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ہم واپس نہیں جا سکتے؟" خالد بولا۔

"میرا خیال ہے پہلے تو ہمیں اپنے ذہنوں میں یہ واضح کرنا چاہئے کہ ہم جانا نہیں چاہتے یا جا نہیں سکتے؟" میمونہ اسی عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ خالد نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ اس کے اندر جیسے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ کوئی بات واضح نہیں تھی۔ ان گنت اندیشے تھے' وسوسے تھے جو اس اندھیرے میں سنپولیوں کی طرح کلبلا رہے تھے۔

"شاید آپ کو اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں دقت پیش آ رہی ہے کیونکہ آپ زیادہ الجھے ہوئے ہیں ..... آپ کے اندر زیادہ کنفیوژن پھیلا ہوا ہے لیکن میں آپ کو بتاتی ہوں ..... اور آپ بھی ابھی یا پھر جلد ہی مجھ سے متفق ہو جائیں گے۔ میرا خیال ہے ہم جانا بھی نہیں چاہتے کیونکہ ہم مکمل طور پر جمشید کے زیر اثر آ چکے ہیں۔"

"اگر ہم مکمل طور پر زیر اثر آ چکے ہوتے تو اس قسم کی باتیں نہ کرتے جیسی کر رہے ہیں۔ ہم اپنی حالت کے بارے میں سوچ ہی نہ پاتے۔ اپنا تجزیہ بھی نہ کر پاتے۔ ہمارے لئے تو بس یہی نارمل زندگی ہوتی۔ ہمیں یہاں جو بھی واقعات پیش آتے وہ ہمارے

گلتے بالکل انوکھے یا عجیب نہ ہوتے۔ ہم اطمینان سے شب و روز گزار رہے ہوتے۔ واپس جانے ...... بلکہ کہیں بھی جانے کے بارے میں نہ سوچتے ......" خالد نے نکتہ اٹھایا۔

"ابھی ہم نئے ہیں۔ ابھی ہمارے اندر اپنی اصل شخصیت کا رنگ بھی باقی ہے۔ اس لئے اس قسم کے خیالات کی لہر سی آ جاتی ہے۔ میں نے کہا نا کہ وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ مرجائے گا۔ ہماری اصل شخصیت ...... یا ہمارے اندر جو تھوڑی بہت اچھائی کی رمق ہے وہ بھی مرجائے گی اور ہم پر مکمل طور پر وہی رنگ چڑھ جائے گا جو جمشید چڑھانا چاہتے ہیں۔" میمونہ بولی۔ "تاہم میں اب بھی اس لئے اپنے آپ کو اور تمہیں مکمل طور پر ان کا مغلوب اور مفتوح شمار کر رہی ہوں کہ ہم میں اس وقت بھی یہاں سے نکلنے کی ہمت نہیں رہی۔ ہم اس بارے میں صرف باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے اس خیال پر عمل ہرگز نہیں کر سکتے۔"

خالد سوچتے ہوئے بولا۔ "میرے خیال میں اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ جتنی ہم باتیں کر رہے ہیں' درحقیقت ہمارے ذہنوں پر اتنا بوجھ نہیں ہے۔ ہمارے ضمیر اتنے بے چین نہیں ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے لاشعور میں ایک خوف موجود ہے کہ اگر ہم یہاں سے نکلے یا ہم نے واپس جانے کی کوشش کی تو ہمارا انجام اچھا نہیں ہو گا۔"

"انجام تو شاید ہمارا یہاں بھی اچھا نہ ہو۔" میمونہ اس اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

"لیکن ایک اطمینان تو ہے کہ ہم ایک سرپرست ...... ایک مربی کی پناہ میں ہیں۔" خالد بولا۔

"اور وہ جو سب سے بڑا سرپرست ...... کائنات میں سب سے طاقتور ہے ...... جس کی اس کائنات پر اصل حکومت ہے اس کی پناہ پر ہمیں اعتماد نہیں رہا۔" میمونہ خود استہزائی کے سے انداز میں بولی۔

"ہم آج کے انسان ہیں نا ...... ہمارے ایمان کمزور ہیں۔" خالد بولا۔

"یا پھر شاید بات یہ ہے کہ ہم انسان ہی نہیں رہے۔" میمونہ بولی۔

"اچھا تم ہی بتاؤ ...... کیا تم یہاں سے نکل بھاگنے کے لئے تیار ہو؟" خالد فیصلہ کن سے لہجے میں بولا۔

"نہیں ......" میمونہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"میں بھی خود میں اس کی ہمت محسوس نہیں کرتا۔" خالد نے اعتراف کیا۔

"بس ...... تو پھر بات ہی ختم ہو گئی۔" میمونہ نے کندھے اچکائے۔

"بات تو ابھی نہ جانے کہاں تک جائے گی۔" خالد نے ٹھنڈی سانس لی۔

○



اس وقت وہاں سے کافی دور نشاط نگر کے ایک کچے مکان میں بھی اندیشوں' وسوسوں اور تفکرات سے بوجھل گفتگو ہو رہی تھی۔ اس گھر کے درودیوار پر ایک عرصے سے اداسیوں نے ڈیرے ڈال لئے تھے۔ خوشیاں گویا اس گھر کے ہر فرد سے روٹھ گئی تھیں۔ سبھی کے دل ایک ناقابل بیان دکھ سے بوجھل رہتے تھے۔

یہ ایک معمولی اور بے وسیلہ ہاری خدا بخش کا گھر تھا جس کی دس سالہ بچی شاہدہ کو کافی عرصہ پہلے نیاز علی نے اٹھا لیا تھا۔ اس المناک واقعے کے بعد سے گویا بربادیوں نے اس گھر کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ پہلی بربادی تو یہی تھی کہ بچی کی زندگی خراب ہو گئی تھی۔ بات تھانے کچہری تک پہنچی تھی۔ اتنے بڑے زمیندار کے بیٹے سے دشمنی چل پڑی تھی۔ وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔

اس وقت خدا بخش' اس کی بیوی لکھاں اور انیس بیس سال کا ان کا بیٹا شمشیر علی آدھے چاند کی دھندلی چاندنی میں کچے صحن میں جھلنگا سی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔ سب اپنی اپنی جگہ گہری سوچوں میں تھے۔

صحن ہی کے ایک کونے میں اونچا سا مٹی کا چبوترہ تھا جس پر چھپر پڑا ہوا تھا۔ اس حصے میں چولہا وغیرہ تھا۔ یہ ایک طرح کا کچن تھا۔ مٹی کے چولہے میں اس وقت آگ دم توڑ رہی تھی۔ لکڑیاں جل کر کوئلہ بنی تھیں اور اب دھیرے دھیرے کوئلے راکھ میں تبدیل ہو رہے تھے۔ راکھ چولہے سے باہر ذرا دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

شاہدہ جو اب تقریباً" گیارہ کی عمر کو پہنچ رہی تھی اسی چولہے کے قریب سر جھکائے' ایک رخسار گھٹنے پر ٹکائے تقریباً" ساکت بیٹھی تھی۔ اجرک نے اس کا چہرہ تقریباً" چھپا رکھا تھا لیکن اگر کوئی قریب سے دیکھتا تو اس کے ایک رخسار پر دھندلی چاندنی میں جھلملاتی ہوئی آنسوؤں کی لکیر دیکھ سکتا تھا۔ اس کا صرف ایک ہاتھ دھیرے دھیرے حرکت کر رہا تھا۔ چھوٹے سے اس نرم و نازک ہاتھ میں ماچس کی ایک بجھی ہوئی تیلی تھی اور اس تیلی سے وہ چولہے کے باہر پھیلی ہوئی راکھ میں آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ ایک عرصے سے اس کا بیشتر وقت اسی طرح کسی نہ کسی کونے کھدرے میں لکیریں کھینچتے ہوئے گزرتا تھا۔

اس المناک واقعے کے بعد سے اسے ایک طرح کی چپ لگ گئی تھی۔ کئی دن اسے ہسپتال میں بھی رہنا پڑا تھا۔ پولیس نے اس سے بہت جرح کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ قانون کے تقاضے پورے کرنے کے لئے تفصیلات اور باریکیوں میں جانا ضروری تھا مگر زیادہ تر وہ سر جھکائے خاموشی سے آنسو بہانے کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔ سرکاری وکیل کا کہنا تھا کہ اس کے اس رویئے نے بھی کیس پر برا اثر ڈالا تھا۔ شاید وہ توقع رکھتا تھا کہ وہ ذرا سی بچی اپنے لٹنے کی داستان تمام تر جزئیات و تفصیلات کے ساتھ بھری عدالت میں بیان کرتی۔

شاہدہ کو سکول سے اٹھانا پڑا تھا۔ سکول جانا تو درکنار' اس نے باہر نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ سب اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے تھے۔ بعض تو اس موضوع پر بات کرنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ اپنی کم عمری اور کم سمجھی کے باوجود وہ شرم سے زمین میں گڑ جاتی تھی۔ آخر کار وہ گھر میں بیٹھ گئی تھی۔ اس نے پورے گاؤں سے ..... حتیٰ کہ اپنی ہم جولیوں سے بھی منہ چھپا لیا تھا۔

آخر شاہدہ کے نوجوان بھائی شمشیر علی نے سکوت توڑا۔ "ہمیں یہاں سے جانا ہی پڑے گا بابا! اس گاؤں میں ہمارے لئے بربادی اور ذلت کے سوا کیا رہ گیا ہے؟" اس کے لہجے میں تلخی' ناراضی اور ایک مجبور سا غیظ و غضب تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا .....! لیکن جائیں گے کہاں؟ کھائیں گے کہاں سے؟" اس کے ادھیڑ عمر باپ نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ مضبوط کاٹھی کا آدمی تھا مگر دکھ اور تفکرات نے اس کے کندھے جھکا دیئے تھے۔

"جو اللہ سائیں یہاں روٹی دے رہا ہے' وہ کہیں اور بھی روٹی دے دے گا۔" شمشیر علی گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ "اور یہاں کون سے ہمارے کارخانے لگے ہوئے ہیں یا جائیداد پڑی ہوئی ہے۔ اب تو کوئی ہمیں زمینوں پر کام بھی نہیں دیتا۔ یہ جھونپڑی جیسا مکان بھی ہمارا اپنا نہیں ہے۔ ایک ٹائم کھا لیتے ہیں تو دوسرے ٹائم کی فکر لگی رہتی ہے۔ میں نے آپ کو کتنی مرتبہ تو سمجھایا ہے کہ کراچی چلتے ہیں۔"

خدا بخش کو جیسے کراچی کے نام سے بھی خوف آتا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہاں رہیں گے کہاں؟ کھائیں گے کہاں سے؟"

"بابا .....!" شمیر علی اب قدرے رسان سے بولا۔ "خانہ بدوش بھی تو اپنا تھوڑا سا سامان اٹھائے ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتے رہتے ہیں۔ اب ہم میں اور خانہ بدوشوں میں کیا فرق رہ گیا ہے؟ کراچی کے آس پاس بہت سے گوٹھ ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی جاننے والا مل جائے گا۔ کہیں جھگی ڈال لیں گے۔ کہیں محنت مزدوری کا کام بھی مل ہی جائے گا ....."

یکدم وہ پرخیال سے انداز میں خاموش ہو گیا۔ اس کی عمر تو صرف انیس بیس سال تھی لیکن وہ تنومند اور لمبا تڑنگا تھا۔ چہرے پر گھنی مونچھ کو بل دیتے ہوئے وہ دھیمی مگر غراہٹ جیسی آواز میں بولا۔ "وہ وکیل خالد بھی تو کراچی ہی گیا ہے ..... اس سے بھی حساب کتاب برابر کرنا ہے ..... قریب رہیں گے تو اس کو ڈھونڈنے اور حساب کتاب برابر کرنے میں بھی آسانی رہے گی۔"

"تم یہ بدلے وغیرہ کی باتیں مت کیا کرو ....." خدا بخش یکدم برہمی سے بولا۔ "ہم پہلے کم پریشانیاں اٹھا چکے ہیں۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر فدا حسین جو ہمارے سب سے بڑے



حمایتی بنے ہوئے تھے وہ بھی سکول چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ جس ماسٹر ریاض نے انہیں سب سے زیادہ اکسایا تھا' تمہیں معلوم ہے نیاز علی نے اس بے چارے کا کیا حشر کرایا ہے؟ وہ ابھی چارپائی سے نہیں اٹھا ہے ..... اور پھر اصل مجرم تو نیاز علی ہے۔ جب ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو خواہ مخواہ وکیل سے خار کھانے کا کیا فائدہ؟ وکیلوں نے تو پیسے لے کر کسی کا بھی کیس لڑنا ہوتا ہے۔"

"نیاز علی سے بھی نمٹنا ہے ....." شمشیر علی غرایا۔ "لیکن اس کے لئے زیادہ طاقت کی ضرورت ہے ..... اور میں وہ طاقت حاصل کر کے ایک دن یہاں ضرور واپس آؤں گا ..... لیکن پہلے اس وکیل سے حساب کتاب برابر کرنا زیادہ ضروری ہے۔ وہ کچھ الگ ہی قسم کا وکیل تھا۔ ایسے وکیل بھی نیاز علی جیسے لوگوں کے جرائم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

"تم تو پاگل ہو ..... شیخ چلی والے خواب دیکھتے ہو۔" خدا بخش خفگی سے بولا۔

شمشیر علی سر جھٹک کر بولا۔ "تم یہ باتیں چھوڑ بابا! بس تم چلنے کی تیاری کرو۔"

"کیا ابھی اور اسی وقت چلنا ہے؟" اس کا باپ استہزائیہ سے لہجے میں بولا۔

"ہاں ..... اگر ہم رات کے اندھیرے میں ہی خاموشی سے نکل چلیں تو اچھا ہے۔"

"اچھا ..... بھئی ٹھیک ہے ....." آخر اس کا باپ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہاں رہنے کو اب میرا دل بھی نہیں چاہتا۔ خاص طور پر جب سے نیاز علی نے ریاض کا برا حشر کر دیا ہے مجھے ڈر محسوس ہونے لگا ہے کہ کہیں وہ تمہارے بارے میں کوئی سازش تیار نہ کر رہا ہو۔"

"اگر تمہیں میری اتنی ہی فکر ہے بابا ..... تو پھر یہاں سے نکل چلو۔" شمشیر علی بولا۔ "ہمارے پاس کون سا لمبا چوڑا سامان ہے۔ ابھی باندھ لیتے ہیں۔ چارپائیاں ہم یہیں چھوڑ دیں گے۔ میرے پاس تھوڑے سے پیسے ہیں۔ کرائے بھاڑے اور کراچی پہنچ کر دو چار دن کہیں سر چھپانے میں کام آ جائیں گے۔"

آخر کار ہجرت پر اتفاق رائے ہو گیا اور وہ لوگ لالٹینوں کی روشنی میں سامان باندھنے لگے۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" خدا بخش نے قدرے خوفزدہ سے انداز میں پوچھا۔

"میں ہوں ..... مستی خان ..... وڈیرے نیاز علی کا کمدار ..... دروازہ کھولو۔" ایک بھاری اور پارعب آواز سنائی دی۔ نام کے بعد اس شخص کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں

تھی۔ اس علاقے میں اسے کون نہیں جانتا تھا۔

خدا بخش نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا تو مستی خان سامنے کھڑا مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو گیم شحیم کلاشنکوف بردار تھے۔

"شمشیر علی کہاں ہے؟" مستی خان نے اپنے مخصوص بارعب لہجے میں کہا۔ "اسے وڈیرہ نیاز علی نے بلایا ہے۔"



خدا بخش کے جسم سے گویا جان نکل گئی۔ اس نے سہارے کے لئے دروازے کی چوکھٹ کو تھام لیا۔ اس طرح درحقیقت اس نے مستی خان کا راستہ روکنے کی کمزور سی کوشش کی تھی۔ اسے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ کہیں مستی خان دندناتا ہوا اندر ہی نہ گھس آئے۔

"وڈیرے نے کس لئے بلایا ہے شمشیر علی کو؟" اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو وہیں چل کر پتہ چلے گا۔" مستی خان نے بے نیازی سے جواب دیا۔

خدا بخش کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ اپنے لئے خوفزدہ نہیں تھا۔ اس کا دل اپنے جگر گوشے کی وجہ سے لرز رہا تھا۔ شمشیر علی اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ابھی تو اس کی چڑھتی جوانی دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی سیر نہیں ہوئی تھیں۔ کمسن بیٹی کی زندگی تو پہلے ہی ایک ناکردہ گناہ کی بھینٹ چڑھ چکی تھی...... اور یہ مستی خان کو بھی کیا عین اسی وقت مرنا تھا؟ خدا بخش سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ اب تو وہ بیٹے کی ضد کے آگے ہتھیار بھی ڈال چکا تھا۔ کراچی جانے کے لئے حامی بھر چکا تھا۔ ابھی تو انہوں نے نقل مکانی کی تیاری شروع ہی کی تھی۔ ایک دو گھنٹے کی بات اور تھی۔ انہیں اپنا مختصر سا سامان باندھنے کے لئے اس سے زیادہ وقت کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر مستی خان دو گھنٹے بعد یا پہنچ آجاتا تو اسے اس گھر کے دروازے پر تالا جھولتا ملتا۔ کیا ان کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ لب بام پہنچ کر ان کی کمند ٹوٹ جائے؟

اس کے ذہن میں خیالات آندھی کی طرح آئے اور گزر گئے۔ وہ مستی خان کے سامنے اپنے آپ کو خوف زدہ یا کسی قسم کے احساس جرم کا شکار ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں مستی خان بھانپ نہ لے کہ وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ بھی غنیمت ہی تھا کہ ابھی انہوں نے کوئی خاص سامان نہیں باندھا تھا۔ وہ کوئی ایسی حرکت بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی کوئی ایسی بات کرنا چاہتا تھا جس سے مستی خان کو غصہ آ جاتا لیکن اسے اپنے بیٹے کی طرف سے خطرہ تھا کہ کہیں وہ سامنے آ کر اپنا جوش و خروش یا غصہ دکھا کر بات بگاڑ نہ دے۔ آخر وہ جوان خون تھا۔ بلاوجہ ظلم و زیادتی اور

دھونس دھاندلی کہاں تک برداشت کر سکتا تھا؟

اصولاً" تو نیاز علی ان کا مجرم تھا لیکن الٹا انہیں اس سے ڈرنا پڑ رہا تھا۔ وہ تو ا کے ہاری بھی نہیں تھے۔ ایک چھوٹے سے زمیندار کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ اسی ان کو رہنے کے لئے یہ مکان دیا ہوا تھا لیکن علاقے کے سب سے بڑے زمیندار کا ہونے کی وجہ سے نیاز علی علاقے کا بے تاج بادشاہ بنا ہوا تھا اور اپنے ہتھکنڈوں کے ذر انہیں بھی اپنی اطاعت پر مجبور کرتا تھا جو اس کے دست نگر نہیں تھے۔ جن پر اس کے حکم چلانے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ ان باتوں پر اگر کسی نوجوان کا خون کھول جاتا تو یہ کو تعجب کی بات نہ ہوتی اور اگر کسی نوجوان کی کمسن بہن کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا ہو جیسا شمشیر علی کی بہن کے ساتھ پیش آیا تھا اور وہ نوجوان جا کر نیاز علی کو قتل کر دیتا تو خد بخش کے خیال میں اس پر بھی کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہئے تھا اور اسے عین انصاف سمجھ چاہئے تھا لیکن المیہ یہ تھا کہ وہ اپنے ان خیالات کا اظہار کسی پر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ا جذبات کو دل میں ہی چھپائے رکھنے پر مجبور تھا ورنہ جب وہ اپنی بچی شاہدہ کی طرف دیکھتا اس کی رگ و پے میں بھی بڑے طوفان اٹھتے تھے۔ وہ نوجوان نہیں تھا مگر اس کا بھی چاہتا تھا کہ آندھی طوفان بن کر اٹھے اور نیاز علی کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جائے۔

اس نے کن اکھیوں سے پیچھے دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ شمشیر علی اس کے برابر آن کھڑا نہیں ہوا تھا۔ وہ اندر کوٹھری میں ہی تھا اور مستی خان اور اس کے آدمیوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ شاید وہ چھپ کر ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ البتہ خدا بخش کی بیوی لکھاں اس کے برابر ضرور آن کھڑی ہوئی تھی اور اپنے پرانے دوپٹے کا پلو منہ پر رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مستی خان اور اس کے کلاشنکوف بردار ساتھیوں کو دیکھ رہی تھی۔

"کمدار ......!" خدا بخش التجائیہ لہجے میں بولا۔ "شمشیر علی کو تو کل سے بہت تیز بخار چڑھا ہوا ہے ...... ہمیں تو اس کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ آج رات سرکاری ڈسپنسری کے ڈاکٹر سے دوا لا کر اسے کھلائی ہے تو ذرا اس کی آنکھ لگی ہے ورنہ کل سے بستر پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا اور اب تو کچھ اول فول بھی بکنے لگا تھا۔ بخار شاید اس کے دماغ کو چڑھ گیا ہے۔ صبح تک اس کی طبیعت ذرا بھی صحیح ہو جائے تو میں خود اسے ساتھ لے کر وڈیرے کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ میری طرف سے وڈیرے کو پیغام دے دینا کہ اس نے ہاتھ جوڑ کر یہ گزارش کی ہے....."

خدا بخش نے گویا عملی مظاہرے کے لئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور پہلے سے زیادہ التجائیہ لہجے میں بولا۔ "اگر ابھی اسے جگایا تو طبیعت زیادہ ہی خراب نہ ہو جا اس وقت تو ہم اسے تعلقہ ہسپتال تک بھی نہیں لے جا سکیں گے۔"



اس کے التجائیہ اور عاجزانہ انداز سے مستی خان کچھ نرم پڑتا دکھائی دیا لیکن شاید وہ الجھن میں تھا کہ یونہی واپس جانے پر اسے نیاز علی کی برہمی کا نشانہ تو نہیں بننا پڑے گا؟ کیا وہ اس عذر کو قبول کر لے گا؟ ان کے ارادے تو یقیناً" نیک نہیں تھے لیکن شاید وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ شمشیر علی مر ہی جائے اور اس کی موت ان کے گلے پڑ جائے۔ گو کہ اس قسم کی پریشانیوں سے نمٹنا بھی ان کے لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا لیکن فی الحال شاید وہ اس حد تک الجھن میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد مستی خان اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "تم جھوٹ تو نہیں بول رہے؟"

خدا بخش کھسیاتے ہوئے بولا۔ "میری یہ مجال کہاں کہ میں وڈیرے کے کمدار سے جھوٹ بولوں ...... تم خود اندر آکر دیکھ لو......" اس نے ایک طرف ہٹ کر ان لوگوں کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ خدا بخش کو جھوٹ بولنے کی عادت نہیں تھی اور نہ ہی وہ کچھ ایسا حاضر دماغ تھا مگر اس وقت پریشانی کے عالم میں نہ جانے کس طرح یہ جھوٹ اس کے ذہن میں آگیا تھا اور الفاظ خود بخود اس کی زبان سے پھسلتے چلے گئے تھے۔ اب ایک اندھی خود اعتمادی کے تحت اس نے کمدار اور اس کے آدمیوں کو اندر آنے کی دعوت بھی دے دی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ اس اندیشے سے اس کا ذہن سنسنا بھی رہا تھا کہ اگر کمدار واقعی اندر آگیا تو کیا ہو گا؟

وہ دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا اندر کوٹھری میں شمشیر علی جلدی سے چادر اوڑھ کر چارپائی پر آنکھیں بند کر کے لیٹ جائے تو اچھا ہے۔ وہ کمدار کی منت کر سکتا تھا کہ وہ شمشیر کو چھونے کی کوشش نہ کرے' وہ بڑی مشکل سے سویا تھا' اس کی آنکھ کھل جانے کا اندیشہ تھا۔ اگر کمدار اس کی بات مان لیتا تو اس کا جھوٹ کامیابی سے چل جاتا۔

خلاف توقع اس کا جھوٹ اس سے بھی زیادہ آسانی سے چل گیا۔ اس کی خود اعتمادی نے کمدار کو بھی دھوکہ دے دیا۔ اس نے ایک لمحے سوچا اور پھر اندر نہ آنے کا فیصلہ کیا۔ وہ لوگ اپنے سرپرست اعلیٰ کے اشارے پر شمشیر کا جو بھی حشر کرنا چاہتے تھے شاید تندرستی کی حالت میں کرنا چاہتے تھے۔ بیماری کی حالت میں اسے اٹھا کر لے جانا شاید ان کی مصلحتوں کے خلاف تھا۔

"اچھا ...... خیر...... ٹھیک ہے ...... ابھی تو میں جا رہا ہوں۔ میں وڈیرا سائیں کو سمجھا لوں گا لیکن صبح اس کو اوطاق پر ضرور بھیج دینا۔ جیسے ہی وہ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل ہو' اسے بھیج دینا ...... اسے اکیلا ہی بھیجنا ...... تمہیں اس کے ساتھ چپکنے کی ضرورت نہیں ...... وڈیرا سائیں اس سے اکیلے میں کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ سمجھ گئے نا؟" مستی خان کا دھونس اور دھمکی والا لہجہ برقرار تھا۔

"بالکل سمجھ گیا سائیں!" خدا بخش نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ان تینوں نے اسے بیک وقت چند سیکنڈ کے لئے گھورا پھر پاؤں پٹخنے کے سے انداز میں چلتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف واپس چلے گئے۔ خدا بخش اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا جب تک ان کی گاڑی اس کی نظر سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ گاڑی غائب ہو چکی تھی تب اس کے سینے سے ایک طویل اور بوجھل سانس خارج ہوئی۔ لکھاں کی بھی گویا اب جان میں جان آئی تھی۔

دونوں میاں بیوی کوٹھری میں واپس آئے تو انہوں نے دیکھا شمشیر دروازے کے عقب میں تھا۔ اس کی آنکھیں نفرت سے سلگ رہی تھیں۔ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ "مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے بابا! آپ کے جھوٹ نے مجھے بچا لیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا آپ اتنی صفائی سے جھوٹ بول سکتے ہیں۔"

"شاید مجبوریاں انسان کو سب کچھ سکھا دیتی ہیں بیٹا!" خدا بخش کمزور سے لہجے میں بولا۔ "مجھے تو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں تم جوش میں سامنے نہ آ جاؤ۔"

"میرے سینے میں بے شک بڑا ابال اٹھتا ہے بابا ......!" شمشیر کے لہجے میں اب ہلکی سی افسردگی آ گئی۔ لیکن میں ایسا جوش دکھانا نہیں چاہتا جس سے کچھ حاصل نہ ہو۔ آپ بہت کچھ کرنے کی خواہش لے کر تڑپ کر اٹھیں لیکن آپ کو بلبلے کی طرح بٹھا دیا جائے۔ میں کیڑے مکوڑوں جیسی موت مرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے میں نے دروازے کے پیچھے چھپے رہنا ہی بہتر سمجھا ...... اور اگر مستی خان اندر آ جاتا تو شاید میں آپ کا جھوٹا بہانے کے لئے بخار جیسی حالت بنا کر لیٹ بھی جاتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ مجبوریاں اب برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہیں۔ اب اپنی اس حالت پر روح بھی شرمندہ ہونے لگی ہے ......" دکھ بھرے انداز میں اس نے ایک گہری سانس لی اور نچلا ہونٹ دانتوں تلے بھینچ لیا۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ درودیوار پر ایک نظر ڈالی کہ گویا انہیں گواہ بناتے ہوئے بولا۔ "لیکن ان دیواروں سے ...... یہاں کی مٹی سے ...... یہاں کی ہر چیز سے میرا وعدہ ہے کہ ایک روز میں واپس آؤں گا ...... ضرور واپس آؤں گا ...... اور اس وقت میں اس قابل ہوں گا کہ نیاز علی اور اس کے کلاشنکوفوں والے گرگے مجھ سے چھپتے پھریں گے لیکن انہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی ......"

خدا بخش اور لکھاں نے خوفزدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ شاید وہ اسے بتانا چاہتے تھے کہ اس قسم کے خواب شاید اس گاؤں میں کئی نوجوانوں نے دیکھے تھے لیکن یہ خواب بس خواب ہی تھے۔ ان کی قسمت میں تعبیریں نہیں، شکستگی تھی ...... لیکن پھر انہیں اپنے بیٹے کے چہرے پر نہ جانے ایسی کیا بات نظر آئی کہ انہوں نے اسے سمجھانے کا ارادہ ترک کر دیا۔



خدا بخش جھرجھری سی لے کر بولا۔ "اب تو واقعی یہاں سے نکلنا ضروری ہو گیا ہے ...... اور ہمیں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ کمدار تو چلا گیا ہے لیکن کوئی بھروسہ نہیں کہ نیاز علی اسے ڈانٹ ڈپٹ کر دوبارہ بھیج دے۔ ہم سب کو جلدی جلدی سامان باندھ لینا چاہئے۔ چلو ...... سب مل جل کر کام کرو ......"

وہ چاروں اس فوجی پلٹن کی طرح تیزی سے حرکت میں آ گئے جسے اچانک کسی محاذ سے کوچ کا حکم مل گیا تھا حتیٰ کہ کمسن شاہدہ بھی تیزی اور پھرتی سے ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو یوں نیچی آوازوں میں ہدایات دے رہے تھے جیسے انہیں اس محاورے پر پورا یقین ہو کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔

سامان جلد ہی بندھ گیا۔ انہوں نے بہت ضروری چیزیں ساتھ لی تھیں۔ بہت سا کاٹھ کباڑ چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی آخر ایک گھر کا سامان تھا۔ تمام تر غربت اور بے سروسامانی کے احساس کے باوجود بہرحال پوری گرہستی تھی تاہم انہوں نے مل جل کر اسے سروں پر اٹھا ہی لیا۔ باپ بیٹے نے زیادہ بوجھ بانٹ لیا۔ مین روڈ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں سے انہیں بس ملنے کی امید تھی لیکن انہیں ازراہ احتیاط نہر کے کنارے کنارے ایک محفوظ راستے سے جانا تھا جس سے فاصلہ کچھ بڑھ جاتا تھا تاہم یہ مختصر سا قافلہ جسے گویا ایک ہجرت درپیش تھی، اسی راستے سے روانہ ہوا۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ ادھورا اور دھندلا چاند ہلکے سے بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا تھا اور یوں گھٹا ٹوپ اندھیرا تو نہیں لیکن ملگجی تاریکی ضرور پھیل گئی تھی۔ سفر کرنا کچھ محفوظ ہو گیا تھا اور راستہ دیکھنا اب بھی زیادہ مشکل نہیں تھا۔

کافی دیر کے سکوت کے بعد جب وہ نہر سے دور نکل آئے اور انہیں خطرے کی زد سے نکل آنے کا احساس ہوا تو خدا بخش گویا بہت تاخیر کے ساتھ بیٹے سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ "اچھا ہی ہے ہم یہ گاؤں چھوڑ رہے ہیں۔ واقعی ہمارے لئے اب یہاں کیا رکھا ہے۔ ہمارے حالات تو اپنی جگہ ہیں لیکن دوسرے لوگ کون سے یہاں خوش ہیں۔"

"ہاں ...... یہ بات تو ہے ......" لکھاں بھی مرتعش سانسوں کے درمیان بولی۔ "عجیب عجیب پراسرار واقعات ہو رہے ہیں۔ جن بھوتوں کی کہانیوں جیسی باتیں سننے میں آ رہی ہیں۔ آئے دن جوان جوان لوگ مر رہے ہیں اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ انہیں کیا بیماری تھی۔ رات کو بھلے چنگے سوتے ہیں۔ صبح پتہ چلتا ہے کہ بستر سے اٹھ ہی نہیں سکے۔"

"واقعی ......" خدا بخش نیچی آواز میں بولا۔ "ایک عذاب تو نیاز کی صورت میں پہلے ہی نشاط نگر کو چمٹا ہوا تھا۔ کچھ عرصے سے یہ دوسرا عذاب شروع ہو گیا ہے۔ پرسوں دینو دھوبی کا بھائی تو راہ چلتے ہی ہٹ سے گر کر مر گیا۔ کیسا کڑیل جوان تھا۔ دیکھنے والے بتا رہے تھے کہ سڑک پر گر کر بس چند سیکنڈ کے لئے اس طرح تڑپا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم میں بیسیوں خنجر گھونپ دیئے ہوں۔ سرکاری ڈاکٹر بھی اس کی موت کی وجہ نہیں سمجھ

سکا۔ وہ تو ایسا شیر جوان تھا ..... زندگی میں شاید اسے کبھی نزلہ بھی نہیں ہوا تھا۔"

"واقعی ..... یہ تو بڑی ہی افسوسناک موت تھی ..... ابھی تو بے چارے کی شادی ہوئے مہینہ بھی نہیں ہوا تھا۔ کیسی کم عمر اور حسین بیوی ہے اس کی ..... اندھیرے میں بھی سامنے آ جائے تو لگتا ہے چودھویں کا چاند سامنے آ گیا۔ اس کی گوری گوری کلائیوں میں پڑی ہوئی سرخ چوڑیاں جب توڑی گئیں تو بے چاری صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی۔" لکھاں بولی۔

"بے ہوش تو ہونا ہی تھا ....." خدا بخش ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "ابھی بے چاری نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا۔ ابھی تو شاید اس نے جی بھر کے شوہر کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ پچھلے تین چار مہینوں میں تیرہ چودہ آدمی اسی طرح مر چکے ہیں جن کی موت کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ....."

پھر وہ سر پر لدا ہوا سامان سنبھالتے ہوئے متاسفانہ لہجے میں بولا۔ "یہ جو اپنا گاؤں ہے نشاط نگر ..... یہ گاؤں نہیں اچھا بھلا قصبہ ہے۔ اگر اسے نیاز جیسی نحوست نہ چمٹتی ..... اور اب یہ پراسرار انداز میں لوگوں کے مرنے کا سلسلہ شروع نہ ہوتا تو شاید یہ گاؤں ترقی کر کے چھوٹا موٹا شہر بن جاتا۔ اچھی خاصی آبادی ہے اس کی .....! مگر ایسا لگتا ہے اب دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ یہاں سے آج صرف ہم ہی نہیں جا رہے ہیں۔ ہم سے پہلے بھی بہت سے لوگ یہاں سے چپکے چپکے نکل چکے ہیں۔"

"ہاں ..... یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔" لکھاں افسردہ سے لہجے میں بولی۔ "اب تو گلی کوچوں میں ویرانی سی محسوس ہونے لگی ہے۔ اس مرتبہ تو گندم کی کٹائی کے موقع پر بھی کوئی رونق دیکھنے میں نہیں آئی۔ لوگوں نے کوئی خوشی نہیں منائی۔ سب بجھے بجھے دکھائی دے رہے تھے۔"

شمشیر نے کافی دیر کی خاموشی کے بعد گفتگو میں دخل دیا۔ وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "کوئی بھی ایسی جگہ جہاں کوئی انسان، انسانوں ہی کے درمیان سے اٹھ کر ان پر ظلم ڈھانا شروع کر دیتا ہے اور کوئی بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کرتا، لوگ اس کے ظلم کے خلاف متحد ہونا تو درکنار، اسے زبان سے بھی برا نہیں کہتے وہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اس شخص کی نحوست کے ساتھ ساتھ وہاں اور بھی نہ جانے کیا کیا نحوستیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ نہ جانے کون کون سی آفت وہاں کا رستہ دیکھ لیتی ہے۔ یہ سب نیاز کے وجود اور اس کے اعمال کی نحوست ہے ..... بلکہ مجھے تو لگتا ہے یہ جو لوگ اس طرح پراسرار طریقے سے مرنے لگے ہیں ..... اس سلسلے کا بھی نیاز کی ذات سے کوئی نہ کوئی تعلق ہے۔"

اس کے والدین نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید وہ اس سے متفق نہیں تھے لیکن اس کی جذباتی کیفیت کے پیش نظر وہ اس کی تردید کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اسے مزید غصہ نہیں



دلانا چاہتے تھے یا پھر شاید ان کے ذہنوں میں بھی شک جنم لینے لگا تھا کہ شاید بات یہی تھی۔ شاید شمشیر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

شاہدہ اپنی بساط سے کچھ زیادہ سامان اٹھائے خاموشی سے کسی بھیڑ بکری کی طرح پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اپنے اغوا والے واقعے کے بعد سے اسے جو چپ لگی تھی وہ اس وقت بھی برقرار تھی۔ جب کبھی اس سے بات کی جاتی تھی تب بھی وہ صرف ہوں ہاں میں جواب دیتی تھی۔ کبھی کبھی تو آس پاس اس کی موجودگی کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ اس کا وجود اور عدم وجود گویا برابر ہوتا جا رہا تھا۔

○

نشاط نگر میں آبادی سے تقریباً" تین میل دور شمال میں جنگل کے قریب برسوں پہلے ایک بہت بڑی پن چکی ہوا کرتی تھی۔ کہنے کو وہ پن چکی تھی لیکن درحقیقت وہ ڈیزل سے چلنے والے ایک بہت بڑے انجن کی مدد سے چلائی جاتی تھی۔ چکی کیا تھی، ایک چھوٹا موٹا فلور مل تھا۔ گودام کے طور پر اس کے ساتھ ایک سیدھی سادی مگر خاصی طویل و عریض عمارت بھی بنائی گئی تھی جس میں تہہ خانہ بھی تھا۔ چکی کی اپنی عمارت بھی خاصی بڑی تھی۔

اس دیہی علاقے میں زمین ویسے ہی سستی تھی اور جن دنوں یہ چھوٹا سا فلور مل لگایا گیا تھا ان دنوں تو بہت ہی سستی تھی اس لئے احاطہ وغیرہ کافی بڑا تھا جہاں کبھی درخت اور پھلدار پودے وغیرہ بھی لگائے گئے تھے۔ ان دنوں کئی آدمی یہاں کام کیا کرتے تھے۔ کئی خاندانوں کا روزگار اس سے وابستہ تھا لیکن بجائے اس کے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس جگہ کو ترقی ملتی، ایک وقت ایسا آیا کہ یہ معمولی سی فلور مل بند ہو گئی۔ اسے چلانے والا کوئی نہ رہا۔ اس کے مالکان کا خاندان بکھر گیا۔ کچھ لوگ مر گئے۔ کسی وارث نے تمام مشینری بھی اکھاڑ کر بیچ ڈالی۔ نیم پختہ سی عمارت زیادہ تر اینٹوں اور گارے سے بنی ہوئی تھی۔ وہ بھی اجڑتے اجڑتے کھنڈر میں تبدیل ہو گئی۔ احاطے میں لہلہانے والے درخت، پودے اور سبزہ جھاڑ جھنکاڑ میں تبدیل ہو گیا۔

محل وقوع کے اعتبار سے یہ کوئی خاص جگہ نہیں تھی۔ اس کی اہمیت بس اسی وقت تک تھی جب تک یہاں وہ چکی کام کر رہی تھی۔ شاید اسی لئے کسی نے اس پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ آخری مالک اسے جس کے ہاتھ بیچ گیا تھا اس کا بھی نہ جانے کیا بنا۔ اس نے بھی اس کھنڈر کا کوئی مصرف نہ نکالا۔ پھر اس کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ یہ جگہ آسیب زدہ تھی۔ یہاں کسی ایسے آسیب کا مسکن تھا جو انسانوں کے حق میں بہت ہی خطرناک تھا۔

دو چار آدمیوں نے رات کے سناٹے میں اس کے قریب سے اتفاقاً" گزرتے وقت کچھ عجیب و غریب قسم کی خوفناک آوازیں بھی سن لیں۔ پہلے ہی اس کے بارے میں طرح

طرح کی داستانیں مشہور ہو چکی تھیں۔ داستانوں کو کچھ اور رنگ مل گئے۔ لوگ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے بھی ڈرنے لگے اور رات کے سناٹے میں تو کسی کو اس کے قریب پھٹکنے کا تصور کرنا بھی محال تھا۔ کسی جری قسم کے جوان کو بھی اگر بہت بڑے انعام کا لالچ دیا جاتا تب بھی شاید وہ ادھر کا رخ کرنے کی جرات نہ کرتا۔ جگہ بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ لوگوں کو ادھر جانے یا ادھر سے گزرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ اسی لئے اب تو وہ اکثر لوگوں کے حافظے سے ہی محو ہو چکی تھی۔ اگر کبھی اس کا ذکر آتا بھی تھا تو بعض لوگ اسے "بھوتوں کا ڈیرہ" کہہ کر یاد کرتے تھے۔

اس رات اس کھنڈر نما عمارت کے تہہ خانے میں عجیب منظر تھا۔ تہہ خانے کے وسط میں ایک چبوترا بنا ہوا تھا۔ یہ چبوترا یقیناً" اصل تہہ خانے میں موجود نہیں تھا۔ یہ بعد میں بنایا گیا تھا لیکن یہ بھی نیا نہیں رہا تھا۔ یہ تو تہہ خانے سے بھی زیادہ پرانا بلکہ صدیوں پرانا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی ساخت ایک طرح کی قربان گاہ کی سی تھی۔ اس پر جا بجا خون کی دھاریاں نظر آ رہی تھیں جو گزرے ہوئے برسوں کے دوران میں سیاہ پڑ چکی تھیں۔

اس قربان گاہ پر شاید جانور اور انسان دونوں کی ہی بھینٹ چڑھائی جاتی رہی تھی کیونکہ ایک طرف کچھ جانوروں اور دو تین انسانوں کے ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے اور انجر پنجر اس طرح اوپر نیچے پڑے تھے کہ سب کی شکستہ ہڈیاں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ تہہ خانے میں مشعلیں روشن تھیں جن کی روشنی اسے صحیح طور پر منور کرنے کے لئے ناکافی تھی۔ مشعلوں کی موجودگی کی وجہ سے یہ جگہ اور بھی قدیم دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی لرزتی ہوئی روشنی شکستہ انسانی اور حیوانی ڈھانچوں پر پڑتی تو یوں لگتا جیسے بہت ہی بھیانک بلائیں ایک دوسرے سے الجھتی ہوئی ایک عجیب و غریب رقص پیش کر رہی ہوں۔ شاید موت کا رقص.....! تہہ خانے کی نیچی چھت مشعلوں کے دھوئیں سے سیاہ ہو چکی تھی۔

اس وقت بھی جیسے وہاں کوئی خاص رسم انجام دی جا رہی تھی۔ کئی افراد وہاں موجود تھے اور وہ سب صرف مختصر سے تہہ بند باندھے ہوئے تھے۔ ان کے بدن پر قمیضیں نہیں تھیں اور عجیب بات یہ تھی کہ وہ سب کے سب ہی گہرے سانولے تھے۔ ان کے سانولے جسموں پر کوئی بہت گاڑھی قسم کی چکنائی ملی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ان کے جسم مشعلوں کی تھرتھراتی روشنی میں چمک رہے تھے۔ وہ ایک صف میں کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر گہری سنجیدگی تھی مگر ان کی سرخ سرخ انگارہ سی، خمارزدہ آنکھیں کچھ یوں ظاہر کر رہی تھیں جیسے اس سنجیدگی میں خمار کی بھی آمیزش تھی۔ کسی عجیب سی نشہ آور چیز نے شاید ان کے حواس کو شل کر دیا تھا۔ وہ جیسے انسان نہیں، قد آدم پتلیاں تھیں۔

وہ پتھرائی ہوئی سی آنکھوں سے ایک ٹک قربان گاہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ وہ انہیں ایک ساتھ ہوا میں اوپر لے جاتے پھر نیچے لاتے۔ انداز کچھ



ایسا تھا جیسے وہ کسی نادیدہ چیز کو بار بار چیر رہے ہوں۔ زیر لب وہ کچھ بڑبڑا بھی رہے تھے۔ شاید کوئی عمل پڑھ رہے تھے۔ ان میں سے دو آدمیوں کے گلے میں ڈھول بھی پڑے ہوئے تھے۔

اچانک دو اور آدمی ایک طرف سے نمودار ہوئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے انہیں دیواروں نے اگلا تھا کیونکہ جس طرف سے وہ آئے تھے، ادھر کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان میں سے ایک لمبا سا سفید چغہ پہنے ہوئے تھا جبکہ دوسرے نے بھڑکیلے رنگ کا عجیب و غریب سا لباس پہن رکھا تھا جو مشعلوں کی روشنی میں آگ کی طرح بھڑکتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے شعلوں سے بنا ہوا لباس پہن رکھا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں پر ایک مخصوص قسم کی چارپائی اٹھائی ہوئی تھی۔ یہ وہ چارپائی تھی جس میں میت قبرستان تک لے جائی جاتی تھی۔ یہ چارپائی صرف ایک ڈیڑھ بالشت لمبی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اصل چارپائی کی نقل میں کھلونا تیار کیا گیا تھا۔ وہ اسے دونوں ہاتھوں پر ٹکائے، بازو آگے پھیلائے، اکڑی ہوئی سی حالت میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا قربان گاہ تک پہنچا۔

دوسری طرف سے سفید چغے والا بھی اسی انداز میں چلتا ہوا قربانی کے چبوترے تک پہنچا۔ صف بستہ کھڑے ہوئے نیم برہنہ سانولے آدمیوں میں سے وہ دو آگے بڑھے جن کے گلے میں ڈھول تھے۔ انہوں نے دھیرے دھیرے ڈھول بجانا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ ان کے ہاتھوں کی حرکت تیز ہوتی گئی لیکن ڈھول کی آواز زیادہ بلند نہیں ہوئی۔ وہ ایک عجیب دھن تھی۔ اس میں بڑا زبردست ردھم تھا اور وہ گویا سننے والوں پر ایک سحر سا طاری کر دینے کی خاصیت رکھتی تھی۔

عجیب بات یہ تھی کہ ڈھول تہہ خانے میں ہی بج رہے تھے۔ پھر بھی کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی آواز کہیں دور سے آ رہی تھی۔ صف میں کھڑے ہوئے باقی لوگوں نے خنجروں کو اوپر نیچے ہوا میں حرکت دینا بند کر دیا تھا اور اپنی جگہ کھڑے کھڑے یوں آگے پیچھے دھیرے دھیرے جھولنے لگے تھے جیسے ان پر جادو سا ہو گیا ہو۔ ان کی آنکھیں یوں بند ہوئی جا رہی تھیں جیسے وہ انجانی لذتوں کی دنیا میں سفر کر رہے ہوں۔ خود ڈھول بجانے والوں کی بھی یہی کیفیت تھی لیکن ان کے ہاتھ مشینی انداز میں حرکت کر رہے تھے۔

مشعلوں میں شاید کسی قسم کی چربی جل رہی تھی۔ تہہ کانے میں اس کی بو کے علاوہ بھی نہ جانے کس کس چیز کی بدبو پھیلی ہوئی تھی لیکن وہاں موجود سب لوگوں کے چہروں پر ایسا خمار، ایسی طمانیت تھی جیسے وہ دلفریب خوشبوؤں سے لدے جھونکوں میں ہلکورے لے رہے ہوں۔ کچھ دیر تک ڈھول اسی طرح بجتے رہے حتیٰ کہ دھن گویا اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ تہہ خانے میں موجود تمام افراد کی سانسیں اب اتنی تیز چل رہی تھیں کہ باہر سے سننے

والے کو شاید یہ محسوس ہوتا کہ وہاں ان گنت اژدھے پھنکار رہے تھے۔

شعلوں جیسے لبادوں والے نے میت کی ننھی سی چارپائی قربانی کے چبوترے پر رکھ دی اور اس کا محرابی ڈھکنا ہٹا دیا۔ پھر اس نے اندر پھیلا ہوا سبز ریشمی کپڑا بھی ہٹا دیا۔ چارپائی پر ایک گڑیا چھوٹی سی مردہ عورت کی طرح لیٹی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی مردوں کی طرح بند تھیں۔ آتشیں لباس والا شخص سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اب سفید چغے والے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی گویا شعلے اگل رہی تھیں۔

سفید چغے والے نے جھک کر میت کی چارپائی سے گڑیا کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دھیمے سروں میں کچھ گا رہا تھا۔ ڈھول کی آواز بتدریج کم ہونے لگی اور آخر کار بالکل بند ہو گئی۔ ڈھول بجانے والوں نے ہاتھ روک لئے تھے۔ تب سفید چغے والے کی زیر لب آواز بھی کسی حد تک سنائی دینے لگی۔

"کاوانو سترا ..... کاوا الیسترا ..... کاوانو سترا ....." وہ کسی اجنبی زبان کے الفاظ دہرا رہا تھا مگر اس کی اس تکرار میں بھی بڑا ردھم تھا۔ وہ ان الفاظ کو جیسے کچھ خاص سروں میں دہرا رہا تھا۔

اس وقت وہاں سے تین میل دور نشاط نگر کے ایک مکان میں ایک نوجوان اور خوبصورت دوشیزہ محو خواب تھی۔ وہ اچانک سوتے میں بڑبڑانے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کی آواز بلند ہو گئی۔ وہ گویا خواب میں گنگنا رہی تھی۔ "کاوانو سترا ..... کاوا الیسترا ..... کاوانو سترا ....."

ادھر تہہ خانے میں سفید چغے والے شخص نے اپنے چغے کی جیب سے شیشے کی ایک ٹیوب نکالی۔ یہ سائنسی تجربہ گاہوں میں استعمال ہونے والی ایک شفاف اور نفیس ٹیسٹ ٹیوب تھی۔ اس میں گہرا سرخ سیال بھرا ہوا تھا۔ یہ خون معلوم ہوتا تھا لیکن اس شخص نے اسے مشعلوں کے سامنے بلند کیا تو لہراتی روشنی میں یہ خون دہکتا ہوا سا دکھائی دینے لگا۔ ٹیسٹ ٹیوب میں گویا ایک آتشیں سیال بھرا ہوا تھا۔ یہ پگھلی ہوئی آگ گویا ٹیوب سے چھلک پڑنے کو بے تاب تھی۔ اس میں ابال سا آ رہا تھا اور گماں گزرتا تھا کہ ٹیوب کے سے بار بار شعلہ سا باہر کو لپک رہا تھا۔

اب ہر طرف موت کا سا سکوت چھا گیا۔ ڈھول کی آواز، منتروں کی سی بڑبڑاہٹ، سانسوں کی پھنکار ..... سب کچھ معدوم ہو گیا۔ بس ایک گہری خاموشی رہ گئی۔ سفید والے نے اس ٹیوب کو آسمان کی طرف بلند کیا اور پھر دھیرے دھیرے نیچے لا کر ہونٹوں سے لگایا۔ ایک گھونٹ میں اس نے ٹیوب خالی کر دی اور سارا آتشیں سیال اپنے منہ میں لیکن اس نے اسے حلق سے نیچے نہیں اتارا۔ گڑیا کو وہ پہلے ہی واپس میت کی چارپائی



چکا تھا۔ اب اس نے منہ میں بھرا ہوا سرخ سیال اس گڑیا پر اگل دیا۔

دور نشاط نگر میں بے چینی سے کروٹیں بدلتی نوخیز دوشیزہ نے ایک دلخراش چیخ ماری اور اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے گھر والے بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ وہ اچھی بھلی سوئی تھی لیکن اب کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے بدن کا سارا لہو کسی نے نچوڑ لیا تھا۔ آج دن میں کسی دروازے میں ابھری ہوئی کیل سے رگڑ لگنے کی وجہ سے اس کے بازو پر ایک گہری خراش آ گئی تھی جس پر اس نے ایک معمولی سی دوا لگا کر پٹی باندھ لی تھی اور خون رک گیا تھا ..... لیکن اب حیرت انگیز طور پر اسی خراش سے اتنا خون رس رہا تھا کہ نہ صرف پٹی تر ہو گئی تھی بلکہ بازو سے ٹپ ٹپ خون گرنے لگا تھا۔ لڑکی کا بستر تر ہوا جا رہا تھا۔ گھر والے یہی سمجھے کہ اس کی ساری گھبراہٹ اس زخم سے خون بہنے کی وجہ سے تھی۔ وہ اسے روکنے کی تدبیریں کرنے لگے۔

○

سرجن جمال عثمانی کا شمار کراچی کے مشہور سرجنوں میں ہوتا تھا۔ ابتداء میں کئی سال تک وہ جنرل سرجن رہے تھے۔ وہ مختلف نوعیت کے آپریشنوں میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ بعد میں انہوں نے نیورو سرجری میں سپیشلائز کر لیا تھا اور اپنے آپ کو اسی مخصوص میدان تک محدود کر لیا تھا۔ طبی حلقوں میں ان کا بڑا مقام تھا۔ ہر جگہ انہیں مشورے کے لئے بلایا جاتا تھا۔

اب تو انہوں نے ایک معروف شاہراہ پر اپنا چھوٹا سا ذاتی ہسپتال قائم کر لیا تھا۔ اسی میں ان کا کلینک تھا۔ معائنہ کرانے اور مشورہ لینے والے مریضوں کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ انہیں سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ مریضوں کو ملاقات کے لئے کئی کئی دن بعد کا اپوائنٹمنٹ ملتا تھا۔ سرجری میں بھی یہ عالم تھا کہ مریض کئی دن پہلے ہسپتال میں داخل ہوتے تھے تب جا کر آپریشن کی نوبت آتی تھی۔ صرف ہنگامی نوعیت کے آپریشن وہ جلدی کرتے تھے۔

وہ اعصاب کے ماہر تھے۔ اس نازک اور پرپیچ دنیا کے اسرار و رموز سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مصروفیات کی زیادتی خود ان کے اپنے اعصاب کو بری طرح متاثر کر رہی تھی۔ ان کی زندگی میں تفریح اور فرصت کا کوئی تصور نہیں رہا تھا۔ برسوں سے ان کی مصروفیت کا یہی عالم تھا اور انہیں معلوم تھا کہ ان کے مضبوط اعصاب بھی اب زیادہ عرصے ان معمولات کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔

چنانچہ پچھلے سال سے ہی انہوں نے پروگرام بنا رکھا تھا کہ آئندہ موسم گرما میں وہ شمالی علاقہ جات کے طویل تفریحی دورے پر جائیں گے۔ وہ کم از کم ایک ماہ خوبصورت

پہاڑی علاقوں میں گزاریں گے اور اس دوران میں کام کے بارے میں سوچیں گے بھی نہیں' وہ چاہتے تو یورپ یا سوئزرلینڈ بھی جا سکتے تھے لیکن وہاں کے تمام قابل ذکر مقامات ان کے دیکھے ہوئے تھے۔ شمالی علاقہ جات انہوں نے بچپن میں دیکھے تھے اور تب سے یہ عالم تھا کہ ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔

ایک زمانے میں ان کی مصروفیات انہیں دنیا بھر میں لئے پھری تھیں لیکن اپنے ہی ملک کی خوبصورت اور قدرتی حسن سے مالا مال وادیوں کی سیر کی نوبت نہیں آسکی تھی لیکن انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس سال وہ ضرور جائیں گے اور اپنی اس تشنہ آرزو کی تکمیل کر کے رہیں گے۔ ان کا اپنی اکلوتی بیٹی ..... بلکہ اکلوتی اولاد سارہ کو ساتھ لے جانے کا پروگرام تھا اور وہ بھی بڑے اشتیاق سے اس پروگرام پر عمل درآمد کا انتظار کر رہی تھی۔

بڑی محنت سے انہوں نے اپنے دو اسسٹنٹ کو اس قابل بنایا تھا کہ وہ ان کی عدم موجودگی میں ہسپتال کو بھی عمدگی سے چلا سکتے تھے اور ضروری آپریشن بھی کر سکتے تھے۔ کوالیفائیڈ تو وہ تھے ہی ..... لیکن سرجن جمال نے اپنی خصوصی توجہ کے ساتھ اپنا تجربہ بھی ان تک منتقل کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ نیورو سرجری کی دنیا میں اہمیت انہی کے نام کی تھی۔ مریضوں کا اعتقاد انہی کے نام پر تھا اور وہ انہی سے آپریشن کرا کے مطمئن ہوتے تھے۔ مجبوری یا اشد ضرورت کے تحت وہ کسی اور سرجن سے آپریشن کراتے تھے۔

ہر قسم کے انتظامات اور اٹل ارادے کے باوجود ہوا یہ تھا کہ موسم گرما تقریباً" گزر ہی چلا تھا اور جمال صاحب ابھی تک تفریحی سفر پر روانہ نہیں ہو پائے تھے۔ تاہم اب یہ امکانات روشن نظر آنے لگے تھے کہ دو تین روز میں وہ رخصت ہو جائیں گے۔ انہوں نے تصور ہی تصور میں خود کو کسی پہاڑی ندی میں مچھلیاں پکڑتے' کسی چشمے میں نہاتے اور کسی بلند و بالا سبزہ زار میں جوگنگ کرتے دیکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ ایک بڑے شہر کی نہایت مصروف اور اعصاب شکن زندگی میں محض اس تصور سے بھی رگ و پے میں تازگی کی لہر دوڑتی محسوس ہوتی تھی۔

سرجن جمال عثمانی کو نہیں معلوم تھا کہ اس سال بھی ان کا یہ خواب تشنہ تعبیر رہ جائے گا۔ ہوا یہ کہ اس روز سارہ ان کی سٹڈی میں آئی تو اس کے ہاتھ میں اس روز کی ڈاک تھی۔

جمال صاحب رنڈوے تھے اور سارہ کو دیکھ کر انہیں اکثر اپنی مرحومہ بیوی یاد آ جاتی تھی۔ اسے ماں کی خوبصورتی ورثے میں ملی تھی۔ وہ بھی میڈیکل کی فائنل ایئر کی طالبہ تھی اور باپ کی طرح ایک معروف اور کامیاب سرجن بننے کی تمنا رکھتی تھی۔ ڈیفنس کے اس خوبصورت بنگلے میں دو ملازماؤں اور تین ملازموں کے ساتھ دونوں باپ بیٹی رہتے تھے۔ جمال



صاحب کی بیوی کا جب انتقال ہوا تو ان کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں تھی لیکن سارہ کی خاطر انہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی اور پھر بعد میں تو وہ مصروفیات کے ریلے میں اس طرح بہہ گئے کہ یہ خیال ہی ان کے ذہن سے نکل گیا۔ باپ بیٹی دونوں ہی کو ایک دوسرے سے بے اندازہ محبت تھی اور اب سارہ ملازموں کی موجودگی کے باوجود اس طرح جمال صاحب کی ضروریات اور آرام کا خیال رکھتی تھی جیسے وہ ایک بزرگ تھی اور جمال صاحب ایک ناسمجھ بچے .....! حتیٰ کہ کبھی کبھی وہ پیار بھرے انداز میں جمال صاحب کو ڈانٹتی ڈپٹتی بھی تھی۔

جمال صاحب اس کی اس پیار بھری ڈانٹ ڈپٹ سے بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ سارہ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ان کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں اضافہ کرتا تھا۔ اس کے سامنے بچہ بننے میں انہیں بڑا لطف آتا تھا۔ وہ اس کی کوئی بات ٹالتے نہیں تھے۔ وہ ان کی دوست بھی تھی' مشیر بھی تھی اور گویا ان کی سرپرست و نگراں بھی تھی۔ جمال صاحب کبھی کبھی سوچتے تھے کہ ایک نہ ایک روز تو سارہ کو اپنے گھر جانا ہی تھا۔ پھر وہ زندگی کیسے گزاریں گے؟

قسمت نے شریک حیات کو تو ان سے پہلے ہی جدا کر دیا تھا۔ اب بیٹی کے دم سے زندگی میں رونق اور کشش تھی لیکن اسے بھی ایک روز پرائی ہو جانا تھا جبکہ انہیں گویا اس کے سہارے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ ان کی غیر رسمی سیکرٹری اور حتیٰ کہ کبھی کبھی تو ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دیتی تھی۔ اس روز سارہ ڈاک لے کر آئی تو ایک خط کو بڑے غور سے دیکھتی آ رہی تھی۔

"کیا خاص بات ہے اس خط میں ..... جو اسے اتنے غور سے دیکھا جا رہا ہے؟" جمال صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ وہ اپنی ڈاک میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتے تھے۔

"یہ نشاط نگر سے آیا ہے۔" سارہ نے لفافہ چٹکی میں پکڑ کر لہراتے ہوئے کہا۔ وہ ڈاک کا ایک عام سا لفافہ تھا۔

"نشاط نگر .....؟" جمال صاحب نے آنکھیں سکیڑیں۔ "یہ کہاں ہے؟ کیا اسی کرہ ارض پر واقع ہے؟"

"اب اتنے انجان مت بنئے ڈیڈی!" سارہ مصنوعی خفگی سے بولی۔ "آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ نشاط نگر نہ صرف اسی کرہ ارض ..... بلکہ اسی ملک ..... اسی صوبے میں ہے۔ یہاں سے بہت زیادہ دور بھی نہیں ہے۔"

"چلو مان لیا کہ شاید میں نشاط نگر کے محل وقوع سے واقف ہوں ..... لیکن میں تو وہاں کسی کو نہیں جانتا۔ وہاں سے تو آج تک میرے پاس کوئی مریض بھی نہیں آیا۔ یہ مجھے خط کس نے لکھ ڈالا؟" وہ گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ جان

بوجھ کر انجان بننے کی کوئی اداکاری کر رہے تھے۔ سارہ بھی اس بات کو سمجھ رہی تھی اور مصنوعی خفگی سے انہیں گھور رہی تھی۔ جمال صاحب اس کے اس طرح گھورنے پر دل ہی دل میں محظوظ ہو رہے تھے۔

سارہ کے یاقوتی ہونٹ بھنچ گئے تھے اور وہ اس طرح سر ہلاتے ہوئے اپنے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی جیسے بہ زبان خموشی کہہ رہی ہو' میں آپ کو خوب سمجھتی ہوں۔

آخر جمال صاحب نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے خط لے کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس پر بھیجنے والے کا نام ڈاکٹر تحسین اور پتہ نشاط نگر کا تھا۔ جمال صاحب ڈاکٹر تحسین کو نہیں بھول سکتے تھے اور انہیں یہ بھی یاد تھا کہ دو سال پہلے اس نے جا کر نشاط نگر میں رہائش اختیار کر لی تھی اور وہیں پریکٹس کرنے لگا تھا۔

ڈاکٹر تحسین ایک ہونہار نوجوان ڈاکٹر تھا۔ جمال صاحب سے اس کا کئی طرح سے تعلق بنتا تھا۔ یوں تو وہ ایک عام ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھا۔ جنرل فزیشن تھا۔ اس کے اور جمال صاحب کے میدان عمل سے مختلف تھے لیکن وہ جمال صاحب کے ایک مرحوم دوست کا بیٹا تھا۔ اس ناطے جمال صاحب نے اسے ہمیشہ محبت اور اہمیت دی تھی لیکن وہ ایک وضع دار نوجوان تھا۔ اس نے کبھی جمال صاحب کے مقام و مرتبے سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

زندگی کے بارے میں اس کے اپنے کچھ نظریات اور خیالات تھے۔ ان کی وجہ سے جمال صاحب اس کی اور بھی عزت کرتے تھے۔ وہ نئے دور کے نوجوانوں سے بہت مختلف تھا۔ دنیا داری اور لالچ اس میں نام کو نہیں تھا اور اپنے نظریات کو وہ محض باتوں سے نہیں عمل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جمال صاحب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ انٹر پری میڈیکل میں اچھے نمبر لینے کے بعد لڑکے اور لڑکیاں یہی دعویٰ کرتے تھے کہ وہ دکھی انسانیت کی خدمت کریں گے لیکن ہوتا عموماً" یہی تھا کہ ان کے ڈاکٹر بننے کے چند برس بعد دکھی انسانیت ان کے ہسپتالوں اور کلینکوں کے باہر کراہتی رہتی تھی اور وہ دونوں ہاتھوں سے روپیہ سمیٹنے میں لگے رہتے تھے۔ مگر ڈاکٹر تحسین نے اپنے عمل سے ثابت کیا تھا کہ وہ اپنے نظریات سے کتنا مخلص تھا۔ پہلے وہ کراچی میں رہتا تھا۔ یہیں تعلیم حاصل کی تھی اور یہیں کلینک بھی شروع کیا تھا مگر کچھ عرصے بعد اس کے کلینک پر گاؤں دیہات کے کچھ ایسے پریشان حال مریض آئے کہ اس نے خود کسی دیہی علاقے میں جا کر پریکٹس کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جن ڈاکٹروں کا تعلق دیہات سے تھا وہ بھی وہاں جا کر پریکٹس کرنے سے کتراتے تھے مگر تحسین کا کہنا تھا کہ وہاں کے لوگوں کی حالت قابل رحم تھی اور انہیں طبی سہولیات کی اشد ضرورت تھی۔ اس کی اپنی بیوی آسیہ نے بھی گاؤں جانے کی مخالفت کی تھی لیکن آخر



اسے شوہر کا ساتھ دینا پڑا تھا۔

جمال صاحب اور سارہ سے ڈاکٹر تحسین کا ایک تعلق یہ بھی بنتا تھا کہ اس کی بیوی سارہ کے ساتھ انٹر تک پڑھ چکی تھی۔ وہ میڈیکل میں نہیں جا سکی تھی۔ اس نے بی ایس سی کیا تھا اور اس کے فوراً" بعد اس کی شادی تحسین سے ہو گئی تھی۔ وہ بہرحال سارہ کی اچھی سہیلی رہی تھی۔ ان میاں بیوی نے مکمل طور پر دیہات میں رچ بس کر جمال صاحب کے خیال میں ایک طرح کی ایثار پسندی کا ثبوت دیا تھا۔ اس وجہ سے بھی جمال صاحب کی نظر میں ان کی قدر اور عزت بڑھ گئی تھی۔ تاہم تحسین نے ایک عرصے سے انہیں خط نہیں لکھا تھا۔ شاید مصروفیات نے اجازت نہیں دی تھی۔ آج قطعی غیر متوقع طور پر اس کا خط آیا تھا۔

جمال صاحب نے جب خط کھول کر پڑھنا شروع کیا تو ان کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوتی چلی گئیں اور ان کی خوش مزاجی رخصت ہوتی دکھائی دینے لگی۔

○

سرجن جمال عثمانی نے وہ خط ایک بار نہیں کئی بار پڑھا لیکن وہ اس کا صحیح مفہو
سمجھنے سے قاصر رہے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ خط ان کے ہونہار شاگرد تحسین
ہی لکھا ہوا تھا۔ تحسین یوں تو میڈیکل کا سٹوڈنٹ رہا تھا لیکن اپنے تعلیمی دور میں اس
تحریر و تقریر کے میدان میں بھی اچھے خاصے جوہر دکھائے تھے۔ وہ جب کچھ لکھنے بیٹھتا تھا ا
ڈھنگ سے لکھتا تھا۔ اس کی اردو اور انگریزی کی تحریر بڑی جامع، سلیس اور آسانی سے
سمجھ میں آنے والی ہوتی تھی لیکن یہ خط تو کسی انتہائی پریشانی، منتشر الخیال اور واجبی سے
پڑھے لکھے آدمی کا معلوم ہو رہا تھا جس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنا مفہوم کیسے بیان
کرے۔

"کیا گاؤں جا کر تحسین کی صلاحیتوں کو زنگ لگ گیا تھا؟" جمال صاحب نے دل ہی
دل میں اپنے آپ سے کہا۔

سارہ اس دوران خاموشی سے ان کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ وہ گویا کچھ
سوچے بغیر ان کی کیفیات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن شاید وہ خط کے
مندرجات اور ان کی اندرونی کیفیت کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کرنے سے قاصر رہی
اور آخر کار پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ "بات کیا ہے ڈیڈی؟ کیا لکھا ہے اس خط میں؟"

"میں خود بھی سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" جمال صاحب نے مبہم لہجے میں جواب
دیا۔ تحسین جب کراچی میں تھا تو ہاؤس جاب کے دوران میں اس کی ڈیوٹی دوسرے ڈاکٹروں
کے ساتھ لگتی رہی تھی لیکن زیادہ سے زیادہ سیکھنے کی غرض سے وہ کسی نہ کسی طرح وقت
نکال کر جمال صاحب کے پاس آ جاتا تھا اور جمال صاحب نے اپنے ایک مرحوم دوست کا بیٹا
ہونے کے ناطے اس کی ہر ممکن مدد کی تھی۔ وہ جتنا بھی علم اس کے ذہن میں منتقل کر سکتے
تھے، انہوں نے کیا تھا اور اسی دوران میں انہوں نے اس کے بارے میں یہ رائے قائم کی
تھی کہ وہ ایک ذہین اور باصلاحیت نوجوان تھا۔ زندگی کے بارے میں اس کے نظریات نے
بھی جمال صاحب کو متاثر کیا تھا۔

یہ سب باتیں یاد آنے کی وجہ سے جمال صاحب کو تحسین کا خط اور بھی عجیب لگ
رہا تھا۔ سارہ بغور ان کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "آپ کچھ پریشان سے دکھائی



دینے لگے ہیں۔ نشاط نگر میں خیریت تو ہے؟"

"خیریت ....؟" جمال صاحب بڑبڑائے۔ "مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے ....."

انہوں نے بات ادھوری چھوڑی اور گویا سارہ کی موجودگی کو فراموش کرتے ہوئے
ایک بار پھر خط پر نظر دوڑانی شروع کر دی۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ خط نہیں پڑھ رہے تھے
بلکہ تحسین خود سامنے کھڑا بے ربط سے الفاظ میں ان سے ہمدردی، مدد اور رحم کی
درخواست کر رہا تھا۔ اس کے ایک ایک لفظ کی آمد سے خوف پھوٹ رہا تھا۔ خط کیا، گویا
ایک مایوس و نامراد انسان کی آخری اپیل تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نوجوان اور لائق
ڈاکٹر نے ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد جمال صاحب کے نام یہ بے ربط اور بے
ترتیب سا خط گھسیٹا تھا۔ خط لکھتے وقت شاید اس کے خیالات بے حد منتشر تھے اور ذہن
اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ خط تو اس نے خاصا لمبا چوڑا لکھا تھا لیکن اس کا خلاصہ
درحقیقت یہی تھا کہ اس کا گاؤں ایک پراسرار ہولناک بیماری کی لپیٹ میں تھا اور لوگ
مکھیوں کی طرح مر رہے تھے۔ ایک قابل ڈاکٹر ہونے کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ
رہا تھا۔

"لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں .....!" جمال صاحب نے بے یقینی کے سے عالم
میں یہ الفاظ دہرائے۔ انہیں اس قسم کی مبالغہ آمیز باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ وہ حقیقت
پسند اور عملیت پسند قسم کے آدمی تھے۔ جہاں جذبات کی ضرورت ہوتی تھی وہاں ان میں
جذباتیت بھی امڈ آتی تھی لیکن بیشتر معاملات میں وہ بے حد پریکٹیکل ہی دکھائی دیتے تھے۔
جب انہیں کسی مسئلے کے بارے میں بتایا جاتا تھا تو وہ ٹھوس انداز میں اعداد و شمار وغیرہ کے
ساتھ بات سننا پسند کرتے تھے۔ افسانوی قسم کی تشبیہات انہیں زیادہ متاثر نہیں کرتی
تھیں۔

بہرحال وہ چونکہ تحسین کا خط تھا اس لئے وہ اسے خصوصی توجہ اور ہمدردی سے
پڑھنے پر مجبور تھے۔ خط میں بار بار تحسین نے ان سے مدد کی درخواست کی تھی اور مشورہ
طلب کیا تھا لیکن اس بات کی کوئی وضاحت نہیں تھی کہ آخر وہ ان سے کس نوعیت کی مدد
یا مشورے کا طلب گار تھا۔ جمال صاحب کو سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ
مکمل طور پر اس ایک مایوس انسان کا خط معلوم ہوتا تھا جسے دوسروں کے مرنے کا غم تو
لاحق تھا ہی ..... لیکن شاید وہ خود بھی اپنی زندگی کی طرف سے بے آس ہو چکا تھا۔ آخر
میں اس نے ان سے التجا کی تھی کہ وہ اپنی ساری مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر ایک بار
نشاط نگر ضرور آ جائیں۔ یہ ان کا اپنے مرحوم دوست کے بیٹے پر ہی نہیں، انسانیت پر اور
بنی نوع انسان پر بھی ایک بہت بڑا احسان ہو گا۔ یہ درخواست نہیں گویا ایک جاں بہ لب
مریض کی آخری اور مایوسانہ پکار تھی اور وہ موت کی دہلیز پر اپنے آخری مسیحا کا منتظر تھا۔

"ڈیڈی! آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں ..... آخر بات کیا ہے؟" سارہ نے کچھ پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

جمال صاحب نے خط کے کچھ حصے سارہ کو پڑھ کر سنائے لکھائی بھی اس قدر خراب تھی کہ جمال صاحب کو یقین کرنا مشکل محسوس ہو رہا تھا کہ وہ تحسین ہی کا خط تھا۔ اٹک اٹک کر کچھ اقتباسات پڑھنے کے بعد آخر انہوں نے خط سارہ کو تھما دیا اور وہ بے تابی سے اسے پڑھنے لگی۔ جتنی دیر وہ خط پڑھتی رہی اتنی دیر جمال صاحب نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کسی گہرے خیال میں ڈوبے رہے۔

خط بغور پڑھنے کے بعد سارہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "ڈیڈی! میرا خیال ہے ڈاکٹر تحسین خود بھی کافی بیمار ہے ..... اور شاید اپنی بیماری کو وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر ہے ....."

"ہاں ..... محسوس تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح اس کی مدد کر سکتا ہوں۔" جمال صاحب سرہلاتے ہوئے بولے۔

"ظاہر ہے ہم وہاں جا کر ہی اس کی کچھ مدد کر سکتے ہیں ....." سارہ کی گہری سنجیدگی برقرار تھی۔ پہلے ہمیں مسئلے کی نوعیت کو صحیح طور پر سمجھنا ہو گا اور اس کے لئے وہاں جانا ضروری ہے۔ اس نے آپ کو بلایا ہے ..... اور یہ ایک مایوس انسان کی پکار معلوم ہوتی ہے۔ اس سے ہمارا جو تعلق بنتا ہے اس کے پیش نظر بھی اس پکار پر لبیک کہنا ضروری ہے اور ہمارے پیشے اور انسانیت کا تقاضا بھی یہی ہے۔"

سارہ جب بھی جمال صاحب کی ذات سے تعلق رکھنے والے کسی اہم معاملے کی بات کرتی تھی تو خود کو بھی ان کے ساتھ شامل کر لیتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو جمال صاحب سے الگ شمار نہیں کرتی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ نشاط نگر چلیں؟" جمال صاحب آنکھیں قدرے پھیلاتے ہوئے بولے۔

"جی ہاں ڈیڈی! اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟" سارہ اطمینان سے بولی۔ "آپ تو یوں حیران ہو رہے ہیں جیسے میں نے چاند پر چلنے کی بات کر دی ہے۔ نشاط نگر اتنا دور بھی نہیں ہے۔"

"مسئلہ دور اور نزدیک کا نہیں ہے ..... میرا مطلب ہے وہ ایک گاؤں ہے ..... اور کا سارا علاقہ دیہی ہے۔" جمال صاحب کچھ الجھن زدہ سے لہجے میں بولے۔

"تو پھر کیا ہوا؟" سارہ بدستور اطمینان سے بولی۔ "ہمارے وطن کا بیشتر علاقہ ہی دیہی ہے اور ہمیں اس سے کسی نہ کسی بہانے مانوس ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔ بے چارے تحسین کو بھی تو دیکھیں جس نے اپنی اور اپنی بیوی کی زندگی ہی دیہی علاقے کے لئے وقف کر دی ہے۔"



"لیکن ہمارا وہ شمالی علاقہ جات کی سیر کا پروگرام .....؟" جمال صاحب ذرا پریشانی سے بولے۔ ان کے ذہن میں ان خوبصورت علاقوں اور وہاں کے دلفریب نظاروں کی یاد عود کر آئی۔

"ڈیڈی! وہ بھی زیادہ تر دیہی علاقے ہی ہیں۔ بس وہ ذرا زیادہ خوبصورت ہیں ....." سارہ بڑی رسان سے گویا کسی بچے کو سمجھاتے ہوئے بولی۔ "ہم اس سے ذرا کم خوبصورت مگر زیادہ قریبی علاقے میں چلے جائیں گے۔ یہاں جانے کا کوئی مقصد بھی ہو گا۔ سیر سپاٹا انسانیت کی خدمت سے زیادہ اہم تو نہیں ہے۔ آپ خود ہی بتایئے ..... بھلا پہاڑی علاقوں کی سیر کے لئے ہم کیوں جا رہے تھے؟"

"زندگی کی یکسانیت اور کام کی زیادتی سے فرار کے لئے ....." جمال صاحب سوچتے ہوئے بولے۔ "اپنے شکستہ اعصاب کو سکون دینے کے لئے۔"

"بالکل ٹھیک۔" سارہ نے گویا کسی ننھے بچے کو کسی مشکل سوال کا صحیح جواب دینے پر شاباش دی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "ہم یہی مقاصد ذہن میں رکھ کر نشاط نگر بھی جا سکتے ہیں۔ کسی کے کام آ کر اور کسی اچھے مقاصد کے لئے کام کر کے انسان کے شکستہ اعصاب کو سب سے زیادہ سکون ملتا ہے۔"

"اچھا بابا .....! ہم نشاط نگر ہی چلیں گے بحث میں تم سے بھلا کون جیت سکتا ہے۔ میرے خیال میں تو تمہیں ڈاکٹر کے بجائے وکیل بننا چاہئے تھا۔"

جمال صاحب نے یکدم ہی ہتھیار ڈال دیئے۔

"تھینک یو ڈیڈی! آپ نے تو بہت جلدی ہار مان لی۔" سارہ مسکرائی مگر دوسرے ہی لمحے اس کی متفکرانہ سی سنجیدگی لوٹ آئی۔ "تحسین سے زیادہ مجھے آسیہ کا خیال ستا رہا ہے۔ اگر تحسین اتنا پریشان ہے تو وہ بے چاری کتنی پریشان ہو گی۔ اس احمق ڈاکٹر نے اس کے بارے میں تو لکھا ہی نہیں کہ وہ کس حال میں ہے۔ آج کل تو گاؤں دیہاتوں میں بھی فون ہیں لیکن لگتا ہے ان بے چاروں کے ہاں فون بھی نہیں ہے ورنہ شاید نمبر لکھا ہوتا۔ ہم جانے سے پہلے ان سے فون پر بات ہی کر لیتے۔ حالات کا کچھ اندازہ ہی ہو جاتا۔"

"میرا خیال ہے اس کے ہاں فون ہوتا تو وہ خود ہی کر لیتا۔ پرانے دیہاتیوں کی طرح اس عام سے لفافے میں یوں ٹیڑھی میڑھی لکھائی میں یہ خط نہ گھسیٹتا۔" جمال صاحب سوچتے ہوئے بولے۔ "لگتا ہے کہ اس بے چارے کو جلدی میں جو کچھ بھی میسر آیا اس نے اسی پر الٹے سیدھے انداز میں اپنا حال لکھ بھیجا۔"

"بہرحال ..... اب ہمیں جلد از جلد نشاط نگر جانا ہے۔" گویا تصدیق چاہی۔

"ظاہر ہے بھئی ..... اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے!" جمال صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

اس روز ناشتے کی میز پر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے خالد نے بغور میمونہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا کہ ہمارے گھر میں کسی ننھے مہمان کی آمد کے آثار پیدا ہو گئے ہیں؟"

"میں آپ کو سرپرائز دینا چاہتی تھی ....." میمونہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "اور پھر ابھی تو بات کچھ اتنے زیادہ دن کی بھی نہیں ہوئی تھی ..... مگر یہ تو دیکھو کہ ہمارا ننھا مہمان تو ابھی سے آزاد فضاؤں میں نہ جانے کہاں کہاں اڑتا پھر رہا ہے۔ اس کا جب دل چاہتا ہے ہمیں نظر آ جاتا ہے اور جب چاہتا ہے غائب ہو جاتا ہے ....."

"اگر وہ کل شام اس طرح ظاہر نہ ہوا ہوتا اور تمہارا کچھ لہو پی کر غائب نہ ہو جاتا تو شاید اب بھی تم مجھے نہ بتاتیں کہ تم امید سے ہو۔" خالد کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

"میں نے کہا نا کہ میں آپ کو سرپرائز دینا چاہتی تھی ....." میمونہ نظریں جھکا کر اس کے خالی کپ میں مزید چائے انڈیلتے ہوئے بولی۔

"آئندہ براہ کرم تم مجھے کوئی سرپرائز دینے کا خیال دل میں نہ لانا۔" خالد ملامت سے بولا۔ "یہاں میرے اور تمہارے لئے ویسے ہی حیرتوں کی کچھ کمی نہیں ہے۔"

میمونہ نے کوئی جواب نہ دیا اور نظریں جھکائے انڈا سلائس چباتی رہی۔ خالد بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گزشتہ شام جب اس کے ساتھ بچے والا واقعہ پیش آیا تھا تو وہ سخت خوفزدہ دکھائی دی تھی۔ جس بچے کو اس نے دیکھا وہ نہ جانے واقعی.ان کا ہونے والا بچہ تھا یا کوئی اور مخلوق تھی۔ بہرحال وہ کچھ دیر اس کا خون بھی پی کر گیا تھا اس لئے اگر اس وقت اس کا چہرہ بالکل زرد دکھائی دے رہا تھا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

کل شام تو اس کی حالت دیکھ کر خالد کو تشویش ہونے لگی تھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اب وہ بالکل تازہ دم اور پہلے سے بہتر دکھائی دے رہی تھی اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ صحت مندی کی چمک تھی بلکہ یہ کہنا بے جا نہ تھا کہ اس کا چہرہ دمکتا سا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ صرف ایک رات کے آرام نے نہ صرف اس کی ساری کھوئی ہوئی توانائیاں لوٹا دی تھیں بلکہ اس کے وجود میں نئی توانائیاں انڈیل دی تھیں' اس کے چہرے پر ایک نئی تب و تاب بکھیر دی تھی۔

خالد سمجھنے سے قاصر تھا کہ صرف چند گھنٹوں میں یہ تب و تاب' یہ چمک دمک کہاں سے آ گئی تھی۔ وہ خود بھی کل شام کے پے در پے پراسرار واقعات کا سامنا کرنے کے بعد جب گھر پہنچا تو بری طرح تھکا ہوا تھا۔ اس کے جسم سے ساری طاقت جیسے کسی نے نچوڑ لی تھی لیکن صبح جب وہ سو کر اٹھا تو خود کو پہلے سے زیادہ تندرست و توانا اور چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ آج صبح شیو بناتے وقت اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا تھا۔ اس کے



چہرے پر بھی میمونہ ہی کی طرح ایک عجیب سی بشاشت' تازگی اور چمک دمک سی تھی۔

کہیں یہ سب مصنوعی تو نہیں تھا؟ کہیں اس کی نظریں دھوکہ تو نہیں کھا رہی تھیں؟ اپنی رگ و پے میں جو نئی توانائی محسوس کر رہا تھا وہ بھی محض اس کا گمان تو نہیں تھا؟ پھر اس نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ جب وہ خود کو اور میمونہ کو صحت مند' تازہ اور چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا تو اسے زیادہ فکر میں پڑنے اور تشویش میں مبتلا ہونے کی کیا ضرورت تھی؟

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد خالد بولا۔ "بہرحال تمہیں اپنا چیک اپ اور ٹیسٹ وغیرہ تو کرا لینا چاہئے تاکہ ایک تو اس بات کی تصدیق ہو جائے دوسرے اگر ڈاکٹر اس سلسلے میں کوئی مشورہ دینا چاہے تو وہ سن لیا جائے ....."

"اس پر عمل چاہے نہ کیا جائے ....." میمونہ شریر سے انداز میں مسکراتے ہوئے

"مشورہ اگر اچھا ہوا تو اس پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے۔" خالد بھی خوشدلی سے بولا۔ "اس وقت میرے پاس ایک گھنٹے کی گنجائش ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں کلینک تک لے جا سکتا ہوں ....."

کلینک سے اس کی مراد ایک اچھا خاصا چھوٹا سا ہسپتال تھا۔ اعلیٰ درجے کا وہ ہسپتال ...ن میں واقع تھا اور ان کی رہائش سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ ہسپتال ان کی فرم کے ...پر تھا اور وہ ہر چھوٹے بڑے مسئلے کے سلسلے میں وہیں جاتے تھے اس میں تقریباً ہر ... موجود تھا اور وہاں پر بیماری علاج اور ہر طرح کے ٹیسٹ کرائے جا سکتے تھے حتیٰ کہ ...لی امراض کا شعبہ بھی موجود تھا جس میں نفسیاتی اور ذہنی امراض میں مبتلا لوگوں کو ... بھی کیا جاتا تھا۔

خالد نے اس ہسپتال کی لابی میں جن ڈاکٹروں کے ناموں کی تختیاں آویزاں دیکھی ... ان میں سب کے ناموں کے سامنے بہت لمبی چوڑی ڈگریاں درج تھیں جن میں سے ...تر بیرون ملک کی تھیں۔ ہر مرض کا سپیشلسٹ وہاں موجود تھا۔ خالد اور میمونہ کو تو معمولی مسائل کے سلسلے میں دو چار مرتبہ وہاں جانا پڑا تھا لیکن پھر بھی ایک بات خالد ...ٹ کی تھی کہ وہاں شاذونادر ہی کوئی مریض دیکھنے میں آتا تھا۔

ہسپتال نہایت شاندار تھا۔ تمام سہولیات وہاں میسر تھیں۔ تمام ڈاکٹر اپنی ڈگریوں ...ت قابل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے اس کے باوجود وہاں کوئی خاص مصروفیت ...ظر نہیں آتی تھی۔ خالد نے وہاں مریضوں کی آمدورفت بھی نہیں دیکھی تھی۔ ہسپتال ...اف ستھری اور جھلملاتے فرش والی راہداریوں میں موت کا سا سناٹا چھایا رہتا تھا۔ کسی ... کسی وارڈ سے کوئی آواز نہیں ابھرتی تھی۔ بس کبھی کبھار کسی راہداری میں سفید

براق یونیفارم میں کوئی نرس یا اٹینڈنٹ ادھر ادھر آتا جاتا دکھائی دے جاتا تھا۔

خالد نے اکثر دیکھا تھا کہ نرسیں عموماً" کھٹ کھٹ کرتی ادھر سے ادھر جاتی تھیں۔ ان کی جوتیاں تھوڑی بہت آواز ضرور پیدا کرتی تھیں اور اس سے ان کی چال میں مستعدی کا تاثر بھی پیدا ہوتا تھا۔ ہسپتال کے سکون طلب ماحول میں بھی یہ آواز بری نہیں لگتی تھی لیکن اس ہسپتال میں خالد نے نرسوں کو ہمیشہ بے آواز قدموں سے چلتے دیکھا تھا۔ شاید ا ربڑ سول کے جوتے پہنتی تھیں کہ ان کے چلنے سے ذرا سی بھی آہٹ پیدا نہیں ہوتی تھی بلکہ خالد نے وہاں کبھی کسی کے بھی قدموں کی آواز نہیں سنی تھی۔ بعض اوقات کوئی م اٹینڈنٹ بھی اچانک ہی عقب سے نمودار ہو جاتا تھا اور اس کے منہ پر ویسا نقاب بھی ہو تھا جیسا آپریشن تھیٹر میں جانے والوں کے منہ پر ہوتا ہے۔ انہیں خاموشی سے اچانک نمودار ہوتے دیکھ کر انسان ایک لمحے کے لئے ڈر سا جاتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس ہسپتال میں کوئی عجیب سی بات ضرور تھی جس وجہ سے یہ اپنے معیار کے دوسرے ہسپتالوں سے بھی کچھ مختلف محسوس ہوتا تھا۔ اس ویرانی اور سکوت غیر معمولی تھا۔ خالد نے پہلے یہی سمجھا تھا کہ شاید بہت مہنگا اور مخصوص حلقوں کے لئے محدود ہونے کی وجہ سے وہاں بھیڑ بھاڑ یا زیادہ آمدورفت دکھائی دیتی تھی لیکن وہ خود بھی اپنی اس دلیل سے مطمئن نہیں ہو سکا تھا۔ اسے حیرت بھی ہو تھی کہ ہسپتال کے اخراجات کیسے چلتے تھے اور اگر وہاں مریضوں کی آمدورفت کا یہ عالم تو اس نے اپنا اعلیٰ معیار کیسے برقرار رکھا ہوا تھا؟

پھر اس نے خود کو یہی سمجھایا تھا کہ انہیں آم کھانے سے مطلب رکھنا چاہئے تھا گننے سے نہیں ..... ان کے لئے تو اہم بات یہی تھی کہ انہیں شاندار سہولیات میسر تھیں دن رات کے کسی بھی حصے میں اگر انہیں معمولی سا سردرد بھی محسوس ہوتا تو وہ اپنی سے کوئی گولی وغیرہ کھانے کے بجائے ریسپشن پر فون کر کے کہہ سکتے تھے کہ کامران گا لے کر گیٹ پر آ جائے۔ وہ نیچے جا کر گاڑی میں بیٹھ کر پانچ منٹ میں ہسپتال پہنچ سکتے اور ڈیوٹی پر موجود کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر سے باقاعدہ چیک اپ کروا کے' اس کے مشو سے' وہیں سے مفت دوا لے کر آ سکتے تھے۔ بوقت ضرورت فون کر کے وہ کسی ڈاکٹر کو گ بھی بلا سکتے تھے۔ یہ اتنی بڑی سہولیات تھیں کہ ان کے بارے میں سوچتے ہوئے خالد اور بات کے بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔

میمونہ نے ایک لمحے سوچا اور بولی۔ "ٹھیک ہے ..... میرا خیال ہے چیک اپ کر لینا چاہئے۔ میں ناشتہ کر کے آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں ....."

خالد نے گاڑی کے لئے نیچے ریسپشن پر فون کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ لفٹ کے نیچے جانے کے لئے گھر سے نکل رہے تھے تو لاؤنج سے گزرتے وقت خالد کی نظر ایک



پر پڑی تو وہ ٹھٹھک کر بولا۔ "وہ پینٹنگ کہاں گئی؟"

"کون سی پینٹنگ؟" میمونہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کل نسرین نے مجھے گھر میں لگانے کے لئے ایک پینٹنگ دی تھی۔ میں نے وہ یہاں دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی تھی کہ جب وقت ملے گا تو کہیں لگاؤں گا ....." اس نے اشارے سے بتایا کہ پینٹنگ کہاں کھڑی کی گئی تھی پھر پوچھا۔ "کیا تم نے اسے اٹھا کر کہیں اور رکھ دیا ہے؟"

"اٹھا کر رکھنا تو دور کی بات ..... میں نے اسے دیکھا بھی نہیں کہ وہ کس قسم کی پینٹنگ تھی ....." میمونہ نے جواب دیا۔ "کیا بہت اچھی تھی؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں ....." خالد تذبذب سے بولا۔ "شاید اسے اچھی بھی کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال ..... وہ کچھ عجیب ضرور تھی لیکن میں نے سوچا تھا کہ نسرین اتنے خلوص سے تحفے کے طور پر دے رہی ہے تو گھر میں لگا ہی لیں گے۔"

"اچھا ..... تو وہ اب آپ کو باہر سے تحفے بھی دینے لگی؟" میمونہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ "گھر میں آ کر مجھے نہیں دے سکتی تھی؟"

"خدا کی پناہ .....! تم نے تو وہی روایتی عورتوں والی باتیں شروع کر دیں ....." خالد آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

"میں عورتوں والی باتیں ہی کر سکتی ہوں کیونکہ میں ایک عورت ہی ہوں ....." میمونہ نے گویا اسے مطلع کیا۔

"لیکن مجھے تم سے ایسی باتوں کی امید نہیں تھی۔ ویسے بھی نسرین ہماری فرم کے سینئر پارٹنر کی بیوی ہے۔ اس سے ہمارا احترام کا رشتہ ہے۔"

"سچ کہہ رہے ہیں؟" میمونہ کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہاں ..... سچ کہہ رہا ہوں۔" خالد سنجیدگی سے بولا۔

"تو پھر میں بھی آپ کو سچ بتا رہی ہوں مجھے اس پینٹنگ کے بارے میں قطعاً" کچھ علم نہیں۔" میمونہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

خالد خاموش ہو گیا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ پینٹنگ غائب ہو چکی ہے۔ اس نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ویسے بھی اس وقت وہ جلدی میں تھے۔ انہیں معلوم تھا نیچے کامران گاڑی لئے ان کے انتظار میں کھڑا ہو گا۔ وہ گھر سے نکلے اور دروازہ مقفل کر کے لفٹ کے ذریعے نیچے آ گئے۔ خاموش طبع' دراز قد اور سپاٹ سے چہرے والا کامران گیٹ کے سامنے لمبی سی سیاہ مرسڈیز کے پاس ساکت کھڑا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس نے مستعدی سے دروازہ کھولا اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ خالد کا ذہن اس وقت بھی پینٹنگ میں الجھا ہوا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود اس خیال سے پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا۔ اس

کے ذہن میں خلش سی بیٹھ گئی تھی جو کئی سوالوں کی پیداوار تھی۔

پینٹنگ کیوں اور کس طرح غائب ہوئی تھی؟ کیا اس میں کسی کی مصلحت تھی؟ وہ مصلحت کیا ہو سکتی تھی اور غائب کرانے والا کون ہو سکتا تھا؟ رہ رہ کر اس کا خیال جمشید کی طرف جاتا تھا۔ شاید انہوں نے نہیں چاہا ہو گا کہ وہ نسرین کی دی ہوئی پینٹنگ گھر میں لگائے۔ انہوں نے نسرین کے بارے میں جس طرح باتیں کی تھیں اس سے تو یہی امکان نظر آتا تھا۔ شاید اس پینٹنگ میں کوئی خاص بات تھی۔

گاڑی ہسپتال کے کشادہ ڈرائیو وے میں جا رکی تو خالد نے ان الجھے ہوئے خیالات کو ذہن سے جھٹکا۔ یکدم ایک اور خیال اس کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ اس نے یا میمونہ نے کامران کو یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ انہیں کہاں جانا تھا۔ اس کے باوجود انہیں سیدھا ہسپتال لے آیا تھا۔ گاڑی سے اترتے وقت خالد اس بات کا ذکر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ کامران اس وقت گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ دونوں بالکل آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ کامران نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

"تم نے بتایا نہیں ....." خالد نے اصرار کیا۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ہمیں یہاں آ[نا] تھا؟ ہم نے تمہیں بتایا ہی نہیں تھا۔"

تب کامران کے سپاٹ چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ قدرے مشفقانہ سے لہجے میں بولا۔ "کم از کم اب تو ایسی باتوں پر حیران ہونا چھوڑ دیجئے ....."

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی بزرگ کسی نوعمر لڑکے کو سمجھا رہا ہو کہ اب تو تم سمجھدار ہو گئے ہو' کوالیفائیڈ ہو گئے ہو' اب تو بچگانہ اور احمقانہ باتیں کرنا چھوڑ دو۔ وہ گھوما اور ڈرائیونگ سیٹ پر واپس جا بیٹھا۔ گویا بات ختم ہو گئی تھی۔ اس موضوع پر اب مزید بات کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔

خالد نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور میمونہ کے ساتھ اندر چلا گیا وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ واقعی اسے اب بہت سی باتوں پر ..... بلکہ شاید کسی بھی بات پر حیران ہونا چھوڑ دینا چاہئے تھا۔ اندر ریسپشن پر سفید یونیفارم میں ایک چاق و چوبند خاتون تھی۔ میمونہ نے اسے اپنا کمپیوٹرائزڈ کارڈ دکھایا۔ جن افراد کے پاس یہ کمپیوٹرائزڈ کارڈ ہو[تا] تھا صرف وہی اس ہسپتال میں علاج کرانے کے اہل ہوتے تھے۔ میمونہ نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

خاتون نے خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے میمونہ کا کارڈ ایک کمپیوٹر میں ڈال کر [اس] کے وزٹ کا کمپیوٹر میں ہی اندراج کیا اور اشارے سے ایک اٹینڈنٹ کو بلا کر بولی۔ "... اور مسز خالد کو ڈاکٹر تجمل صاحب کے پاس لے جاؤ۔"

"بہتر ہوتا کہ میری بیوی کو کسی گائنا کالوجسٹ کے پاس بھیجا جاتا۔" خالد [...]



آمیز لہجے میں بولا۔

"تجمل صاحب گائناکالوجسٹ ہی ہیں ....." ریسپشنسٹ نے سنجیدگی سے جواب دیا اور ایک دیوار پر لگے ہوئے بڑے سے بورڈ کی طرف اشارہ کیا جس پر ڈاکٹروں کے نام اور ان کی ڈگریاں وغیرہ درج تھیں۔

"میرا مطلب تھا کہ لیڈی ڈاکٹر....." خالد ذرا گڑبڑا کر بولا۔

خاتون گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چبھتے ہوئے سے لہجے میں بولی۔ "ابھی آپ کی مسز کا کوئی ایسا معائنہ نہیں ہو گا جس کے لئے لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت پڑے۔ آئندہ جب ضرورت پڑے گی تو انہیں لیڈی ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا جائے گا۔"

وہ ریوالونگ چیئر گھما کر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے گویا بات ختم کر دی تھی۔ خالد کو اس کے جواب سے اطمینان تو ہو گیا لیکن اسے ہلکی سی خفت کا احساس ہوا تاہم وہ اور میمونہ اٹینڈنٹ کے ساتھ چل دیئے۔ اس عورت کو خالد نے آج پہلی بار ریسپشن پر دیکھا تھا اور اسے اس کے بارے میں کوئی بات کچھ عجیب لگی تھی۔ شاید وہ اس کی آنکھیں تھیں جو دونوں سائیڈوں پر کچھ زیادہ ہی کھنچی ہوئی سی تھیں۔ عام طور پر عورتیں آنکھوں میں کاجل کے ڈورے کھینچ کر انہیں اس طرح لمبا ظاہر کرنے کی کوشش کرتی تھیں لیکن اس عورت کی آنکھیں قدرتی طور پر ہی اس طرح لمبی لمبی تھیں اور بات کرتے وقت اس نے ایک بار بھی پلک نہیں جھپکی تھی۔ بہرحال خالد نے اسے بھی غیراہم سی بات سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔

ہسپتال میں حسب معمول خاموشی اور سکوت ..... بلکہ سناٹے کا راج تھا۔ خالد کے خیال میں یہ ان میاں بیوی کے حق میں اچھا ہی تھا۔ یہاں نہ اپوائنٹمنٹ لینے کا چکر تھا اور نہ انتظار کی زحمت ..... ورنہ اس نے تو یہی دیکھا تھا کہ نہایت امیر طبقے کے افراد کو بھی نہایت اعلیٰ قسم کے کلینکوں' ہسپتالوں اور علاج گاہوں میں کچھ نہ کچھ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑتی تھی۔

اٹینڈنٹ انہیں ایک کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا جس پر ڈاکٹر تجمل کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ دروازہ کھول کر وہ دونوں ہی اندر جا پہنچے۔ صاف ستھرا اور سفید براق درودیوار والا بڑا سا کمرہ تقریباً" خالی ہی تھا۔ صرف ایک کونے میں ڈاکٹر صاحب میز کے عقب میں بیٹھے تھے۔ ان کی میز پر ضروری طبی آلات سجے ہوئے تھے۔ ان کے بائیں ہاتھ پر کمپیوٹر یا پھر کسی چھوٹے موٹے سکینر سے مشابہ ایک مشین سائیڈ بورڈ پر رکھی تھی۔ شاید وہ اس کی سکرین پر ایکسرے وغیرہ لگا کر لائٹ آن کر کے دیکھتے ہوں۔ ایک طرف پارٹیشن کے عقب میں لمبی سی کاؤچ نما ایگزامینیشن ٹیبل بھی نظر آ رہی تھی۔ کمرے میں دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ خالد کو ایک نہایت مدہم لیکن کچھ عجیب سی بو کا بھی احساس ہوا۔

خالد کو صحیح طور پر یاد نہیں آ سکا کہ ایسی مخصوص بو کہاں آتی تھی۔ شاید ایسی ہی ..... مگر اس سے کہیں تیز بو ان جگہوں پر محسوس ہوتی تھی جہاں مردے نہلائے جاتے تھے۔ شاید یہ کافور یا پھر اس سے ملتے جلتے کسی کیمیکل کی بو تھی تاہم اس وقت وہ ناگوار نہیں بلکہ کچھ اچھی ہی معلوم ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر جبل نے مسکراتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ یہ مسکراہٹ گویا ان کے چہرے پر چسپاں تھی۔ یہ روح سے خالی مسکراہٹ تھی۔ بس ان کے ہونٹ گویا دائیں بائیں کھنچے ہوئے تھے۔ خالد انہیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر خفیف سی حیرت ہوئی کہ ان کی آنکھیں بھی ریسپشن پر بیٹھی ہوئی عورت کی طرح کچھ زیادہ ہی لبوتری سی تھیں اور کمرے کی دودھیا روشنی میں ان کا چہرہ کچھ زیادہ ہی سفید لگ رہا تھا۔ کورے لٹھے کی طرح ..... ان کے جسم میں جیسے خون ہی نہیں تھا۔ خالد نے ایسی سفید رنگت زندگی میں کم ہی کسی کی دیکھی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ان کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔ خالد کو جھرجھری سی آ گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں اپنے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خالد نے بیٹھتے ہی بلاتمہید اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔

"بہت خوب ..... بہت خوب .....!" ڈاکٹر صاحب نے اب بغور میمونہ کی طرف دیکھا۔ ان کے کھنچے ہوئے سے ہونٹ کچھ اور کھنچ گئے۔ ان کی آواز بھی کچھ عجیب سرسراتی ہوئی سی تھی۔ یکایک خالد کو احساس ہوا کہ کمرے میں سردی بھی کچھ زیادہ ہی تھی جبکہ کہیں کوئی اے سی وغیرہ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اسے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کمرے میں نہیں، کسی بہت بڑے فریج میں آ گیا تھا۔

میمونہ کی بھی یقیناً" یہی کیفیت تھی۔ اس نے تو غیرارادی سے انداز میں بغلوں میں ہاتھ دے لئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بغور اس کا سر تا پا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔ "ابھی دیکھ لیتے ہیں ..... ابھی چیک کر لیتے ہیں ....."

انہوں نے میز سے ٹارچ نما ایک آلہ اٹھایا جس کے آگے محدب عدسہ بھی لگا ہوا تھا۔ میز کے عقب سے نکل کر وہ ان کے قریب آ گئے۔ انہوں نے میمونہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کا سر پیچھے کی طرف کو جھکایا جس سے اس کا گلا نمایاں ہو گیا۔ وہ اس ٹارچ نما آلے کو روشن کر کے اس سے میمونہ کے حلقوم کا معائنہ کرنے لگے۔ چند سیکنڈ کی تاخیر سے خالد کی سمجھ میں آیا کہ وہ درحقیقت میمونہ کے گلے پر باریک سے سوراخوں کے ان دو ننھے ننھے نشانات کا معائنہ کر رہے تھے جو حیرت انگیز طور پر ایک ہی رات میں کافی حد تک معدوم ہو چکے تھے۔ میمونہ کا سفید مرمریں گلا بالکل بے داغ دکھائی دے رہا تھا لیکن ذرا بڑے مساموں کی طرح وہ معمولی سے گلابی نشان بہرحال موجود تھے اور اس آلے سے شاید



وہ کافی نمایاں دکھائی دیتے ہوں۔

ان نشانات کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر ایک عجیب سی طمانیت پھیل گئی گو کہ وہ خود انسان سے زیادہ ایک روح دکھائی دے رہے تھے مگر وہ نشانات دیکھ کر جیسے ان کی روح سرشار ہو گئی تھی اور خالد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان نشانات کا اس ٹیسٹ یا چیک اپ سے کیا تعلق تھا جو وہ درحقیقت کرانے کے لئے آئے تھے۔ تاہم اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میمونہ کا منہ کھلوا کر اندر سے بھی گلا دیکھا' زبان کا بھی معائنہ کیا اس قسم کے چیک اپ پر خالد ہی کو حیرت نہیں تھی' میمونہ بھی حیران نظر آ رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے صرف میمونہ ہی کے معائنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ خالد کے پاس بھی آ گئے لیکن انہوں نے صرف اس کی گردن پر وہ باریک اور مبہم سے نشانات دیکھنے پر اکتفا کیا۔ اس کا منہ کھلوا کر زبان یا حلق نہیں دیکھا۔ صبح شیو بناتے وقت خالد دیکھ چکا تھا کہ اس کے گلے پر بھی وہ باریک سے نشان تقریباً" معدوم ہو چکے تھے لیکن اس آلے سے وہ یقیناً" ڈاکٹر صاحب کو واضح نظر آ گئے تھے وہ اور بھی زیادہ مطمئن اور مسرور نظر آنے لگے۔ ان کے برف جیسے چہرے پر کچھ رونق دکھائی دینے لگی۔

وہ واپس اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سرسراتی سی آواز میں بولے۔ "بہت خوب ..... بہت خوب .....! آپ تو خالصتاً" اپنے ہی آدمی ہیں۔ آپ سے تو کسی تکلف کی ضرورت نہیں ....."

معلوم نہیں کیوں یہ کہتے ہوئے ان کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ خالد کو ان کے پتلے پتلے نچڑے ہوئے سے ہونٹوں کے عقب میں ان کے دانتوں کی جھلک نظر آئی اور اسے کچھ یوں لگا جیسے ان کے سامنے کے دو دانت کسی درندے کی طرح ذرا بڑے اور نوکیلے تھے ..... لیکن شاید یہ اس کا وہم تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ اس طرح بات کرنے لگے کہ ان کے دانتوں کی جھلک دکھنا ممکن نہ رہا۔

"مبارک ہو ..... مبارک ہو ....." وہ خالد سے مخاطب تھے۔ وہ اپنے بعض الفاظ کو دہرانے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔

"کس بات کی مبارکباد؟" خالد نے بغور ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ اب گویا کمرے کی کچھ زیادہ ہی خنک فضا کو برداشت کرنے کے قابل ہوتا جا رہا تھا ورنہ کچھ دیر پہلے تو اسے اندیشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید اس کے دانت بجنے لگیں گے۔

"آپ کی بیگم واقعی امید سے ہیں ....." ڈاکٹر صاحب بڑے مسرور لہجے میں بولے۔

"خوشخبری کے لئے آپ کو بس پانچ ماہ اور آٹھ دن مزید انتظار کرنا پڑے گا۔"

خالد حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اتنے وثوق سے اس طرح صحیح مدت کیسے

جا سکتے تھے جبکہ انہوں نے نہ تو کوئی چیز ٹیسٹ کے لئے لیبارٹری میں بھیجی تھی اور نہ ہی میمونہ کو کہیں الٹراساؤنڈ وغیرہ کے لئے بھیجا تھا۔ انہوں نے تو صرف اس طرح اس کا معائنہ کیا تھا جیسے اسے گلے کی کوئی تکلیف ہو۔ میمونہ بھی حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آخر خالد اپنا خیال ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکا۔

چہرے مہرے سے ڈاکٹر صاحب ہنسنے کے عادی معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن اس وقت وہ آہستگی سے ہنس دیئے۔ خالد کو ان کے دانتوں کی جھلک دکھائی دی اور ایک لمحے کے لئے اسے پھر گماں گزرا کہ ڈاکٹر صاحب کے وہ دانت لمبے اور نوکیلے تھے لیکن یہ تاثر صرف ایک لمحے کے لئے ہی رہا۔ دوسرے ہی لمحے اسے دانت صحیح اور نارمل دکھائی دینے لگے۔ شاید یہ اس کی نظر کا فریب تھا۔

"آپ ابھی نئے ہیں اس لئے ان باتوں پر تھوڑی بہت حیرت ہونا لازمی بات ہے۔" ڈاکٹر صاحب سر ہلاتے ہوئے مشفقانہ لہجے میں بولے۔ "لیکن رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بہت کچھ جان جائیں گے ..... بہت سی چیزوں کے عادی ہو جائیں گے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان اپنی نئی زندگی سے مانوس ہو جاتا ہے۔"

"نئی زندگی .....؟" خالد نے ایک ٹک ان کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں دہرایا۔

"چھوڑیئے ان باتوں کو ....." ڈاکٹر صاحب نے بے پروائی سے اپنا استخوانی سا ہاتھ ہلاتے ہوئے موضوع بدلا۔ "یہ بتایئے آپ اپنے برخوردار کو ..... میرا مطلب ہے ہونے والے برخوردار کو دیکھنا پسند کریں گے کہ اس وقت وہ کیا کر رہا ہے؟"

میمونہ اور خالد نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر خالد نے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر ہکلاتے ہوئے کہا۔ "ابھی سے .....؟ میرا مطلب ہے ..... ابھی اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہو گا ....."

"یہ محض آپ کا خیال ہے۔ وہ کوئی عام بچہ نہیں ہے۔" ڈاکٹر صاحب اطمینان سے بولے۔

"تو ..... آپ کا مطلب ہے ..... آپ میمونہ کو الٹراساؤنڈ کے لئے کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں؟" خالد کی حیرت برقرار تھی۔

"ارے نہیں ....." ڈاکٹر صاحب حقارت سے ہاتھ ہلاتے ہوئے ہنسے۔ "الٹرا ساؤنڈ تو بہت پرانی، بہت فرسودہ چیز ہے۔ ہم لوگ اس قسم کے آلات استعمال نہیں کرتے ذرا ٹھہریئے ..... میں آپ کو ابھی دکھاتا ہوں ....." وہ اپنے قریب سائیڈ بورڈ پر رکھی ہوئی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے اس کا ایک سرخ بٹن دبایا اور سکرین روشن ہو گئی۔ کمپیوٹر سے ذرا مختلف سکرین تھی۔ اس میں سینما کی سکرین کا سا دودھیا پن تھا۔



ڈاکٹر صاحب نے دو تین بٹن اور دبائے۔ سکرین پر کچھ دھندلے سے مناظر یکے بعد دیگرے نمودار ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب اب ایک بٹن گھما کر گویا مشین کو ٹیون کر رہے تھے۔ وہ گویا کسی خاص مقام اور کسی خاص منظر کو فوکس میں لانا چاہ رہے تھے۔ آخر وہ منظر سکرین پر آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک اور بٹن دبایا اور اس کی دھندلاہٹ بھی دور ہو گئی۔ منظر بالکل صاف واضح اور روشن دکھائی دینے لگا۔ خالد اور میمونہ کے سامنے گویا ایک چھوٹے سے روشن پردے پر رنگین فلم چل رہی تھی۔

وہ درختوں کے کسی جھنڈ کا منظر تھا۔ دھیرے دھیرے صرف ایک درخت سکرین پر رہ گیا اور اس کی شاخ پر چھوٹا سا ایک ننگ دھڑنگ بچہ بڑے اطمینان سے ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ وہ کسی چیز کا سہارا لئے بغیر بیٹھا تھا اور اس کے گرنے یا تھوڑا بہت بھی ادھر ادھر جھولنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ اس طرح بیٹھنے میں گویا کسی جنگلی جانور سے بھی زیادہ ماہر تھا حالانکہ وہ بہت ہی چھوٹا تھا۔ شیر خوار نظر آ رہا تھا اور وہ بھی چند ماہ کی عمر کا ..... تاہم وہ صحت مند گول مٹول اور نہایت گورا چٹا تھا۔

میمونہ بے اختیار سانس کھینچ کر رہ گئی۔ اس کا ہاتھ خالد کے بازو پر سختی سے آن ٹکا اور وہ سکرین سے نظر ہٹائے بغیر مضطربانہ سے انداز میں سرگوشی میں بولی۔ "خالد! یہ وہی بچہ ہے جس کے بارے میں میں نے تمہیں بتایا تھا ....."

خالد بھی دم بخود سکرین کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے انہماک کی وجہ محض بچہ نہیں تھا وہ جو کچھ کر رہا تھا وہ اس کے اپنے وجود سے بھی زیادہ حیرت انگیز عمل تھا۔ وہ ایک کراہت انگیز اور گھناؤنا منظر تھا۔ بچے کے ننھے سے ہاتھ میں دل، پھیپھڑے اور سانس کی نالی وغیرہ لٹکی ہوئی تھی اور وہ بڑے اطمینان و انہماک سے انہیں چبا رہا تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اندرونی اعضا کسی انسان کے تھے یا جانور کے ..... لیکن یہ بہرحال طے تھا کہ انہیں جسم سے نکلے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کیونکہ ان سے تازہ تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ ننھا سا بچہ بڑی پھرتی اور رغبت سے انہیں چباتا جا رہا تھا۔ اس کا ننھا سا دہن خون سے لتھڑا ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے گردن گھما کر دونوں میاں بیوی کی طرف دیکھا اور بولے۔ "ارے ..... آپ تو کچھ پریشان سے دکھائی دے رہے ہیں ..... آپ کو تو خوش ہونا چاہئے کہ آپ کا ہونے والا بچہ بالکل تندرست، نارمل اور پھرتیلا ہے ....." پھر وہ تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "اچھا ..... میں سمجھ گیا ..... دراصل یہ آپ کا پہلا پہلا بچہ ہے نا ..... تھوڑی سی پریشانی اور گھبراہٹ تو ہوتی ہے ....."

خالد کچھ سنبھلتے ہوئے بولا۔ "لیکن ڈاکٹر صاحب! یہ کہاں پھر رہا ہے؟"

"بھئی آپ کو تو خوش ہونا چاہئے یہ بڑا پھرتیلا اور خودکفیل قسم کا بچہ ہے۔ اپنی

خوراک کا خود ہی بندوبست کر لیتا ہے۔ ابھی تو یہ اسی طرح آزاد اور خود مختار رہے گا ..... جب دل چاہے گا ادھر ادھر پھرتا رہے گا ..... لیکن وقت آنے پر یہ اسی دنیا کے دوسرے بالکل عام اور نارمل بچوں کی طرح آپ کے ہاں جنم لے گا اور پھر آپ لاڈ پیار سے اس کی پرورش کیجئے گا جس طرح دوسرے تمام والدین کرتے ہیں ....."

خالد اور میمونہ دم بخود سے بیٹھے سکرین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بچہ کسی ننھے سے درندے کی طرح تیزی سے ان خون آلود اعضاء کو چبا کر ہڑپ کرتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے شاید محسوس کر لیا کہ ان دونوں کو زیادہ دیر وہ منظر دکھانا ٹھیک نہیں تھا۔ انہوں نے ایک بٹن دبا کر مشین آف کر دی اور مطمئن انداز میں ریوالونگ چیئر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ تسلی دینے کے سے انداز میں بولے۔ "اب آپ اطمینان سے گھر جائیں اور خوشخبری کا دن آنے کا انتظار کریں۔ بچہ اور بچے کی ماں ... بلکہ باپ بھی بالکل صحت مند اور نارمل ہیں۔ وقت آنے پر سب کچھ ٹھیک ٹھاک طریقے سے ہو جائے گا۔ آپ کو ذرا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ....."

خالد اور میمونہ نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے وہ کمرے سے باہر آئے تو دروازہ خود بخود ان کے عقب میں بند ہو گیا۔ دونوں قدرے سست رفتاری سے واپس چل دیئے۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خیالات میں الجھے ہوئے تھے۔

باہر آ کر انہوں نے دیکھا، گاڑی تو گیٹ کے پاس کھڑی تھی لیکن کامران گاڑی میں یا آس پاس کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ نہ تو سگریٹ پیتا تھا اور نہ ہی پان کھاتا تھا اس لئے وہ یہ تو نہیں سمجھ سکتے تھے کہ وہ پان یا سگریٹ لینے ادھر ادھر چلا گیا ہو گا لیکن شاید اسے آس پاس کا کوئی کام یاد آ گیا تھا۔ وہ گاڑی کے قریب کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے لگے

اسی اثناء میں سڑک کے ایک طرف سے ایک نہایت مفلوک الحال بڑھیا لنگڑاتی ہوئی نمودار ہوئی اور ان کے قریب رکی۔ وہ بیساکھی کے سہارے چل رہی تھی اور معذور ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ بیمار بھی دکھائی دیتی تھی۔ پرانے اور میلے کچیلے کپڑوں پر پیوند لگے تھے وہ ہانپتے ہوئے ایک انگلی اٹھا کر بطور خاص میمونہ سے مخاطب ہوئی "بیٹی! اللہ کے نام پر میری مدد کر دے ....."

خالد اور میمونہ دونوں ہی پیشہ ور بھکاریوں سے قطعاً" متاثر نہیں ہوتے تھے لیکن اس وقت میمونہ کے نہ جانے کیا جی میں آئی کہ اس نے پرس سے سو کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ تب نہ جانے کیوں بڑھیا نوٹ لینے کے بجائے عجیب سے انداز میں مسکرا دی اور کچھ رازدارانہ سے انداز میں دھیمی آواز میں بولی۔ "چل ..... بس .....



لے اپنا نوٹ اپنے پاس ..... میں تو بس یہ دیکھ رہی تھی کہ تیرے دل میں انسانیت کی کچھ رمق باقی ہے یا نہیں ..... اب میں ایک آیت پڑھ کر تجھ پر پھونکتی ہوں ..... مجھے بس یہ ایک ہی آیت آتی ہے ..... لیکن یہ ہی بلا اور شیطان سے بچانے کے لئے کافی ہے ..... آج سے تو ہر بلا اور شیطان سے محفوظ رہے گی ....."

یہ کہہ کر بڑھیا صرف چند سیکنڈ کے لئے زیر لب بڑبڑائی پھر اس نے میمونہ پر پھونک مار دی۔ اس نحیف اور بدحال بڑھیا کی اس ہلکی سی پھونک سے میمونہ یوں لرز کر رہ گئی اور پھر یوں پیچھے کو لڑکھڑا گئی جیسے تیز و تند طوفان کے سامنے کوئی تنکا۔

اس کا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا۔

○

خالد نے جلدی سے میمونہ کو دونوں ہاتھوں سے سہارا دیا۔ اسے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ میمونہ گر پڑے گی۔ خالد سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک نحیف و نزار بڑھیا کے محض پھونک مارنے کا صحت مند اور تندرست میمونہ پر یہ اثر ہوگا۔ وہ قدرے برہمی سے بڑھیا سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اسے یہ محسوس کرکے حیرت ہوئی کہ اس کی زبان گویا تالو سے چپک گئی تھی وہ کوشش اور خواہش کے باوجود ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

اسی اثناء میں ڈرائیور کامران لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایک طرف سے آتا دکھائی دیا۔ اسے آتے دیکھ کر خالد کو کچھ ڈھارس سی محسوس ہوئی۔ اسی اثناء میں بڑھیا تیز تیز قدم اٹھاتی دوسری طرف کو چل دی۔ کامران جس طرف سے آرہا تھا بڑھیا اس کی مخالف سمت میں جارہی تھی اور اب اس کا چلنے کا انداز ہی مختلف ہوگیا تھا۔ جب خالد نے اسے بیساکھی کے سہارے لنگڑاتے ہوئے آتے دیکھا تھا تو گویا وہ نقاہت سے گرنے کو تھی اور اس کیلئے چند قدم چلنا بھی محال ہوا جارہا تھا لیکن کامران پر نظر پڑتے ہی جیسے یکایک اس کی ساری نقاہت دور ہوگئی تھی۔ اس کے جسم میں گویا بجلی بھر گئی تھی یا پھر شاید اسے پر لگ گئے تھے۔

سڑک کے موڑ پر وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اسی اثناء میں کامران تیزی سے خالد اور میمونہ کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن خالد کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اس کے پاس نہیں رکا بلکہ کچھ اور تیزی سے بڑھیا کے تعاقب میں نکلتا چلا گیا وہ بھی گویا اب سڑک پر نہیں چل رہا تھا بلکہ اس سے کچھ اوپر اڑا جا رہا تھا۔ جب وہ خالد کے قریب سے گزرا تو خالد نے دیکھا تھا کہ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

کامران عام طور پر نہایت پرسکون دکھائی دینے والا آدمی تھا بلکہ زیادہ تر تو اس کا چہرہ سپاٹ اور آنکھیں برف زاروں کی طرح سرد دکھائی دیتی تھیں لیکن آج خالد نے پہلی بار اس کے چہرے پر جذبات کا تلاطم دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے دہک رہا تھا اور آنکھوں میں گویا غیض و غضب کے شعلے لپک رہے تھے۔ خالد کو حیرت تھی کہ وہ محض ایک بھکاری ٹائپ بڑھیا کو دیکھ کر اتنا غضبناک کیوں ہوگیا تھا۔ چند سیکنڈ پہلے تک خالد کو خود بڑھیا پر غصہ آگیا تھا لیکن اب کامران کو اتنا غضبناک دیکھ کر وہ اپنے غصے کو بھول گیا تھا اور الٹا اسے تشویش ہو چلی تھی کہ کامران بڑھیا کے ساتھ زیادہ ہی سخت یا برا سلوک نہ کر ڈالے۔



وہ نہیں چاہتا تھا کہ سڑک پر کسی قسم کا ہنگامہ کھڑا ہو اور لوگوں کو دیکھنے کیلئے تماشا مل جائے۔ کامران نے تو ان کے قریب رک کر جاننے کی بھی کوشش نہیں کی تھی کہ معاملہ کیا تھا۔

کامران بھی سڑک کا موڑ مڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا لیکن چند لمحے بعد ہی لوٹ آیا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بڑھیا کو پکڑنے میں ناکام رہا تھا۔ چہرے پر غیض و غضب کی جگہ جھنجلاہٹ نے لے لی تھی۔ خالد کو حیرت تھی کہ وہ ناتواں سی بڑھیا ایسے قوی و توانا جوان کی تیز رفتاری کو شکست دینے اور نکل جانے میں کیسے کامیاب ہوئی تھی۔ اس نے اس دوران میں میمونہ کو گاڑی میں بٹھا دیا تھا لیکن دروازہ کھلا ہی رکھا تھا۔ اس کی حالت اب کافی سنبھل چکی تھی لیکن چہرہ بدستور زرد تھا اور وہ گویا اپنے گرد و پیش سے بے خبر ناک کی سیدھ میں نہ جانے کیا تک رہی تھی۔ وہ اس وقت شاید گہری سوچ میں تھی۔

کامران ان کے پاس واپس پہنچا تو اس کا چہرہ اس وقت بھی متغیر تھا۔ خالد نے اسے اتنا بے سکون اور تشویش زدہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک دہک رہی تھیں۔ وہ گھٹی گھٹی لیکن غضبناک سی آواز میں بولا۔ "نکل گئی سور کی بچی——!"

پھر اس نے خود پر قابو پایا۔ یکدم ہی اس کا غیض و غضب بہت کم ہوگیا اور وہ گویا حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "اگر ہاتھ بھی آجاتی تو شاید میں اس کا کچھ نہ بگاڑ پاتا—— لیکن کم از کم اپنی سی کوشش تو کرسکتا تھا——"

خالد کو یہ سن کر حیرت ہوئی کہ وہ ایسا توانا اور کڑیل جوان ہوتے ہوئے اس نحیف و نزار بڑھیا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا لیکن پھر اسے اس کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ ظاہر ہے اگر کامران جیسا جوان ایسی ضعیف اور مفلوک الحال بڑھیا کے ساتھ سر راہ کوئی برا سلوک یا مار پیٹ کرنے کی کوشش کرتا تو لوگ جمع ہو جاتے اور ان کی ہمدردیاں بڑھیا کے ساتھ ہوتیں۔ لوگ نہ صرف کامران کو لعن طعن کرتے بلکہ شاید کچھ جرات مند لوگ عملی طور پر بھی اس کے خلاف کچھ کرنے پر تل جاتے۔ چنانچہ سر راہ اس قسم کی کوئی حرکت کامران کی نظر میں یقیناً" ٹھیک نہیں تھی۔

مگر دوسرے ہی لمحے کامران نے جو بات کی اس سے اندازہ ہوا کہ وہ یہ سب کچھ سوچ کر بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔ "منحوس بڑھیا بہت طاقتور ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس پر ہمارا کوئی زور نہیں چلتا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" خالد حیرت سے بولا۔ "تم اس نحیف و نزار اور مفلوک الحال بڑھیا کو طاقتور کہہ رہے ہو؟"

اب تک کامران کا غیظ و غضب جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا وہ مسکراتے ہوئے بولا "آپ بھی اس کے ظاہری حلیے سے دھوکا کھا گئے۔ آپ نے اسے بھاگتے نہیں دیکھا تھا؟"

"دیکھا تھا۔۔۔" خالد بولا۔ "میرا تو خیال تھا کہ شاید وہ خوف کے باعث اتنا تیز دوڑنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔۔۔ لیکن کیا اصل بات کچھ اور ہے؟ اس کا حلیہ بہروپ تو نہیں لگ رہا تھا۔ بالکل اصلی۔۔۔ عمر رسیدہ۔۔۔ اور شکستہ حال بڑھیا لگ رہی تھی۔"

"اس کا حلیہ تو حقیقی ہی تھا۔۔۔" کامران بولا۔ "میری مراد یہ نہیں ہے کہ وہ کسی قسم کے گٹ اپ' میک اپ یا بہروپ میں تھی۔ درحقیقت وہ کسی بھی قسم کا روپ دھارنے پر قادر ہے' وہ ہماری مخالف قوتوں کی ایجنٹ اور آلہ کار ہے جو ہماری ہی طرح طاقتور۔۔۔ بلکہ بعض معاملات میں ہم سے بہت بدتر ہیں۔۔۔ مگر ہم اور وہ بالکل متضاد قوتوں کے مالک ہیں۔ ہم کسی اور طرح کے ہیں وہ کسی اور طرح کے ہیں۔ ہم دنیا میں کچھ اور کاموں کیلئے آئے ہوئے ہیں' وہ کچھ اور کاموں کیلئے۔۔۔ موقع پاکر ہم ایک دوسرے پر اپنے داؤ آزمانے سے باز نہیں آتے۔ شکر ہے میں بروقت واپس آگیا ورنہ شاید وہ اپنا کوئی داؤ کھیل جاتی۔۔۔"

کامران کی باتیں خالد کو کچھ اور الجھن میں ڈال رہی تھیں۔ وہ کچھ سمجھ رہا تھا' کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ میمونہ گویا ان دونوں کی باتوں سے بے نیاز ایک ٹک ہوا میں تک رہی تھی۔ خالد ایک نظر اس کی طرف دیکھنے کے بعد بولا۔ "داؤ کھیلنے سے تمہاری مراد کیا ہے؟"

کامران گویا اس کا سوال ان سنا کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بتایئے وہ کیا کہہ رہی تھی؟"

خالد نے اسے بتایا کہ کس طرح بڑھیا نے قریب آکر بطور خاص میمونہ کو مخاطب کیا تھا اور مدد کی درخواست کی تھی۔ کس طرح میمونہ نے اسے سو کا نوٹ دینے کی کوشش کی تھی اور اس نے کیا کہہ کر وہ واپس کردیا تھا۔

کامران ایک نظر میمونہ کی طرف دیکھ کر خالد کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "بیگم صاحبہ نے اسے پیسے دینے کی کوشش کی؟ اس سے اخلاق سے پیش آئیں اور اس کی مدد کرنے کی کوشش کی۔۔۔؟" اسے گویا اس تصور سے پھر غصہ آنے لگا تھا' وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ دونوں کو تو چاہئے تھا کہ اسے دو چار زوردار لاتیں رسید کرتے۔"

خالد نے ایک بار پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ اسے بڑھیا پر غصہ آیا تھا لیکن اس حد تک جانے کا اس نے نہیں سوچا تھا' وہ دھیمے لہجے میں بولا "میں بھلا یہاں ایک اچھی بھلی بارونق سڑک کے کنارے کھڑا ہوکر ایسی حرکت کیسے کرسکتا تھا؟ لوگ مجھے لعنت ملامت کرتے۔۔۔"

کامران نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر گویا اصل بات اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ میں سمجھ گیا' دراصل ابھی آپ کو دوست دشمن کی صحیح طرح پہچان نہیں ہوئی۔ ابھی آپ اس منزل تک نہیں پہنچے۔

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی سینئر طالب علم کسی جونیئر طالب علم سے کہہ رہا ہو



"ابھی تم اس مسئلے کو نہیں سمجھ سکتے کیونکہ ابھی تم اس کلاس میں نہیں پہنچے جہاں یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے۔"

پھر جیسے کامران ذرا چونک کر اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "بہرحال۔۔۔ وہ کیا کہہ رہی تھی؟ نوٹ واپس کرنے کے بعد اس نے کیا کیا؟"

خالد نے بڑھیا کے الفاظ دہرائے اور پھر بتایا کہ کس طرح اس نے میمونہ پر پھونک ماری تھی جس کے بعد سے وہ گم صم تھی۔ یہ سنتے ہی کامران کا چہرہ زرد پڑگیا۔ ایک لمحے کیلئے وہ دم بہ خود سا رہ گیا۔ خالد نے گویا اسے بہت ہی بری خبر سنا دی تھی۔ ایک لمحے کیلئے تو وہ کچھ بھی نہ بول سکا اس کی قوت گویائی جیسے جواب دے گئی تھی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میمونہ کی طرف دیکھے جارہا تھا۔

پھر وہ نہایت افسوس زدہ لہجے میں خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔۔۔ ساری محنت برباد ہوگئی۔۔۔ مالک تو مجھ پر بہت خفا ہوں گے۔۔۔ میں صرف ایک منٹ کیلئے قریب ہی ایک کام سے گیا اور ایک منٹ میں دشمن کا داؤ چل گیا۔۔۔" اس کے لہجے میں بلا کا تاسف تھا۔ اس وقت شاید اس کا خود کو اپنے ہی ہاتھوں ہلاک کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔

"آخر یہ سب کیا ہے؟ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔۔۔" خالد زچ ہوکر بولا۔ "جب سے بڑھیا نے میمونہ پہ پھونک ماری ہے تب سے اُس کی عجیب حالت ہے۔ پہلے تو میں ڈر ہی گیا تھا۔۔۔"

"وہ تو ہونا ہی تھا۔۔۔ وہ تو ہونا ہی تھا سر!" کامران کے لہجے میں تاسف برقرار تھا۔ "بازی پلٹ گئی ہے۔۔۔ ہمارے مالک۔۔۔ ہمارے باس۔۔۔ بیگم صاحبہ کو جیسا دیکھنا چاہتے تھے شاید اب یہ ویسی نہ رہیں۔۔۔"

پھر وہ گویا دل ہی دل میں خود کو سمجھا بجھا کر' سینے پر صبر کی سل رکھ کر اور اس انجانے صدمے سے سنبھل کر ذرا نارمل لہجے میں بولا۔ چلیں۔۔۔ خیر۔۔۔ جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ مالک بہرحال بہت طاقت والے ہیں۔ شاید وہ اس کی تلافی کی کوئی صورت نکال لیں۔ آپ گاڑی میں بیٹھیں واپس چلتے ہیں۔"

خالد میمونہ کے برابر بیٹھ گیا اور کامران نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد گاڑی آگے بڑھا دی۔ چند لمحے کے اعصاب شکن سے سکوت کے بعد خالد نے پوچھا۔ "کیا تم واقعی اس بڑھیا کو نہیں پکڑ سکے؟" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"میں تو محض قسمت آزمائی کیلئے اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ مجھے معلوم تھا میں اسے نہیں پکڑ سکوں گا۔ پکڑ بھی لیتا تو شاید اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکتا۔ اس کے پیچھے جو روحانی طاقت کام کرتی ہے وہ اسے بچا لیتی اور اپنی پناہ میں بلا لیتی۔" کامران نے بتایا پھر وہ ایک

ٹھنڈی سانس لیکر بولا۔ "وہ بھی محض دکھاوے کیلئے بھاگی تھی۔ وہ چاہتی تو وہیں کھڑے کھڑے غائب ہوجاتی لیکن اس سڑک کے راہ گیروں کو دکھانے کے لئے وہ بھاگی تھی۔ موڑ مڑتے ہی وہ غائب ہوچکی تھی۔

"لیکن تم صحیح طرح بتاؤ نا کہ وہ کون تھی؟" خالد الجھن آمیز لہجے میں بولا۔

"میں نے صحیح بتا تو دیا ہے——" کامران کے لہجے میں ہمیشہ کی سی سرد مہری در آئی۔

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ ظاہر ہے جو قوتیں بھی ہم سے الٹ ہوں گی وہ ہماری دشمن ہوں گی۔ وہ بڑھیا ان دشمنوں کی ایجنٹ تھی—— ہرکارہ تھی۔ بڑھیا کا روپ تو محض دکھاوے کے لئے تھا' وہ بیگم صاحبہ کو کریدنا چاہتی تھی۔ آزمانا چاہتی تھی—— اور شاید اسے اپنی توقع کے مطابق جواب مل گیا اس لئے اس نے اپنا مطلوبہ عمل کر ڈالا۔ آپ اسے بڑھیا نہ سمجھیں—— وہ تو بس—— یوں سمجھ لیں کہ ایک روح تھی—— ایک علامت تھی—— بدروحیں' یہ علامتیں ہمارے خاص خاص ٹھکانوں کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں اور موقع پاتے ہی اپنا کام کر جاتی ہیں۔"

خالد خاموش رہا۔ بات کافی حد تک اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ مزید وضاحت وہ نہیں چاہتا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ کامران اس سے زیادہ وضاحت نہیں کرے گا۔ میمونہ بدستور خاموش تھی تاہم اب وہ بالکل پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد خالد نے کامران سے پوچھا۔ "کیا مجھے باس کو اس واقعے کے بارے میں بتانا ہوگا؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" کامران بولا۔

"انہیں معلوم ہوجائے گا' وہ زیادہ تر اہم باتوں سے باخبر رہتے ہیں۔"

چند منٹ بعد وہ اپنی بلڈنگ میں جا پہنچے۔ میمونہ گاڑی سے اترتے ہوئے پرسکون لہجے میں خالد سے مخاطب ہوئی۔ "بس—— ٹھیک ہے—— آپ اسی گاڑی میں دفتر چلے جایئے—— میں خود ہی اوپر چلی جاؤں گی۔"

"نہیں—— میں تمہیں اپارٹمنٹ میں پہنچا کر چند منٹ بعد دفتر چلا جاؤں گا۔" خالد نے جواب دیا۔ اس کی اپنی گاڑی بھی بیسمنٹ کے پارکنگ والے حصے میں کھڑی رہتی تھی لیکن اس کے استعمال کی نوبت شاذونادر ہی آتی تھی۔ نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کامران ہر ایک ہی کی ضرورت کے وقت گاڑی لئے موجود رہتا تھا۔

میمونہ نے اکیلے اوپر جانے پر اصرار نہیں کیا اور خاموشی سے لفٹ کی طرف چل دی۔ لفٹ جب انہیں لیکر اوپر روانہ ہوئی تو میمونہ نے یوں محتاط سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ ڈربا نما اس محدود سی جگہ میں بھی کوئی غیبی آنکھ انہیں دیکھ رہی ہوگی اور کوئی غیبی کان ان کی آواز سن رہا ہوگا۔

پھر وہ خالد کے کچھ اور قریب ہوکر کچھ عجیب تناؤ زدہ اور اجنبیت آمیز لہجے میں



سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "خالد صاحب! ایک بات کان کھول کر سن لیجئے—— میں اس بچے کی ماں نہیں بنوں گی جسے میں نے آج دوسری مرتبہ دیکھا ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو——" خالد نے بری طرح چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے جو کہا ہے وہ آپ نے اچھی طرح سن لیا ہے۔" میمونہ کی سرگوشی کسی ناگن کی پھنکار سے مشابہہ تھی۔

"لیکن—— شاید جمشید صاحب اس بات کو پسند نہ کریں۔" خالد ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"جمشید صاحب کی پسند ناپسند کا اب صرف آپ ہی خیال رکھا کریں۔ مجھے ان کی پسند ناپسند سے کوئی غرض نہیں۔" میمونہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔ اس کے انداز نے خالد کو حیران کردیا۔ اس کی ذات' اس کے ذہن' اس کی سوچ میں یک بیک ہی جیسے کوئی انقلاب آگیا تھا۔

اس وقت تک تیز رفتار لفٹ ان کے فلور تک پہنچ چکی تھی۔ طویل و عریض بیرونی ہال عبور کرکے وہ تالا کھول کر اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ میمونہ سیدھی بیڈ روم کی طرف چلی جارہی تھی۔ خالد اس کے پیچھے پیچھے تھا لیکن بیڈ روم کے دروازے پر وہ اس طرح رک گئی جیسے وہ چاہتی ہو کہ خالد اس کے ساتھ اندر داخل نہ ہو۔

آہستگی سے گھومتے ہوئے وہ پہلے سے بھی دھیمی آواز میں بولی۔ "خالد صاحب! آپ کو بھی یقیناً" اچھی طرح اندازہ ہے کہ وہ بچہ ہمارا نہیں ہے—— آپ تو کیا—— شاید میں بھی اسے اپنا نہیں کہہ سکتی—— وہ گویا ہم پہ مسلط کیا جا رہا ہے۔ کسی وجہ سے اسے ہماری—— یا شاید صرف میری ضرورت ہے لیکن آپ نے اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں اور کان بند کر لئے ہیں۔ شاید آپ کو—— یا آپ کی حمیت کو کچھ ہوگیا ہے۔ آپ کو اب ہرحال میں صرف جمشید صاحب کی خوشنودی کی فکر رہنے لگی ہے لیکن مجھے ان کی خوشنودی کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نہ تو اپنے لہو پر اس کی پرورش کروں گی اور نہ ہی اسے جنم دوں گی——"

"یہ تم نے کیا بکواس شروع کردی ہے——" خالد کو یکدم غصہ آگیا۔ اس کی کنپٹیوں میں جیسے شرارے پھوٹنے لگے تھے۔ "تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ اس فیصلے پر تمہیں اختیار ہے؟"

"اگر مجھے اختیار نہیں ہے تو میں اختیار حاصل کروں گی——" میمونہ اس کی برہمی سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر ٹھوس اور فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

خالد ابھی مزید کچھ کہنے کیلئے مناسب الفاظ ہی تلاش کر رہا تھا کہ میمونہ نے کھٹاک سے دروازہ بند کرکے نہ صرف مقفل کرلیا بلکہ بولٹ بھی چڑھا لیا۔ خالد بے وقوفوں کی

طرح باہر کھڑا رہ گیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ دروازہ اس کی ناک پر لگتے لگتے رہ گیا تھا۔

○

سرجن جمال عثمانی اور ان کی بیٹی سارہ نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی پجیرو میں بائی روڈ نشاط نگر جائیں گے۔ ان کا ڈرائیور عمر رسیدہ مگر بہت تجربہ کار اور بھروسے کا آدمی تھا۔ اپنی گاڑی میں سڑک کے راستے سفر کے سوا کوئی دوسرا طریقہ جمال صاحب کو مناسب معلوم نہیں ہوا۔ سفر کچھ ایسا طویل بھی نہیں تھا۔ شاندار ایئر کنڈیشنڈ پجیرو میں حیدر آباد تک کے سفر کا تو انہیں گویا احساس بھی نہیں ہوا کہ انہوں نے سفر کیا تھا۔

اس کے بعد تقریباً" تیس چالیس کلومیٹر کا فاصلہ انہیں ایک چھوٹی سڑک پر طے کرنا تھا جس کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔ اس لئے گاڑی نے تھوڑے بہت ہچکولے کھانے شروع کردیئے لیکن یہ بھی جمال صاحب یا سارہ کیلئے کچھ ایسی زحمت کی بات نہیں تھی۔ راستہ اگر تھوڑا سا خراب بھی تھا تو اس کی کمی یوں پوری ہوگئی تھی کہ سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے ہرے بھرے کھیت اور مختلف پھلوں کے باغات اپنی سادگی مگر فطری حسن کے باعث دونوں باپ بیٹی کو بہت اچھے لگ رہے تھے۔ بیچ میں کہیں کہیں غیر آباد زمینیں بھی دکھائی دے جاتی تھیں اور کہیں جنگلات کا سلسلہ بھی شروع ہوجاتا تھا۔ شہر کی نہایت ہی مصروف اور بے آسائش زندگی سے نکلنے کے بعد باپ بیٹی کو یہ سب کچھ ہی بہت بھلا لگ رہا تھا۔ وہ ایک معصومانہ سے جوش و خروش کے ساتھ ہر چیز میں ہی کچھ نہ کچھ حسن تلاش کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ حتیٰ کہ کسی نیم صحرائی سے میدان کے قریب سے گزرتے وقت بھی جمال صاحب بچوں کی طرح پر اشتیاق انداز میں اشارہ کرتے ہوئے کہتے "ارے۔۔۔ سارہ! تم نے دیکھا یہاں کی مٹی میں کیسی چمک ہے؟"

"جی ہاں ڈیڈی! بالکل نارنجی رنگ کی معلوم ہوتی ہے۔ دھوپ میں کیسی خوبصورت معلوم ہو رہی ہے۔" سارہ بھی خوشی اور جوش و خروش سے جواب دیتی۔

وہ نشاط نگر کے قریب پہنچ رہے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ سڑک کے کنارے کنارے سنگ میل موجود تھے جن سے انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ منزل سے ان کا فاصلہ بتدریج کم ہوتا جارہا تھا۔ اس کے علاوہ ڈرائیور بھی انہیں مطلع کرتا جارہا تھا۔ ڈرائیور کیلئے یہ علاقہ بالکل ہی اجنبی نہیں تھا۔ کئی سال پہلے وہ ایک ملازمت کے سلسلے میں کچھ عرصہ ان اطراف میں گزار چکا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ دیہی علاقوں میں زیادہ جلدی کچھ ایسی خاص نمایاں تبدیلیاں نہیں آتی تھیں جن کی وجہ سے انہیں پہچاننا دشوار ہوتا۔

اس وقت وہ ایک ایسے علاقے سے گزر رہے تھے جہاں دونوں طرف چھدرے درختوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ درخت اتنے چھدرے تھے کہ ان میں سے کوئی



گاڑی بھی آسانی سے گزر سکتی تھی۔ اچانک ہی سڑک کے ایک طرف سے ایک خاصی توانا اور بڑی سی لومڑی دوڑتی ہوئی نمودار ہوئی اور سڑک عبور کرکے دوسری طرف کے درختوں کے درمیان دوڑتی ہوئی چند لمحوں میں غائب ہوگئی۔

وہ یکدم ہی پجیرو کے سامنے آگئی تھی تاہم رفتار چونکہ زیادہ نہیں تھی اس لئے ڈرائیور نے بروقت بریک لگا کر اسے بچا لیا تھا۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ "ابھی مر جاتی! بال بال بچی ہے۔"

"بھئی جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔" جمال صاحب خوش دلی سے بولے۔

ڈرائیور کو جیسے خیال آیا اور وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے قدرے حیرت سے بولا۔
"اس علاقے میں لومڑیاں تو نہیں پائی جاتیں۔ یہ کہاں سے آگئی۔"

"بھئی ان جنگلی جانوروں کے بارے میں سو فیصد یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" جمال صاحب بولے۔ "اکا دکا تو کوئی بھی جانور کسی بھی علاقے میں نظر آسکتا ہے۔"

"بہرحال اس میں شک نہیں۔۔۔۔" سارہ نے گفتگو میں دخل دیا۔ "کہ لومڑی کی خواہ کتنی ہی برائیاں کی جائیں اور اسے کتنی ہی مکار مخلوق قرار دیا جائے مگر اپنے قدرتی ماحول میں یہ بھی خوبصورت لگتی ہے۔ کتنی پیاری لگ رہی تھی اس طرح بھاگتی ہوئی۔۔۔۔" اس نے گردن گھما کر اس سمت میں دیکھنے کی کوشش کی جدھر لومڑی غائب ہوئی تھی۔

"قدرت کی پیدا کی ہوئی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی خوبصورتی ہوتی ہے۔ بس اس کیلئے تلاش کرنے والی نظر چاہئے۔" جمال صاحب عقیدت مندانہ لہجے میں بولے۔

ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ درختوں کے درمیان سے اسی طرح ایک کھلی جیپ نمودار ہوئی جس طرح انہوں نے لومڑی کو نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ وہ جیپ کچے سے سڑک پر چڑھ کر سامنے سے ان کی طرف آئی اور اس طرح ترچھی ہو کر آئی کہ اس نے پجیرو کا راستہ روک لیا۔ ڈرائیور کو بریک لگانا پڑا تاہم وہ خوفزدہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس نے بٹن دبا کر گاڑی کا خودکار شیشہ نیچے کردیا۔ جیپ میں ڈرائیونگ کرنے والے تین آدمی تھے۔ ایک آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی۔ دو آدمی پچھلی سیٹوں پر تھے۔ ان کے پاس کلاشنکوفیں تھیں لیکن وہ ان کے کندھوں پر لٹکی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں میں نہیں تھیں۔

اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص کافی بدصورت اور تقریباً" سیاہ فام تھا۔ چہرے پر چیچک کے داغوں نے اس کی بدصورتی میں مزید اضافہ کردیا تھا لیکن اس کا لباس بہت عمدہ تھا اور اس کی بدصورتی کے باوجود بہرحال اس کی شخصیت سے رعب و دبدبہ جھلک رہا تھا۔ اس کی موٹی موٹی نوکیلی مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اور بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے خونخواری سی عیاں تھیں۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ لوگوں پر حکم

چلانے کا عادی تھا۔

وہ تینوں جیپ سے اتر کر پجیرو کے نزدیک آ گئے۔ بدصورت شخص شاٹ گن ہاتھ میں بے پروائی سے لٹکائے آگے آگے تھا۔ دونوں کلاشنکوف بردار سعادت مندانہ سے انداز میں اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ جمال صاحب کے ڈرائیور نے مرعوب ہوئے بغیر ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔ "کون ہو تم لوگ—— اور ہمارا راستہ کیوں روکا ہے؟"

ایک کلاشنکوف بردار جلدی سے ذرا آگے بڑھ کر حقارت آمیز سے انداز میں بولا۔ "بالکل ہی نئے لگتے ہو اس علاقے میں—— ارے تم ہمارے سائیں سرکار کو نہیں پہچانتے؟" اس نے بدصورت مگر خوش لباس شخص کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ نیاز علی صاحب ہیں۔ انہیں اس علاقے کا مالک ہی سمجھو۔ یہاں کے سب سے بڑے زمیندار ہیں۔ آس پاس کا بچہ بچہ وڈیرا سائیں کو پہچانتا ہے۔ تم لوگ یقیناً کہیں دور سے آئے ہو جو سائیں کو نہیں پہچانتے۔"

"ہاں —— ہم کافی دور سے آئے ہیں۔" ڈرائیور اس بار ذرا نرم لہجے میں بولا۔ اس نے پچھلی سیٹوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ جمال عثمانی صاحب اور ان کی صاحبزادی ہیں۔ جمال صاحب کراچی کے بہت بڑے سرجن ہیں۔"

بدصورت شخص جس کا نام نیاز علی بتایا گیا تھا' ایک ہاتھ سے بے خیالی کے سے انداز میں مونچھ کو بل دیتے ہوئے ایک ٹک صرف سارہ کو تک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب شیطانی سی چمک تھی۔ سارہ کو اس کا یوں گھورنا ہرگز اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سیٹ پر کسمانے لگی تھی۔ جمال صاحب کی پیشانی پر بھی بل پڑ گئے تھے۔

ڈرائیور کی زبانی ان کا مختصر سا تعارف سن کر نیاز علی اور اس کے ساتھیوں کے چہرے پر ذرا نرمی آ گئی۔ نیاز علی ذرا مسکراتے ہوئے سر ہلا کر بولا۔ "اچھا—— اچھا—— کراچی سے آئے ہیں—— بہت بڑے سرجن ہیں—— ان سے تو کبھی ہمیں بھی کام پڑ سکتا ہے——" بات کرتے وقت بھی اس کی نظر سارہ کے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھی۔ "پھر تو آپ لوگ ہمارے مہمان ہیں۔ اگر ادھر ٹھہرنے کا خیال ہے تو ہماری حویلی پر چلیں۔ ہم اس علاقے کے بادشاہ سہی مگر آپ کے خادم ہیں۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

اس کے الفاظ اور پیشکش بہت اچھی تھی مگر لہجے کے تہہ میں وہ خلوص نہیں تھا جو اس قسم کی پیشکشوں میں عموماً ہوتا ہے۔ تاہم جمال صاحب اب پہلے کی نسبت کچھ نرمی سے بولے۔ "بہت شکریہ—— لیکن ہم کسی اور کے مہمان ہیں۔ براہ مہربانی گاڑی راستے سے ہٹالو—— راستہ چھوڑ دو ورنہ ہم کچے میں اتر کر گزر جائیں گے۔"

"نہیں—— نہیں—— اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔ ہم ابھی گاڑی ہٹا دیتے ہیں۔" نیاز علی جلدی سے بولا۔ نظر اب بھی سارہ کے چہرے پر تھی۔ "ہم تو دراصل



یہ پوچھنے کیلئے رک گئے تھے کہ آپ نے ادھر سے کسی خوبصورت سی لومڑی کو تو بھاگتے نہیں دیکھا؟"

اس موقع پر سارہ نے پہلی بار گفتگو میں دخل دیا۔ وہ اپنی طرف کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے اپنا مرمریں ہاتھ گاڑی سے نکال کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "ہاں—— وہ اس طرف گئی ہے——"

"ٹھیک ہے—— بس اتنا ہی پوچھنا تھا——" وہ تینوں تیزی سے مڑے اور جیپ میں جا بیٹھے۔ چند سیکنڈ میں ہی جیپ ان کے سامنے سے ہٹ چکی تھی اور تیز رفتاری سے اس طرف روانہ ہو چکی تھی جدھر سارہ نے اشارہ کیا تھا۔

جمال صاحب کے ڈرائیور نے پجیرو بھی آگے بڑھا دی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جمال صاحب مسکراتے ہوئے بیٹی سے مخاطب ہوئے۔ "سارہ! بھئی تم بہت شریر ہو تم نے ان لوگوں کو غلط راستہ کیوں بتا دیا؟ لومڑی اس طرف تو نہیں گئی تھی۔"

سارہ بھی مسکراتے ہوئے بولی۔ "تو پھر کیا ہوا ڈیڈی! مانا کہ لومڑی ہم انسانوں کی نظر میں زیادہ اچھا جانور نہیں ہے لیکن بہرحال—— اسے بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ وہ بے چاری انسان کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچاتی۔ اگر وہ ان لوگوں کو نظر آ گئی تو یہ خواہ مخواہ محض شغل شغل میں اسے گولی مار دیں گے۔ خواہ اس سے کسی کو کوئی فائدہ نہ ہو۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے شریر لڑکی" جمال صاحب کو قائل ہونا پڑا۔ "تم حاضر جواب بھی ہو اور حاضر دماغ بھی۔"

"آپ کو بہت دیر سے پتا چلا۔" سارہ نے مصنوعی بے نیازی سے کہا۔

مزید کچھ دیر کے سفر کے بعد وہ نشاط نگر کے قریب جا پہنچے۔ اکا دکا کچے' پکے اور نیم پکے مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ڈرائیور جمال صاحب اور سارہ تینوں باتیں کئے جا رہے تھے۔ ابھی تک نیاز علی اور اس کے ساتھیوں کا تذکرہ چل رہا تھا۔ وہ ان کے انداز و اطوار سے خوفزدہ یا مرعوب نہیں ہوئے تھے۔ تینوں کی رائے یہی تھی کہ اگر وہ ایک اندرونی اور دیہی علاقے میں آئے تھے تو انہیں اس قسم کی باتوں کیلئے تیار رہنا چاہئے تھا۔

ابھی ذرا گنجان مکانوں اور گلیوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا کہ سامنے سے کچھ لوگ سڑک پر آتے دکھائی دیئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی جنازہ اٹھائے آ رہے تھے۔ ڈرائیور نے احتراماً گاڑی ایک طرف روک لی۔ تب انہوں نے دیکھا کہ وہ باقاعدہ جنازہ نہیں تھا۔ چھ سات افراد ایک چارپائی اٹھائے آ رہے تھے چارپائی پر چادر سے ڈھکا ہوا ایک انسانی جسم تو موجود تھا لیکن یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ مردہ تھا یا زیادہ بیمار کوئی شخص تھا۔

جمال صاحب کو معلوم تھا کہ گاؤں دیہات میں ایمبولینس تو میسر نہیں تھی۔ بعض اوقات شدید بیمار یا قریب المرگ کسی مریض کو ہسپتال یا ڈسپنسری لے جانے کیلئے کوئی دوسری

ڈھنگ کی سواری بھی دستیاب نہیں ہوتی تھی تو اس کے عزیز و اقارب اسے یونہی چارپائی پر ڈال کر چل دیتے تھے۔

ابھی انہوں نے گاڑی روکی ہی تھی کہ عقب سے انجن کی گھرگھراہٹ سنائی دی پھر وا جیپ تیزی سے آتی دکھائی دی جو کچھ دیر پہلے ان کا راستہ روک چکی تھی۔ اس بار وہ پیچھے سے آکر ترچھی ہوکر پجیرو اور سامنے سے آنے والے افراد کے درمیان حائل ہوگئی۔ اب گویا دونوں ہی کیلئے راستہ رک گیا تھا۔ البتہ کچے میں اتر کر وہ آگے بڑھ سکتے تھے۔

جیپ میں ڈرائیور کے علاوہ وہی تینوں افراد موجود تھے اور اب ان کے تاثرات کچھ بدلے ہوئے نظر آرہے تھے۔ وہ پہلے کی نسبت برہم سے دکھائی دے رہے تھے۔

انہوں نے چارپائی اٹھائے سامنے سے آنے والے لوگوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور پہلے ہی کی طرح نیاز علی اور اس کے دو باڈی گارڈ نما ساتھی جیپ سے کود کر ان کے قریب آگئے۔ جمال صاحب کا ڈرائیور اب بھی گویا ان سے مرعوب یا خوفزدہ ہونے کیلئے تیار نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کر چکا تھا لیکن نیاز علی اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے سارہ کی بند کھڑکی کے شیشے سے اسے گھورتے ہوئے بولا "تم خود بھی کسی خوبصورت لومڑی سے کم نہیں ہو۔ ہمیں پتا چل گیا ہے کہ تم نے لومڑی کے بارے میں ہمیں غلط بتایا تھا۔ شہروں سے آنے والے بھی نیاز علی سے اس قسم کے مذاق نہیں کرتے ہیں۔"

جمال صاحب اور سارہ آسانی سے اس کی گونجیلی آواز سن سکتے تھے۔ جمال صاحب بھی مرعوب ہونے والے لوگوں میں سے نہیں تھے۔ انہیں احساس تھا کہ وہ ایک اجنبی جگہ پر تھے۔ لیکن وہ کسی کو سارہ سے اس انداز میں بات کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ وہ اونچی اور بارعب آواز میں بولے۔ "تمیز سے بات کرو برخوردار! وڈیرہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم ایک معزز خاندان کی لڑکی سے اس طرح بات کرو۔ لومڑی ادھر ہی گئی تھی جدھر اس نے بتایا تھا۔ اگر وہ تمہیں نہیں ملی تو اس میں ہمارا قصور نہیں۔ وہ کوئی بند جگہ تو نہیں تھی۔ جنگلی جانور کسی طرف بھی جا سکتا ہے۔ ہم نے اس لومڑی کو تمہارے ہاتھوں شکار کروانے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا تھا۔"

اس دوران میں سامنے سے آنے والی ٹولی بھی قریب آچکی تھی۔ ان میں سے چار افراد نے چارپائی اٹھا رکھی تھی اور تین افراد ان کے ساتھ چل رہے تھے۔ سب سے آگے ایک باریش اور مولانا قسم کی شخصیت تھی۔ ان کے سر پر ٹوپی کندھے پہ سفید رومال اور شلوار ٹخنوں سے اونچی تھی۔ وہ سب اداس اور یاسیت زدہ دکھائی دے رہے تھے۔ خصوصاً ایک نوجوان جس نے چارپائی کا ایک پایہ تھاما ہوا تھا بہت رنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کا [illegible] بڑھا ہوا تھا اور چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ یوں تو وہ ایک توانا اور دراز قد انسان تھا لیکن



معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت کسی حادثے نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ وہ بے حد دل شکستہ اور مضمحل تھا۔ وہ سبھی رک گئے تھے اور ایک ٹک پجیرو اور جیپ والوں کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ ان کی اداس آنکھوں میں تجسس در آیا تھا۔

جمال صاحب نے اپنی دانست میں نیاز علی کو طبیعت صاف کرنے والا جواب دے دیا تھا۔ ان کے ڈرائیور کے پاس سیٹ کے نیچے ایک عمدہ پستول موجود تھا لیکن انہیں امید تھی کہ اس کے نکالنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ ان کا نظریہ تھا کہ مسلح اور بدمعاش دکھائی دینے والے لوگوں کے سامنے جو لوگ خوفزدہ نظر آتے تھے یا کھسیاتے تھے ان کے ساتھ زیادہ برا سلوک ہوتا تھا۔ وہ اس اجنبی علاقے میں بھی اپنے نظریے پر قائم رہنا چاہتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ نیاز علی کوئی غلط حرکت کرنے سے پہلے نتائج کے بارے میں ضرور سوچے گا۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ ان کی بارعب آواز یقیناً چارپائی والوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔

توہین اور خجالت کے احساس سے نیاز علی کا بدنما چہرہ کچھ اور بگڑ کر رہ گیا۔ سارہ کی طرف کی کھڑکی کا شیشہ تو بند تھا۔ اس نے یکدم ڈرائیور والی کھڑکی سے بازو اندر گھسیڑ دیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ڈرائیور کو گریبان سے پکڑ کر کھڑکی کے راستے باہر گھسیٹ لے گا۔ اس کی یہ حرکت جمال صاحب کے لئے تو شاید غیر متوقع تھی لیکن ڈرائیور شاید اس کیلئے کسی حد تک تیار تھا۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اس نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیاز علی کا ہاتھ اپنے گریبان تک پہنچنے سے روک دیا لیکن اس دوران میں اس کا پاؤں کلچ پر سے ہٹ گیا اور ایکسی لیٹر پر اس کے پاؤں کا دباؤ بڑھ گیا۔

"پجیرو کا انجن کسی درندے کی طرح غرایا اور گاڑی لہراتی ہوئی چارپائی والوں کی طرف بڑھی۔ ان لوگوں میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر کو بھاگے اور ان کے کندھوں پر موجود چارپائی بری طرح ڈگمگائی پھر زمین پر جاگری۔ چارپائی سے ایک انسانی جسم لڑھک کر کچے میں جاگرا۔ وہ یقیناً" ایک لاش تھی لیکن اس کی حالت عجیب تھی۔ اس کی بے نور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور گویا خلاء میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں اور ناک کچھ زیادہ ہی ابھری ہوئی تھی۔ چہرہ کچھ اس قدر زرد تھا جیسے کسی نے اس پر زردی مل دی ہو۔ پتلے پتلے مرجھائے ہوئے ہونٹ نیم وا تھے اور ان کے عقب سے اس کے چھدرے چھدرے دانت جھانک رہے تھے جو کچھ نوکیلے سے دکھائی دے رہے تھے۔

لاش پر گو کہ بوسیدہ سا لباس موجود تھا مگر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کی حالت کسی ڈھانچے سے مشابہ تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے نہایت چھدرے بال سر پر لوہے کی تاروں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ سرجن جمال نے زندگی میں بہت سی لاشیں دیکھی تھیں لیکن ایسی بھیانک لاش کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کہنے کو بظاہر اس میں کوئی ایسی

خوفناک بات بھی نہیں تھی لیکن اس کا مجموعی تاثر بہت بھیانک تھا۔

جمال صاحب کے ڈرائیور نے گو کہ گاڑی پر فوراً ہی قابو پالیا تھا اور گاڑی کسی سے ٹکرانا تو درکنار مس بھی نہیں ہوئی تھی لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ لاش زمین پر گر چکی تھی۔ مرنے کے بعد شاید کسی نے اس شخص کی آنکھیں بھی بند کرنے کی کوشش نہیں کی تھی یا پھر شاید کوشش کی گئی ہو مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی ہو۔

تتر بتر ہونے والے لوگ فوراً ہی پلٹ آئے تھے۔ اس کی توجہ اب لاش کی طرف تھی۔ حتیٰ کہ نیاز علی اور اس کے ساتھی بھی اپنا غصہ اور جھگڑے کے ارادے بھول کر اس طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ جمال صاحب اور سارہ بھی گاڑی سے اتر آئے تھے۔ دونوں باپ بیٹی نیاز علی اور اس کے ساتھیوں پر یہ جتا دینا چاہتے تھے کہ وہ ان کی کلاشنکوفوں اور بدمعاشوں والے انداز و اطوار سے خوفزدہ نہیں تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کہتے' زیادہ رنجیدہ اور آنسوؤں سے لتھڑے چہرے والا نوجوان آگے بڑھا اور نیاز علی کی طرف انگلی اٹھا کر غصے سے کانپتی آواز میں بولا۔ "تم ہر جگہ بدمعاشی اور غنڈہ گردی دکھانے کیوں پہنچ جاتے ہو؟ تمہاری وجہ سے میرے بھائی کی لاش کی بے حرمتی ہوئی ہے۔"

نیاز علی نے اپنی لال انگارہ سی آنکھوں سے غضبناک انداز میں اس کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔ اسے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کے ایک باڈی گارڈ نما ساتھی نے کلاشنکوف کی نالی اس کے سینے پر رکھ کر اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے غرا کر کہا "تمیز سے بات کر کس سے بات کر رہا ہے؟"

عین ممکن تھا کہ نوجوان اپنے نہتے ہونے کی پرواہ کئے بغیر ان سے بھڑ جاتے لیکن اسی لمحے باریش اور عمر رسیدہ شخص آگے آگیا اور ان دونوں کے درمیان حائل ہوگیا۔ وہ غمزدہ نوجوان کو روکتے ہوئے مشفقانہ اور مہربانہ لہجے میں بولا۔ بس ـــــ بس محمد علی ـــــ! ہمیں اندازہ ہے کہ اس وقت تم کتنے غمزدہ ہو۔ جوان بھائی کی موت کا صدمہ کم نہیں ہوتا۔ لیکن یہ وقت لڑنے جھگڑنے کا نہیں ہے۔ بے شک تمہارے جذبات مجروح ہوئے ہیں لیکن حوصلہ کرو اور اپنے آپ پر قابو رکھو ـــــ"

یہ شاید ان کے لہجے کی مٹھاس اور خلوص تھا یا پھر ان کی بزرگانہ شخصیت کا اثر ـــــ کہ انہوں نے محمد علی نامی نوجوان گویا اپنے غم و غصے کو برداشت کرتے ہوئے اور خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اپنی جگہ رک گیا۔ تب وہ مولانا قسم کی شخصیت نیاز علی سے مخاطب ہوئی "بہتر ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں وڈیرہ سائیں! کبھی موقع محل بھی دیکھ لیا کریں ـــــ آپ کو تو معلوم ہی ہے محمد علی کیسے صدمے سے گزرا ہے۔ اتنے دن اس کا بھائی بیمار رہا۔ اس نے وہ دن بھی بڑی تکلیف سے گزارے ہیں اور اب آخر کار وہ مر گیا۔ اس کے حال پر رحم کھائیں ـــــ"



وہ مولوی قسم کے صاحب جو کوئی بھی تھے' نیاز علی اور اس کے ساتھیوں نے ان کے سامنے سرکشی یا اکڑ نہیں دکھائی اور پیچھے ہٹ کر خاموشی سے اپنی جیپ میں جا بیٹھے اور وہاں سے رخصت ہوگئے۔ یوں گویا کوئی زیادہ ناخوشگوار واقعہ ٹل گیا۔ دوسرے لوگوں نے اس دوران میں جلدی سے لاش کو اٹھا کر اور مٹی وغیرہ جھاڑ کر دوبارہ چارپائی پر ڈال دیا تھا اور اسے چادر سے بھی ڈھانپ دیا تھا۔ اتنی سی دیر میں ہی اس پر مکھیاں بھنبھنانے لگی تھیں۔

جمال صاحب نے معذرت خواہانہ انداز میں سبھی کو مخاطب کیا۔ "ہمیں آپ لوگوں کے جذبات کا پوری طرح احساس ہے لیکن شاید آپ لوگوں نے دیکھ ہی لیا ہو گا کہ اس میں ہمارا قصور نہیں تھا۔ ہم جان بوجھ کر کسی لاش کی بے حرمتی کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس شخص نے خواہ مخواہ ہی ذرا سی بات کو بہانہ بنا کر میرے ڈرائیور سے ہاتھا پائی شروع کر دی تھی جس کی وجہ سے ایک لمحے کے لئے گاڑی بے قابو ہوگئی۔"

"ہمیں اندازہ ہے ـــــ ہم سب دیکھ رہے تھے ـــــ" مولانا ٹائپ شخصیت نے نرمی سے کہا۔ "ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ آپ کون ہیں اور کیسے اس طرف آئے ہیں؟"

جمال صاحب نے اپنا تعارف کرایا تاہم اپنی آمد کا مقصد نہیں بتایا جواباً" باریش شخصیت نے بھی اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے مولوی رشید کہتے ہیں۔ یہاں ایک چھوٹی سی مسجد ہے ـــــ قبرستان کے قریب ـــــ میں اس کا امام ہوں۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" جمال صاحب نے مولوی رشید سے ہاتھ ملایا۔ باقی لوگ ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دے رہے تھے۔ شاید وہ جلد از جلد چارپائی اٹھا کر وہاں سے روانہ ہو جانا چاہتے تھے۔

"آپ یہاں اجنبی ہیں تو یوں سمجھیں کہ ہمارے مہمان ہیں۔ ہمارے لائق کوئی خدمت ہے تو بتائیں۔" مولوی رشید سینے پر ہاتھ کر ذرا جھکتے ہوئے بولے۔

"ہم ڈاکٹر تحسین کے ہاں آئے ہیں۔ کچھ دن اس کے گھر قیام کریں گے۔ بس آپ ہمیں اس کا گھر بتا دیں۔" جمال صاحب بولے۔

"ڈاکٹر صاحب کا گھر ڈھونڈنا تو بہت آسان ہے۔ بس اسی سڑک پر سیدھے چلتے رہیں۔ الٹے ہاتھ پر کھجور کے دو درختوں کے درمیان کافی بڑا سا مکان ہے ـــــ اس پر ڈاکٹر صاحب کے نام کی تختی بھی لگی ہوئی ہے۔ کھڑکیوں پر لوہے کی گرلیں لگی ہوئی ہیں۔ اس کی سامنے کی دیوار لال اینٹوں کی ہے اور سامنے سبزے کی باڑھ بھی لگی ہوئی ہے۔" مولوی رشید نے کافی وضاحت سے بتا دیا۔

"بہت شکریہ۔" جمال صاحب نے کہا پھر چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہچکچاہٹ

کے ساتھ پوچھا "اس نوجوان کا انتقال کس طرح ہوا؟"

مولوی صاحب نے ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا پھر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر جھرجھری سے لیکر بولے۔ "بس جی ـــــ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی بھی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ شاید یہاں بھی ایک طرح کا عذاب نازل ہو رہا ہے۔ لوگ عجیب پراسرار انداز میں مر رہے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ یہ نوجوان بھی چند دن پہلے تک بھلا چنگا تھا۔ ایک دم ہی اس پر نہ جانے کسی بدروح کا سایہ ہوا۔ کوئی جیسے اس کے بدن سے لہو نچوڑنے لگا۔ چند دن کے اندر اندر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر بستر پر گرا اور پھر نہیں اٹھ سکا ـــــ آپ کے ڈاکٹر تحسین صاحب کا علاج بھی ہوا۔ ان کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔ بے چارہ شکل سے بے شکل ہوگیا ـــــ پھر سرکاری ڈسپنسری میں داخل کرا دیا۔ وہاں چند دن میں ہی خاموشی سے مرگیا۔ ابھی ہم اسے وہیں سے اٹھا کرلا رہے ہیں۔ کفن دفن کے لئے گھر لے جارہے ہیں۔"

"اوہ ـــــ بہت افسوس ہوا سن کر ـــــ" جمال صاحب نے حقیقتاً افسوس سے کہا۔ ان کے قریب کھڑے ڈرائیور نے بھی تاسف سے سر جھکا لیا۔ سارہ کے چہرے پر بھی افسردگی ابھر آئی۔

لوگوں نے چارپائی دوبارہ اٹھالی تھی۔ مولوی رشید صاحب ان کے ساتھ روانہ ہونے سے پہلے بولے "آپ آخری مرتبہ ڈاکٹر تحسین صاحب سے کب ملے تھے؟"

"تقریباً" دو سال پہلے۔" جمال صاحب نے جواب دیا۔

مولوی صاحب متاسفانہ سے انداز میں سرہلاتے ہوئے بولے۔ "پھر تو آپ اسے شکل سے ہی پہچان پائیں گے۔ گاؤں میں ہونے والی ہولناک اموات نے بے چارے ڈاکٹر صاحب کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی ہے۔ وہ دوسرے ڈاکٹروں سے بہت مختلف ہیں۔ وہ ایسی ہر موت کا صدمہ اس طرح دل پر لے رہے ہیں جیسے وہ ہر مرنے والے کے قریب ترین عزیز ہوں۔ یہ احساس ان کے لئے روح کا بوجھ بن گیا ہے کہ لوگ ان کے سامنے اس طرح مر رہے ہیں اور وہ اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کرپا رہے۔ حتیٰ کہ وہ تو لوگوں کو صحیح طور پر کوئی مشورہ بھی نہیں دے پا رہے کہ لوگوں کو اس طرح کی موت سے بچنے کیلئے کیا احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔"

"اوہ ـــــ" جمال صاحب صرف اتنا ہی کہہ سکے پھر انہوں نے ایک بوجھل سی سانس لی اور مولوی صاحب انہیں خدا حافظ کہہ کر چل دیئے۔ باقی لوگ چارپائی اٹھائے ان کے پیچھے تھے۔ وہ تینوں کچھ دیر وہیں کھڑے انہیں دیکھتے رہے حتیٰ کہ وہ لوگ سڑک سے اتر کر ایک گلی میں مڑے اور نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

تب جمال صاحب نے سارہ کی طرف دیکھا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔



"سارہ! میری جان ـــــ ایک بار پھر سوچ لو ـــــ یہاں جو مسئلہ درپیش ہے میرا خیال ہے اس میں الجھنا اور اس کا حل تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہم اب بھی واپس جاسکتے ہیں۔"

"ڈیڈی ـــــ! آپ میرے ڈیڈی ہیں ـــــ مجھے آپ سے ایسی مایوسی اور کم ہمتی کی بات سننے کی امید نہیں تھی ـــــ" سارہ ہمیشہ سے بھی زیادہ مضبوط اور پر اعتماد لہجے میں بولی "یہاں تک آنے کے بعد بھلا ہم کیسے واپس جاسکتے ہیں۔؟ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ہمیں صرف ڈاکٹر تحسین نے ہی مدد کے لئے نہیں بلایا بلکہ بہت سے بے وسیلہ' مجبور اور اذیت و جہالت کے مارے لوگوں کی روحیں ہمیں مدد کے لئے پکار رہی ہیں۔ ہم ان سے پیٹھ موڑ کر ان کی پکار ان سنی کر کے نہیں جاسکتے۔"

جمال صاحب نے فخر اور محبت سے بیٹی کی طرف دیکھا پھر خاموشی سے پجیرو میں جا بیٹھے۔ سارہ بھی بیٹھ چکی تو ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھال کر گاڑی سٹارٹ کی۔ ڈاکٹر تحسین کا مکان تلاش کرنے میں انہیں کوئی دشواری نہ ہوئی لیکن جب گاڑی اس مکان کے سامنے آکر رکی تو چند لمحے کے لئے باپ بیٹی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی اسے تکتے رہ گئے۔ وہ مکان بس گویا بربادی کا مسکن تھا جس کے درو دیوار پر موت سایہ فگن تھی۔

○

اس مکان کے درو دیوار رنگ و روغن سے محروم تھے اور ان پر گرد جمی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے گو کہ چھوٹا سا لان اور باڑھ بھی موجود تھی۔ لیکن وہ جھاڑ جھنکاڑ میں تبدیل ہوچکی تھی۔ سارہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ڈاکٹر تحسین خود بھی ایک نفاست پسند آدمی تھا اور اس کی بیوی آسیہ بھی نہایت صفائی پسند اور سلیقہ شعار عورت تھی لیکن اس مکان کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ اس مکان میں ایسے میاں بیوی رہتے تھے بلکہ درحقیقت یہ کہنا ہی مشکل تھا کہ اس مکان میں کوئی رہتا بھی تھا۔ وہ تو ویرانی کی علامت لگتا تھا۔

جمال صاحب کے ڈرائیور نے گاڑی سے اتر کر دروازے پر دستک دی۔ جمال صاحب اور سارہ بھی گاڑی سے اتر آئے۔ دستک کا کوئی جواب نہ ملا تو ڈرائیور نے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس بار دروازے کے عقب میں کچھ کھڑبڑ سی ہوئی لیکن کوئی باہر نہیں آیا۔ ڈرائیور نے پلٹ کر سوالیہ سی نظروں سے جمال صاحب کی طرف دیکھا گویا پوچھ رہا ہو۔ "اب کیا کروں؟"

جمال صاحب نے اسے ایک بار پھر دستک دینے کی ہدایت کی۔ اس بار ڈرائیور نے ذرا زور سے دستک دی تو ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ ذرا سا کھلا۔ شاید وہ بیٹھک کا دروازہ تھا۔ اندر ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس ملگجے اندھیرے کے غلاف سے ایک زرد رو عورت نے سر نکال کر جھانکا۔ اس کے خدوخال پر گویا صدیوں کی تھکن تھی۔ اس نے چندھیائی ہوئی سی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا مگر اس کا ذہن گویا کہیں اور تھا۔ وہ تھکی تھکی اور بیزاری آمیز سی آواز میں بولی۔ "ڈاکٹر صاحب اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔"

اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور وہ دنیا سے بیزار معلوم ہوتی تھی۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی عدم موجودگی کی اطلاع دیتے ہی دروازہ بند کر لینا چاہتی تھی مگر اسی لمحے سارہ ڈاکٹر جمال صاحب کے عقب سے نکل کر آگے بڑھی اور حیرت و بے یقینی سے بولی "آسیہ——! یہ تم ہو؟"

"آپ—— آپ کون ہیں؟" آسیہ نے اب اپنی چندھیائی ہوئی سی آنکھیں پوری طرح کھول کر دیکھا اور دروازہ بھی ذرا زیادہ کھول دیا۔ اب اس کا چہرہ پوری طرح روشنی میں آگیا۔ جمال صاحب بھی آسیہ سے بہت اچھی طرح واقف تھے لیکن اس وقت انہیں اپنی



آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ پریشان حال اور وحشت زدہ عورت درحقیقت وہی لڑکی تھی جو سارہ کی سب سے دلکش، زندگی کا جوش و خروش رکھنے والی ایک زندہ دل دوست تھی۔

دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔ خوشی کے مارے آسیہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگے اور وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی۔ "بہت اچھا ہوا تم آگئیں سارہ! میں بتا نہیں سکتی کہ اس وقت تمہیں اور انکل کو دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ کوئی اب یہ دیکھنے آئے گا کہ ہم کس حال میں ہیں۔"

پھر وہ بطور خاص جمال صاحب سے مخاطب ہوئی۔ "خصوصاً" آپ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ ہمارے لئے وقت نکالیں گے۔ آپ اتنے مصروف ہیں۔ آپ کا وقت اتنا قیمتی ہے۔"

"کسی بھی انسان کا وقت رشتے ناتوں، دوستی اور واسطے سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتا۔ آسیہ بیٹی!" جمال صاحب شفقت سے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ "یہ تم کیسی تکلیف آمیز سی باتیں کر رہی ہو؟ ہم نے یہاں آکر تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ تحسین نے ہمیں بلایا اور ہم چلے آئے۔ ویسے بھی ہمارا تم دونوں سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔ یقین کرو کتنے عرصے بعد تم سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے——"

ڈاکٹر جمال کہتے کہتے رہ گئے۔ "یہ تمہاری حالت کیا ہو رہی ہے؟ تم نے اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟ اس مکان کے درو دیوار پر وحشت کیوں برس رہی ہے؟" انہوں نے خود کو یہ سب کچھ کہنے سے باز رکھا۔ انہیں یکدم ہی خیال آگیا تھا کہ جو انسان پہلے ہی مایوسی اور دل شکستگی کا شکار دکھائی دے رہا ہو، اس سے ملتے ہی اس کی حالت کی نشاندہی کرنا اور اس بارے میں افسوس زدہ انداز میں سوالات کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔ اس طرح اس انسان کی مایوسی اور دل شکستگی میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ اس قسم کی باتیں ذرا ٹھہر کر اور موقع مناسب دیکھ کر ہی پوچھنی چاہئیں۔

آسیہ انہیں اندر لے گئی۔ مکان گاؤں دیہات کے عام مروجہ اور متوقع معیار سے بہتر بنا ہوا تھا اور کچھ ایسا تنگ و تاریک بھی نہیں تھا۔ مگر دروازے کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے اس میں روشنی ہوا کا گزر کم تھا۔ لگتا تھا کہ ابتداء میں اس کی سجاوٹ اور ساز و سامان سے اسے آراستہ کرنے کے سلسلے میں بھی کافی اہتمام کیا گیا تھا لیکن اب جیسے عرصے سے گھر کی کسی چیز کی طرف کسی کی توجہ نہیں تھی۔ پورے مکان پر عجیب سی ویرانی اور وحشت برس رہی تھی۔ ہر چیز اس طرح گرد آلود تھی جیسے اسے مہینوں سے صاف نہ کیا گیا ہو۔ گھر کی فضا دل کو پژمردہ کرنے والی تھی۔ گلدانوں میں پھول نہ جانے کتنا عرصہ پہلے سوکھ چکے تھے اور آسیہ کے رخساروں کے گلاب بھی انہی پھولوں کی طرح بے کیف ہو چکے تھے۔

تازگی سے محروم دکھائی دے رہے تھے۔"

مکان کا جائزہ لینے کے بعد جمال صاحب کی نظر آسیہ پر رکی تو انہوں نے دیکھا اس کی کلائی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکے۔ "یہ کیا ہوا ہے؟ کوئی زخم آگیا ہے یا چھوٹ لگی ہے؟"

"بس ــــ وہ ــــ ذرا سا کٹ گیا تھا ــــ" آسیہ نے مبہم سے لہجے میں کہا اور بازو کو ذرا پیچھے کر لیا۔ جمال صاحب کو یوں لگا جیسے وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی ــــ کیسا زخم ہے؟ انفیکشن وغیرہ کا خطرہ تو نہیں ہے؟" جمال صاحب بولے۔

"جی نہیں ــــ ایسی پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ــــ" پھر اس نے پھیکی سے مسکراہٹ کے ساتھ بات مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔ "یہ مت بھولیں کہ میرے شوہر بھی اچھے ڈاکٹر ہیں۔"

"ہاں ــــ سنا تو میں نے بھی ہے۔" جمال صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

آسیہ نے محسوس کیا کہ سارہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے زرد گالوں پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ وہ خود بھی اپنے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ "آپ لوگ اتنے غیر متوقع طور پر آگئے کہ میں تیار بھی نہیں ہو سکی۔"

"تمہیں اس پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ــــ" سارہ اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولی۔ "اپنوں کو انسان ہر حال میں اچھا لگتا ہے ــــ اور اب ہم آگئے ہیں ــــ ہم تمہارا حال بھی صحیح کر دیں گے اور اس گھر کا بھی ــــ"

ڈرائیور نے ان کا سامان اندر لا رکھا تھا۔ آسیہ نے سامان ایک کمرے میں رکھوایا اور ڈرائیور کو پچھلے صحن کی طرف بنے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں ٹھہرا دیا۔ جمال صاحب اور سارہ کے لئے اس نے اپنی خوابگاہ سے متصل کمرہ مخصوص کر دیا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ آسیہ نے چائے اور دیگر لوازمات سے ان کی خاطر تواضع کی۔ اس کے فوراً بعد ہی سارہ اس کے ساتھ گھر کی فرد کی طرح صفائی ستھرائی میں جت گئی۔ آسیہ کچھ شرمندہ بھی نظر آئی اور اصرار کرنے لگی کہ وہ اکیلی ہی صفائی کر لے گی مگر سارہ نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ آسیہ گویا وضاحتیں بھی پیش کرتی رہی کہ کچھ عرصے سے وہ اپنے کچھ گھریلو مسائل اور گاؤں کے حالات کی وجہ سے گھر کی حالت پر توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔

جمال صاحب سوچ رہے تھے ایک عام خیال یہ تھا کہ گاؤں کی آب و ہوا وغیرہ صحت کے لئے بہتر ثابت ہوتی تھی لیکن آسیہ تو گاؤں کی فضا میں برسوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھی۔ جمال صاحب نے دو برس پہلے جب اسے آخری بار دیکھا تھا تو وہ ایک صحت مند اور چاق و چوبند لڑکی تھی۔ اس کی خراب حالت کی وجہ یقیناً" گاؤں کی آب و ہوا نہیں بلکہ



[...]ں کے پراسرار حالات تھے۔

صفائی ستھرائی سے فارغ ہو کر نہا دھو کر جب تینوں افراد دوبارہ بیٹھک' جسے ازراہ [...]ف ڈرائنگ روم بھی کہا جاسکتا تھا میں جمع ہوئے تو جیسے مکان پر سے نحوست اور عجیب [...]م کا بوجھل پن کچھ کم ہو چکا تھا۔

جمال صاحب بولے۔ "بھئی ہمیں آئے ہوئے اتنی دیر ہوگئی اور ابھی تک تحسین نظر [...]یں آیا۔ وہ کہاں ہے؟"

"جس طرح ہسپتال میں ڈیوٹی دینے والے ڈاکٹر اپنے راؤنڈ پر آتے ہیں بالکل اسی [...]ح تحسین بھی بڑی باقاعدگی سے دن میں دو تین مرتبہ بغیر کسی فیس اور بغیر کسی بلاوے [...] گاؤں میں مریضوں کو دیکھنے راؤنڈ پر جاتے ہیں۔ جو مریض ان کے کلینک پر نہیں آسکتے' [...]ہیں انہیں دیکھنے خود ان کے گھر جا پہنچتے ہیں۔ آسیہ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"کیاں یہاں مریض بہت زیادہ ہوتے ہیں؟" تحسین بہت مصروف رہتا ہے؟ جمال صاحب نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

"نہیں ــــ مریض تو کچھ ایسے زیادہ نہیں ہوتے ــــ" آسیہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔ [...]ں تحسین کو خود ہی اپنے لئے کام بڑھانے کا شوق ہے۔ کچھ عرصے سے لوگ یہاں کافی [...]نیوں میں مبتلا ہیں ــــ اور تحسین کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کی پریشانیوں اور مسائل کو [...]ے دل پر لیتے ہیں۔ وہ ان میں کچھ اس طرح الجھ جاتے ہیں کہ ان کی ذاتی زندگی' گھربار' [...] کچھ متاثر ہوتا ہے۔"

"اوہ ــــ ایک ڈاکٹر کے لئے یہ تو کچھ اچھی بات نہیں۔" جمال صاحب بولے۔

"دنیاوی اعتبار سے وہ ابھی تک ایسے صحیح ڈاکٹر نہیں بن سکے۔" آسیہ کے لہجے میں [...]ت نہیں تھی۔ وہ سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "لیکن مجھے اس کا افسوس نہیں ہے۔ [...]ی سوچ کر ان کا ساتھ دیتی ہوں اور یہاں گاؤں میں بہت سی پریشانیوں کا سامنا کر رہی [...] کہ دنیا میں کچھ لوگ تحسین جیسے بھی تو ہونے چاہئیں۔ روپیہ کمانے کی دھن میں مگن' [...]رضی میں مبتلا اور اپنے اردگرد کے لوگوں کے دکھ درد سے بے خبر تو بے شمار لوگ [...] ہیں۔"

"تم بالکل ٹھیک سوچتی ہو۔" جمال صاحب تحسین آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے [...]ے بولے۔ "مجھے تم پر بھی فخر ہے اور تحسین پر بھی ــــ"

"بس مجھے فکر صرف اس بات کی رہتی ہے کہ تحسین اپنی برداشت سے زیادہ بوجھ [...]دل اور دماغ پر نہ لیں۔" آسیہ قدرے مغموم سے انداز میں سر جھکاتے ہوئے بولی۔ "[...]بھی مجھے یوں لگتا ہے کہ انہوں نے حالات کو اور لوگوں کی پریشانی کو کچھ زیادہ ہی [...]دل پر لے لیا ہے۔ وہ جیسے خود کو ــــ اس گھر کو ــــ اپنی ذاتی زندگی کی ذمے داریوں

کو بالکل فراموش کر بیٹھے ہیں۔ اپنے آپ سے بیگانہ ہوگئے ہیں۔ میری اپنی صحت کچھ ٹھیک نہیں رہتی لیکن مجھے زیادہ فکر ان کی ہے۔"

جمال صاحب مسکرا دیئے۔ آسیہ ایک روایتی مشرقی اور وفا شعار بیوی کی طرح خود سے زیادہ شوہر کی فکر میں گھل رہی تھی حالانکہ اس کی اپنی حالت بھی توجہ طلب تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے بھی خاصی نگہداشت۔۔۔ بلکہ تیمارداری کی ضرورت تھی۔

پھر آسیہ نے گویا جمال صاحب کو تسلی دی۔ "وہ جلدی آجائیں گے۔ کافی دیر سے گئے ہوئے ہیں۔"

جمال صاحب نے طمانیت سے سرہلا دیا۔ انہیں اس بات سے کوئی پریشانی نہیں تھی کہ تحسین گھر پر نہیں تھے۔ اب جبکہ وہ اپنی اہم مصروفیات اور ہنگامہ خیز شب و روز کو کچھ عرصے کے لئے خدا حافظ کہہ ہی آئے تھے تو بالکل مطمئن اور پرسکون ہو کر بیٹھنا چاہتے تھے۔ انہیں کہیں جانے کی جلدی نہیں تھی اور وہ کسی تشویش یا انتظار میں اپنے اعصاب کشیدہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ تاہم انہوں نے بہتر سمجھا کہ دونوں لڑکیوں کو کچھ دیر تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس لئے وہ مکان دیکھنے کا بہانہ کرکے ٹہلنے کے سے انداز میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے سیڑھیوں کے ذریعے اوپر چھت پر چلے گئے اور وہاں سے گاؤں کا نظارہ کرنے لگے۔

ان کی آنکھیں شہر کی بلند و بالا عمارتیں اور گاڑیوں کا ہجوم دیکھنے کی عادی تھیں اور کان ہروقت گھرگھراتے انجنوں اور چیختے ہارنوں کی آوازیں سننے کے عادی ہو چکے تھے لیکن کچھ عرصے سے ان کی طبیعت ان چیزوں سے کچھ زیادہ ہی اکتانے لگی تھی۔ شہر اونچی اونچی عمارتوں کا ایک بے ہنگم جنگل معلوم ہونے لگا تھا جہاں زندگی کی اصل خوشی ناپید تھی۔ عمارتیں گویا عمارتیں نہیں۔ سیمنٹ لوہے اور شیشے سے بنے ہوئے مقبرے تھے۔ جن کے درمیان زندگی کی اصل روح سے محروم لوگ روبوٹس کی طرح چلتے پھرتے تھے۔

اب ان کے سامنے ایک مختلف نظارہ تھا۔ مکانات کچے پکے اور چھدرے تھے۔ ٹریفک کا شور نہیں تھا۔ سڑکیں اکا دکا ہی پکی تھیں۔ سبزہ زیادہ تھا۔ گاڑیوں اور انسانوں کا ہجوم نہیں تھا۔ یہ سارا منظر اور یہاں کی خاموشی بھلی لگ رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں یہاں کی فضا میں ایک قسم کی سوگواری کا احساس بھی تھا۔ گھروں کے درو دیوار پر جیسے افسردگی سایہ کئے ہوئے تھی۔ جمال صاحب کا دل جیسے کسی انجانی خوشی اور ایک عجیب اطمینان کا متلاشی تھا مگر یہ چیزیں گویا یہاں بھی نہیں تھیں۔ لگتا تھا کہ ان کے دل کی تشنگی یہاں بھی ان کی ہم سفر رہے گی۔

انہوں نے دیکھا کچھ دور سڑک کے کنارے ایک خاصا معقول سا ریستوران بھی تھا۔ اس کی پیشانی پر جلی حروف میں "غریب نواز ہوٹل" لکھا تھا۔ شہر میں بھی زیادہ تر کھانے



چائے پانی کے ایسے اڈوں کو ہوٹل ہی کہا جاتا تھا۔ ریستوران کچھ ایسا شاندار تو نہیں تھا اسے "چھپر ہوٹل" بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ جمال صاحب نے لوگوں کی ایک بڑی ٹولی اس ریستوران کی طرف جاتے دیکھا۔ ان میں بیشتر لوگ وہی تھے جنہیں جمال صاحب آتے وقت راستے میں میت کے ساتھ دیکھا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ مرنے والے کی تدفین کر آئے تھے۔ انہوں نے اس کام میں یقیناً" بڑی عجلت دکھائی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ آج گاؤں میں مرنے والے کی لاش کو زیادہ دیر گھر میں نہیں رکھتے تھے اور جلد از جلد اسے دیتے تھے۔ وہ لوگ سر جھکائے آگے پیچھے اس ریستوران میں چلے گئے۔

جمال صاحب نیچے آئے۔ لڑکیاں کچن میں تھیں اور وہیں سے ان کے باتیں کرنے کی آ رہی تھی۔ شاید وہ کھانا وغیرہ تیار کرنے میں لگ گئی تھیں۔ جمال صاحب نے بہ بلند کہا۔ "بھئی میں ذرا سامنے سڑک کا جائزہ لینے جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں آ جاؤں" جواب کا انتظار کئے بغیر وہ گھر سے نکل گئے۔

ٹہلنے کے انداز میں چلتے ہوئے وہ ریستوران میں جا پہنچے۔ انہوں نے بارہا دیکھا تھا کہ ن کے بعد جنازے کے شرکاء مرنے والے کے گھر لوٹ آتے تھے اور وہاں کھانے کا ام ہوتا تھا جو کوئی قریبی عزیز دوست یا محلے دار کرتا تھا۔ لوگ کچھ دیر پہلے کی افسردگی غم و اندوہ کو بھول کر کھانے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ بعض لوگ تو بہ آواز بلند سالن میں سی بوٹی کی فرمائش کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ شاید اسی کا نام زندگی تھا۔ قبرستان طرف سے منہ پھیرتے ہی زندگی کی ہماہمی شروع ہوجاتی تھی۔ صرف مرنے والے کے فین اور پسماندگان کے دلوں پر حسب حالات دکھ کا بوجھ رہ جاتا تھا۔

لیکن اس مرنے والے کے گھر پر شاید کھانے کا انتظام نہیں تھا۔ اس لئے کوئی ان کو ریستوران میں لے آیا تھا۔ ان کی آمد سے ریستوران میں بڑی رونق ہوگئی تھی۔ اور کھانوں وغیرہ کے آرڈر دیئے جارہے تھے۔ جمال صاحب کو ایک میز پر وہ نوجوان آیا جسے جمال صاحب نے میت کے ساتھ سب سے زیادہ غمزدہ دیکھا تھا اور لاش چارپائی کر جانے کے بعد جس کی نیاز علی کے ساتھ جھڑپ ہوتے ہوتے بھی رہ گئی تھی۔ اس ن کو محمد علی کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا اور جمال صاحب کو پتا چلا تھا کہ وہ مرنے کا بھائی تھا۔

اس کے قریب ایک کرسی خالی تھی۔ جمال صاحب اسی پر جا بیٹھے۔ انہیں دیکھ کر کئی باتیں کرتے کرتے خاموش ہوگئے تھے اور ان کی متجسس نگاہیں جمال صاحب کا جائزہ لی تھیں۔ جمال صاحب نے سوچا تھا کہ شاید محمد علی کے قریب بیٹھ کر اس سے راہ و بڑھانے کی کوشش کرکے وہ اس کے بھائی کی موت کی وجوہات کے بارے میں کچھ سکیں۔ محمد علی نے ان کے سلام کا جواب تو دے دیا لیکن ذرا بھی گرمجوشی کا مظاہرہ

نہیں کیا۔ وہ غمزدہ تو یقیناً تھا لیکن اس کی غمزدگی عجیب سی تھی۔ وہ ساری دنیا سے خفا خفا سا دکھائی دے رہا تھا۔

"میں اس گاؤں میں مہمان ہوں۔۔۔" جمال صاحب دھیمی آواز میں بولے۔ "مجھے تمہارے بھائی کی موت کا بہت افسوس ہے۔۔۔ اور ہمارے اس گاؤں میں آتے وقت نیاز علی کی وجہ سے جو واقعہ پیش آیا مجھے اس پر بھی افسوس ہے۔ میں تم سے معذرت خواہ بھی ہوں اور مجھے تم اپنے غم میں بھی شریک سمجھو۔"

"آپ کی مہربانی ہے جی۔۔۔ بہرحال کسی کی بھی ہمدردی اب میرے بھائی کو واپس نہیں لا سکتی۔" محمد علی کا لہجہ اب بھی اکھڑا اکھڑا سا تھا۔

محمد علی کے دائیں بائیں دو آدمی بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے کھانا آ چکا تھا۔ انہوں نے محمد علی کو بھی کھانے میں شریک کرنے کی کوشش کی لیکن محمد علی ان کے اصرار کے باوجود آمادہ نہ ہوا۔

"میں صرف چائے پیوں گا۔" وہ بولا۔ "میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"مجھے تمہارے غم کا اندازہ ہے۔۔۔" جمال صاحب ایک بار پھر ملائمت سے بولے۔ "لیکن زندگی بہرحال اسی کا نام ہے۔ کبھی غم کبھی خوشی۔۔۔ میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ تم کھانا کھا لو۔ تمہارے چہرے سے نقاہت ظاہر ہو رہی ہے اور لگ رہا ہے کہ تم نہ جانے کب سے بھوکے ہو۔"

"ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا جناب! جب دل چاہے گا کھا لوں گا۔" نوجوان کے لہجے میں کھردرا پن اب کچھ کم ہوگیا تھا۔ بیرے نے چائے اس کے سامنے لا رکھی تھی۔

دفعتاً جمال صاحب نے قریبی میز سے ایک آواز سنی۔ ان کی طرف پشت کئے ایک شخص کسی سے مخاطب تھا۔ "قسم سے میں نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی۔۔۔ تم سب لوگ گواہ ہو کہ میں نے اس کے علاج میں رات دن ایک کر دیا تھا۔ مجھے خود بڑا دکھ ہے کہ میں اسے نہیں بچا سکا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔"

جمال صاحب اپنی جگہ ساکت سے ہوگئے۔ وہ اس آواز کو پہچان گئے تھے۔ وہ یقیناً ڈاکٹر تحسین تھا۔ شاید وہ ریستوران میں پہلے سے موجود تھا۔ اب اسی کے گرد لوگوں کا زیادہ ہجوم تھا۔ لوگ بے ترتیب سے کرسیاں کھینچے جمگھٹا بنائے میزیں بھی ایک دوسرے کے قریب کئے بیٹھے تھے۔ جمال صاحب نے فوراً اٹھ کر تحسین سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ فی الحال لوگوں میں غیر نمایاں اور خاموش رہ کر ان کی باتیں سننا چاہتے تھے۔ انہیں امید تھی کہ لوگوں کے تبصروں سے ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

اس میز پر ایک اور شخص بولا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ کے خیال میں اسے بیماری کیا تھی؟ اس کی موت کی وجہ کیا تھی؟"



یہ بات محمد علی نے بھی سن لی تھی۔ وہ اس میز کی طرف گردن گھماتے ہوئے تلخ سے ... میں بولا۔ "ڈاکٹر صاحب سے صرف میرے بھائی کی موت کی وجہ کیوں پوچھ رہے ہو۔ ... سے ان سارے کے سارے آدمیوں کی موت کی وجہ پوچھو جو اس سے پہلے مر چکے ... میرے بھائی سمیت سب کے سب کیسے کڑیل اور خوبصورت جوان تھے۔ ابھی تو ان ... سے کسی کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے پوچھو تھوڑے دنوں کے اندر ... باری باری ان سب کو کون سی بیماری کھا گئی؟"

محمد علی کی آواز گو کہ بلند نہیں تھی لیکن اس میں ایک عجیب سا غم و غصہ، مجبوری ... لاہٹ اور بے عنوان سا درد تھا۔ ریستوران میں ایک لمحے کے لئے سکوت چھا گیا۔ ... کی بھنبھناہٹ بھی بند ہوگئی۔ تاہم ڈاکٹر تحسین نے محمد علی کی آواز سن کر بھی گھوم کر ... کی طرف نہیں دیکھا۔ شاید اس میں محمد علی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

... وہ جب بولا تو اس کے لہجے میں بے بسی اور شکست خوردگی تھی۔ "میں مانتا ہوں مجھے ... ف ہے کہ مجھے ان کی موت کا سبب نہیں معلوم۔۔۔ میں کچھ نہیں جان سکا۔۔۔ میں ... طور پر کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔"

"تمہیں کچھ معلوم نہیں اور تم خود کو ڈاکٹر کہلواتے ہو!" اسی کی میز پر سے کوئی شخص ... سے انداز میں بولا۔

اب شاید تحسین کو بھی غصہ آ گیا۔ اس کے اعصاب پہلے ہی کشیدہ معلوم ہوتے تھے۔ ... شاید یکدم ہی اس کا اعصابی تناؤ اس کی برداشت سے باہر ہوگیا۔ وہ برہمی سے تقریباً ... ا۔ "ہاں۔۔۔ میں چونکہ سچ بولنے کا عادی ہوں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے کچھ نہیں۔۔۔ تم لوگ ہر معاملے میں جھوٹ سننے کے عادی ہو گئے ہو۔ اس لئے جھوٹ ... یر تمہاری تسلی نہیں ہوتی۔ کاش تم لوگوں نے مجھے ایک بھی لاش حیدر آباد لے جانے ... اں اس کا پوسٹ مارٹم کرانے کی اجازت دی ہوتی تو شاید کچھ معلوم ہو جاتا مگر جاہلوں ... ٹ مارٹم کی اہمیت کا کیا پتا۔۔۔"

ایک اور شخص بولا۔ "یہ پوسٹ مارٹم۔۔۔ یہ مردوں کی چیر پھاڑ سب بے کار باتیں ... مردوں کی بے حرمتی کے سوا اس سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ مرنے والے کے عزیزوں ... داروں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ جب تم ڈاکٹر لوگ مریض کی زندگی میں ہی اس کی ... کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کرسکتے تو مرنے کے بعد کیا کرو گے۔"

ڈاکٹر تحسین تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اب تو میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا ... شاید میں نے یہاں آ کر غلطی کی تھی۔ میں تم جیسے لوگوں کے ساتھ مغزماری کر کے ... ی خراب کر رہا ہوں۔ تمہارے خیالات میں کوئی بہتری نہیں آ سکتی۔ جعلی ڈاکٹر، بغیر ... لے حکیم اور چھوٹے موٹے ڈسپنسر یا عطائی تم لوگوں کو الٹی سیدھی باتیں بتا دیتے ہیں

تو تم ان پر یقین کر لیتے ہو لیکن ایک کوالی فائیڈ ڈاکٹر اگر ایمانداری سے ایک بات تسلیم کر لیتا ہے تو تم سمجھتے ہو کہ اس میں تو کوئی قابلیت ہی نہیں ہے۔"

اب محمد علی اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈاکٹر تحسین کے قریب چلا گیا اور بولا۔ "آج تک میرے بھائی سمیت ہم پندرہ خوبصورت اور کڑیل جوانوں کو قبرستان میں دفن کر چکے ہیں۔ تقریباً" ہر مہینے ایک آدمی مرجاتا ہے۔ ایک سال میں پندرہ موتیں ہوئی ہیں۔ سب کے سب جواں مرگ تھے۔ تم نے تو کسی کو بچا سکے اور نہ کسی کی بیماری جان سکے۔ اس کے باوجود تم کہتے ہو کہ تم شہر کے پڑھے لکھے ڈگری یافتہ اور ایک قابل ڈاکٹر ہو۔ تمہاری قابلیت ہمارے کس کام کی ——"

ڈاکٹر تحسین اس سے مرعوب ہوئے بغیر سخت لہجے میں بولا۔ "بعض اوقات قابلیت بھی کسی کام نہیں آتی۔ شہروں میں جہاں ہزاروں قابل ڈاکٹر موجود ہوتے ہیں کیا وہاں موتیں نہیں ہوتیں؟ کیا میرے آنے سے پہلے یہاں کوئی نہیں مرا تھا؟ میرے آنے سے پہلے جو مرے تھے کیا ان کی موت کا بھی میں ذمے دار تھا؟ کیا میرے علاج سے آج تک بہت سے لوگ صحت یاب نہیں ہوئے؟ بہت سے لوگ موت کے منہ میں جاتے جاتے نہیں بچے' یہاں جتنے بھی لوگ بیٹھے ہیں کیا ان سب کو کبھی نہ کبھی میرے علاج سے فائدہ نہیں ہوا؟"

سب کے سب چپ رہے۔ ڈاکٹر تحسین نے غصیلے انداز میں سلسلہ کلام جوڑا۔ "میں تو خدمت کے جذبے کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ لوگوں کی تکلیفیں کم کرانے کے لئے میں نے دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ رات کے دو بجے بھی کسی نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا تو اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ کبھی اپنی کوئی فیس مقرر نہیں کی۔ جس نے جو دیا خاموشی سے رکھ لیا۔ جو کچھ بھی نہیں دے سکتا تھا اس کے علاج سے بھی کبھی انکار نہیں کیا۔ اسے پلے سے دوائیں دیں اور گھر جا جا کر بھی دیکھتا رہا۔ آج میری خدمات کا یہ صلہ مل رہا ہے کہ سب مجھے آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ تم لوگ احسان فراموش ہو۔ میں نے غریبوں' ان پڑھوں اور کم وسائل رکھنے والے لوگوں کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کا جو عہد کیا تھا اب میں ذرا نئے سرے سے اس کے بارے میں سوچوں گا۔ شاید میں بہ حالت مجبوری اپنا عہد ہی توڑ دوں—— یا کم از کم کسی اور جگہ چلا جاؤں جہاں کے لوگ کچھ مردم شناس اور احسان کے قدر کرنے والے ہوں۔"

محمد علی اب کافی دھیمے لہجے میں بولا۔ "اس سے پہلے جو لوگ مرتے تھے' کم از کم ہمیں ان کی موت کی وجہ تو معلوم ہو جاتی تھی۔"

"اگر یہ عام اور فطری موتیں ہوتیں تو اب بھی وجہ معلوم ہوجاتی——" تحسین بھی ذرا ٹھنڈا پڑتے ہوئے بولا۔ جمال صاحب اس کے عقب سے بھی اس کا ہاتھ دیکھ سکتے تھے جس میں اس نے چائے کا کپ تھاما ہوا تھا۔ اس ہاتھ میں کپکپاہٹ تھی۔ پہلے کے مقابلے



اب وہ نقاہت زدہ تو دکھائی دے ہی رہا تھا لیکن اس وقت جذباتیت کا بھی شکار تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں چاہتا تو میں بھی جعلی ڈاکٹروں' جعلی حکیموں کی طرح تم لوگوں سے کہہ سکتا تھا کہ یہ موتیں طاعون' دلدلی بخار' وبائی بخار سے ہوئی ہیں یا مریض کے گردوں سے گیس نکل کر اس کے دماغ کو چڑھ گئی تھی یا اس کے دماغ میں عرق النساء ہوگیا تھا—— یا اس کو ایک ساتھ ٹی بی' خناق' ملیریا' پیلیا اور گردن توڑ بخار ہوگیا تھا۔ کسی جعلی عامل یا جھوٹے پیر فقیر کی طرح میں یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ اس پر جنات کا قبضہ ہوگیا تھا یا کوئی چڑیل اس سے ناراض ہو گئی تھی۔ پھر تم لوگوں کی تسلی ہو جاتی۔"

کئی افراد نے شرمندہ سے انداز میں سر جھکا لیا۔ وہ گویا کھانا بھی بھول گئے تھے۔ صرف دو تین افراد دھیرے دھیرے گویا بادل ناخواستہ منہ چلا رہے تھے۔ کاؤنٹر سے بھی ایک بھاری بھر کم سا شخص اٹھ کر میزوں کے قریب آگیا تھا۔ شاید وہ ریستوران کا مالک تھا۔ آخر وہی ڈاکٹر تحسین کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے التجائیہ سے لہجے میں بولا۔ "ڈاکٹر صاحب! یہ کم پڑھے لکھے اور سادہ لوح ہیں۔ ان میں سے بعض تو بالکل ہی ان پڑھ ہیں۔ اپنے نوجوان عزیز و اقارب کی موت نے ان کے دماغ خراب کردیئے ہیں لیکن یہ دل کے برے نہیں ہیں۔ آپ انہیں معاف کر دیں۔"

حیرت انگیز طور پر اس وقت محمد علی بھی اچانک ہی ہاتھ جوڑ کر بول اٹھا۔ "ہاں ڈاکٹر صاحب! ہم بدتمیزوں' جاہلوں کو معاف کردیں۔ صدمے نے ہمیں اندھا کر دیا تھا—— لیکن یہ وقتی باتیں ہیں۔ آپ کے احسان بھلا ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔ آپ تو ہمارے گاؤں میں نیکی کا فرشتہ بن کر آئے ہیں ورنہ یہاں تو جو بھی آتا ہے ہمیں بیوقوف بنانے' ہمیں لوٹنے اور ہماری کھال اتارنے آتا ہے۔ ہمیں آپ کی محبت اور خلوص کا اندازہ ہے—— اور ہم اس کا کوئی صلہ نہیں دے سکتے——!"

اس کی آواز بھرا گئی اور وہ ڈاکٹر تحسین کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی اور بھی کئی لوگ اٹھ کر ڈاکٹر تحسین سے تقریباً" چمٹ گئے۔ کوئی اس کی ٹانگیں پکڑ رہا تھا' کوئی اس کا کندھا دبا رہا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا "ڈاکٹر صاحب آپ بھلا یہاں سے کیسے جا سکتے ہیں۔ آپ جس بس میں جائیں گے ہم اس کے آگے لیٹ جائیں گے۔ آپ یہ خیال بھی دل میں نہ لائیں کہ آپ یہاں سے جا سکتے ہیں۔"

جمال صاحب اٹھ کر اس میز کے قریب چلے گئے اور تب انہوں نے دیکھا ڈاکٹر تحسین کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ محمد علی سمیت گاؤں والوں میں سے بھی کئی اپنی آنکھیں پونچھ رہے تھے۔ یہ ایک جذباتی منظر تھا۔ جمال صاحب بھی اس کے اثرات محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے بھی اپنی آنکھوں میں نمی اور جسم میں ایک عجیب سی سنسنی محسوس کی۔

ان کے خیال میں اب جبکہ بگڑی ہوئی بات بن چکی تھی' اس صورتحال کو طول دینا

مناسب نہیں تھا۔ انہوں نے آگے بڑھتے ہوئے بہ آواز بلند تحسین کو مخاطب کیا۔
"برخوردار ڈاکٹر تحسین! تم یہاں بیٹھے ہو اور میں کب سے تمہارے گھر بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ چلو۔۔۔ اٹھو۔۔۔ جلدی چلو۔۔۔ گھر پہ سارہ اور آسیہ بھی تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔"

ڈاکٹر تحسین حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ اپنی جذباتیت کو بھول گیا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس میں گویا اٹھنے کی سکت نہیں تھی یا پھر شاید زیادہ حیرت کے باعث اسے خیال ہی نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ آخر جمال صاحب نے ہی اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اٹھاتے ہوئے اس کے گرد جمع لوگوں سے معذرت آمیز لہجے میں مخاطب ہوئے۔ "بھئی میں آپ کے ڈاکٹر تحسین کا ایک طرح سے استاد ہوں اور اس وقت اسی کے ہاں مہمان ہوں۔ اگر آپ لوگ برا نہ محسوس کریں تو میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں؟"

"ضرور۔۔۔ ضرور۔۔۔!" کسی نے کہا اور وہ سب پیچھے ہٹ گئے۔

جمال صاحب نے کاؤنٹر پر پہنچ کر پانچ سو کا ایک نوٹ مالک کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ سب لوگ جو کچھ بھی کھائیں پئیں گے اس کے پیسے اس میں سے کاٹ لینا۔"

ریستوران کا مالک نوٹ واپس کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ تو خود ہمارے مہمان ہیں۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کے مہمان ہیں تو سمجھو ہمارے مہمان ہیں۔ ہم آپ سے پیسے کیسے لے سکتے ہیں۔ میں خود آج ان سب لوگوں کو اپنی طرف سے کھانا کھلا رہا ہوں۔"

عقب سے بھی کئی افراد کی پر احتجاج آوازیں ابھریں۔ ان سب کا مفہوم یہی تھا کہ بھلا مہمان سے کوئی کیسے پیسے لے سکتا تھا۔ تب جمال صاحب نے ریستوران میں بیروں کے فرائض انجام دینے والے تین مفلوک الحال سے افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا۔۔۔ یہ پیسے ان میں میری طرف سے ٹپ کے طور پر تقسیم کر دینا۔"

یہ کہہ کر وہ نوٹ کاؤنٹر پر چھوڑ کر ڈاکٹر تحسین کا ہاتھ پکڑے تیزی سے ریستوران سے نکل آئے۔ وہ لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے تھے اور اپنے آپ کو ان لوگوں کی نظر میں ایک ہمدرد اور خوش اخلاق شخص کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے۔ انہیں صحیح طور پر اب بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے تھے یا نہیں۔۔۔ بہرحال انہیں امید تھی کہ اب گاؤں کے لوگوں کا رویہ ان کے ساتھ جارحانہ سا نہیں ہوگا۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ جمال صاحب ڈاکٹر تحسین کا ہاتھ تھامے اس کے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ "خدا کی پناہ تحسین۔۔۔! تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ تم اس قدر کمزور ہوگئے ہو۔ لگتا ہے ایک ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی تم خود اپنا خیال نہیں رکھتے اور نہ ہی آسیہ تمہارا خیال رکھتی ہے۔"



اس بے چاری کو تو خود توجہ اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔۔۔" تحسین پھیکی سی
اہٹ کے ساتھ بولا۔ "دراصل ہم دونوں ہی کافی دنوں سے کچھ پریشان رہے ہیں۔۔۔
آرام کی بھی کمی ہے۔۔۔ بہرحال۔۔۔ اللہ مالک ہے۔۔۔ حالات کبھی تو ٹھیک ہوں
۔۔۔ میں آسانی سے مایوس ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔" وہ یہ کہہ تو رہا تھا لیکن
کا لہجہ درحقیقت ایک مایوس انسان کا لہجہ تھا اور وہ خود کلامی کے سے انداز میں باتیں کر
تھا۔ وہ اپنے چہرے مہرے اور انداز گفتگو سے کچھ خبط الحواس سا بھی لگ رہا تھا۔

اچانک وہ آنکھیں سکیڑ کر جمال صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ باتیں تو ہوتی
گی۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ اچانک یہاں کیسے آن پہنچے؟"

جمال صاحب چلتے چلتے رک کر چند سیکنڈ کے لئے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے رہ
۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر تحسین کی ذہنی حالت واقعی تسلی بخش نہیں تھی۔ تاہم وہ
حیرت اور تشویش کو چھپاتے ہوئے خوشگوار لہجے میں بولے۔ "بھئی بوڑھا اور پروفیسر تو
ہوں لیکن غائب دماغی کا مظاہرہ تم کر رہے ہو۔ تمہاری یادداشت کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا
تم بھول گئے ہو کہ تم نے خود ہی خط لکھ کر مجھے بلایا تھا۔"

"ارے ہاں۔۔۔" تحسین نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "کیا واقعی میں اتنا غائب دماغ ہوتا
رہا ہوں؟" یہ سوال اس نے گویا اپنے آپ سے کیا تھا۔ پھر وہ معذرت خواہانہ سی
ہٹ کے ساتھ بولا۔ "مجھے اب یاد آگیا ہے۔۔۔ میں نے وہ بے ربط اور الٹا سیدھا
انتہائی عجلت اور پریشانی کے عالم میں لکھا تھا۔ اسے پوسٹ کرنے کے بعد مجھے خیال
ا کہ شاید آپ اس سے کوئی مطلب اخذ نہ کر سکیں اور شاید اسے پڑھنے کے بعد ردی
کری میں پھینک دیں۔۔۔ لیکن آپ نے نہ صرف میرا مقصد سمجھ لیا بلکہ آپ چلے
ئے۔۔۔ آپ واقعی ایک عظیم انسان ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے آپ کا
ادا کروں۔"

"اگر سمجھ میں نہیں آ رہا تو مت ادا کرو شکریہ۔۔۔ لیکن اپنی ذہنی حالت ٹھیک
کی کوشش ضرور کرو۔ مجھے تمہارے شکریئے کی نہیں، تمہاری صحیح الدماغی کی ضرورت
" جمال صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

اس وقت وہ گھر کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ جمال صاحب بولے۔ "رات کے
کے بعد ہم تخلیے میں بیٹھ کر بات کریں گے۔ پھر تم مجھے ذرا سکون، یکسوئی اور
سے بتانا کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔ تم کیوں اس قدر پریشان ہو۔"

○

یمونہ اپنی ضد پر قائم تھی کہ وہ ماں نہیں بنے گی۔

خالد نے برہمی کا اظہار تو کر کے دیکھ لیا تھا اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کی برہمی سے مرعوب نہیں ہو گی۔ بڑھیا والے واقعے کے بعد سے وہ یکسر ہی بدل گئی تھی۔ اسے گویا شہر کی زندگی' عیش و آرام' آسائشوں اور ٹھاٹ باٹ سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ ضد کرنے لگی تھی کہ انہیں حیدر آباد واپس چلنا چاہئے لیکن خالد کو اب واپس جانا تقریباً" ناممکن نظر آتا تھا۔ وہ یہاں کی زندگی' یہاں کی مصروفیات میں اس بری طرح الجھ چکا تھا کہ واپس جانا اب اسے اتنا ہی دشوار کام محسوس ہوتا تھا جتنا کسی تناور درخت کو اس کی جگہ سے جڑوں سمیت اکھیڑنا۔

اسے یہ بھی احساس تھا کہ وہ کس منہ سے صدرالدین صاحب کے پاس واپس جائے گا؟ اور اگر وہ ان کی فرم میں واپس نہ جاتا تو پھر اسے ایک نو آموز وکیل کی طرح نئے سرے سے پریکٹس شروع کرنا پڑتی اور یہ گویا زندگی کا سارا عمل ایک بار پھر صفر سے شروع کرنے کے مترادف تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس میں اب جمشید کو چھوڑ کر جانے کی جرات بھی نہیں تھی اور اس کا دل بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس نئی زندگی کا پوری طرح عادی ہو چکا تھا اور ان معمولات میں مکمل طور پر رچ بس گیا تھا۔

ادھر اس کے اہم ترین کیس کی سماعت شروع ہو چکی تھی جس میں شرافت علی ملزم تھا۔ اس پر انسانوں کو قتل کر کے ان کا خون پینے اور ان کی لاشوں کو ٹکڑے کرنے کا الزام تھا۔ خالد نے اسے بری کرانے کے لئے اپنی مخصوص حکمت عملی کے تحت اس کا دفاع شروع کر دیا تھا اور تمام ضروری انتظامات کر لئے تھے۔ اس نے کچھ ماہرین نفسیات کی رپورٹیں حاصل کر لی تھیں جن کے مطابق شرافت علی ذہنی طور پر کچھ پسماندہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک معزز خاتون کی شہادت تیار تھی جسے گواہی دینا تھی کہ پولیس نے شرافت کی گرفتاری کا جو وقت روزنامچے میں درج کیا تھا اس وقت تو شرافت علی اس خاتون کے بنگلے پر مالی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ پولیس نے اس کی ذہنی پسماندگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی نا اہلی چھپانے کے لئے وہ پراسرار کیس اس پر ڈال دیئے تھے جن میں وہ اصلی مجرم کو تلاش نہیں کر سکی تھی۔

خالد نے ان نکات کی بنیاد پر کیس لڑنا شروع کر دیا تھا۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں اور وقت آنے پر اسے اپنی تمام شہادتیں پیش کرنا تھیں۔ اسے یقین تھا کہ کیس زیادہ لمبا نہیں چلے گا اور وہ چند پیشیوں کے بعد ہی شرافت علی کو جیل سے باہر لانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ کیس کو عدالتوں کی مروجہ سست رفتاری سے ہٹ کر ذرا تیز رفتاری سے انجام تک پہنچانے کے لئے بھی انہوں نے اپنا اثرورسوخ استعمال کیا تھا اور قانونی موشگافیوں سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

اس طرف سے تو خالد پوری طرح مطمئن تھا لیکن میمونہ کی طرف سے بہت زیادہ بے



اطمینانی تھی۔ اس کی ضد جاری تھی اور اس کا رویہ بہت بدل گیا تھا۔ چونکہ خالد اس کی بات نہیں مان رہا تھا اس لئے اس کے رویئے میں کبھی سرکشی' کبھی ایک عجیب سا اڑیل پن اور کبھی بلا کی سرد مہری آجاتی۔ خالد کو اندیشہ تھا کہ جمشید ان ساری باتوں سے بے خبر نہیں ہوں گے۔

ایک روز اس کے اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔ جمشید نے اس شام اسے انٹر کام پر اپنے اپارٹمنٹ میں بلایا۔ وہ اوپر گیا تو کامران ایک پراسرار سائے کی طرح اپارٹمنٹ کے دروازے پر اس کا منتظر تھا۔ اس نے خالد کو جمشید کے اس کمرے میں پہنچا دیا جو ایک طرح کا آفس ہی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن خالد کو معلوم تھا کہ جمشید گھر پر عملاً" پیشہ ورانہ معاملات کے بارے میں بات نہیں کرتے تھے مگر اس روز خلاف توقع انہوں نے شرافت علی کیس کے بارے میں بات چیت شروع کر دی۔

جب وہ مطمئن ہوگئے کہ کیس صحیح ڈگر پر جا رہا تھا تو انہوں نے اچانک ہی میمونہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ خالد کو اندازہ ہو گیا کہ درحقیقت انہوں نے اسے اسی لئے بلایا تھا۔ جمشید ریوالونگ چیئر پر تھوڑا سا گھومتے ہوئے بظاہر سرسری سے انداز میں بولے۔ "سنا ہے میمونہ خوشی کی اس خبر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے جو خوش قسمتی سے اس کے حصے میں آئی ہے؟"

"جی ہاں ۔۔۔ کچھ ایسا ہی مسئلہ ہے۔" لیکن مجھے امید ہے میں اسے منا لوں گا۔"

"مگر مجھے یہ امید نہیں ہے۔" جمشید کا لہجہ خالد کو کچھ سرد اور سفاک سا محسوس ہوا مگر دوسرے ہی لمحے اس میں تبدیلی آگئی اور وہ ملائمت سے بولے۔ "دراصل ہمارے حفاظتی انتظامات میں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ یہ سب کچھ اس بدبخت بڑھیا کی وجہ سے ہوا ہے۔"

"جی ہاں ۔۔۔ میں آپ کو یہی بتانے والا تھا۔" خالد جلدی سے بولا۔ اسے اس پر حیرت نہیں ہوئی تھی کہ جمشید کو یہ بات پہلے ہی سے معلوم تھی۔ یہ امکان تو کامران نے اسی روز ظاہر کر دیا تھا جس روز بڑھیا والا واقعہ پیش آیا تھا۔

جمشید بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "میرے اور میرے پیروکاروں کے گرد ایک غیر مرئی حفاظتی ہالہ ہر وقت موجود رہتا ہے جسے انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اس ہالے کی وجہ سے ہماری متضاد اور مخالف قوتیں ہم پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں ۔۔۔ لیکن کبھی کبھی ہماری کسی غلطی یا کچھ دیر کے لئے ہماری طاقت میں کچھ کمی آجانے کی وجہ سے کسی کسی کا ہالہ کمزور پڑ جاتا ہے اور موقع مناسب دیکھتے ہی کوئی مخالف قوت ہم پر اثر انداز ہو جاتی ہے۔ ہمیں بہت چوکس رہنا پڑتا ہے۔ ہم سے ذرا سی غلطی ہوتی ہے یا ذرا سی دیر کے لئے بھی ہماری طاقت میں کمی آجاتی ہے تو بعض اوقات کسی بہت اہم پروگرام میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ یہ جو گڑبڑ ہوتی ہے اس کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے۔ میمونہ کو خوشی کی اس خبر کو

تکمیل تک تو پہنچانا ہو گا۔ اس پروگرام کو اب ملتوی نہیں کیا جاسکتا——"

خالد دل ہی دل میں کچھ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جمشید اس مسئلے کا ذکر اور اس کے بارے میں تشویش کا اظہار کچھ اس طرح کر رہے تھے جیسے اس کا تعلق ان کی اپنی نجی زندگی سے تھا۔ یہ گویا ان کا اپنا مسئلہ تھا اور وہ اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے۔

"میں کوشش کروں گا سر——!"

جمشید نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں اب تک تمہاری کوششوں کے نتائج کا ہی انتظار کر رہا تھا لیکن اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تمہاری کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ میں تمہیں اس کا حل بتاتا ہوں۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"جی سر——!" خالد ہمہ تن گوش ہوگیا۔

جمشید ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگا کر ایک پنسل انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولے۔ "وہ جو اپنا خاص ہسپتال ہے نا—— اس میں سائیکاٹری وارڈ بھی ہے—— نفسیاتی مریضوں کو وہاں رکھا جاتا ہے۔ تم میمونہ کو چند دن کے لئے وہاں داخل کرا دو۔ اس کی نفسیات میں کچھ تبدیلی آ گئی ہے—— کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے—— لیکن اس ہسپتال میں نفسیاتی امراض کے بھی بہت قابل اور بڑے بڑے معالج موجود ہیں۔ وہ نہایت توجہ سے اس کا علاج کریں گے۔ وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی اور پہلے کی طرح ہشاش بشاش ہو کر تھوڑے ہی دنوں میں گھر واپس آجائے گی۔ اس قسم کے مسائل ہم وہیں حل کراتے ہیں۔"

خالد نے ایک لمحے سوچا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے سر! اگر آپ کا مشورہ یہی ہے تو ایسا ہی کرلیں گے۔ میں صبح اس سے بات کروں گا۔"

"تم اس سے اجازت یا مشورہ طلب کرنے کے انداز میں بات نہیں کرو گے۔ تم اسے حکم دو گے۔ "جمشید نے فوراً" کہا اور یہ کہتے ہوئے ان کا اپنا لہجہ خاصا تحکمانہ ہوگیا۔

ٹھیک ہے سر——! جیسے آپ کی مرضی۔" خالد کا لہجہ سعادت مندانہ تھا مگر اندر سے وہ کچھ بجھ سا گیا تھا۔

اس رات گھر آنے کے بعد بستر پر لیٹے لیٹے بہت دیر تک خالد چھت کو تکتے ہوئے اس بارے میں سوچتا رہا۔ میمونہ اس کی طرف پشت کئے لیٹی تھی۔ کافی دنوں سے وہ ایک خوابگاہ میں سونے کے باوجود اجنبیوں کی طرح راتیں گزار رہے تھے۔ میمونہ کو جیسے اس کے ہاتھ کا لمس بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ گویا اس کے سائے سے بھی بچنے کی کوشش کرتی تھی۔ خالد آخرکار سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ شاید اس مخصوص ہسپتال کے نفسیاتی وارڈ میں داخل ہونا ہی اس کے حق میں بہتر ہو۔

دوسری صبح ناشتے کے بعد اس نے اس موضوع پر بات کی اور مناسب تمہید باندھنے کے بعد میمونہ کو بتایا کہ حالات کا تقاضا اور جمشید کا حکم کیا تھا۔



"کیا——؟" میمونہ جیسے یکدم پھٹ پڑی۔ "تم مجھے اس ہسپتال میں داخل کرانا چاہتے ہو—— اور وہ بھی نفسیاتی وارڈ میں——؟ تمہارا دماغ تو صحیح ہے؟ تم مجھے پاگل سمجھتے ہو؟ اب تو اگر میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں تب بھی اس ہسپتال میں قدم نہیں رکھوں گی۔ وہ ہسپتال نہیں شیطانوں کا اڈا ہے——"

○

خالد حیرت سے میمونہ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اسے اس کی طرف سے اتنے شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ حیرت کے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد نرمی سے بولا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو! وہ جدید ترین سازو سامان سے آراستہ ایک شاندار ہسپتال ہے۔ قابل ترین ڈاکٹر اس میں بیٹھتے ہیں۔ لوگ تو ایسے ہسپتالوں میں علاج کرانے کے لئے ترستے ہیں۔ بعض بے چاروں کو تو ایسے ہسپتالوں کے دروازے سے اندر قدم رکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔"

"وہ کچھ اور طرح کے ہسپتال ہوتے ہیں۔" میمونہ بدستور جارحانہ لہجے میں بولی۔ "بلکہ یوں کہو کہ وہ واقعی ہسپتال ہوتے ہیں مگر یہ جگہ کوئی ہسپتال نہیں ہے جہاں ہمیں بھیجا جاتا ہے۔ یہ جمشید کے شیطانی کارخانے کا ایک حصہ ہے۔ مجھے تو جمشید کے بارے میں بھی یقین ہو چکا ہے۔ وہ کوئی عام انسان نہیں ہیں۔ بلکہ شاید سرے سے انسان ہی نہیں ہیں۔"

خالد نے اپنے دل میں ایک عجیب سے خوف کی لہر محسوس کی۔ اس نے یوں ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کوئی اس کے قریب کھڑا یہ گفتگو سن رہا ہوگا۔ کافی دنوں سے اس کا یہی عالم تھا کہ جب جمشید کے بارے میں کوئی بات ہوتی تھی تو اسے اندیشہ محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی ایسی طاقت قریب ہی موجود ہو جو تمام مکالمے جمشید تک پہنچا رہی ہو۔ یہ نادیدہ طاقت گویا غیر مرئی شعاعی لہروں کی طرح ہوا میں تحلیل رہتی تھی۔

"آہستہ بولو۔۔۔" وہ قدرے خوفزدہ لہجے میں بولا۔" یہ بات کسی نہ کسی طرح ان تک پہنچ جائے گی اور وہ اچھا محسوس نہیں کریں گے۔"

"مجھے ان کے محسوسات کی پرواہ نہیں رہی۔" میمونہ بے خوفی سے بولی۔" مجھے اب صرف اپنے محسوسات کی پرواہ ہے۔۔۔ اور یہ میرا مشورہ ہے کہ آپ بھی اپنی سوچوں کی اصلاح کریں۔ میں آپ کو خبردار کر رہی ہوں کہ ہم کسی بہت بڑے شیطانی چکر میں پھنس چکے ہیں۔ ہم کسی اور ہی دنیا کے باسی بنتے جا رہے ہیں اور اس دنیا کی حیثیت دلدل کی سی ہے۔ جتنا زیادہ وقت گزرتا جائے گا ہم اس میں اتنا ہی زیادہ گہرائی میں اترتے جائیں گے۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم اس میں سے نکلنے کی اس سے نجات حاصل کرنے کی کوئی تدبیر کریں۔ میں پوری طرح آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں۔۔۔ اور یقین کریں اس میں آپ کا بھی فائدہ ہے۔ اگر آپ نے اس دنیا سے نکلنے کی کوشش نہ کی تو میرا دل کہتا ہے کہ



ایک روز آپ بہت پچھتائیں گے مگر اس وقت تک بہت تاخیر ہو چکی ہوگی۔ پچھتانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔"

خالد خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میمونہ کے الفاظ ایک مسلسل دستک کی طرح تھے۔ یہ دستک وہ اپنے دل کے بند دروازے پر سن رہا تھا مگر کوئی طاقت تھی جو اسے دروازہ کھولنے سے باز رکھے ہوئے تھی۔ میمونہ کے مشورے پر عمل تو دور کی بات تھی وہ ان الفاظ کو سننا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن یہ گویا زبردستی اس کے کانوں میں ٹھونسے جا رہے تھے۔

"مجھے لگتا ہے کہ تمہارے دماغ میں واقعی کوئی خلل آ گیا ہے۔ تم عجیب و غریب واہموں کا شکار ہوتی جا رہی ہو۔۔۔" خالد ذرا رکھائی سے بولا۔ یہ الفاظ گویا خود بہ خود ہی اس کے منہ سے نکلے تھے پھر وہ اسی لہجے میں کہتا چلا گیا۔ "تم ایک ناشکری عورت ہو۔ تمہیں جو کچھ میسر ہے اس کی تمہیں قدر نہیں ہے۔ عورتوں کی فطرت ہی عجیب ہوتی ہے۔ پہلے جن چیزوں کی تمنا میں مری جاتی ہیں جب وہ چیزیں میسر آجاتی ہیں تو پھر ان میں کیڑے نکالنے لگتی ہیں۔ تم جیسی عورتیں تو خاص طور پر کسی بھی حال میں خوش نہیں رہ سکتیں۔

غیر ارادی طور پر خالد کے لہجے میں برہمی بڑھتی چلی گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے میمونہ کی طرف سے شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آج کل اس کی جو کیفیت ہو رہی تھی اس میں زیادہ امکان اس بات کا تھا لیکن خلاف توقع وہ ایک عجیب افسردگی آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے اور تاسف زدہ سے لہجے میں بولی۔ "یہ تم نہیں تمہارے اندر جمشید کی زبان بول رہی ہے۔"

"بیکار قسم کی افسانوی باتیں مت کرو۔" خالد بیزاری سے بولا۔ "کسی انسان میں کسی دوسرے کی زبان نہیں بولتی۔ ہر انسان جو کچھ کہتا ہے وہ خود ہی اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔"

"میں آپ کے ساتھ بحث کو طول دینا نہیں چاہتی۔۔۔" میمونہ اس سے بھی زیادہ بیزاری کے ساتھ بولی۔ "ہماری زندگی مجھے پہلے ہی کسی بڑی تباہی سے دو چار ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ میں اس میں الجھنیں مزید بڑھانا نہیں چاہتی لیکن یہ بات بہرحال طے ہے کہ میں اس ہسپتال میں داخل نہیں ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہسپتال نہیں ہے۔ آپ نے کبھی وہاں اس بلڈنگ کے مکینوں کے علاوہ کوئی مریض دیکھا ہے؟"

خالد ایک لمحے کے لئے خاموش رہا۔ میمونہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اس نے تو اس بلڈنگ کے مکینوں میں سے بھی اکا دکا افراد کو ہی کبھی وہاں دیکھا تھا۔ سب سے زیادہ نسرین کو وہاں لے جانے کی ضرورت پیش آتی تھی اور اسی کی ذہنی و جسمانی حالت سب سے زیادہ خراب معلوم ہوتی تھی۔ کبھی کبھار اس پر دورے پڑتے تھے۔ وہ کافی ہنگامہ مچاتی تھی اور اس کے بعد بے ہوش ہو جاتی تھی۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں ہی ہسپتال لے جایا

جاتا تھا۔ اس کے بعد چند دن وہ نظر نہیں آئی تھی۔ اس دوران میں صرف اس کے شوہر سعید پاشا سے اس کی خیر و عافیت کا پتا چلتا رہا تھا جو یہی بتاتا تھا کہ وہ تیزی سے ٹھیک ہو رہی ہے لیکن کوئی اس کی عیادت کے لئے یا اسے دیکھنے نہیں جاتا تھا۔ عام تاثر یہی تھا کہ اس ہسپتال میں داخل ہو جانے والے مریضوں کو دیکھنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

دو چار دن بعد نسرین لوٹ آتی تھی اور تقریباً پہلے ہی کے سے انداز میں اس کے معمولات زندگی شروع ہوجاتے تھے۔ لیکن ہر بار وہ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ بجھی بجھی دکھائی دیتی تھی۔ تاہم کوئی اس بات کا تذکرہ نہیں کرتا تھا۔ ہر تھوڑے دن بعد اس کا ہسپتال جانا گویا ایک معمول بن گیا تھا جو کسی کو عجیب نہیں لگتا تھا۔ خالد کو اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں میمونہ بھی اسی منزل کی طرف تو نہیں جا رہی تھی۔

تاہم وہ میمونہ کے سوال کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "یہ تو اس ہسپتال کی ایک اور بڑی خوبی ہے کہ وہ محض گنتی کے چند افراد کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ تم نے ایسا ہسپتال کہیں دیکھا ہے؟ اچھے سے اچھے اور مہنگے سے مہنگے ہسپتال میں بھی مریضوں کا بے تحاشا رش ہوتا ہے۔"

"خدا کے لئے آپ میرے سامنے اس ہسپتال کی خوبیاں نہ گنوائیں۔۔۔" میمونہ ہاتھ باندھتے ہوئے بہت ہی بیزاری سے بولی۔ "مجھے معلوم ہے آپ کے دل کی دنیا بدل چکی ہے۔ آپ کے اندر کوئی اور ہی روح حلول کر گئی ہے۔ آپ کو جمشید اور ان کی ہر چیز اچھی لگے گی۔ آپ ان کی ہر برائی کا بھی دفاع کریں گے لیکن میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ ایک روز آپ ان سب باتوں پر پچھتائیں گے جو آپ اب کر رہے ہیں لیکن وقت گزر چکا ہوگا۔"

خالد کی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے سے بازگشت سی سنائی دیتی تھی کہ میمونہ ٹھیک کہہ رہی تھی لیکن وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اور اپنی زبان سے تو وہ گویا اس کا اعتراف کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"تم تو خواہ مخواہ جمشید صاحب کے۔۔۔ اور یہاں کی ہر چیز کے خلاف ہوگئی ہو۔۔۔" وہ اب کچھ نرمی سے بولا۔ "بہرحال ہمیں فضول بحث میں الجھ کر اپنی زندگی میں تلخیاں گھولنے کی ضرورت نہیں۔ تم ابھی فیصلے نہ کرو۔ ٹھنڈے دل سے دوچار دن سوچ لو۔ ہم اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔"

خالد نے اپنی دانست میں بات بڑھانے سے گریز کیا تھا۔ تاہم دل ہی دل میں وہ بہت پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ جمشید کو کیا جواب دے گا؟ اور یہ بات طے تھی کہ جمشید اس سے جواب ضرور طلب کریں گے۔ وہ اس معاملے میں خصوصاً دلچسپی لے رہے تھے۔



اس کا اندیشہ درست ہی ثابت ہوا۔ جمشید نے اسی رات اسے ایک بار پھر اپنے گھر کے اس کمرے میں طلب کیا جسے وہ سٹڈی اور غیر رسمی آفس کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

"مجھے معلوم ہے تم نے میمونہ سے بات کی تھی اور اسے قائل کرنے کی اپنی سی کوشش کی تھی لیکن وہ نہیں مانی۔" وہ بلا تمہید بولے۔ ان کی گونجیلی آواز میں خفیف سی ناپسندیدگی کا تاثر تھا لیکن یہ ناپسندیدگی ان کے لئے نہیں میمونہ کے لئے تھی۔ خالد ان کے مقابل کرسی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"یس سر!" وہ قدرے شرمندگی سے بولا۔ "مجھے اعتراف ہے کہ میں اسے کسی طرح بھی ہسپتال میں داخل ہونے کے لئے آمادہ نہیں کرسکا۔"

جمشید ملائمت سے بولے۔ "تمہیں اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ صبح وہ بہرحال ہسپتال میں داخل ہو جائے گی۔"

خالد نے سر اٹھایا اور ذرا جرات سے کام لے کر جمشید کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "سر! کیا زبردستی۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ زبردستی کی کیا ضرورت ہے۔۔۔" وہ گویا اس کی بے وقوفی پر حیران ہوتے ہوئے بولے۔ "وہ آرام اور سکون سے چلی جائے گی۔"

خالد کو میمونہ کا ردعمل یاد آیا۔ اسے قطعاً امید نہیں تھی کہ وہ آرام و سکون سے چلی جائے گی لیکن پھر اسے خیال آیا کہ جمشید جن پراسرار قوتوں کے مالک تھے ان کی موجودگی میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر شرافت علی کے کیس کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں پھر جمشید نے اسے رخصت کردیا۔ اس نے گھر آکر میمونہ سے کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ جمشید سے کیا بات ہوئی تھی۔

صبح وہ ناشتے کے بعد دفتر کے لئے تیار ہونے لگا تو میمونہ بولی۔ "میرا سر کچھ بھاری ہورہا ہے۔ میں اسپرین کی گولی کھا کر کچھ دیر آرام کرنے کے لئے لیٹ رہی ہوں۔"

اس کا مطلب غالباً یہی تھا کہ وہ روزانہ کی طرح اسے رخصت کرنے کے لئے دروازے پر موجود نہیں ہوگی۔ خالد نے بے دھیانی سے سر ہلایا اور بولا۔ "کوئی بات نہیں۔۔۔ اگر آرام سے طبیعت بہتر نہ ہو اور تم ضرورت محسوس کرو تو ڈاکٹر کو بلوا لینا۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ امید ہے اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" وہ کچھ غنودگی زدہ سے لہجے میں بولی اور بیڈ پر جا لیٹی۔ گولی وہ ناشتے کے بعد ہی کھا چکی تھی۔

خالد بیڈ روم سے نکل آیا۔ اپنے بریف کیس میں ضروری کاغذات وغیرہ کی موجودگی کا اطمینان کرنے کے بعد اس نے طویل و عریض لاؤنج کے دیوار گیر آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ آج شرافت علی کیس کے سلسلے میں اس کی فیصلہ کن پیشی تھی۔ آج فیصلہ سنایا

جانا تھا اور اسے ننانوے فیصد یقین تھا کہ شرافت علی کو بری کر دیا جائے گا۔ ایک فیصد شک کی گنجائش تو بہرحال ہر کیس میں رکھنی چاہئے تھی۔

آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ اس کی شخصیت متاثر کن لگ رہی تھی۔ اس کا سوٹ نہایت عمدہ' بریف کیس شاندار اور چہرے پر تازگی تھی۔ کافی اعصابی تناؤ اور ان دنوں کی پریشانیوں کے باوجود وہ اپنی تازگی اور خوداعتمادی برقرار رکھنے میں کامیاب تھا۔ کورٹ میں کیس جیتنے کے سلسلے میں اس کے اور اس کی فرم کے تمام ہتھکنڈوں کے علاوہ اس کی متاثر کن شخصیت کا بھی اہم کردار ہوتا تھا۔

وہ بریف کیس اٹھا کر گھر سے نکلنے ہی لگا تھا کہ کال بیل بج اٹھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے کامران کو کھڑے پایا۔ اس کے ساتھ ڈھیلے ڈھالے مخصوص سفید لباس اور سفید ٹوپی میں مضبوط قد کاٹھ کا ایک نوجوان تھا۔ وہ کسی ہسپتال کا اٹینڈنٹ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی جیب پر ایک مونوگرام بھی کڑھا ہوا تھا۔ خالد کو یاد آیا کہ وہ ان کے اپنے ہسپتال کا ہی مونوگرام تھا۔ وہ ایک فولڈنگ اسٹریچر بھی اٹھائے ہوئے تھا جس سے تصدیق ہوتی تھی کہ اس کا تعلق ہسپتال سے ہی تھا۔

خالد نے قدرے حیرت سے کامران کی طرف دیکھا مگر اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی کامران بولا۔ "ایمبولینس آ گئی ہے۔" اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے خالد نے کچھ دیر پہلے ہی اسے ایمبولینس منگوانے کی ہدایت دی ہو۔

"ایمبولینس ۔۔۔؟" خالد نے حیرت سے دہرایا۔ "مگر کس لئے؟"

"بیگم صاحبہ کو ہسپتال لے جانا ہے ناں ۔۔۔" کامران نے یوں اطمینان سے جواب دیا۔ گویا یہ پروگرام طے ہو چکا تھا مگر خالد کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ اب وہ اسے یاد دلا رہا تھا۔

"لیکن اس طرح ۔۔۔ اچانک تو شاید ۔۔۔ وہ جانے کے لئے تیار نہ ہو ۔۔۔" خالد بیڈ روم کی طرف دیکھتے ہوئے ہکلایا۔

"اس وقت وہ آرام اور سکون سے چلی جائیں گی۔ اسی لئے تو جمشید صاحب نے ہمیں بلوایا تھا اور ہدایات دے کر یہاں بھیجا ہے۔" کامران نے پلک جھپکائے بغیر جواب دیا۔ خالد زیادہ دیر اس سے نظر نہ ملا سکا۔ وہ دونوں اس کی اجازت کا انتظار کئے بغیر ہی بیڈ روم کی طرف چل دیئے۔ خالد بھی ان کے پیچھے پیچھے بیڈ روم کے دروازے تک پہنچا۔ اس نے دیکھا میمونہ بیڈ پر چت پڑی بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوبصورت اور معصومانہ سی مسکراہٹ تھی جیسے وہ کوئی حسین خواب دیکھ رہی ہو۔ خالد حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ابھی چند منٹ پہلے ہی تو وہ اس سے باتیں کرتے کرتے اندر جا کر لیٹی تھی اور اتنی سی دیر میں گہری نیند بھی سو گئی تھی۔



اس کی نیند گہری ہونے کا اندازہ خالد کو یوں ہوا کہ کامران اور اٹینڈنٹ نے اس کے بازو اور ٹانگیں پکڑ کر اسے اٹھا کر اسٹریچر پر لٹا دیا۔ اور وہ کسمسائی تک نہیں۔ اسے گویا ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ اس کے اردگرد یا اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ کامران یا اٹینڈنٹ نے خالد سے اجازت لینے کی بھی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ میمونہ کو لے جائیں یا نہیں ۔۔۔ انہوں نے بالکل اس طرح اسے اٹھا کر اسٹریچر پر ڈال دیا تھا جیسے وہ سر راہ حادثے کا شکار ہو جانے والی کوئی خاتون ہو اور فی الحال اس کے متعلقین میں سے کوئی بھی آس پاس موجود نہ ہو۔

خالد نے دل ہی دل میں اس بات کو محسوس کیا لیکن وہ منہ سے کچھ بھی نہ بول سکا۔ اگر یہ سب کچھ جمشید کی مرضی سے ہو رہا تھا تو وہ کیا بول سکتا تھا؟ اسے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی روح جمشید کے قبضے میں چلی گئی تھی اور ان کے احکامات کی تابع ہو گئی تھی۔ وہ جیسے ان کے احکامات کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور ان کی خواہشات کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسے یاد آیا گزشتہ رات جمشید نے کہا تھا کہ صبح میمونہ آرام اور سکون سے ہسپتال چلی جائے گی اور اب کامران نے بھی آ کر انہی کے الفاظ دہرائے تھے۔ اب خالد کی نظروں کے سامنے واقعی یہی ہو رہا تھا۔

"میمونہ ٹھیک تو ہے؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" خالد نے ذرا گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ صرف گہری نیند سو رہی ہیں۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔" اس بار اٹینڈنٹ نے جواب دیا۔

انہوں نے میمونہ کو اٹھا کر اسٹریچر پر ڈال دیا تھا جیسے وہ کوئی ہلکی پھلکی سی گڑیا ہو اور اب وہ اسی طرح اسٹریچر پر اسے اٹھا کر لے چلے تھے جیسے اس کا کوئی وزن ہی نہ ہو۔ خالد تشویش زدہ سے انداز میں ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ باہر نکلتے وقت اسے دروازے کھڑکیاں وغیرہ مقفل کرنے میں چند سیکنڈ لگ گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ دونوں اسٹریچر لیکر کارگو لفٹ میں داخل بھی ہو چکے تھے۔ وہ اپنی سہولت کے لئے کارگو لفٹ کا دروازہ کھلا ہی چھوڑ آئے تھے۔

انہوں نے خالد کا انتظار کرنے کی زحمت نہیں کی۔ لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ خالد بریف کیس سنبھالے جلدی سے لفٹ کی طرف لپکا لیکن بند دروازے کی پیشانی پر جلتے بجھتے نمبروں سے اندازہ ہوا کہ لفٹ نیچے کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ حیرت سے اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ کامران اور اٹینڈنٹ تو اس طرح میمونہ کو لئے جا رہے تھے جیسے خالد کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جیسے وہ سڑک کے کنارے پڑی ہوئی کوئی لاوارث لاش تھی۔ جسے ٹرسٹ یا سرکاری ہسپتال والے اٹھا کر لے جا رہے تھے۔

غصے کی ایک لہر اس کے دل سے ابھری اور وہ تیزی سے دوسری عام لفٹ کی طرف

بڑھا ہی تھا کہ ایک ستون کے عقب سے نسرین نکل کر اچانک ہی اس کے سامنے آگئی۔ وہ نہ جانے کب سے وہاں موجود تھی۔ شاید کامران کو بھی اس کی موجودگی کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ وہ بھڑکیلے سرخ رنگ کے ایک ریشمی' میکسی نما لبادے میں تھی۔ وہ ایک دبلی پتلی دراز قد عورت تھی لیکن اس ڈھیلے ڈھالے لبادے میں اس کے سوکھے سے جسم کی بھی کچھ نہ کچھ خوبصورتیاں نمایاں تھیں۔ مگر اس لبادے کا رنگ کچھ عجیب سا تھا۔ وہ کوئی عام کپڑا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ خالد کو اس کے لئے تشبیہ ڈھونڈنا مشکل محسوس ہوئی۔ اسے دیکھ کر ذہن میں پہلا خیال یہی آتا تھا جیسے اس نے آگ سے بنا ہوا لبادہ پہن رکھا ہو۔ حتیٰ کہ جب وہ قریب آئی تو خالد کو اس کے وجود سے تپش بھی پھوٹتی محسوس ہوئی لیکن اس نے دل ہی دل میں اسے اپنا واہمہ قرار دیا۔ اسے خود بھی احساس تھا کہ اس وقت اس کی نفسیاتی کیفیت کچھ عجیب تھی۔ وہ کسی بھی واہمے کا شکار ہو سکتا تھا۔ اس کے محسوسات اسے دھوکا دے سکتے تھے۔

نسرین کے ستے ہوئے سے چہرے پر ہمیشہ کی طرح زردی بکھری ہوئی تھی لیکن پتلے پتلے سفاک سے ہونٹوں پر سرخی تھی اور یہ ہونٹ عجیب سے انداز میں کھنچے ہوئے تھے۔ شاید وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ تیز مگر میٹھی اور سرگوشی جیسی آواز میں بولی۔ "میں نے کہا تھا ناں کہ جب تک اس بلڈنگ میں ہو—— کوشش کرنا کہ تمہاری بیوی ماں نہ بننے پائے—— لیکن تم نے شاید میری بات کو اہمیت نہیں دی۔ اس پر کان نہیں دھرا—— اب کچھ بھی تمہارے اختیار میں نہیں رہے گا۔"

"میرے اختیار میں تو پہلے ہی کچھ نہیں ہے——" خالد تیزی سے بولا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیسے ہو رہا ہے—— تمہاری نصیحت پر عمل کرنے یا نہ کرنے—— دونوں ہی باتوں میں میرا کوئی عمل دخل نہیں—— میں تو کوئی احتیاطی تدبیر کرنے کے بارے میں کچھ سوچ بھی نہ سکا۔ پہلے ہی سب کچھ ہو چکا تھا——"

نہ جانے کیوں نسرین عجیب سے انداز میں ہنسی۔ اس کی منگولوں جیسی لمبی لمبی سی آنکھوں میں عجیب چمک تھی۔ وہ پہلے کی طرح نیچی اور کھرکھراتی سی آواز میں بولی۔ "ہاں—— یہ بھی تم نے ٹھیک کہا—— دراصل تمہارا بھی کوئی قصور نہیں—— یہ تو ہونا ہی تھا۔ جب تم اس بلڈنگ میں آ گئے تھے تو تم نے ایک طرح کی قید قبول کر لی تھی—— اور قیدی کو تو کسی بھی چیز پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہوا اس سے تم صرف اسی صورت میں بچ سکتے تھے کہ اس بلڈنگ میں ہی نہ آتے——"

اس کی آواز کچھ اور نیچی ہو گئی۔ "یہ تو شیطان کا قید خانہ ہے—— اور جمشید صاحب شیطان کے خاص الخاص پیروکار ہیں۔ انہیں اس دنیا میں اپنی نسل پھیلانے کے لئے زیادہ سے زیادہ عورتوں کی ضرورت رہتی ہے—— اور تم جیسے—— تمہاری بیوی جیسے احمق اس



میں بہت پائے جاتے ہیں جو راتوں رات دنیا بھر کی آسائشیں حاصل کرنے کے لالچ میں جیسے کسی نہ کسی پیروکار کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ شیطان کے ان جیسے پیروکار بھی دنیا میں بہت پھیلے ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی روحیں شیطان کے پاس گروی رکھ کر ابدی زندگی حاصل کر لی ہے اور وہ اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں دن رات مصروف ہیں۔ وہ شیطان کے پیروکاروں کے حلقے کو وسیع سے وسیع تر کر رہے ہیں۔ شیطان کے سب سے پکے پیروکار وہی ہوتے ہیں جو ان کی اپنی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ خالص پیروکار ہوتے ہیں۔ وہ کبھی نہیں بدلتے۔ جو لوگ ان کے اثر میں آ کر پیروکار بنتے ہیں وہ اتنے مضبوط پیروکار نہیں ہوتے۔ ان پر اگر کبھی کوئی الٹا اثر ہو جائے تو وہ بدل بھی سکتے ہیں۔ اپنی اصلیت کی طرف واپس بھی جا سکتے ہیں۔ میں—— تم—— تمہاری بیوی اور یہاں رہنے والے دوسرے افراد اسی طبقے میں شامل ہیں۔ تمہاری بیوی واپسی کا سفر شروع کر چکی ہے—— لیکن ظاہر ہے اسے واپس جانے نہیں دیا جائے گا۔ اسے شیطانی حلقے میں شامل رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ کم از کم اس وقت تک تو اسے ضرور قابو میں رکھا جائے گا جب تک وہ شیطان کے ایک ایک پیروکار کو جنم نہیں دے دیتی—— اس کے بعد اسے مروا بھی دیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

خالد دم بخود اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں بھی ایک باغی پیروکار ہوں۔ میں جمشید کو ایک وارث دے چکی ہوں جو نہ جانے کہاں پرورش پا رہا ہے لیکن میں نے آئندہ کے لئے اس شیطانی چکر میں آلہ کار بننے سے انکار کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے میں ایک باغی پیروکار ہوں لیکن میں چونکہ گزشتہ چند سالوں میں خود بہت طاقت حاصل کر چکی ہوں۔ میری شیطانی قوت جمشید کی قوت کے مقابلے میں تو کچھ نہیں ہے پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ مجھے آسانی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ خود جمشید بھی مجھے آسانی سے ختم نہیں کر سکتے ورنہ میں کب کی اپنے انجام کو پہنچ چکی ہوتی۔ جمشید سے بغاوت کر کے بھلا کوئی کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟ لیکن ان کے مقابلے میں میری حیثیت کچھ ایسی ہو گئی ہے جیسے سانپ کے گلے میں چھچھوندر۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں نہایت آہستگی سے ہنسی۔ اس کی ہنسی کا تاثر کچھ ایسا تھا جیسے کوئی زنگ آلود لوہے پر کند چھری رگڑ رہا ہو۔ خالد کی رگ و پے میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑ گئی۔ نسرین شاید اپنی دی ہوئی مثال سے خود ہی محظوظ ہوتے ہوئے ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی تھمی تو وہ بولی۔ "لیکن تمہاری اور میمونہ کی بات اور ہے۔ تم دونوں ابھی کمزور ہو۔ تمہارے پاس اپنے بچاؤ کے لئے شیطانی قوت نہیں ہے—— بلکہ میرے علاوہ درحقیقت جمشید کے کسی اور پیروکار کے پاس بھی شیطانی قوت نہیں ہے۔ انہیں اگر طاقت ملی بھی ہے تو صرف اتنی ہی ملتی ہے جتنی جمشید کے احکامات کی تعمیل کرنے کے لئے

ضروری ہوتی ہے۔ وہ اس طاقت کو اپنی مرضی سے استعمال نہیں کر سکتے لیکن میں کبھی جمشید کی بڑی چہیتی تھی اس لئے میں بھی اپنی روح شیطان کے پاس گروی رکھنے کے سلسلے میں کچھ ایسے عمل کرتی رہی جن سے مجھے کافی طاقت حاصل ہوگئی۔ جمشید چونکہ اس وقت مجھ پر کافی مہربان تھے اس لئے انہوں نے مجھے نہیں روکا لیکن اب وہ پچھتاتے ہیں کہ انہوں نے مجھے اتنی طاقتور بننے کا موقع کیوں دیا۔"

"تم یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہی ہو؟" خالد گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔

"تمہاری بھلائی کے لئے——" نسرین سنجیدگی سے بولی۔ "اب بھی وقت ہے۔ اپنی بیوی کو ساتھ لو اور یہاں سے نکل بھاگو۔ ویسے تو تم جمشید سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ دنیا میں کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں تک ان کی رسائی نہ ہو لیکن اگر تم ایسے کسی اللہ والے آدمی کی پناہ میں آگئے جس کی روحانی طاقت جمشید کی شیطانی طاقت کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوئی تو پھر جمشید تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے لیکن اگر میمونہ کے توسط سے تمہارے گھر میں ان کا ایک اور حقیقی پیروکار پیدا ہوگیا تو پھر تمہاری نجات کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ جمشید کی وہ اولاد تمہیں بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی بنا دے گی۔"

"جمشید کی اولاد——؟" خالد نے پھنسی پھنسی آواز میں دہرایا۔ وہ نسرین کی اب تک کی باتوں میں یہ اشارہ واضح طور پر محسوس کر چکا تھا لیکن جان بوجھ کر اس کی نشاندہی کرنے سے کترا رہا تھا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس حقیقت سے جتنی دیر تک نظر چرائی جاسکے اتنا ہی بہتر ہے۔ لیکن اب وہ اس نکتے پر اٹکنے پر مجبور ہوگیا۔

نسرین نے ترحم آمیز سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "ظاہر ہے—— تمہیں اس بارے میں کسی خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہئے۔ تم اور میمونہ دیکھ ہی چکے ہو کہ ہونے والا بچہ کس قسم کا ہے۔ جب وہ مکمل اور صحیح طور پر اس طرح اس دنیا میں ظاہر ہو گا کہ عام لوگ بھی اسے ایک عام بچے کی طرح پروان چڑھتے دیکھ سکیں گے—— تو تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ حقیقت میں وہ کیا چیز ہو گا۔"

خالد کے سینے میں جیسے ایک ہولناک سناٹا پھیل گیا۔ ایک عجیب سا احساس زیاں اس کے دل و دماغ پر ایک لمحے کے لئے غالب آیا لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے کسی نامعلوم طاقت نے اس کے دل کو سہارا دیا اور اس کی جذباتی اذیت کم ہوگئی۔ وہاں سے بھاگ نکلنے کی خواہش جو ایک لحہ پہلے اس کے دل میں ابھری تھی، بلبلے کی طرح بیٹھ گئی۔ البتہ اسے میمونہ کا خیال ضرور آگیا۔

وہ جیسے کسی خواب سے چونکتے ہوئے بولا۔ "میں یہاں باتوں میں الجھ گیا۔ مجھے ذرا میمونہ کو دیکھنا چاہئے۔ وہ لوگ میرا انتظار کئے بغیر ہی اسے لے گئے۔"

نسرین ایک بار پھر عجیب سے انداز میں ہنسی اور اس کے راستے سے ہٹتے ہوئے بولی۔



"وہ تو اب تک ہسپتال بھی پہنچ چکی ہوگی۔"

خالد تیزی سے لفٹ کی طرف لپکا اور اس کے ذریعے نیچے پہنچا۔ اس نے دیکھا کامران سیاہ مرسیڈیز کے قریب گیٹ سے ذرا ہٹ کر کمپاؤنڈ میں ہی کھڑا تھا لیکن وہاں کسی ایمبولینس کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

"ایمبولینس کہاں ہے؟ میمونہ کہاں ہے؟" خالد نے تیزی سے پوچھا۔

"وہ تو اب تک ہسپتال بھی پہنچ چکی ہوگی۔" کامران نے اطمینان سے جواب دیا۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح پرسکون تھا اور وہ حسب معمول پلک جھپکائے بغیر خالد کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم نے میرا انتظار کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔" خالد نے اپنے لہجے سے ذرا خفگی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" کامران بدستور اطمینان سے بولا۔ "آپ بھلا کیا کرتے؟ یہ ہسپتال والوں کے کام ہیں اور وہ اپنا کام بڑی عمدگی اور ذمے داری سے کرتے ہیں۔ اتنا مہنگا اور شاندار ہسپتال اسی لئے قائم کیا گیا ہے کہ ہم لوگ فالتو قسم کی بھاگ دوڑ اور زحمتوں سے بچے رہیں۔ اسی لئے تو جب کوئی مریض وہاں داخل ہوتا ہے تو اس کے لواحقین کو تیمارداری کے لئے جانے، کھانے پینے یا دوسری ضروریات کا خیال رکھنے، غرضیکہ کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مریض کی وہاں گھر سے بھی بہتر نگہداشت ہوتی ہے۔ وہ لوگ خود ہی آکر لے جاتے ہیں اور جب مریض صحت یاب ہو جاتا ہے تو خود ہی اسے گھر چھوڑ جاتے ہیں۔ آپ کو ذرا سی بھی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں—— اور نہ ہی آپ کے کاموں میں کوئی خلل پڑتا ہے۔ یہی تو فائدہ ہے۔"

خالد اس کی تقریر سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔ "کم از کم اس کے داخل ہوتے وقت مجھے اس کے قریب تو موجود رہنا چاہئے۔ تم نے تو اسے بالکل ہی لاوارثوں کی طرح روانہ کر دیا۔ میں ہسپتال جا رہا ہوں۔"

اس نے کامران سے یہ کہنے کی زحمت نہیں کی وہ اسے ہسپتال لے چلے۔ اسے اندیشہ تھا کہ کامران انکار نہ کر دے۔ وہ اپنی گاڑی نکالنے کے ارادے سے بیسمنٹ کی طرف بڑھا مگر دوسرے ہی لمحے اسے رکنا پڑا۔ کامران ایک لمبے چوڑے ستون کی طرح اس کے راستے میں حائل ہوگیا تھا۔ وہ قد میں اس سے خاصا اونچا تھا اور گویا بلندی سے سرد نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

وہ بہت نیچی آواز میں بولا۔ "میں نے کہا ناں خالد صاحب——! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مریضوں کو سنبھالنا اور ان کا خیال رکھنا ہسپتال والوں کی ذمے داری ہے۔ انہیں اپنا کام کرنے دیں۔ آپ اپنا کام کریں۔ آج عدالت میں آپ کی [illegible]

چٹی ہے۔ آپ کو وہاں جانا چاہئے۔ آیئے چلیں——"

خالد نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن کامران کے لہجے میں' اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ جھرجھری لیکر رہ گیا۔

"آیئے چلیں——" کامران نے ایک بار پھر کہاں اور اس بار ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی بھی پکڑلی۔ کامران کی گرفت کسی آہنی شکنجے سے کم نہیں تھی۔ خالد کسی سعادت مند بچے کی طرح اس کے ساتھ چل دیا۔

کار میں بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک موہوم سی امید کے سہارے سڑک کی طرف دیکھا لیکن کہیں دور تک بھی کسی ایمبولینس کا نام و نشان نہیں تھا۔ میمونہ کا چہرہ اس کے تصور میں ابھر آیا۔ کس طرح پھرتی سے وہ لوگ اسے اٹھا کر لے گئے تھے—— اور اس وقت وہ تنہا ہسپتال میں ہوگی—— نہ جانے ہوش میں بھی آئی ہو گی یا نہیں——؟ جانے وہ نیند میں تھی یا بے ہوش تھی——؟

خالد سوچے جا رہا تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں ویرانی تھی۔ اس کے دل میں بھی کچھ ایسی ہی ویرانی پھیل گئی تھی۔ اس نے اپنے طویل و عریض اپارٹمنٹ کا تصور کیا۔ میمونہ کے بغیر وہ بھی کیسا ویران لگ رہا ہوگا۔ بھائیں بھائیں کر رہا ہوگا۔ نہ جانے اسے وہاں کتنے دن تنہا گزارنے پڑیں۔ کیا وہ آسانی سے وہاں تنہا رہ لے گا؟

اس لمحے اسے احساس ہوا کہ اسے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی اور وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے کامران کی سرد سی آواز نے اسے چونکایا۔ "بیٹھ جایئے نا——" وہ اسے گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

خالد خاموشی سے بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے کار اسے لیکر عدالت کی طرف روانہ ہوگئی۔

○

نشاط نگر میں جمال صاحب جب ڈاکٹر تحسین کو ساتھ لئے گھر میں داخل ہوئے تو سارہ اور آسیہ باتوں میں مصروف تھیں۔ آسیہ کی حالت اب بہت بہتر دکھائی دے رہی تھی اور گھر کے در و دیوار سے بھی جیسے نحوست کے سائے کم ہوگئے تھے۔ جمال صاحب سوچے بغیر نہ رہ سکے کہ سب رونقیں انسانوں کے دم سے تھیں۔ تنہائی اور ویرانی بجائے خود ایک تکلیف دہ چیز تھی۔ انسانوں کے آنے سے دل کو سہارا ملتا تھا۔ ڈھارس بندھتی تھی' تفکرات میں کمی ہوتی تھی۔

کھانا کھانے اور چائے وغیرہ پینے کے بعد گپ شپ میں کافی وقت گزر گیا۔ لڑکیوں کی



باتیں ختم ہی ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔ آخر جمال صاحب نے ان سے کہا۔ "تم دونوں جاکر بیڈ روم میں لیٹ جاؤ اور سونا چاہو تو سو جاؤ۔ میں اور تحسین ابھی کچھ دیر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

سارہ اور آسیہ بیڈ روم میں چلی گئیں۔ جمال صاحب تحسین کو ساتھ لئے ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ جمال صاحب جیب سے تحسین کا خط نکال کر لہراتے ہوئے بولے۔ "ہاں—— اب بتاؤ—— معاملہ کیا ہے۔ مجھے یہ اتنا مایوسی بھرا اور بے ربط خط کیوں لکھا تھا؟ کیا تم نے اس پراسرار بیماری کی وجوہات معلوم کرنے کی کوشش کی تھی؟"

اپنے خط پر نظر پڑتے ہی اور یہ تذکرہ شروع ہوتے ہی تحسین پر گویا ایک بار پھر مایوسی اور اضمحلال چھانے لگا۔ کچھ دیر پہلے وہ گویا اپنے تفکرات کو بھول گیا تھا مگر اب ایک بار پھر اسے جیسے تفکرات اور اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔

وہ ہوا میں گھورتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔ "یہاں کسی جدید تو کیا معمولی اور عام سی لیبارٹری کی سہولت بھی میسر نہیں ہے کہ میں خون اور تھوک وغیرہ کے بہت پیچیدہ اور تفصیلی ٹیسٹ کروا سکتا تھا۔ اس پر مریضوں کا یہ حال ہے کہ جونہی ان میں سے پراسرار بیماری کی علامات نمودار ہوتی ہیں وہ انجکشن اور عام سوئی تک سے اتنا ڈرنے لگ جاتے ہیں جیسے کوئی گردن زدنی مجرم' جلاد کی تلوار سے——"

وہ افسردہ سے انداز میں مسکرایا اور جمال صاحب کی طرف دیکھ کر بولا۔ "آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ میں نے یہاں کیسے مشکل حالات میں کام جاری رکھا ہے۔ میں اس پراسرار بیماری کے مریض کے قریب انجکشن لیکر بھی نہیں جاسکتا۔ وہ یوں تڑپنے لگتا ہے جیسے اسے ذبح کیا جارہا ہو۔ چیخ چیخ کر یہی تکرار کرنے لگتا ہے کہ وہ معمولی سی چبھن بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ میرے لئے ایک تو ان کو کسی دوا کا انجکشن لگانا بھی تقریباً" ناممکن ہوتا ہے دوسرے اگر میں ٹیسٹ اور کلچر کے لئے ان کا خون حیدر آباد کی کسی لیبارٹری میں بھی بھجوانے کا انتظام کر لوں تو خون لینا ہی ناممکن ہے۔ مجھے یہ اندیشہ بھی ہے کہ جتنی دیر میں خون حیدر آباد پہنچے اور وہاں کی لیبارٹری والے جب تک اس کا پیچیدہ تفصیلی تجزیہ کرنے کی زحمت کریں تب تک شاید اس میں سے کچھ اہم علامتیں معدوم ہوجائیں—— ختم ہو جائیں۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا پھر گہری سانس لیکر بولا۔ "میں آپ کو سچی بات بتاؤں—— اول تو مجھے امید ہی نہیں ہے کہ ان کے خون کے ٹیسٹ اور کلچر وغیرہ سے اس پراسرار بیماری کے بارے میں کوئی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ خون یا جسم کی کسی اور رطوبت میں اس بیماری کا کوئی سراغ نہیں ملے گا۔"

"یہ تو تم بہت غیر سائنسی سی بات کر رہے ہو۔" جمال صاحب بولے۔

یہ سارا سلسلہ ہی نہایت غیر سائنسی اور سمجھ میں نہ آنے والا ہے۔" تحسین ٹھنڈی سانس لیکر بولا۔ "مزید سنگین مسئلہ ہے کہ یہاں کے لوگ نہایت توہم پرست اور ضعیف الاعتقاد ہیں۔ کسی مرنے والے کے پوسٹ مارٹم کی بات کرو تم اس کے لواحقین کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے—— اور پھر میرے پاس پوسٹ مارٹم کا بندوبست بھی نہیں ہے۔ ایک تیسرا مسئلہ یہاں کے زمیندار کا بیٹا نیاز علی بھی ہے۔ سنا ہے زمیندار خود تو بہت اچھا آدمی ہے لیکن اب وہ اپنی بیماری اور کچھ دوسرے مسائل کی وجہ سے عضو معطل بن چکا ہے۔ زیادہ تر وہ یہاں ہوتا ہی نہیں ہے۔ علاج معالجے وغیرہ کے سلسلے میں زیادہ تر کراچی اور کبھی ملک سے باہر رہتا ہے۔ اس طرح سیاہ و سفید کا مالک نیاز علی بنا ہوا ہے۔ وہ بجائے خود مجھے بڑا پراسرار اور شیطانی قسم کا کردار لگتا ہے۔"

تحسین ایک لمحے کے لئے الجھن آمیز سے انداز میں خاموش ہوا پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "معلوم نہیں یہ اس کے ظلم اور جبر کا اثر ہے یا پھر وہ کسی پراسرار قوت کا مالک ہے کہ لوگ آنکھیں بند کرکے اس کے حکم پر چلتے ہیں۔ کوئی اس کے حکم کی ذرا سی بھی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اوپر اس نے لوگوں کو غلط سلط خیالات اور نظریات میں الجھائے رکھنے کے لئے ہر شعبہ زندگی کے ایک ایک آدمی کو قابو میں کیا ہوا ہے۔ جو گاؤں کے لوگوں کو مزید گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً" ایک جعلی حکیم صاحب ہیں جو لوگوں کو کسی بھی صحیح طریقہ علاج سے برگشتہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ خود حکمت سے بھی واقف نہیں ہیں اور لوگوں کو ایسے ایسے الٹے سیدھے ٹوٹکے بتاتے رہتے ہیں جن سے ان کے مسائل سلجھنے کے بجائے اور بھی الجھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ایک جعلی عامل صاحب ہیں وہ لوگوں کے ذہنوں میں نہ جانے کیسی کیسی ڈراؤنی باتیں بٹھاتے رہتے ہیں۔ ایک بات انہوں نے لوگوں کے ذہن میں یہ بھی بٹھا دی ہے کہ اگر انہوں نے اپنے مردے کا پوسٹ مارٹم کرایا تو اس کے جسم میں کوئی بدروح گھس جائے گی اور اس کے بعد وہ قیامت تک اسی دنیا میں بھٹکتا رہے گا۔ لوگوں کو پریشان کرتا رہے گا۔ حالانکہ مجھے وہ عامل صاحب خود کسی بدروح سے کم نہیں لگتے۔ یہ لوگ نیاز علی کے اشاروں پر ایسا کرتے ہیں—— اور سادہ لوح دیہاتی تو بے چارے پہلے ہی ضعیف الاعتقاد کم علم ہیں۔"

"لیکن اس میں نیاز علی کا کیا مفاد ہے؟" جمال صاحب بولے۔ "اس طرح تو ظاہر ہے اگر کوئی یونہی بقول تمہارے، مکھیوں کی طرح مرتے رہیں گے، گاؤں میں خوف و دہشت اور پراسراریت کی فضا قائم رہے گی تو رفتہ رفتہ گاؤں ویران ہو جائے گا۔ زندہ بچ جانے والے بھی رفتہ رفتہ ادھر ادھر بھاگ جائیں گے۔ جس کے جدھر سینگ سمائیں گے چلا جائے گا۔ پھر نیاز علی کن لوگوں پر حکومت کرے گا؟ کون لوگ اس کے لئے دولت پیدا کریں گے؟ کن کے بل بوتے پر اس کے ٹھاٹ باٹ چلیں گے؟"



"یہ سوچنے کی تو شاید وہ زحمت ہی نہیں کرتا۔" تحسین بولا۔ "ویسے بھی اس قسم کے لوگوں کے پاس نہایت تن آسانی سے جمع کی گئی اتنی دولت موجود ہوتی ہے کہ یہ ایک جگہ کو اجاڑنے کے بعد کہیں اور جا کر بھی آباد ہو سکتے ہیں اور پھر وہاں اپنا کھیل شروع کر سکتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے نیاز علی خود کسی بڑی اور پراسرار طاقت کا ایجنٹ ہے—— آلہ کار ہے—— وہ جیسے کسی شیطانی قوت کے ایجنڈے پر کام کر رہا ہے—— لیکن افسوس کہ میں پراسراریت پر یقین نہیں رکھتا اور ان دیکھی طاغوتی طاقتوں کا قائل نہیں ہوں۔ طاغوتی طاقتیں ہمارے آپ جیسے انسانوں ہی کے روپ میں اس دنیا میں موجود ہیں۔ سیاست، مذہب تجارت غرضیکہ کسی بھی شعبہ زندگی میں جو شخص بھی جھوٹ بول رہا ہے لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے، انسانی اقدار کو پامال کر رہا ہے، انسانوں کو تکلیف پہنچا رہا ہے، کسی نہ کسی طرح لوگوں کے دکھوں میں اضافہ کررہا ہے، چہرے پر مکرو فریب کا نقاب چڑھائے دن رات اپنی گھٹیا خواہشوں کی تکمیل میں لگا ہوا ہے، میرے نزدیک وہ ایک طاغوتی طاقت ہی ہے۔"

جمال صاحب تحمل سے مسکرائے اور مربیانہ لہجے میں بولے۔ "تمہارے نظریات میں اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تمہاری سوچ میں اب بھی وہی شدت ہے۔"

"خدا نہ کرے کہ میرے نظریات میں تبدیلی آئے۔" تحسین جلدی سے بولا۔ "میں اعلیٰ انسانی اقدار کے لئے لڑ رہا ہوں۔ قربانی دے رہا ہوں۔ اس دور میں ایک دوسرے کو مار کر آگے بڑھ جانے کا جو چلن عام ہے اس سے بچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس دنیا میں کچھ لوگ تو میرے جیسے بھی ہونے چاہئیں نا——"

"درست ہے——" جمال صاحب نے سر ہلایا۔ "یہ پراسرار بیماری اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی پریشانیاں تو اپنی جگہ ہیں لیکن تمہیں تو نیاز علی کی وجہ سے بھی کافی پریشانی ہوگی۔ میرا یہاں آتے وقت راستے میں اس سے سامنا ہو چکا ہے وہ تو واقعی مجھے بھی خبیث چیز لگتا ہے۔"

"کچھ نہ پوچھیں——" تحسین ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "ایک تو دیانتدار، مخلص اور جاں سوز ڈاکٹر کی حیثیت سے اس ماحول اور یہاں کے حالات میں میری پریشانیوں کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ دوسرے مجھے خود بھی اس پراسرار بیماری کی لپیٹ میں آجانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ مجھے چونکہ اس کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں ہے اس لئے میں اس سے بچاؤ کی بھی کوئی تدبیر نہیں کر سکتا۔ اگر اس بیماری سے بچ بھی گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ نیاز علی میرا پتا صاف کرا دے گا۔ وہ مجھے اپنی راہ کا کانٹا سمجھتا ہے لیکن ابھی تک اس نے اس لئے مجھے کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی اور اس لئے میرا کوئی بندوبست نہیں کیا کہ درحقیقت میں اس کے لئے ابھی تک کسی پریشانی کا باعث نہیں بنا۔ گاؤں میں وہی [illegible]

چاہتا ہے۔ لوگ اس کا حکم مانتے ہیں۔ کچھ لوگ میرے علاج معالجے سے استفادہ ضرور کرتے ہیں اور میرے معتقد بھی ہیں۔ میری شرافت اور بے غرضی کے بھی قائل ہیں لیکن درحقیقت یہاں میری مرضی سے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نیاز علی کو میری طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔"

کمرے میں چند لمحے کے لئے بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔ آخر جمال صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ "یہ تو واقعی خاصی مایوس کن صورتحال ہے تبھی تمہارا خط اس قدر مایوسی لئے ہوئے تھا۔"

"جی ہاں —— وہ تو میں نے بالکل ہی ذہنی خلجان کے عالم میں لکھا تھا۔ درحقیقت وہ تو میں نے بے ربط الفاظ کے ذریعے صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ آپ اور سارہ واقعی اس پکار پر لبیک کہتے چلے آئیں گے۔" تحسین کے لہجے میں ممنونیت تھی۔

"کچھ لوگ ایسے بھی تو ہونے چاہئیں جو تم جیسے سرپھروں کا ساتھ دے سکیں۔" جمال صاحب مسکراتے ہوئے بولے لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر حالات اتنے ہی مایوس کن ہیں تو تم واپس کیوں نہیں چلتے؟ ہمارے ساتھ واپس چلو —— چھوڑو اس سارے جھنجھٹ کو ——"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی سر!" تحسین تیزی سے بولا۔ "مجھے آپ سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی۔ کٹھن حالات میں میدان چھوڑ کر بھاگ جانا نیک مقاصد کے لئے لڑنے والوں کا شیوہ نہیں —— اگر آپ اتنی دور سے زحمت اٹھا کر میرے یہاں آ ہی گئے ہیں تو میرا ساتھ دیجئے۔ کوئی عملی قدم تجویز کیجئے۔"

"مجھے معلوم تھا تم نہیں مانو گے۔ تم ہمیشہ کی طرح وہی ضدی تحسین ہو۔" جمال صاحب نے گہری سانس لی اور ایک لمحے کے توقف سے بولے۔ "اگر تم میری مدد سے واقعی کوئی عملی قدم اٹھانا چاہتے ہو تو پہلا عملی قدم یہ ہے کہ ہمیں پوسٹ مارٹم کے لئے اس بیماری سے مرنے والے کسی شخص کی لاش حاصل کرنی چاہئے۔ میرے پاس گاڑی میں پوسٹ مارٹم کے لئے ضروری سامان اور کیمیکلز وغیرہ موجود ہیں۔ دوائیں بھی ہیں۔ تمہارے گھر کے کسی کمرے میں ہم عارضی آپریشن تھیٹر کی شکل دے دیں گے۔ اس مقصد کیلئے محمد علی کے بھائی کی لاش مناسب رہے گی جسے آج ہی دفن کیا گیا ہے۔ وہ لاش ذرا تازہ ہوگی۔ شاید اس میں ہم موت کی وجہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"لیکن ہمیں بھلا وہ لاش کیسے ملے گی؟" تحسین نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کی قبر کھود کر ——" جمال صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔

تحسین تعجب سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

○



جمال صاحب تحسین کو حیرت زدہ دیکھ کر بولے۔ "اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟"

"لاش کو قبر سے نکالنا —— اور وہ بھی اس کے لواحقین کی اجازت کے بغیر —— یہ خاصا نامناسب کام ہے۔" تحسین ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"لیکن ہمیں یہ کام ایک نیک مقصد اور انسانیت کی بھلائی کیلئے کرنا ہے۔" جمال صاحب بولے۔ "اور قبر سے لاش نکالنے کے سوا کوئی چارہ نہیں —— کیونکہ گاؤں کے ماحول اور لوگوں کے رویئے کے بارے میں تم خود ہی بتا چکے ہو کہ یہ لوگ ان حالات میں بھی پوسٹ مارٹم کی اجازت نہیں دیتے تو پھر آخر اس بیماری کے بارے میں تحقیق کرنے کیلئے کون سا قدم اٹھایا جا سکتا ہے —— اور کیسے اٹھایا جا سکتا ہے؟"

تحسین خاموش رہا تو جمال صاحب مزید پرزور لہجے میں بولے۔ "تم اپنے مقصد میں مخلص ہو' تم ان لوگوں کے کام آنا چاہتے ہو' اسی مقصد کیلئے تم اتنے عرصے سے تکلیف اٹھا رہے ہو بلکہ ایک طرح سے تم نے اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی ہے' اسی مقصد کیلئے تم نے مجھے بلایا ہے اور میں اپنے بیسیوں ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں' اب ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا جو کچھ ہمارے بس میں ہے' وہ کرنے کی کوشش کرکے دیکھ لیتے ہیں' یہ کام ہم جتنی جلدی کر لیں بہتر ہے کیونکہ لاش کو دفن ہوئے جتنی زیادہ دیر گزر جائے گی اتنا ہی بعض علامتوں کے غائب ہونے یا تبدیل ہونے کا خطرہ بڑھتا جائے گا۔ آج چودھویں رات ہے یعنی ہمیں تھوڑی بہت قدرتی روشنی بھی میسر ہے' ہم ذرا آسانی سے اپنا کام کر سکیں گے۔"

تحسین نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ جمال صاحب اسے آمادہ دیکھ کر مطمئن لہجے میں بولے۔ "میرا خیال ہے اپنی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے ہم کچھ دیر آرام کر لیں' میں بھی آج کے سفر سے تھکا ہوا ہوں اور تمہیں بھی یقیناً آج دن بھر کے واقعات اور ذہنی کوفت کے بعد آرام کی ضرورت ہے' اس دوران میں رات بھی کچھ اور گزر جائے گی' ہم آدھی رات کے بعد اپنی مہم پر روانہ ہوں تو بہتر ہے' اس وقت کسی کی دخل اندازی کے امکانات اور کم ہو جائیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔۔۔" تحسین نے ان سے اتفاق کیا اور وہ ڈرائنگ روم میں ہی سونے کیلئے لیٹ گئے۔

ادھر بیڈ روم میں سارہ' آسیہ ابھی تک باتیں کر رہی تھیں لیکن ان کے ذہنوں پر نیند کا غلبہ ہونے لگا تھا۔ سارہ نے راستے میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں آسیہ کو بتا دیا اور آسیہ نے تصدیق کر دی تھی کہ ان سے ٹکرانے والا مقامی جاگیردار کا بیٹا نیاز علی ہی رہا ہو گا جو اس علاقے میں سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ اس نے نیاز علی کے بارے میں اسے بہت کچھ بتایا۔ آخر کار دونوں سونے کیلئے لیٹ گئیں۔

سارہ کو جلد ہی نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا لیکن پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر سوئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ تھوڑی ہی دیر کیلئے اسے نیند آئی تھی اور کسی لاشعوری سے اضطراب نے اسے جگا دیا تھا۔ زیرو کے بلب کی دھندلی سی روشنی میں اس نے قریب موجود ٹیبل کلاک میں وقت دیکھا اور اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی' وہ زیادہ دیر نہیں سوئی تھی۔

اچانک' اس کی نظر دوسرے بیڈ پر پڑی اور اس نے دیکھا آسیہ وہاں نہیں تھی۔ پہلے اسے یہی خیال آیا کہ شاید وہ باتھ روم میں ہو لیکن پھر اس نے دیکھا کہ باتھ روم کا دروازہ نیم وا تھا اور اس میں لائٹ آن نہیں تھی۔ اندھیرا تھا۔ وہ کسی ناقابل وضاحت سی بے چینی کے تحت بیڈ پر اٹھ بیٹھی اور تبھی اس کی نظر کھڑکی سے باہر چلی گئی اور وہ بری طرح چونک اٹھی۔

اس نے ایک ہیولے کو مکان سے نکل کر ایک طرف جاتے دیکھا۔ اس نے آنکھیں مل کر دیکھا اور حیران رہ گئی وہ آسیہ تھی۔ سارہ نے دھیرے سے اسے پکارا لیکن آسیہ نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ گویا ایک عالم خواب میں چلی جا رہی تھی۔ سارہ کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید وہ نیند میں چلنے کی عادی تھی لیکن پھر ایک اور خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں لپکا۔ گاؤں کے اور خود آسیہ اور تحسین کے گھر کے حالات کچھ پراسرار سے ہی تھے' کہیں آسیہ کے اس طرح رات کو چپکے سے گھر سے نکلنے کا تعلق بھی اسی پراسراریت سے تو نہیں تھا؟

وہ جلدی سے بستر سے نکلی' شب خوابی کا گاؤن اس کے جسم پر تھا' اس نے پھرتی سے سلیپر پیروں میں پھنسائے اور باہر کو لپکی۔ باہر جاتے جاتے اس نے ڈرائنگ روم میں جھانک کر دیکھا تو قالین پر جمال صاحب اور تحسین کو محو خواب پایا لیکن اس نے انہیں اٹھانے کی کوشش نہیں کی دراصل اس کا ذہن بیک وقت ان گنت خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

ایک خیال تو یہ تھا کہ کہیں ان دونوں کو اٹھانے اور بات سمجھانے میں دیر نہ ہو جائے اور اس دوران آسیہ غائب نہ ہو جائے۔ دوسرے اسے خود کچھ کرنے اور اپنے آپ کو



ایک باہمت و بے خوف لڑکی ظاہر کرنے کا بھی شوق تھا۔ اس کے علاوہ ذہن کے کسی گوشے میں ایک دھندلا سا خیال یہ بھی تھا اور اس پر اسے تھوڑی سے شرمندگی بھی تھی کہ شاید یہ اس کی محض بدگمانی ہی ہو کہ آسیہ رات کے سناٹے میں یوں چپکے سے گھر سے نکل کر کسی سے ملنے جا رہی تھی لیکن اگر اس کا یہ معیوب سا اندیشہ درست بھی تھا تو وہ چاہتی تھی کہ یہ بات اس تک ہی محدود رہے' دو سہیلیوں کے درمیان ہی رہے' مردوں تک نہ پہنچے۔ خصوصاً" تحسین تک تو ہرگز نہ پہنچے۔ اس کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس گرہ کو وہ خود ہی سلجھانے اور آسیہ کو سمجھانے کی کوشش کر سکتی تھی۔ یہ اس کے خلوص کی دلیل تھی تاہم وہ اپنے آپ کو یہی یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ایسا کوئی چکر نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا آسیہ شادی سے پہلے بھی ایک نہایت شریف لڑکی تھی' اعلیٰ اخلاقی اقدار پر یقین رکھتی تھی اور سارہ کو امید تھی کہ شادی کے بعد اس کے کردار کی پختگی میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہوگا' کمی نہیں آئی ہوگی۔

بہرحال ان تمام خیالات میں الجھی سارہ تیزی سے گھر کے عقبی دروازے سے نکلی اور تنہا ہی آسیہ کے تعاقب میں چل پڑی۔ اس نے آسیہ کو ایک گلی کے موڑ پر غائب ہوتے دیکھا تھا' سارہ نے دوڑ کر سڑک عبور کی اور دوسری طرف کی اس گلی میں داخل ہو گئی۔ گلی کے دونوں طرف اونچے نیچے مکان سکون اور ملگجے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے' اس وقت تک آسیہ کافی دور پہنچ چکی تھی' ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زمین پر نہیں چل رہی تھی بلکہ زمین سے بالشت بھر اوپر ہوا میں تیر رہی تھی۔ سارہ کو اس کا تعاقب جاری رکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی' اس نے دل ہی دل میں شک کیا کہ وہ اپنے ڈیڈی اور تحسین کو جگانے کیلئے نہیں رکی تھی۔ ورنہ آسیہ یقیناً" غائب ہو جاتی اور یہ بات ان دونوں کیلئے زیادہ پریشانی کا باعث ہوتی۔

سارہ ایک باہمت اور توانا لڑکی تھی' اس کے باوجود اسے آسیہ کا تعاقب جاری رکھنے میں وقت پیش آ رہی تھی' اسے احتیاط بھی کرنا پڑ رہی تھی' وہ نہیں چاہتی تھی کہ آسیہ تعاقب سے باخبر ہو جائے وہ حتی الامکان تیزی سے اس کا پیچھا کرتی رہی اور اسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ بہت کم وقت میں وہ کتنا فاصلہ طے کر گئی تھی۔ بس ایک دھندلا سا احساس ضرور تھا کہ وہ گاؤں سے نکل آئی تھی اور ویرانے میں چلی جا رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ آخر اس ویرانے میں آسیہ کہاں جا رہی تھی؟ چاندنی میں وہ اپنے سفید لباس میں کافی دور سے کوئی روح یا آسیب ہی معلوم ہو رہی تھی۔

آخر ایک جگہ درخت کے جھنڈ میں داخل ہو کر آسیہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی' سارہ ہمت کر کے اس جھنڈ میں داخل ہوئی لیکن آسیہ اسے کہیں دکھائی نہ دی' کافی دیر تک پریشان ہونے کے بعد آخر سارہ دوسری طرف سے جھنڈ سے نکل آئی لیکن آسیہ کا

اب کہیں پتا نہ تھا۔ سارہ ویرانے میں حیران و پریشان کھڑی تھی' سڑک پیچھے رہ گئی تھی اور سامنے ہر طرف دور دور تک کھیت دکھائی دے رہے تھے' کھیتوں پر عجیب وحشت سی برس رہی تھی' سارہ کو جھرجھری سی آگئی اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ گاؤں سے کافی دور نکل آئی تھی اور راستہ بھول چکی تھی' اسے قطعاً" اندازہ نہیں تھا کہ وہ اب واپس کیسے پہنچے گی' اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔

پھر اس نے ہمت و جرات کو یکجا کیا' اپنے آپ کو حوصلہ دیا اور پیچھے مڑنے کے بجائے آگے ہی چل دی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ آسیہ کس طرف گئی تھی تاہم اس نے ذرا نیچی آواز میں اس ہولناک سناٹے میں اسے پکارنا شروع کردیا۔

"آسیہ ـــــ آسیہ ـــــ!" اس سناٹے میں یہ آواز بھی تیز اور نمایاں محسوس ہو رہی تھی' وہ نہیں چاہتی تھی کہ آسیہ کے بجائے اس ویرانے میں ادھر ادھر کہیں موجود کوئی اور ذی روح اس کی طرف متوجہ ہوجائے۔

اچانک ایک دلخراش چیخ نے اسے دہلا کر رکھ دیا' وہ لڑکھڑا کر رہ گئی مگر پھر اسے احساس ہوا کہ وہ تیز اور کریہہ آواز تو الو کی تھی۔ سارہ نے بارہا اردو اور انگریزی کہانیوں میں اس قسم کی صورتحال کے بارے میں پڑھا تھا' فلموں میں بھی ایسی سچویشنز دیکھی تھیں لیکن اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ انسان جب خود حقیقی زندگی میں ایسی صورتحال سے دوچار ہوتا ہے تو درحقیقت اس کے محسوسات کیا ہوتے ہیں' اس کی کیفیات کیا ہوتی ہیں' اب اسے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ اگر آسیہ کو اس کی نظر سے اوجھل ہی ہوجانا تھا تو بہتر تھا کہ وہ اپنے ڈیڈی اور تحسین کو جگا ہی لیتی' وہ تو اپنی دانست میں کوئی اہم راز معلوم کرنے اور چھوٹی سی کوئی مہم سر کرنے کے خیال سے تنہا نکل کھڑی ہوئی تھی۔

اچانک ایک طرف جھاڑیوں کے عقب سے ایک سایہ نمودار ہوا۔ سارہ کا دل دھک سے رہ گیا' اس نے الٹے قدموں سے بھاگ جانا چاہا مگر ٹانگوں نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ مگر دھندلی چاندنی میں اس سائے کو پہچان کر اسے کچھ ڈھارس ہوئی وہ محمد علی تھا جسے اس نے دوپہر کو گاؤں آتے وقت ایک میت کے ساتھ دیکھا تھا اور اسے معلوم ہوگیا تھا کہ پراسرار بیماری کا شکار ہوکر مرنے والا وہ شخص محمد علی کا بھائی تھا۔

محمد علی گرتا پڑتا اس کی طرف بڑھا پہلے تو سارہ کو یہی خیال آیا کہ شاید وہ زخمی تھا اسے چوٹ لگی ہوئی تھی لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ وہ نشے میں دھت تھا پھر وہ اتنا قریب آگیا کہ سارہ اس کے منہ اور وجود سے اٹھتی ہوئی بو بھی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ محسوس کرسکتی تھی' شاید وہ سستی اور گھٹیا قسم کی شراب کی بو تھی۔ سارہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی آج اس کے جوان بھائی کا انتقال ہوا تھا اور رات میں وہ شراب کے نشے میں دھت ہوکر اس ویرانے میں لڑکھڑاتا پھر رہا تھا۔ یہ بات اگر اس سے کہی جاتی تو شاید وہ یہی جواب دیتا کہ وہ تو غم بھلانے کیلئے پیئے ہوئے تھا۔



سارہ نے اس سے کوئی خاص خطرہ محسوس نہیں کیا تھا' اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ احترام سے پیش آئے گا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ شراب کو خواہ مخواہ ہی ام الخبائث نہیں کہا گیا تھا۔ محمد علی نشے کے باعث ہوش و حواس سے بیگانہ تھا۔ اگر وہ اسے پہچان بھی چکا تھا تب بھی شاید اسے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ بس اس کی نظر میں ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

وہ دونوں بازو پھیلا کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے نشے میں لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ "واہ ـــــ واہ ـــــ اس جنگل بیابان میں ایک حسین لڑکی بھی موجود ہے ـــــ ادھر آؤ خوبصورت لڑکی ـــــ! میرے قریب آجاؤ ـــــ میں تمہارے ساتھ مل کر اپنا غم غلط کرنا چاہتا ہوں ـــــ میں آج بہت غمگین ہوں ـــــ"

اس کی آنکھوں میں ناچتی ہوئی ہوس اور پھیلی ہوئی بانہیں بتا رہی تھیں کہ غم غلط کرنے سے اس کی مراد کیا تھی۔ درختوں کی خشک ٹہنیاں سوکھے پتے اور ادھر ادھر پھیلی ہوئی گھاس پھوس اس کے پیروں تلے چرچرا رہی تھی' وہ سارہ کے اتنا قریب آچکا تھا کہ ایک لمحے کیلئے بے اختیار سارہ کا دل چاہا کہ اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کرے لیکن پھر اس نے اس سے نہ ہی الجھنے میں عافیت سمجھی۔ بے شک وہ ایک جرات مند اور تیز و طرار سی تھی' پھرتی سے ہاتھ پاؤں بھی چلا لیتی تھی' اسے تھوڑی بہت جوڈو کراٹے کی بھی شدبد تھی لیکن بہرحال وہ ایک لڑکی تھی' اس وقت اس ویرانے اور سناٹے میں اس نے بہتر یہی سمجھا کہ زیادہ بہادری دکھانے کی کوشش نہ کی جائے' وہ یکدم پلٹ کر دوڑ پڑی۔ محمد علی شاید اپنی دھن میں اوندھے منہ گر گیا تھا۔

سارہ اپنی دانست میں واپس گاؤں کی طرف بھاگ رہی تھی لیکن اسے راستہ بالکل یاد نہیں تھا اور نہ ہی اس وقت سمتوں کا احساس تھا' اس کے سامنے تاحد نظر ایک ناہموار سا میدان پھیلا ہوا تھا جس میں کہیں کہیں جھاڑ جھنکاڑ ہیولوں کی طرح لہرا رہے تھے' اچانک اسے ایک نئی افتاد کا احساس ہوا۔ اس نے سامنے سے تین گھڑسواروں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا' محمد علی سے تو وہ کافی دور نکل آئی تھی اور اپنی دانست میں اس خطرے سے بچ گئی تھی' لیکن سامنے سے اس سے کہیں بڑا خطرہ تیز رفتاری سے اس کی طرف چلا آرہا تھا۔

اس نے دوڑتے دوڑتے اپنی سمت بدلنے کی کوشش کی لیکن اس کے ساتھ ہی گھڑسواروں نے بھی اپنی سمت بدل لی۔ وہ نیم دائرے میں اس کی طرف بڑھ رہے تھے اور اگر وہ پلٹ کر بھاگتی تو عین ممکن تھا کہ محمد علی سے ایک بار پھر اس کا سامنا ہو جاتا اور گھڑسوار بہرحال پھر بھی اس تک آن ہی پہنچتے کیونکہ ان کی رفتار اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ

چاندنی میں اب تو ان کے خطوط بھی واضح ہو چکے تھے' وہ گہرے رنگ کی شلوار قمیضوں میں ملبوس' کرخت صورت سے دیہاتی معلوم ہوتے تھے' کندھوں پر بندوقیں لٹکی دکھائی دے رہی تھیں' پتلی نال کی جدید گنیں ہی معلوم ہوتی تھیں' تاہم سواری ان کی قدیم تھی یعنی گھوڑا ـــــ

ان کے اور سارہ کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں رہا تھا اور وہ یقیناً" اسے بھاگتے دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے' انہوں نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے تھے' یہ وحشت انگیز اور مجنونانہ سے قہقہے سارہ کے جسم میں سنسنی دوڑا رہے تھے' اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اسے زندگی میں کبھی ایسی صورتحال سے بھی واسطہ پڑے گا پھر اس کی رہی سہی امید بھی اس وقت خاک میں مل گئی جب وہ کسی چیز میں الجھ کر گر پڑی۔ یہ غنیمت تھا کہ وہاں گھاس پھونس کی نرم تہہ موجود تھی' اسے چوٹ نہیں لگی لیکن اس میں وہاں سے اٹھنے کی ہمت نہ رہی۔

یکدم ہی جیسے اس کے جسم سے جان نکل گئی تھی' اب تک وہ ایک روانی میں بھاگی چلی جا رہی تھی لیکن گرتے ہی اس کا وجود جیسے ریت کے گھروندے کی طرح ڈھے گیا۔ اسے احساس تھا کہ خطرہ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا' اس کے باوجود وہ اٹھنے میں کامیاب نہ ہو سکی البتہ وہ سیدھی ضرور ہو گئی۔

جب اس نے گھڑ سواروں کو سر پر پہنچتے دیکھا تو ایک بار پھر اپنی بچی کچھی توانائی جمع کرنے کی کوشش کی۔ کسی نہ کسی طرح وہ اٹھنے میں کامیاب ہو گئی اور کمزور سے انداز میں ایک طرف کو بھاگی مگر اس وقت تک تینوں گھڑ سوار گویا اس کے گرد مثلث سی بنا چکے تھے وہ ایک طرف کو بھاگی تو جلدی سے ایک گھڑ سوار سامنے آ گیا۔ راستہ مسدود پا کر وہ دوسری طرف کو مڑی تو دوسرے گھڑ سوار نے گھوڑا آگے لا کر اس کا راستہ روک لیا۔

اس کی حالت اس لومڑی کی سی تھی جسے چاروں طرف سے شکاری کتوں نے گھیر لیا تھا' ان کے چاروں طرف کھلا میدان تھا' اس کے باوجود فرار کا کوئی راستہ نہ تھا' وہ لوگ اب اس کی حالت سے اور بھی زیادہ محظوظ ہو رہے تھے' ہزیانی سے انداز میں قہقہے لگا رہے تھے اب تو سارہ صاف طور پر ان کے چہرے بھی دیکھ سکتی تھی جن سے وحشت و درندگی عیاں تھی۔

سارہ کو کچھ دور درختوں کا جھنڈ دکھائی دیا شاید وہ کوئی چھوٹا موٹا جنگل تھا' وہ کسی طرح تینوں گھڑ سواروں کے درمیان سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی اور اس جنگل کی طرف بھاگی کہ شاید وہاں درختوں کے درمیان اسے کسی ایسی جگہ پناہ میسر آ جائے جہاں گھڑ سوار نہ گھس سکیں۔ لیکن وہ رفتار میں گھڑ سواروں کو شکست نہیں دے سکتی تھی پھر اسے اندازہ ہوا کہ گھڑ سواروں نے شاید اسے خود ہی اپنے نرغے سے نکلنے کا موقع فراہم کیا تھا شاید وہ چوہے



ی کے اس کھیل سے مزید لطف اندوز ہونے کے لئے اسے کچھ اور بھگانا چاہتے تھے' ان کی ہی لور قہقہے کچھ اور تیز ہو گئے تھے۔

آخر کار انہوں نے گویا اس کھیل کو اختتام تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا' ان میں سے ایک سوار جو باقی دونوں سے زیادہ قد آور اور توانا معلوم ہوتا تھا اور جسے شاید حیثیت میں بھی ان پر برتری حاصل تھی' گھوڑے کو ایڑ لگا کر زیادہ تیزی سے سارہ کے برابر آیا' اس نے جھک کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور کھینچ کر اوپر اٹھا کر گھوڑے کی پیٹھ پر لاد لیا' ایک لمحے کیلئے گھوڑا بے قابو سا ہو کر زور سے ہنہنایا لیکن پھر سرپٹ دوڑنے لگا۔

سارہ گھوڑے پر دہری ہو کر لٹکی ہوئی تھی اور اس کے جسم کا سارا خون گویا اس کے ہر میں جمع ہو رہا تھا' اس کے دل و دماغ میں طوفان سے اٹھ رہے تھے' اس نے جس ماحول ں پرورش پائی تھی اس میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اسے ایسی صورتحال سے واسطہ سکتا تھا وہ غم و غصے سے کھول رہی تھی کہ ان لوگوں نے ایک لمحے کیلئے بھی یہ دیکھنے النے یا جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ کون تھی' کیا اور کس وجہ سے رات کے اس ر ویرانے میں نظر آ رہی تھی وہ تو بس فلمی غنڈوں کی طرح گھوڑے دوڑاتے ہوئے اس ے پیچھے لگ گئے تھے۔

اسے یہ تو معلوم تھا کہ کیا دیہات اور کیا شہر ـــــ کہیں بھی صحیح معنوں میں قانون کی مرانی نہیں رہی تھی' ہر جگہ خود سری اور اپنی اپنی طاقت کے گھمنڈ میں مبتلا کوئی نہ کوئی لا شرافت و شائستگی اور انسانیت کا جنازہ نکالنے پر کمربستہ رہتا تھا' پھر بھی نہ جانے کیوں بھی کبھار ایسا تصور اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا جیسا اس وقت اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

سر نیچے کی طرف لٹکا ہونے کی وجہ سے خون گویا اس کی آنکھوں میں اترا آ رہا تھا' ہموار زمین تیزی سے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتی جا رہی تھی اور وہ گھوڑے کی نکھوں کے سامنے سے گزرتی جا رہی تھی اور وہ گھوڑے کی ٹانگوں کو بھی تیزی سے حرکت رتے دیکھ رہی تھی' کچی زمین پر گو کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں زیادہ بلند نہیں تھیں لن وہ بھی سارہ کے دماغ پر گویا ہتھوڑوں کی طرح برس رہی تھیں۔

کچھ دیر کے سفر کے بعد آخر کار وہ لوگ رک گئے اور گھوڑوں سے اتر پڑے' اسے ی بے رحمانہ سے انداز میں کھینچ کر گھوڑے سے اتارا گیا' تب سارہ نے پہلی بار نہایت ب سے اپنے صیاد کی شکل دیکھی' وہ سانولے رنگ اور کرخت چہرے والا تقریباً" تیس ں کی عمر کا ایک مضبوط اور توانا آدمی تھا' اس کے سر پر بڑی سی ڈھیلی ڈھالی پگڑی تھی' بیان کھلا تھا اور بالوں بھرے سینے پر سونے کی موٹی سی چین چمک رہی تھی' اس کے ھے پر کلاشنکوف لٹکی ہوئی تھی' موٹی موٹی آنکھوں میں خمار کے گلابی ڈوروں کے ساتھ تھ شیطانیت کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں' باقی دونوں بھی کسی حد تک اسی سے ملتے

جلتے تھے لیکن وہ جسامت اور حیثیت میں اس سے بہت کمتر معلوم ہوتے تھے' وہ ان دونوں کا سردار معلوم ہوتا تھا۔

انہوں نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا اور سردار اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ کر اسے لکڑی کے ایک سالخوردہ اور نیم شکستہ سے گیٹ کی طرف لے چلا جو کھلا ہی تھا' وہ پوری عمارت ہی سالخوردہ اور نیم شکستہ بلکہ تقریباً" کھنڈر ہی معلوم ہوتی تھی۔ سارہ کو گمان گزرا کہ شاید وہاں پہلے کبھی کوئی فلور ملز تھا۔ ایک نیم شکستہ سی دیوار پر اسے "فلورملز" کے مٹے مٹے دھندلے دھندلے سے انگریزی حروف بھی دکھائی دیئے اور کچھ دوسری معدوم ہوتی سی نشانیاں بھی دکھائی دیں۔

گیٹ کے قریب پہنچ کر سارہ جیسے کسی بھیانک خواب سے چونکی اور اس نے جھرجھری سی لے کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی' اندر سے وہ بری طرح خوفزدہ تھی' اسے اندازہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا کچھ ہونے والا تھا اور کیا کچھ ہوسکتا تھا۔ اس احساس سے اس کی رگوں میں خون منجمد ہوا جارہا تھا لیکن وہ اپنا خوف ان لوگوں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی' اس نے مزاحمت اور چیخ و پکار شروع کردی لیکن ان تین مضبوط اور توانا مردوں کے سامنے اس کی مزاحمت کیا حیثیت رکھتی تھی؟

اسے تو اکیلے سرغنہ نے ہی قابو میں کرلیا' اس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک بازو سے اسے جکڑ لیا' دوسرے آدمی نے اس کے پاؤں زمین سے اٹھالئے اور وہ اسے کسی بڑی مگر ہلکی پھلکی گڑیا کی طرح اٹھائے اندر لے آئے' ان پر درندگی سی سوار تھی جس میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ چند سیڑھیاں اتر کر وہ ایک ہال نما حصے میں آگئے' حالت تو اس کی بھی تباہ ہی تھی لیکن کچھ پرانے اور مختصر سے سامان کے ذریعے گویا اسے قیام کے قابل بنایا گیا تھا۔

ایک طرف زمین پر فوم کے گدوں کا بستر بھی لگا ہوا تھا۔ کارنس پر بڑی بڑی کئی موم بتیاں روشن تھیں جن سے وہ ہال نما تہہ خانہ خاصا روشن تھا' ضرورت کی کچھ چیزیں بھی وہاں موجود تھیں' لکڑی کی ایک بے ہنگم میز' کرسی پر ایک اور شخص بھی وہاں موجود تھا' وہ ان تینوں سے زیادہ وحشی معلوم ہوتا تھا' اس کے چہرے پر گھنی مونچھوں کے ساتھ جھاڑ جھنکاڑ داڑھی بھی موجود تھی' وہ جنگلیوں کی طرح بڑا سا ایک تھال سامنے رکھے بھنی ہوئی ایک سالم مرغی ادھیڑ رہا تھا' اس کا جنگلی پن اس سے بھی عیاں تھا کہ اس کی داڑھی اور سر کے بالوں میں تنکے پھنسے ہوئے تھے۔

اس نے جب ان لوگوں کو سارہ کو اٹھائے ہال میں داخل ہوتے دیکھا تو بن مانس کی طرح چیخ مار کر اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا' اس کی آنکھوں میں خمار کی سرخی بھی تھی' آنے والوں نے سارہ کو فوم کے بستر پر "پٹخ دیا' وہ چاروں بھوتوں کی طرح اس کے گرد کھڑے



ہوکر بھوکی نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگے پھر جھاڑ جھنکاڑ بالوں والا تو باقاعدہ ناچنے لگا۔

"ہو ہو___ ہو ہو___" وہ قہقہے لگانے لگا۔ وہ کسی حد تک زمانہ غار کا آدمی معلوم ہوتا تھا اور وہ جگہ ڈاکوؤں کی کمین گاہ معلوم ہورہی تھی۔ چند سیکنڈ ناچنے کے بعد وہ رک کر سارہ پر سے نظر ہٹائے بغیر بولا۔ "آج تو تم لوگ ہمیشہ سے بھی زیادہ اچھا زیادہ خوبصورت شکار لائے ہو۔"

"ہاں___ آج قسمت زیادہ مہربان تھی۔" سارہ کو گھوڑے پر لاد کر لانے والے نے جواب دیا۔ "اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ سردار کے دسترخوان سے پھینکی جانے والی جھوٹی اور چچوڑی ہوئی ہڈی بھی نہیں ہے___ یہ ہمارا اپنا شکار ہے___ بالکل تازہ اور شاندار___"

وحشی شخص مرغی ادھیڑنا بھول گیا تھا' وہ لتھڑے ہوئے ہاتھوں سے ہی کارنس سے تاش کی ایک گڈی اٹھاتے ہوئے بولا۔ "چلو___ چلو___ وقت ضائع نہ کرو___ سب سے پہلے فیصلہ کرلو___ ہمیشہ کی طرح___ سب کو اپنی اپنی باری کا پتا ہونا چاہئے___ ہم بڑے انصاف پسند لوگ ہیں___ ہاہا___ ہو ہو___" وہ ایک بار پھر قہقہے لگانے لگا۔ وہ سب بڑے کرخت اور غیر مہذبانہ انداز میں باتیں کررہے تھے مگر ان کا مفہوم یہی تھا۔

اس نے الٹے تاش پھیلا کر باری باری سب کے سامنے کردیئے' سب نے ایک ایک پتا کھینچ لیا اور پھر سب نے باری باری اپنا اپنا پتا سیدھا کیا۔ سارہ کو اٹھا کر لانے والے نے ایک فاتحانہ نعرہ بلند کیا اور بولا۔ "ہمیشہ کی طرح میرا پتا سب سے بڑا ہے___ حکم کا بادشاہ___ ویسے بھی یہاں سردار کی غیر موجودگی میں حکم کا بادشاہ میں ہی ہوتا ہوں___ میرا ہی حکم چلتا ہے اور شکار بھی سب سے پہلے میرے ہی حصے میں آتا ہے۔"

سارہ دم بخود پڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی' اب تو جیسے اس میں چیخنے کی بھی سکت نہیں تھی' اس بدن پر خفیف سا لرزہ طاری تھا' جھاڑ جھنکاڑ داڑھی والے کے چہرے پر بدمزگی کے آثار تھے' وہ تاش کے پتوں کے ذریعے ہونے والے فیصلے پر خوش دکھائی نہیں دیتا تھا' لیکن شاید اپنے تمام تر جنگلی پن اور وحشت کے باوجود اسے بھی اس شخص کے سامنے بولنے کی جرأت نہیں تھی جو سارہ کو گھوڑے پر ڈال کر لایا تھا۔

بن مانس نما شخص نے ناگواری سے اسے مخاطب کیا۔ "ڈیو! تو ہمیشہ سے خوش قسمت ہے' جس دن تیری قسمت ذرا ٹھنڈی ہوئی' اس دن ایسے ہی کسی موقع پر تو میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔"

سارہ کو اٹھا کر لانے والا آدمی جسے ڈیو کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا' خوش دلی سے قہقہہ لگاتے ہوئے بن مانس نما شخص کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر بولا۔ "مجھے مارنے

کیلئے تجھے شیرنی کا دودھ پینا پڑے گا۔ ریچھ کی اولاد۔۔۔!"

بن مانس نما شخص گویا اپنی بدمزگی کو چھپانے اور اپنا دھیان ہٹانے کیلئے دوبارہ مرغی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اب وہ گویا جھنجلاہٹ کے سے عالم میں اسے بھنبھوڑ رہا تھا۔ ڈیو باقی دونوں آدمیوں سے مخاطب ہوا۔ "جاؤ۔۔۔ کچھ اور شراب و کباب کا بندوبست کرو۔۔۔ اصل مزا تو اب آئے گا۔"

قریب ہی شاید کوئی دوسرا کمرہ تھا' وہ لوگ جلد ہی ناؤنوش کا اسباب لے آئے اور سارہ کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے' دور چلنے لگا' ڈیو اب ایک ہنٹر گود میں رکھے بیٹھا تھا' بار بار ہنٹر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ پرخیال انداز میں سارہ کا سرتاپا جائزہ لینے لگتا تھا' شاید وہ اس صورتحال سے لذت کشید کرنے کے ساتھ ساتھ درندگی کے کچھ نمونے بھی ذہن میں ترتیب دے رہا تھا۔ ادھر سارہ کو اسی خیال سے کسی حد تک سکتہ سا ہوگیا تھا کہ شاید یہ ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ وہ اب اسی خیال سے دل کو ڈھارس دیئے ہوئے تھی کہ وہ خواب کسی بھی لمحے ٹوٹ جائے گا۔ اس کی آنکھ کھل جائے گی اور خود کو آسیہ کے ساتھ خواب گاہ میں پائے گی لیکن اس کے لاشعور میں کوئی چیز اسے ڈرا بھی رہی تھی کہ اس کی یہ تمنا پوری ہونے والی نہیں تھی۔

اس دوران میں ڈیو نے ایک بار ہنٹر پر ہاتھ پھیرنے کے بجائے ہاتھ سارہ کی طرف بڑھایا' وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی اور اپنی دانست میں چلائی۔ "خبردار۔۔۔ مجھے مت چھونا۔۔۔ میرے قریب مت آنا۔۔۔"

اپنی دانست میں تو وہ چلائی تھی مگر درحقیقت اس کے حلق سے ایک نہایت ہی کمزور اور قابل رحم سی آواز برآمد ہوئی تھی۔ وہ چاروں طنزیہ انداز میں ہنسنے لگے پھر ڈیو نے ہنٹر اپنی گود سے اٹھا کر دھیرے سے ہوا میں لہرایا اور غرانے کے سے انداز میں بولا۔ "اب میں ان تینوں کو باہر بھیج رہا ہوں' خیریت چاہتی ہو تو چپ چاپ پڑی رہنا ورنہ مار مار کر تمہاری یہ خوبصورت گوری چمڑی تمہارے اس حسین جسم سے الگ کر دوں گا' سمجھ گئی نا؟ خاموشی میں ہی تمہاری بھلائی ہے' ویسے اگر چیخ چیخ کر اپنا گلا خراب کرنے کا تمہیں بہت ہی شوق ہے تو بے شک چیخو۔۔۔ یہاں دور دور تک تمہاری آواز سننے والا کوئی نہیں ہے۔"

پھر اس نے باقی تینوں کو اشارہ کیا اور گویا وہ بادل نخواستہ اٹھ کھڑے ہوئے' گلاس ابھی ان کے ہاتھوں میں ہی تھے۔

○

جمال صاحب کے لاشعور میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ انہیں آدھی رات کے بعد اٹھ کر قبرستان جانا تھا۔ اس لئے گہری نیند سے بھی ان کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے کی دھندلی



[illegible] میں انہوں نے اپنی رسٹ واچ اٹھا کر دیکھی جو انہوں نے سوتے وقت قریب ہی [illegible]ی پر رکھ دی تھی' بارہ بج چکے تھے۔ انہوں نے آہستگی سے تحسین کو پکارا' پھر اس کا [کن]دھا ہلایا' جلد ہی وہ بھی اٹھ بیٹھا۔ جمال صاحب نے سرگوشیوں میں اسے یاد دلایا کہ انہیں کس مہم پر روانہ ہونا تھا' تحسین فوراً ہی غنودگی کو ذہن میں جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

خواب گاہ کا دروازہ چونکہ بند تھا' اس لئے انہوں نے یہی سمجھا کہ دونوں لڑکیاں اندر [سو]ئی ہوئی تھیں وہ نہ تو ان کی نیند میں مخل ہونا چاہتے تھے اور نہ ہی انہیں آگاہ کرنا چاہتے [تھ]ے کہ وہ کس چکر میں تھے' اس لئے دبے پاؤں چل پھر رہے تھے' ان کے وہم و گمان میں [بھ]ی نہیں تھا کہ اس وقت سارہ یا آسیہ دونوں میں سے کوئی بھی خواب گاہ میں موجود نہیں تھی۔

وہ دبے پیروں برآمدے میں آئے۔ تحسین کے پاس ایک بیلچہ اور ایک کسی موجود تھی' انہوں نے وہ اٹھا لیں' بڑی ٹارچ ساتھ لی گو کہ اس وقت چاندنی پھیلی ہوئی تھی لیکن ٹارچ کی ضرورت بہرحال پڑ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے ضرورت کی وہ تین چیزیں ساتھ لیں اور دبے پیروں گھر سے نکل آئے۔

"قبرستان زیادہ دور نہیں ہے۔۔۔" تحسین سرگوشی میں بولا۔ "بہتر تو یہی رہتا کہ ہم پیدل چلتے لیکن چونکہ ہمیں وہاں سے لاش نکال کر لانی ہے اس لئے بہتر ہے کہ گاڑی میں چلیں۔"

"لیکن اگر ہم گاڑی گھر کے قریب سٹارٹ کریں گے تو کہیں لڑکیاں نیند سے بیدار نہ ہوجائیں۔" جمال صاحب نے خدشے کا اظہار کیا۔ "بہتر ہے کہ پہلے ہم دونوں اسے دھکیل کر گھر سے کچھ دور لے جائیں۔"

تحسین نے ان کے مشورے سے اتفاق کیا اور دونوں ڈاکٹر جمال کی پجیرو کو بمشکل دھکیل کر کچھ دور لے گئے۔ انہیں قطعاً علم نہیں تھا کہ وہ بلا وجہ ہی یہ مشقت کر رہے تھے۔ غنیمت تھا کہ انہیں گاڑی زیادہ تو ڈھلوان کی طرف دھکیلنا پڑی پھر گاڑی میں بیٹھ کر وہ ذرا ہی دیر میں قبرستان پہنچ گئے' گاڑی انہوں نے قبرستان سے باہر ہی چھوڑ دی اور ضرورت کی چیزیں اٹھا کر پیدل قبروں کے درمیان چل پڑے۔

ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا' دھندلی چاندنی میں قبرستان میں کہیں کہیں ہوا سے دھیرے دھیرے ہلتی ہوئی درختوں کی شاخوں کی وجہ سے قبروں کے درمیان پرچھائیاں سی حرکت کرتی دکھائی دے رہی تھیں' سناٹا اتنا گہرا تھا کہ چلتے چلتے ایک بار تحسین کا بیلچہ جمال صاحب کی کسی سے ٹکرا گیا تو "ٹن" کی جو آواز پیدا ہوئی وہ رات کے سکوت میں بلند ہونے والی گھنٹہ گھر کی آواز کی طرح دور تک پھیل گئی۔ تحسین ہڑبڑا کر جمال صاحب سے

کچھ دور ہو کر چلنے لگا' اسے محمد علی کے بھائی کی قبر کا پتا تھا۔ اس مرحوم نوجوان کا نام احمد علی تھا تاہم اس کی قبر پر اس کے نام کا کتبہ نصب نہیں تھا۔ ڈاکٹر تحسین کو کتبے کی نشانی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے جمال صاحب کو بغیر کسی دشواری کے قبر پر لے جا کر کھڑا کیا۔

قبر کی مٹی تازہ اور نم دکھائی دے رہی تھی' لیکن اس پر پڑے ہوئے تھوڑے سے پھول مرجھا چکے تھے۔ دونوں آدمیوں نے ادھر ادھر دیکھا پھر آستینیں چڑھا کر اپنے کام میں جت گئے۔ چند دن پہلے تک جمال صاحب نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک روز وہ دیہات کے ایک قبرستان میں ایسا پرمشقت اور معیوب سا کام کر رہے ہوں گے لیکن وہ گھر سے نکلے ہی سوچ کر تھے کہ وہ ایک ایڈونچر پر روانہ ہو رہے ہیں اور ایڈونچر بھی ایسا جس میں انسانیت کی بھلائی بھی پنہاں تھی۔ بس اسی احساس کی بدولت وہ نہ تو بدمزگی کا شکار ہو تھے نہ ہی انہیں کسی قسم کا خوف لاحق تھا۔ گویا ان کے جسم میں نئی توانائی اور طاقت بھر رہی تھی۔

قبر کی مٹی ابھی نرم ہی تھی' انہیں کھدائی میں زیادہ وقت پیش نہیں آئی' جلد ہی انہیں سیمنٹ کی سلیں نظر آنے لگیں جن کے نیچے پہلودار گڑھے میں لاش کو موجود ہونا چاہئے تھا مگر روشنی وہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی' سلوں سے مٹی ہٹانے کے بعد وہ ستانے کیلئے رک گئے' مشقت کے اثر اور ایک عجیب سی سنسنی کے احساس سے اس وقت ان دونوں کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے' تحسین قبر میں اترا ہوا تھا۔

ذرا دیر ستانے کے بعد وہ دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئے' جمال صاحب ٹارچ سے قبر میں روشنی ڈالنے لگے اور تحسین پہلی سل ہٹانے کی کوشش کرنے لگا' وہ خاصی مضبوطی سے پھنسی ہوئی تھی اور وزنی بھی معلوم ہوتی تھی۔ آخر کار تحسین نے کافی دیر کی زور آزمائی کے بعد جمال صاحب سے کسی لیکر اس کا کنارا ایک طرف پھنسا کر سل کو اٹھایا پھر اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر قبر میں ہی ایک طرف کھڑا کر دیا۔

جمال صاحب نے ٹارچ کی روشنی اب قبر کے اس حصے میں ڈالی جہاں دراصل لاش کو لٹایا جاتا تھا۔ تحسین گھٹنوں کے بل جھک کر اس شگاف سے اندر جھانکنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے گھگیائی ہوئی سی آواز نکلی اور وہ گویا اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ اگر وہ گر جاتا تو اس کا سر اور کندھے قبر کے اصل شگاف میں چلے جاتے' وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے جمال صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "لاش تو قبر میں ہے ہی نہیں——"

یہ کیا کہہ رہے ہو!" جمال صاحب بے یقینی سے بولے۔ وہ جہاں کھڑے تھے وہاں ـ ٹارچ کی روشنی ڈالنے کے باوجود اس چھوٹے شگاف سے قبر کے پہلو دار گڑھے کا ـ



ں لے سکتے تھے۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں—— قبر خالی پڑی ہے۔" تحسین ہکلاتے ہوئے بولا۔

جمال صاحب مارے بے یقینی کے خود قبر میں کود پڑے۔ اب انہوں نے شگاف سے ھی طرح روشنی ڈالتے ہوئے گھٹنوں کے بل جھک کر گڑھے کا معائنہ کیا' واقعی وہاں کسی ہوے کی موجودگی کا نشان تک نہیں تھا وہ بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کا ذہن معطل سا ونے لگا۔ قبر انہوں نے تحسین کے ساتھ ملکر خود ہی کھودی تھی اور اپنی آنکھوں سے یہ ں دیکھا تھا کہ سیمنٹ کی سلیں کتنی مضبوطی سے اپنی اصل حالت میں جمی ہوئی تھیں۔ اگر سب کچھ وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ چکے ہوتے تو شاید اس کی کوئی توجیہہ یا وضاحت گھڑ تے اور اس قسم کی کسی بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیتے لیکن وہ خود کو اور اپنے حواس تو نہیں جھٹلا سکتے تھے۔

کئی لمحے تک تو وہ کچھ بھی نہ بول سکے۔ دونوں افراد قبر میں کھڑے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر جمال صاحب سرسراتی سی آواز میں لے۔ "تمہیں یقین ہے کہ احمد علی کو اسی قبر میں دفن کیا گیا تھا؟"

"جی ہاں—— مجھے یقین ہے——" تحسین خفیف سی ناگواری سے بولا۔ "ابھی میرے واس اتنے خراب نہیں ہوئے کہ مجھے اس قبر کا مغالطہ ہونے لگے' آپ پورے قبرستان کا ئزہ لے لیں' آپ کو اتنی تازہ بنی ہوئی قبر کوئی اور نہیں ملے گی' اگر ایک لمحے کیلئے فرض ر بھی لیا جائے کہ اس قبر میں احمد علی کو دفن نہیں کیا گیا تھا تو پھر کسی کو تو دفن کیا گیا وگا' اتنے اہتمام سے پوری قبر بنا کر—— حتیٰ کہ اس میں سیمنٹ کی سلیں بھی رکھ کر اسے الی تو نہیں چھوڑا جاتا اور ان باتوں سے قطع نظر میں آپ کو بہ قائمی ہوش و حواس بتا رہا وں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے احمد علی کو اس قبر میں دفن ہوتے دیکھا تھا اور اس وقت ی میرے ہوش و حواس سلامت تھے۔"

"تو پھر لاش آخر کہاں گئی؟" جمال صاحب بڑبڑائے۔ "ایسے آثار بھی موجود نہیں ہیں کہ قبر کو دوبارہ کھودا گیا ہو۔"

"اب تو آپ کو یقین کر لینا چاہئے کہ اس گاؤں میں واقعی کچھ پراسرار واقعات رونما ہو رہے ہیں۔" تحسین ٹھنڈی سانس لیکر بولا۔

"ہاں—— واقعی—— اس میں کیا شک ہے کہ اس گاؤں میں واقعی بڑے پراسرار اقعات رونما ہونے لگے ہیں—— بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ یہاں کے اچھے بھلے معزز لوگ بڑی اسرار حرکتیں کرنے لگے ہیں۔" یہ بارعب سی آواز قبر کے باہر سے آئی تھی پھر ان کے روں پر کسی اور کی ٹارچ کی تیز روشنی یاری باری پڑی۔ ان کی آنکھیں چندھیا گئیں' چند حوں کیلئے وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکے۔

اس دوران میں وہی آواز دوبارہ ابھری۔ "بہت خوب ڈاکٹر صاحب! کیا آپ کی ڈاکٹری اچھی نہیں چل رہی جو آپ نے پارٹ ٹائم جاب کے طور پر کفن چوری کا دھندا شروع کر دیا ہے؟ آپ نے کسی سے مشورہ تو کر لیا ہوتا' کفن چرانے کے دھندے میں بھی کوئی ایسی خاصی کمائی تو نہیں ہے۔"

اب انہوں نے وزدیدہ سی نظروں سے دیکھا۔ قبر کے کنارے مٹی کے ڈھیر پر ایک باوردی پولیس انسپکٹر اور دو پولیس کانسٹیبل کھڑے تھے' انسپکٹر کے ہاتھ میں چھڑی تھی جسے وہ دھیرے دھیرے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مار رہا تھا اور گہری نظروں سے جمال صاحب اور تحسین کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ ایک بار پھر طنزیہ لہجے میں تحسین سے مخاطب ہوا۔ "ڈاکٹر صاحب! کچھ تو خیال کیا ہوتا۔ آپ ڈاکٹر لوگ زندگی میں تو لوگوں کو چین سے نہیں رہنے دیتے کم از کم مرنے کے بعد تو انہیں ان کی قبروں میں آرام سے سونے دیا کریں' شاید آپ یہ کہیں گے کہ یہاں بھی آپ اپنے مریض کو چیک کرنے آئے تھے لیکن اب چیک کرنے کا کیا فائدہ —— جب آپ اس کی زندگی میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکے اب مرنے کے بعد اس کا دل' گردے اور پھیپھڑے چیک کرنے کا کیا فائدہ ——؟"

وہ یقیناً" ڈاکٹر تحسین کو پہچانتا تھا' اسی لئے طنزیہ انداز میں باتیں کئے جا رہا تھا اور تحسین دم بخود اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ گویا بولنا ہی بھول گیا تھا۔ جمال صاحب بھی خاموش کھڑے تھے' وہ پہلے ہی زمین میں کچھ گہرائی میں اترے ہوئے تھے لیکن شاید ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ زمین میں کچھ اور گڑ جائیں۔

○

خالد کا اندازہ درست ہی تھا۔

اس پیشی پر شرافت علی کو بری کر دیا گیا۔ دلائل مکمل ہو چکے تھے' گواہوں پر جرح ہو چکی تھی' شہادتیں پیش کی جا چکی تھیں۔ خالد نے ہمیشہ کی طرح اپنے پتے نہایت ہوشیاری سے کھیلے تھے۔ اس روز عدالت میں خاصا ہجوم تھا۔ پریس نے بھی اس کیس میں پوری دلچسپی لی تھی اور ہر پیشی پر پریس کے کچھ نہ کچھ لوگ موجود رہے تھے' اس روز ان کی تعداد کچھ زیادہ تھی۔

جج صاحب نے فیصلہ سنایا تو عدالت میں سناٹا چھا گیا لیکن یہ خاموشی ایک خاص تاثر لئے ہوئے تھی۔ خالد کو معلوم تھا اور شاید خود جج صاحب کو بھی اندازہ تھا کہ ان کا یہ فیصلہ پسند نہیں کیا گیا تھا لیکن وہ مجبور تھے۔ قانون تو قاعدوں' ضابطوں اور ایک خاص طریقہ کار کا نام تھا' اس میں جذبات تو کیا محض واقعاتی شہادتوں سے بھی بات نہیں بنتی تھی۔ بعض



ات واقعاتی شہادتیں صاف بتاتی تھیں کہ فلاں شخص ہی قاتل تھا لیکن شہادتوں کو جب ٹھوس' مادی اور ناقابل تردید شکل میں عدالت میں پیش نہیں کیا جاتا تھا' عدالت فیصلہ یں دے سکتی تھی۔ اس لئے قانون کو اگر اندھا کہا جاتا تھا تو یہ کچھ ایسا مبالغہ نہیں تھا۔

فیصلہ سننے کے بعد خالد نے طمانیت کی گہری سانس لیں' یہ اس کی پیشہ ورانہ زندگی کا ب تک کا اہم ترین کیس تھا۔ اس نے جب اس کیس پر کام شروع کیا تھا تو اسے شرافت و بری کرانا تقریباً" ناممکن دکھائی دیا تھا لیکن آج یہ ناممکن کام ممکن ہوگیا تھا۔ جیل کا عملہ افت علی کو باہر لے چلا تو پریس فوٹوگرافر دھڑا دھڑ اس کی تصویریں کھینچنے لگے۔ وہ موٹے اغ کا نوجوان تھا' بے وقوفوں کی طرح مسکرا مسکرا کر ان کی طرف دیکھنے لگا' اسے شاید خود ندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی کا کتنا اہم فیصلہ سنایا گیا تھا۔ وہ درحقیقت موت کے نہ میں سے واپس آیا تھا۔ اسے صورتحال کا اتنا بھی ادراک نہیں تھا کہ وہ خالد کا شکریہ ہی دا کر دیتا۔

پریس والوں سے فارغ ہونے کے بعد جیل کا عملہ شرافت علی کو دوسرے دروازے ے باہر لے چلا' خالد بھی عدالت سے نکل آیا پھر وہ عمارت کے احاطے سے بھی باہر آگیا۔ امران گاڑی لئے اس کا منتظر تھا۔ اس نے دیکھا وہیں پولیس کی وہ بند گاڑی بھی موجود تھی س میں قیدیوں کو پیشیوں کیلئے لایا جاتا تھا۔ شرافت علی کو بھی پولیس والے باہر لا کر اسی ڑی میں بیٹھا رہے تھے۔ خالد کو معلوم تھا کہ شرافت کو بے شک بری کر دیا گیا تھا لیکن بھی اسے واپس جیل جانا تھا اور ایک باقاعدہ طریقہ کار سے گزرنے کے بعد ریلیز ہونا تھا' وارث ملزموں کو اس مرحلے پر بھی خاصی دشواریاں پیش آتی تھیں۔

خالد گاڑی میں بیٹھ چکا تھا اور کامران نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی' انجن بھی ارٹ تھا لیکن کامران نے اس وقت تک گاڑی آگے نہیں بیھائی جب تک پولیس کا بند ک شرافت کو لیکر روانہ نہیں ہوگیا۔ پولیس کا ٹرک روانہ ہوا تو کامران بھی گاڑی اسی ار سے اس کے پیچھے پیچھے چلانے لگا۔ کچھ دیر بعد خالد کو احساس ہوا کہ گاڑی گھر کی ف نہیں جا رہی تھی بلکہ مسلسل پولیس کے ٹرک کا ہی تعاقب کر رہی تھی۔

آخر خالد بولا۔ "تم گھر کی طرف کیوں نہیں چل رہے؟ کیا اس ٹرک کے پیچھے پیچھے ہی تے رہو گے؟ یہ تو جیل جا رہا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" کامران نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "ہم بھی وہیں جا رہے ' ہمیں شرافت کو جیل سے نکلوا کر اپنی گاڑی میں ساتھ لانا ہے' اسے جمشید صاحب نے ب کیا ہے۔"

پولیس کا ٹرک جیل کے سامنے جا رکا اور قیدیوں کو اتار کر اندر بھیج دیا گیا۔ گیٹ دوبارہ بند ہوگیا۔ کامران نے گاڑی جیل کے گیٹ سے کچھ دور روک لی تھی۔ وہ گردن گھما کر خالد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہم کچھ دیر انتظار کرتے ہیں۔ اگر جیل والوں نے جلدی اپنی رسمی کارروائیاں پوری کرکے شرافت کی جان چھوڑ دی تو ٹھیک ہے ورنہ پھر آپ کو اندر جاکر اسے چھڑا کر لانا پڑے گا۔"

اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آدھے گھنٹے بعد ہی دوبارہ جیل کا بغلی گیٹ کھلا اور شرافت علی باہر آتا دکھائی دیا۔ جیل کے عملے نے حیرت انگیز پھرتی کا ثبوت دیتے ہوئے جلد ہی اس کی جان چھوڑ دی تھی یا پھریوں کہنا چاہئے تھا کہ انہوں نے اپنی جان چھڑا لی تھی کیونکہ اس سے کوئی فائدہ پہنچنے کی امید نظر نہیں آتی تھی۔ ایک بڑے وکیل نے نہ جانے کیوں اس کا دفاع ضرور کیا تھا لیکن درحقیقت اس کا کوئی والی وارث نظر نہیں آتا تھا جو مختلف موقعوں پر اس کے لئے آگے بڑھ کر کچھ خرچ کرتا تاہم کئی مرحلوں پر کسی گمنام شخصیت کی طرف سے انہیں شرافت علی کا خیال رکھنے' اس کے کیس کو جلدی آگے بڑھانے اور ہر پیشی پر عدالت میں اس کی موجودگی کو یقینی بنانے کے لئے "لفافے" ملتے رہے تھے۔ کئی جگہوں پر تو لفافے پہنچوانے کا بندوبست خود خالد نے کیا تھا لیکن بعض جگہوں پر لفافے پہنچائے جانے کے بارے میں وہ بھی لاعلم تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس وقت بھی ایک ایسا ہی لفافہ صحیح جگہ پر پہنچ چکا تھا جس کی وجہ سے شرافت علی کم سے کم وقت میں تمام ضروری کارروائیوں سے گزر کر باہر آگیا تھا۔

وہ گہرے رنگ کی ایک معمولی سی اور شکن آلود شلوار قمیض میں تھا۔ شاید گرفتاری کے وقت اس کے جسم پر یہی لباس تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کسی قسم کا سازوسامان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے ہاتھ ہلاتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔ اس کی بے فکری دیکھ کر ایک لمحے کے لئے تو خالد کو بڑا رشک آیا۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا شاید کوڑھ مغز اور درندہ صفت ہونا بھی آج کے دور میں بڑی خوبی تھی۔ انسان ہر فکر اور احساس سودوزیاں سے بے نیاز رہتا تھا۔ اس شخص کو نہ تو گرفتاری کے وقت کوئی فکر تھی اور نہ ہی وہ جیل میں پریشان نظر آیا تھا۔ اب وہ رہا ہوگیا تو یہ بھی اس کے لئے گویا کوئی اہم بات



نہیں تھی۔

جب وہ جیل سے کافی دور نکل گیا تو کامران نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سست رفتاری سے آگے بڑھاتے ہوئے کچھ دیر بعد شرافت علی کے عین قریب لے جاکر روکی۔ اس وقت وہ سڑک کے کنارے رک کر آنکھیں سیکڑے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے سواری کہاں سے ملے گی۔ ایک شاندار گاڑی اپنے پاس رکتے دیکھ کر اس کی توجہ ادھر مبذول ہوگئی۔

کامران گاڑی سے اتر کر اس کے لئے دروازہ کھول کر اپنے برابر والی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "چلو ——— گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"

شرافت علی نے تشویش زدہ ہونے کے بجائے باچھیں کھلاتے ہوئے پوچھا۔ "اچھا ———؟ واقعی بیٹھ جاؤں۔"

"ہاں ——— میں کہہ جو رہا ہوں ——— بیٹھ جاؤ۔" کامران سنجیدگی سے بولا۔

شرافت علی جھٹ سے بیٹھ گیا گویا اسے اندیشہ ہو کہ کامران کہیں اپنا ارادہ نہ بدل لے۔ کامران جب دروازہ بند کرکے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تو شرافت علی بچوں کی طرح پراشتیاق انداز میں گاڑی کی ایک ایک چیز کو چھو کر دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ سیٹ پر اچھل کر اندازہ لگانے لگا کہ وہ کتنی گدیلی تھی۔

"میں آج تک اتنی شاندار گاڑی میں نہیں بیٹھا۔" اس نے خاصی سادگی اور دیانتداری سے کامران اور خالد کو مطلع کیا۔

"ہمارے ساتھ رہو گے تو تمہیں اور بھی بہت شاندار چیزیں ملیں گی۔" کامران نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ خالد خاموش تھا۔

چند لمحے بعد شرافت علی نے گویا اپنے موٹے دماغ کو تھوڑا بہت استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"ایک بہت شاندار جگہ پر ———" کامران نے جواب دیا۔

"گھمانے پھرانے لیجا رہے ہو۔؟" شرافت نے اشتیاق سے پوچھا۔

"نہیں ——— تم وہیں رہو گے۔ وہاں شاندار فرنیچر ہوگا ——— ٹی وی ہوگا ——— وی سی آر ہوگا ——— ڈھیر ساری فلمیں ہوں گی۔ تمہیں شاندار کھانے ملیں گے۔ پہننے کے لئے بہترین کپڑے ملیں گے۔ تم جو کہو گے وہ ملے گا۔ ہر چیز بہت شاندار ملے گی۔" کامران نے نہایت مشاقی سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اچھا ——— واقعی ———؟ پھر تو بڑا مزا آئے گا ———" شرافت خوشی سے اچھلتے ہوئے بولا لیکن شاید اس کے موٹے دماغ کے کسی کونے کھدرے میں تھوڑی بہت عقل موجود تھی۔ کم از کم اتنا تو اسے بھی معلوم تھا کہ اس دور میں بلا مقصد کوئی کسی پر عنایات و

نوازشات کی بارش نہیں کرتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "لیکن مجھے کرنا کیا پڑے گا۔؟"

"کچھ بھی نہیں ---- بس تم عیش کرنا ---- آرام سے رہنا۔" کامران نے جواب دیا۔

شرافت سر کھجانے لگا۔ شاید اس جیسے احمق آدمی کے لئے بھی یہ یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ کوئی اس سے کچھ کرائے بغیر اس کے لئے اتنے عیش و آرام کے سامان مہیا کرنے والا تھا۔ تاہم وہ مزید کچھ نہیں بولا۔ خاموش ہی رہا۔

خالد محسوس کر رہا تھا کہ جب سے شرافت گاڑی میں بیٹھا تھا' اندر ایک عجیب سی بو محسوس ہونے لگی تھی۔ گاڑی ائیرکنڈیشنڈ ہونے کی وجہ سے بو اور بھی تیز محسوس ہو رہی تھی۔ شرافت جیل سے رہا ہو کر آرہا تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ وہ وہاں کچھ اچھے حال میں نہیں رہا ہوگا لیکن وہ بو میل اور پسینے کی نہیں تھی۔ خالد نے ذہن پر زور دیا تو اسے یاد آیا کہ ویسی بو عموماً ان قصابوں کی دکانوں سے آتی تھی جو زیادہ صفائی ستھرائی نہیں رکھتے تھے۔

وہ کچے گوشت اور خون کی بو تھی۔ کیا یہ بو شرافت کے جسم سے پھوٹ رہی تھی؟ نہ جانے کیوں یہ سوچتے ہوئے خالد کے جسم میں خفیف سی سنسنی دوڑ گئی۔

○

شمشیر علی اپنے والدین کے ساتھ نشاط نگر سے کراچی تو آگیا تھا لیکن جلد ہی وہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ شاید اس کا یہ فیصلہ غلط تھا۔ اس نے اپنے ساتھ ساتھ اپنے والدین اور اس کمسن بہن کو بھی مصیبت میں ڈالا تھا جو پہلے ہی ایک ہولناک تجربے سے گزر چکی تھی ---- لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اگر وہ گاؤں میں ہی رہتے تو اب تک نیاز علی کے ہاتھوں ان کا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔ اب مسائل ذرا دوسری طرح کے تھے لیکن وہ ان سے بہرحال کم ہولناک تھے جن سے انہیں نشاط نگر میں واسطہ پڑ سکتا تھا۔

وہ لوگ کراچی پہنچنے کے بعد نواح میں واقع ایک گوٹھ میں اپنے ایک جاننے والے کے ہاں چلے گئے تھے جو ان سے کئی برس پہلے نشاط نگر سے اجڑ کر وہاں آیا تھا اور ایک کچا پکا سا مکان بنا کر بیوی بچوں کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ اس کا نام تو نصراللہ تھا لیکن گاؤں والے سب اسے صرف نصرو کے نام سے جانتے تھے۔ نصرو ایک ادھیڑ عمر' شریف اور وضعدار آدمی تھا۔ اس نے خندہ پیشانی سے خدا بخش اور اس کے کنبے کا استقبال کیا تھا' انہیں خوش آمدید کہا تھا۔

بے شک وہ شہر میں نہیں رہتا تھا۔ اصل شہر سے کئی میل دور نواح میں رہتا تھا۔ لیکن وہ بہرحال کئی برس سے یہاں تھا' اکثر شہر میں جاکر کام بھی کرتا تھا۔ دوسری ضروریات



تحت بھی اسے شہر سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ یوں وہ گویا شہر کو کافی حد تک سمجھتا تھا۔ ں کی زندگی کے نشیب و فراز سے بڑی حد تک واقف تھا۔ اسے خدا بخش اور اس کے نبے کی ہر ممکن مہمانداری کی تھی۔ انہیں جس مدد کی بھی ضرورت تھی وہ بہم پہنچائی تھی ور نئی جگہ میں پاؤں جمانے کے سلسلے میں وہ جتنی رہنمائی کرسکتا تھا وہ بھی اس نے کی تھی کن مسئلہ یہ تھا کہ نصرو خود ایک غریب آدمی تھا اور اس پر کافی بڑے کنبے کا بوجھ تھا۔

گوٹھ میں اس کا مکان بھی کچھ ایسا کشادہ نہیں تھا۔ تھوڑی سی زمین پر ایک کچی چار اری کھڑی کرکے اس نے شیٹ کی چھت والے دو کمرے بنائے ہوئے تھے۔ انہیں میں ی نہ کسی طرح خدا بخش کے کنبے کو اس کے سازو سامان کے ساتھ سمو لیا تھا۔ وہ چاروں ی اسی کے کنبے کے افراد کی طرح رہنے لگے تھے۔ نصرو کافی عرصے سے ایک تعمیراتی مزدور ے طور پر کام کر رہا تھا۔ کبھی کام مل جاتا تھا' کبھی نہیں ملتا تھا۔ کھینچ تان کر گزر بسر ہوتی ی۔ اس نے خدا بخش اور شمشیر علی کو بھی اپنے ساتھ اسی کام میں لگانے کی کوشش کی۔ یں کام ملنے کی اوسط اس سے بھی کم تھا۔ کہنے کو گھر میں تین مرد تھے اور تینوں کام کرنے ے بھی جی نہیں چراتے تھے اس کے باوجود تنگی ترشی سے گزر بسر ہوتی تھی۔ مکان پہلے تنگ تھا۔ دو کنبوں کے گزارے کے لئے ناکافی تھا کیونکہ ان میں سے ایک کنبہ آٹھ افراد مشتمل تھا۔

جگہ کی تنگی کے ساتھ ساتھ جب معاشی پریشانیاں بھی بڑھنے لگیں' تنگدستی پنجے ڑنے لگی تو میزبانوں کی خوش مزاجی دم توڑنے لگی۔ نصرو کی وضعداری اس کا ساتھ ڑنے لگی۔ اس کی بیوی اور بچوں کی چخ چخ اس کے ساتھ بڑھنے لگی تھی۔ وجہ وہ بھی ی طرح سمجھتا تھا۔ آخر ایک روز اس نے تنگ آکر دبی دبی زبان میں خدا بخش سے کہہ لہ وہ اپنا کہیں الگ مکان کا بندوبست کرلیں۔ شمشیر علی نے بھی یہ بات اپنے کانوں سے لی۔ اس کے سینے میں دھیرے سے جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ شاید یہ اس کا دل شکستہ تھا ی کی مزید کرچیاں ہوئی تھیں۔

ابھی تو انہیں ڈھنگ سے کوئی روزگار ہی ملنے نہیں پایا تھا۔ ابھی وہ اپنا علیحدہ کیا بست کرسکتے تھے؟ چنانچہ علیحدہ کوئی بندوبست نہیں ہوسکا لیکن گھر میں چولہے ضرور الگ ے۔ شمشیر علی کی ماں لکھاں نے چھوٹے سے صحن کے ایک کونے میں اپنا مٹی کا چولہا بنالیا اور اس کنبے کا کھانا ادھر پکنے لگا۔ کہیں زیادہ دولت انسانوں کو ایک دوسرے سے لے جاتی ہے اور کہیں زیادہ غربت ---- اس گھر میں غربت نے دلوں میں فاصلے پیدا ے شروع کر دیئے تھے۔ دونوں کنبوں کے افراد کے درمیان بات چیت بھی کم ہونے دونوں عورتیں تو اکثر ہی ایک دوسرے سے خفا خفا سی رہتیں۔ کبھی ایک کنبے کا چولہا ا تو وہ دوسرے کنبے سے اس بات کو چھپائے رکھنے کی کوشش کرتا۔ دوسرا کنبہ بھی کوئی

خاص توجہ نہ دیتا ورنہ سب کچھ تو ایک دوسرے کے سامنے ہی تھا۔

شمشیر علی کا اب اس گھر میں دل نہیں لگتا تھا لیکن مجبوری تھی اس لئے رہ رہا تھا۔ اس کا رہنا بھی بس ایسا ہی تھا۔ صبح منہ اندھیرے گھر سے نکلتا اور رات گئے گھر میں گھستا۔ بس سونے کے لئے ہی آتا تھا۔ اس نے باپ سے الگ بھی قسمت آزمائی شروع کردی تھی۔ شہر کے راستوں اور علاقوں سے اسے تھوڑی بہت واقفیت ہوگئی تھی۔ اس نے اور بھی ایسی کئی جگہیں دیکھ لی تھیں۔ جہاں مزدور فٹ پاتھ وغیرہ پر قطاروں میں اس انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ کوئی انہیں مزدوری کے لئے لے جائے۔

وہ ان ٹھکانوں میں سے کسی پر جا بیٹھتا۔ پہلے وہ اس کا باپ مضافاتی علاقوں میں ہی بیٹھتے تھے۔ وہاں تعمیراتی کام زیادہ چل رہے تھے۔ وہ اس امید پر وہاں بیٹھتے تھے کہ وہاں کام زیادہ ملے گا لیکن وہاں تقریباً" ہر کام ٹھیکیداروں کے توسط سے ہوتا تھا اور ٹھیکیداروں کے پاس ان دنوں ضرورت سے زیادہ مزدور تھے۔ ان کے پاس ہنر مندوں کی تو پھر بھی کچھ کھپت تھی لیکن غیر ہنر مند مزدوروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ انہیں پیسے بھی اصل اجرت سے کم دیتے تھے لیکن مزدور مستقل کام پر لگے رہنے کے لالچ میں ان کے ساتھ نتھی رہتے تھے۔ شمشیر علی اور اس کے باپ خدا بخش کے لئے ابھی یہ نوبت بھی نہیں آسکی تھی۔

خدا بخش تو ابھی مضافاتی علاقوں میں ہی قسمت آزمائی میں لگا ہوا تھا جہاں سے گوٹھ قریب پڑتا تھا لیکن شمشیر علی نے اندرون شہر دور دراز کے علاقے کھنگالنے شروع کر دیئے تھے لیکن سردست اس سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ صورتحال وہی تھی۔ کبھی مزدوری مل گئی' کبھی نہیں ملی' شہر میں پھرنے میں اخراجات بھی زیادہ ہوتے تھے۔ باپ اسے سمجھایا کرتا کہ روزی اتنی ہی ملے گی جتنی مقدر میں ہوگی اس لئے وہ باپ کے ساتھ ہی رہ کرے تو بہتر ہے لیکن شمشیر علی کو بھی جوابی دلیل سوجھ گئی تھی۔ وہ کہا کرتا کہ حرکت میں برکت ہے اس لئے اسے ادھر ادھر کی خاک چھاننے دی جائے۔ اس طرح وہ شہر اور شہر کی زندگی سے بھی کچھ واقف ہو جائے گا۔ باپ نے اس پر زور نہیں دیا۔ وہ سخت گیر باپ نہیں تھا اور نہ ہی اسے اپنے گھر کے افراد پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی عادت تھی۔ خصوصاً" شمشیر علی کو تو وہ کسی بھی کام کے لئے مجبور نہیں کرتا تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ جب بیٹے جوان ہو جائیں تو ان پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی بالکل ہی کوشش نہیں کرنی چاہئے کیونکہ اس طرح وہ کہنا ماننے کے بجائے زیادہ سرکش ہو جاتے تھے جو لوگ اس سے اختلاف کرتے وہ ان سے بحث میں نہ الجھتا۔ بس کان دبائے' سر جھکائے خاموشی سے اپنی زندگی اپنے نظریات کے مطابق بسر کرتا۔

شمشیر علی اس روز بھی گھر سے ناشتہ کئے بغیر نکلا تھا۔ وہ اکثر ہی ناشتہ کئے بغیر نکلتا تھا۔ جیب اجازت دیتی تھی تو بعد میں کسی چھپر ہوٹل یا کسی اور سستی سی جگہ پر بیٹھ کر کچھ



کھا لیتا تھا ورنہ ناشتے کے بغیر ہی گزارا کرلیتا تھا۔ اگر مزدوری مل جاتی تھی تو دوپہر کو کھانے کے وقفے میں شکم سیر ہو لیتا تھا اور ناشتے کی کسرپوری ہو جاتی تھی ورنہ کبھی کبھی تو دوپہر کا کھانا بھی گول ہو جاتا تھا۔ دن بھر کی خواری کے بعد رات کو گھر جاکر ہی کچھ روکھی سوکھی میسر آتی تھی شاید اسی لئے وہ اب کچھ دبلا ہوتا جا رہا تھا اور رنگت میں بھی سانولا پن آنے لگا تھا۔

اس روز تو وہ اس لئے بھی ناشتے کے بغیر نکل آیا تھا کہ گھر میں چولہا جلنے کے آثار ہی نہیں تھے۔ اس کی جیب میں تھوڑے سے پیسے تھے لیکن وہ اس نے اس خیال سے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے کہ اگر مزدوری نہ ملی تو بس ویگن میں کرایہ دے کر گھر پہنچ سکے۔ یہ گاؤں تو تھا نہیں کہ کام کاج سے فارغ ہوکر انسان پیدل گھر پہنچ جاتا۔ یہاں تو شہر کی وسعت اور ایک سے دوسری جگہ کے فاصلے دیکھ کر اب بھی شمیر علی کی عقل دنگ رہ جاتی تھی۔

اسے کسی نے بتایا تھا کہ ڈیفنس کے کسی نہ کسی حصے میں چونکہ بڑے بڑے بنگلے اور کمرشل علاقوں میں کئی منزلہ عمارتیں بڑی تیزی سے بنتی رہتی تھیں اس لئے وہاں کام ملنے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ اناڑی اور ماہر دونوں ہی طرح کے مزدور کہیں نہ کہیں کھپ جاتے تھے۔ بعض ٹھیکیداروں کے پاس بھی آدمیوں کی کمی رہتی تھی اور وہ سڑکوں' فٹ پاتھوں کے مخصوص ٹھکانوں سے مزدور' کاریگر وغیرہ جمع کرکے ساتھ لے جاتے تھے۔ شمشیر علی نے اس سلسلے میں کافی معلومات جمع کی تھیں۔

آج وہ اسی علاقے میں قسمت آزمائی کے لئے تین بسیں بدل کر ڈیفنس پہنچا اور کچھ فاصلہ پیدل طے کرنے کے بعد دو ایک راہ گیروں سے پوچھ پاچھ کر گزری میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں بہت سے مزدور سڑک کے کنارے قطار بنائے بیٹھے تھے۔ وہاں صرف مزدور ہی نہیں' بہت سے ہنر مند بھی موجود تھے' چنائی' پلستر اور فرشوں کے ماہر۔ بڑھئی' پلمبر' رنگ و روغن کرنے والے ـــــ غرضیکہ تعمیرات سے تعلق رکھنے والے سبھی طرح کے لوگ موجود تھے۔ شمشیر علی بھی ایک طرف کو بیٹھ گیا۔ وہ میلوں کا سفر طے کرکے وہاں پہنچا تھا اور ابھی صبح کا اجالا پھیلنے ہی لگا تھا۔

دھوپ پھیلنے لگی تو گاڑیوں میں لوگ آنے شروع ہوئے اور مطلوبہ آدمی منتخب کرکے لے جانے لگے۔ یہ زیادہ تر وہ لوگ تھے جنہیں چھوٹے موٹے کاموں کے لئے اتفاقاً" آدمیوں کی ضرورت پڑگئی تھی ورنہ بڑے بڑے بنگلے تو وہاں بھی زیادہ تر بڑے بڑے ٹھیکیداروں کے توسط سے ہی بنتے تھے اور ان کے پاس مستقل طور پر ہر طرح کے آدمیوں کا بندوبست ہوتا تھا۔ بہرحال رفتہ رفتہ سڑک کے کنارے ہجوم کم ہونے لگا۔ دن چڑھنے تک صرف شمشیر علی اور پانچ سات دوسرے مزدور ہی رہ گئے۔

دھیرے دھیرے تقریباً" دوپہر ہی ہوگئی۔ شمشیر علی دھوپ سے کھسک کر چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد مزدوری ملنے کی امید نہیں رہ جاتی تھی شمشیر علی کو یہ تجربہ ہو چکا تھا لیکن وہ پھر بھی امید کا دامن تھامے ' اپنے آپ کو کسی چھوٹے موٹے معجزے کی آس دلائے مستقل مزاجی سے بیٹھا رہا۔ اس جیسے تین چار اور تھے جو اٹھ کر ادھر ادھر پھرنے لگے تھے۔ آپس میں باتیں اور ہنسی مذاق بھی ہونے لگا تھا۔ سبھی کی کہانیاں ملتی جلتی تھیں۔ کوئی کہیں سے آیا تھا' کوئی کہیں سے یا پھر شاید تقدیر انہیں دھکیلتی ہوئی لائی تھی۔ ان میں امید اور ناامیدی مشترک تھی۔ وہ انہیں دو کیفیتوں کے درمیان جینے والی مخلوق تھے۔

شمشیر علی صرف مسکراہٹ کی حد تک ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس کا کسی سے ہنسی مذاق کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک سرد سی اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ مزدوری سے محروم رہ جانے والے دوسرے لوگوں کے حالات بھی کم و بیش اسی جیسے تھے۔ اسے حیرت تھی کہ وہ کس طرح آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ پھر اس کی سمجھ میں آیا کہ شاید وہ اپنے تفکرات اور انہی دکھوں کو بھلانے کے لئے ہنسی مذاق کر رہے تھے جو گھروں پر ان کے منتظر تھے۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ لوگ جب بغیر مزدوری کئے بغیر اجرت لئے گھر پہنچتے ہوں گے تو وہ دکھ اور تفکرات مزید گہرے' مزید گمبھیر ہو جاتے ہوں گے۔

آخر کار جب دھوپ بہت تیز ہوگئی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور غیر ارادی سے انداز میں ایک طرف کو چل دیا۔ بھوک نے اس کے معدے میں پنجے گاڑے ہوئے تھے اور گویا دھیرے دھیرے اس کی آنتوں کو کتر رہی تھی۔ رات اس کو گھر پر روکھی سوکھی ایک روٹی کھانے کو ملی تھی۔ صبح بھی وہ ناشتے کے بغیر چل دیا اور اب دوپہر کے کھانے کا وقت بھی گزر رہا تھا۔ درد کی ایک لہر کبھی کبھی اس کے شکم سے اٹھتی اور کنپٹیوں تک آن پہنچتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ قدم اٹھاتا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا۔ اسے اندیشہ محسوس ہوتا کہ شاید وہ کسی تاریک دلدل میں قدم رکھ رہا ہے۔ پھر وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تو اسے سڑک کے کنارے کچا حصہ دکھائی دیتا اور وہ سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتا حالانکہ ہر قدم کے ساتھ نقاہت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

گزری سے گزر کر وہ سعودی ایمبیسی کے سامنے سے ہوتا ہوا مزید آگے چلتا چلا گیا۔ اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا یا کہاں جانا چاہتا تھا۔ اسے گویا کوئی غیبی سی طاقت مجبور کر رہی تھی کہ وہ متحرک رہے۔ اس کی جیب میں تین روپے باقی تھے اور بمشکل خود کو انہیں خرچ کرنے سے باز رکھے ہوئے تھا۔ اسے تین بسیں بدل کر گھر واپس جانا تھا اور اسے معلوم تھا کہ یہ پیسے کرائے کے لئے بھی ناکافی تھے لیکن ایک آس تھی کہ



ان کے سہارے وہ کھینچ تان کر کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ سکتا تھا۔ جیب بالکل ہی خالی ہو جانے کے باعث گھر سے میلوں دور کسی بالکل ہی اجنبی علاقے میں پھنس جانے کا تصور اس کے لئے اور بھی سہما دینے والا تھا۔

اس کے دائیں بائیں خوبصورت اور طویل و عریض بنگلوں کی قطاریں تھیں اور سامنے سڑک بتدریج سنسان ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ ٹریفک کم ہوتا جا رہا تھا۔ اسے کچھ یوں لگا جیسے وہ یونہی چلتے چلتے کسی انتہائی سنسان مقام پر پہنچ کر کسی جادوئی عمل کے ذریعے ہوا میں تحلیل ہو جانا چاہتا تھا تاکہ دکھ' اندیشے اور تفکرات اس کا تعاقب نہ کر سکیں۔ کئی دنوں سے اس کی چھوٹی بہن شاہدہ بھی شدید بیمار تھی۔ اس کے علاج معالجے نے دونوں باپ بیٹوں کی مزید کمر توڑ دی تھی۔ مسئلہ الٹی اور دست سے شروع ہوا تھا پھر الجھتا ہی چلا گیا تھا۔ نصرو اور اس کے گھر والوں کا کہنا تو یہی تھا کہ اسے یہاں کا پانی راس نہیں آیا تھا لیکن اب وہ اسے ایسی کونسی جگہ لے کر جاتے جہاں کا پانی اسے راس آجاتا؟

وہ طویل و عریض بنگلوں اور بعض بلند و بالا عمارتوں کے در و دیوار پر طائرانہ سی نظر ڈالتا مضمحل انداز میں چلا جا رہا تھا اور اس کے ذہن میں ان گنت خیالات کا ہجوم تھا۔ اگر اسے اور اس کے باپ کو باقاعدگی سے کام ملتا رہتا تب بھی شاید انہیں اتنی پریشانیاں لاحق نہ ہوتیں۔ ان کا کنبہ مختصر تھا۔ اخراجات زیادہ نہیں تھے لیکن انہیں مزدوری ہی کبھی کبھار ملتی تھی۔ معلوم نہیں ان کی قسمت ہی خراب تھی یا ان کے چہروں پر ایسی کوئی بات لکھی تھی کہ دیکھنے والے انہیں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے تھے اور دوسرے مزدوروں کو ساتھ لے جاتے تھے۔

اس نے تو سنا تھا کہ یہ بڑا غریب پرور شہر تھا۔ دور دور سے لوگ یہاں روزی کی تلاش میں آتے تھے لیکن اسے تو ابھی تک کہیں اس کی غریب پروری کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیئے تھے۔ الٹا اپنے پرانے جاننے والوں یعنی نصرو اور اس کے کنبے کے لوگوں سے بھی تعلقات خراب ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کشادہ سڑکوں اور خوبصورت بنگلوں پر نظر ڈالتے ہوئے سوچ رہا تھا کیا اتنے بڑے شہر میں —— انسانوں کے اس سمندر میں —— عمارتوں کے اس لامتناہی سے جنگل میں —— اس کے لئے کہیں کوئی جگہ نہیں تھی؟ کہیں کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا؟

اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ مرد تھا —— اور اسے اپنے مرد ہونے کا کچھ زیادہ ہی احساس بھی تھا۔ اسے رونے کے تصور سے بھی شرم آتی تھی۔ اس نے چلتے چلتے اپنی آنکھوں پر انگلیاں پھیر کر دیکھیں کہ کہیں ان میں نمی تو نہیں چھلک آئی تھی؟ کہیں دل میں مچلتے ہوئے آنسوؤں نے پلکوں تک پہنچنے کا راستہ تو نہیں ڈھونڈ لیا تھا؟ یہ دیکھ کر اسے یک گونہ اطمینان سا ہوا کہ اس کی آنکھیں خشک ہی تھیں

لیکن پھر یکدم اسے چکر سا آیا اور وہ نڈھال سا ہو کر فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھ گیا چند لمحوں کے لئے تو اسے یوں لگا جیسے وہ اب اٹھ نہیں سکے گا مگر نقاہت کی یہ لہر سی آکر گزر گئی۔

آنکھوں کی دھندلاہٹ صاف ہوئی تو اس نے سڑک کے دوسری طرف ایک نیلی ' پجیرو جاتے دیکھی۔ وہ چم چم کرتی ایک نئی پجیرو تھی۔ اس کی نیلاہٹ میں نقرئی دھات کی سی چمک بھی شامل تھی۔ ونڈ اسکرین کے عقب میں اسے ایک خوبصورت چہرہ دکھائی دیا۔ وہ تراشیدہ بھورے بالوں اور دلکش چہرے کی مالک' پختہ سی عمر کی ایک عورت تھی جس کی صورت کو سلیقے کے میک اپ نے اور بھی حسین بنا دیا تھا۔

سڑک تقریباً" سنسان ہی تھی اور پجیرو بڑی سست رفتاری سے گزری تھی شمشیر علی نے محسوس کیا کہ عورت شیشے کے عقب سے بغور اس کی طرف دیکھتی ہوئی گزری تھی۔ مگر وہ سڑک کے دوسری طرف تھی' فاصلہ خاصا تھا اس لئے وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی یا اس کے عقب میں کسی بنگلے کا نمبر پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سڑک دو طرفہ ٹریفک کے لئے درمیان سے تقسیم تھی۔ بیچ میں رکاوٹ تھی اس لئے وہ دوسری طرف سے ہی گزرتی چلی گئی۔ شمشیر کو اندازہ ہوا کہ وہ پجیرو میں اکیلی ہی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت کو پجیرو چلاتے دیکھا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں کچھ ایسا تاثر تھا جیسے پجیرو ایک مردانہ سواری تھی اور صرف مردوں ہی کے لئے مخصوص تھی۔ دیہی علاقوں میں اس نے صرف بڑے زمینداروں کو ہی پجیرو میں دیکھا تھا۔

اب اس نے ایک خوبصورت اور صاف ستھری پجیرو میں ایک خوبصورت عورت کو ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے جاتے دیکھا تو دیر تک تجسس اور اشتیاق سے دیکھتا ہی رہا حالانکہ اب اسے عورت کا چہرہ نہیں' صرف پجیرو کا پچھلا حصہ ہی نظر آرہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ پجیرو اگلے چوراہے سے گھوم کر واپس آرہی تھی۔ اب وہ اس سڑک پر تھی جس کے کنارے شمشیر بیٹھا تھا۔ ایک بار پھر اسے عورت کا چہرہ چاند کی طرح طلوع ہوتا دکھائی دیا۔ پجیرو پہلے ہی کی طرح سست رفتاری سے اس کے قریب آرہی تھی۔ پھر یہ دیکھ کر اس کے مضمحل دل کی دھڑکنیں یکدم خاصی تیز ہوگئیں کہ پجیرو عین اس کے سامنے آن رکی۔ اس کا صرف سامنے کا شیشہ شفاف تھا۔ باقی شیشے تقریباً" سیاہ تھے اور ان سے اندر کا منظر نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ شفاف ونڈ اسکرین کے عقب میں موجود عورت شمشیر کو دیکھ کر یوں مسکرا رہی تھی جیسے وہ اسے جانتی ہو۔

○

ڈاکٹر تحسین اور سرجن جمال صاحب دونوں ہی دم بخود سے اپنی کھودی ہوئی قبر میں



ے تھے اور انسپکٹر استہزائیہ سی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ے سپاہی گویا منتظر تھے کہ ان کا افسر انہیں حکم دے تو وہ وہیں ان کفن چوروں کی شائی شروع کر دیں جنہیں انہوں نے اپنی دانست میں رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔

آخر تحسین نے ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے ذرا باوقار لہجے میں لا "تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں انسپکٹر! تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو ----"

"اسی لئے تو مجھے زیادہ حیرت ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب!" انسپکٹر اس کی بات کاٹتے ے بولا۔ اس کا لہجہ اب بھی طنزیہ ہی تھا۔ "آخر آپ پر ایسی کیا مصیبت آن پڑی جو پ نے رات کی تاریکی میں قبریں کھودنا شروع کر دیں؟ اس کا مطلب ہے مجھے ٹھیک ہی دار کیا گیا تھا۔"

"کیا مطلب ----؟" تحسین چونکا۔ "تمہیں کس نے ---- کس سلسلے میں خبردار یا تھا۔؟"

"میں اس کا نام تو کسی قیمت پر نہیں بتا سکتا لیکن بہرحال اتنا ضرور بتا دیتا ہوں کہ ے گاؤں کی ایک نہایت معتبر اور ذمے دار شخصیت نے خبردار کیا تھا کہ میں ان قبروں کا ال رکھا کروں جن میں تازہ تازہ مردے دفن ہوتے ہیں اور اپنی رات کی گشت کے دوران ں قبرستان کی طرف دھیان رکھا کروں کیونکہ کچھ بدفطرت قسم کے لوگوں کی طرف سے روں کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے ---- لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ "بدفطرت" ک آپ دونوں ہوں گے۔"

انسپکٹر کی بات سے کم از کم ایک نکتہ تو تحسین کے ذہن میں صاف ہوگیا کہ وہ محض ناقا" یا اپنے فرائض منصبی ضرورت سے زیادہ مستعدی سے انجام دیتے ہوئے رات کو اس ت ان کے سروں پر نہیں آن پہنچا تھا بلکہ اسے پہلے ہی اس قسم کے امکانات کے بارے ں خبردار رکھا گیا تھا' ہدایت کی گئی تھی' ٹپ دی گئی تھی۔ وہ اس شخصیت کا نام بھی ظاہر نے کے لئے تیار نہیں تھا۔

تحسین نے اس ضمن میں اس پر زور دینے کے بجائے پہلے اپنی صفائی پیش کرنا بہتر ھا۔ وہ ملائمت سے بولا۔ "دیکھو انسپکٹر! تمہیں معلوم ہے میں دو سال سے اس علاقے لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں۔ تمہاری بیوی اور بچوں کا علاج بھی میں ہی کرتا رہا ہوں اور نے کبھی ایسا کوئی کام نہیں کیا جو اس علاقے کے لوگوں کے مفادات کے خلاف ہو۔ وقت بھی میں لوگوں ہی کی بھلائی کے سلسلے میں نہ صرف خود رات کے اس پہر پر بیہودہ پر مشقت کام کر رہا ہوں بلکہ اپنے ساتھ اپنے استاد محترم' اپنے بزرگ اور ملک کے نامور سرجن کو بھی خوار کر رہا ہوں۔ یہ صرف میری خاطر اور بہت سے انسانوں کی ی کی خاطر یہ تکلیف اٹھا رہے ہیں ورنہ انہیں اس قسم کا کوئی کام کرنا تو درکنار یہاں

آنے کی زحمت کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔"

"بہت خوب!" انسپکٹر نے ایک بار پھر طنزیہ انداز میں سر ہلایا۔ "یہ مجھے آج ہی پتا چلا کہ قبریں کھودنے ---- کفن چرانے ---- یا مردوں کو تنگ کرنے میں انسانیت کی بھلائی پوشیدہ ہے۔"

تحسین کے اعصاب پہلے ہی کشیدہ تھے۔ اس کے دل و دماغ میں غصے کا لاوا مچلا۔ اس کا جی چاہا کہ زور سے چلا اٹھے۔ "تم اول درجے کے گدھے ہو۔ تمہارے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔ کیا تمہارے خیال میں ہم جیسے معزز لوگوں کے پاس روپیا کمانے کا اور کوئی ذریعہ ہی نہیں رہا جو ہم نے کفن چرا کر دولت سمیٹنے کا پروگرام بنایا ہے؟ تمہارا خیال ہے کہ ہم اس عظیم الشان دھندے میں کروڑ پتی ہو جائیں گے؟"

مگر اس نے خود پر قابو رکھا۔ ان حالات میں پولیس والوں سے الجھنا اور برہمی دکھانا مناسب نہیں تھا۔ وہ ملائمت سے بولا۔ "بات تو سمجھنے کی کوشش کرو انسپکٹر! تمہارا خیال ہے کہ کفن چرا کر ہم بڑی دولت کما لیں گے؟ تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جمال صاحب تو ویسے ہی ماشاء اللہ ایک کروڑ پتی انسان ہیں۔ ان کے ذہن میں تو اس قسم کا گھٹیا خیال بھی نہیں آسکتا۔"

"کروڑ پتی لوگوں نے ہی تو ملک میں زیادہ لوٹ مار مچائی ہوئی ہے جناب!" انسپکٹر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔" اور بدنامی ساری ہم پولیس والوں کے حصے میں آئی ہوئی ہے۔ ویسے بھی کفن چوری کی بات تو میں محاورتاً" کر رہا تھا۔ اصلی چکر تو یہ ہے کہ میں نے سنا ہے بعض لوگ تازہ تازہ دفن ہونے والے مردوں کو نکال کر ان کے بعض ایسے اعضاء نکال لیتے ہیں جو دوسرے انسانوں کو لگائے جاسکتے ہیں اور بہت مہنگے داموں بکتے ہیں۔ یہ بہت بڑی تجارت ہے۔"

"بڑی جہالت کی بات ہے یہ ----" تحسین کہے بغیر نہ رہ سکا۔" یہ بھی تمہیں اسی شخصیت نے بتایا ہوگا جس کا نام تم راز میں رکھ رہے ہو۔؟"

"یہی سمجھ لیں ----" انسپکٹر مبہم لہجے میں بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کسی کے مرنے کے اتنی دیر بعد اس کا کوئی عضو قابل استعمال نہیں رہتا۔ کسی نے تمہیں غلط بتایا ہے۔ اگر تم ہمیں اس شخصیت کا نام بتا دو گے تو شاید ہمارا کام آسان ہو جائے۔" تحسین نرمی سے بولا۔

"کونسا کام؟" انسپکٹر نے بھنویں اچکائیں۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم کام کی بات کی طرف بھی آئے ----" تحسین ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "تمہیں معلوم ہے اس علاقے میں کڑیل جوان لوگ کس طرح پراسرار انداز میں مر رہے ہیں ----"



"مجھے بھلا کیوں نہیں معلوم ہوگا۔ میرا اپنا بھتیجا اس طرح مر چکا ہے۔ کیسا شیر جیسا جوان تھا۔" انسپکٹر بولا۔ "اسی لئے تو میں قبرستان کا زیادہ خیال رکھ رہا ہوں۔"

"میں اسی کا ذکر کرنے لگا تھا ---- اور اسی لئے میں تم سے اس قسم کے رویے کے بجائے تعاون اور ہمدردی کی توقع کر رہا ہوں۔ میں اور یہ بڑے ڈاکٹر صاحب مل کر اسی پراسرار بیماری کے بارے میں تحقیق کر رہے ہیں لیکن ایک تو گاؤں میں سہولیات میسر نہیں ہیں۔ دوسرے گاؤں کے لوگ تعاون نہیں کرتے اور طرح طرح کے توہمات میں پھنسے رہتے ہیں۔ انہیں مختلف طریقوں سے بہکایا بھی جاتا ہے۔ اب تم خود کو ہی دیکھ لو۔ تم تو اچھے خاصے پڑھے لکھے بھی ہو ---- جہاندیدہ بھی ہو لیکن تمہارے ذہن میں بھی غلط ملط باتیں ٹھونس کر تمہیں اصل مسئلے سے دور رکھنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ہمیں کوئی اور طریقہ نہیں سوجھا تو ہم نے مجبوراً" پوسٹ مارٹم کے لئے ایک تازہ لاش حاصل کرنے کی غرض سے یہ طریقہ اختیار کیا۔"

پھر تحسین تفصیل سے انسپکٹر کو سمجھانے لگا کہ انہوں نے کس طرح مجبوری کے عالم میں یہ فیصلہ کیا تھا۔ یہ تو وہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ اس سے کوئی فائدہ ہوتا یا نہیں ---- لیکن کوئی نہ کوئی عملی کوشش کرنا تو ضروری تھی۔ انسپکٹر کچھ نرم پڑ گیا تھا۔ بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ آخر کار تحسین بات ختم کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ لاش قبر میں موجود ہی نہیں ہے۔ اس لئے قانوناً" تم ہم پر کفن یا مردے کے اعضاء کی چوری کا الزام بھی نہیں لگا سکتے ---- اور اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس سے بات پھر وہیں کی وہیں پہنچ گئی ہے۔ ہم کوئی تحقیق نہیں کر سکتے۔"

"کیا واقعی قبر میں لاش موجود نہیں ہے۔؟" انسپکٹر نے بے یقینی سے پوچھا۔

"تم خود دیکھ لو ----" تحسین نے قبر میں روشنی ڈالی۔ انسپکٹر نے اپنی ٹارچ سے بھی روشنی ڈالی۔ مردے کی تدفین والا اصل حصہ واقعی خالی پڑا تھا۔ پولیس والوں نے چاروں طرف دور دور تک روشنی گھما کر بھی دیکھا گویا انہیں شک ہو کہ ان کی آمد سے پہلے تحسین اور جمال صاحب لاش کہیں ادھر ادھر نہ رکھ چکے ہوں مگر وہاں کم از کم زمین کے اوپر کوئی لاش نہیں تھی۔

اب انسپکٹر کا رویہ بالکل بدل گیا۔ اس نے برہمی دکھانے اور طنز گوئی کا مظاہرہ کرنے کی کوششیں ترک کر دیں۔ وہ بھی سوچوں میں الجھ گیا تھا اور شاید حسب توفیق دماغ لڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس شخصیت کا نام بتانے پر وہ اب بھی آمادہ نہیں تھا جس نے اسے قبروں کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔ لگتا تھا کہ اس پر اس شخصیت کا کچھ زیادہ ہی اثر تھا۔

بہرحال تحسین نے بھی اس سلسلے میں اسے مزید کریدنے کے بجائے اصل کام کے

سلسلے میں جذباتی انداز میں ہمنوا بنانے کی کوشش کی اور کہا۔ "تمہیں تمہارے مرحوم بھتیجے کی قسم ---- اس معاملے میں ہمارا ساتھ دو۔ بظاہر یہ ایک پراسرار ہی معاملہ ہے لیکن سائنسی نکتہ نظر سے بھی اس کی تحقیق ضروری ہے۔ آئندہ بھی جو مردہ یہاں دفن کیا جائے گا' ہم اس کی لاش حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں تمہارے صرف اتنے تعاون کی ضرورت ہے کہ تم آج کی طرح ہمارے راستے کی رکاوٹ نہ بننا بلکہ ہوسکے تو کسی اور کو بھی ہمارے کام میں مداخلت سے باز رکھنا ---- اور اس بات کا کسی سے قطعاً" ذکر نہ کرنا ---- خاص طور پر اس شخصیت سے' جس نے تمہیں قبروں کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔"

"اس سے بھلا کیسے ذکر کرسکتا ہوں؟ یہ تو الٹا اپنی ہی نااہلی اور وعدہ خلافی ثابت کرنے والی بات ہوگی۔" انسپکٹر فوراً" بولا۔

"بہرحال ---- ہمیں تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔ اس میں علاقے کے سب لوگوں کی بھلائی ہے۔" تحسین بولا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انسپکٹر گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ "اچھا ---- چلیں ---- میں آپ کو ایک مرتبہ اور قسمت آزمائی کا موقع دے دوں گا لیکن فی الحال آپ اس قبر کو دوبارہ اس طرح پاٹ دیں کہ کسی کو ذرا بھی شبہ نہ ہوسکے کہ اسے چھیڑا گیا تھا اور آئندہ بھی آپ جس قبر کو کھودیں اس کے بارے میں پوری پوری احتیاط کیجئے گا۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔" تحسین نے خلوص سے کہا۔ تب انسپکٹر اپنے سپاہیوں کے ساتھ واپسی کے لئے مڑ گیا اور وہ دونوں ایک بار پھر تندہی سے اپنے کام میں لگ گئے۔ اپنے مقصد میں ناکامی کے باعث انہیں کچھ مایوسی تو تھی لیکن اس بات کی خوشی بھی تھی کہ سر پر آئی ہوئی ایک مصیبت ٹل گئی تھی۔

○

سارہ اب اس ہال نما تہہ خانے میں گویا ڈیو کے رحم و کرم پر تھی۔ ڈیو کے ایک ہاتھ میں ارغوانی سیال سے بھرا ہوا گلاس تھا اور دوسرے میں ہنٹر ---- وہ آنکھوں میں شیطانی چمک اور ہونٹوں پر خباثت بھری مسکراہٹ لئے ایک ٹک سارہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور سارہ کی رگوں میں خون خشک ہوا جا رہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ حوصلہ ہارنا اس کے حق میں اور بھی نقصان دہ ہوگا۔ اس نے ہمیشہ خود کو ایک بہادر اور حوصلہ مند لڑکی سمجھا تھا۔ اپنے آپ کو ہمیشہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رکھا لیکن آج اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ محض سوچوں کی دنیا میں کسی چیز کے لئے تیار ہونے اور عملی طور پر تیار ہونے میں بڑا فرق تھا۔



اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ تو کرلیا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالے گی۔ اپنی بساط کے مطابق زندگی کی آخر سانس تک مزاحمت کرے گی۔ ڈیو نے کوڑا اور جام اپنے عقب میں آہستگی سے کارنس پر رکھ دیئے اور دھیرے دھیرے سارہ کی طرف بڑھنے لگا۔ سارہ اسی رفتار سے پیچھے ہٹنے لگی۔ ایک بار اس نے دزدیدہ نظروں سے کوڑے کی طرف دیکھا اور سوچا کہ کاش وہ اسے اٹھا سکتی لیکن ڈیو بے وقوف نہیں تھا۔ خمار کی حالت میں بھی اس کا ذہن مستعدی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے کوڑا اپنے عقب میں رکھا تھا۔ وہ خود کوڑے اور سارہ کے درمیان حائل تھا۔

سارہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی۔ وہ جوڈو کراٹے کا جو تھوڑا بہت واجبی سا علم رکھتی تھی اسے ذہن میں تازہ کرتے ہوئے فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کونسا داؤ آزمائے گی لیکن وہ قطعاً" پراعتماد نہیں تھی۔ جوڈو کراٹے کا معاملہ تو یہ تھا کہ انسان جتنی مشق کرتا اتنا ہی بہتر تھا لیکن سارہ کو تو ایک طویل عرصے میں مشق یا کوئی داؤ آزمانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ جب ڈیو اس پر جھپٹا تو اس نے اس کے کندھے پر چاپ رسید کرتے ہوئے پیٹ میں گھٹنا مارنے کی کوشش کی لیکن اس کے یہ داؤ کوئی خاص ضرر رساں ثابت نہیں ہوئے۔ گھٹنے کی ضرب سے تو ڈیو بچ ہی گیا۔ کمبخت نشے میں ہونے کے باوجود مستعد اور چاق و چوبند ہے۔ سارہ نے خوف و دہشت کے ساتھ ساتھ حیرت سے سوچا۔

اس کی چاپ کا بھی ڈیو پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ وہ گینڈے کی طرح مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ اگر اسے کچھ تکلیف پہنچی تھی تو وہ آسانی سے برداشت کرگیا تھا۔ اس کی شیطانی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔ اس نے سارہ کو یوں دبوچ لیا جیسے فاختہ' باز کے پنجوں میں آگئی ہو۔ سارہ کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

دفعتہ" سیڑھیوں کی طرف سے ایک گرجدار آواز ابھری۔ "چھوڑ دو اسے ----"

سارہ اور ڈیو دونوں ہی نے بری طرح چونک کر بیک وقت سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ سیڑھیوں کے دروازے پر وہی دراز قد' لحیم شحیم اور بدشکل شخص کھڑا تھا جس سے سارہ اور جمال صاحب کو نشاط نگر آتے وقت سب سے پہلے واسطہ پڑا تھا' اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں اس وقت بھی سرخی تیر رہی تھی اور چیچک زدہ چہرے پر غیظ و غضب کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بدشکل ضرور تھا لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ اس کے چہرے مہرے اور شخصیت سے بے پناہ رعب و داب جھلک رہا تھا۔

ڈیو پر اس وقت گو کہ شیطانیت سوار تھی' اس کے باوجود وہ نیاز علی کو دیکھ کر سکڑ سمٹ سا گیا۔ اس نے سارہ کو چھوڑ دیا لیکن اس کے چہرے پر بدمزگی کے آثار تھے۔ اسے بیٹا" نیاز علی کا یوں رنگ میں بھنگ ڈالنا گراں گزرا تھا۔ سارہ کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ عام حالات میں وہ نیاز علی کو دیکھ کر چوہے کی طرح دبک جاتا ہوگا۔

نیاز علی شاہانہ سے انداز میں دھیرے دھیرے ایک ایک سیڑھی اترتا نیچے آنے لگا اور ڈیو کے عین مقابل آن کھڑا ہوا۔ ڈیو اپنی جگہ ستون کی طرح جما کھڑا تھا اور نیاز علی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ ڈیو بھی ایک گیم سخیم اور مضبوط آدمی تھا مگر نیاز علی اس سے بھی نکلتا ہوا تھا۔

چند لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے پھر نیاز علی نے سرہلایا اور استہزائیہ سے انداز میں غرایا۔ "واہ رے ڈیو ——— ! اب تو تم بھی بڑے آدمی ہوگئے ہو ——— نیاز علی کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور جو دل میں آئے وہ کرتے پھرتے ہو ——— آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی دیکھتے ہو ——— ہم نے اسی دن کے لئے تمہیں اپنا خاص آدمی بنایا تھا ——— !"

یہ کہتے ہی نیاز علی نے قطعی غیر متوقع طور پر بجلی کی سی تیزی سے اچانک ڈیو کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کیا۔ اس گھونسے سے نیاز علی کی طاقت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ ڈیو جیسا گیم سخیم اور مضبوط آدمی بھی تقریباً" ایک فٹ اونچا اچھل پڑا اور دور جاگرا۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ نکلی۔

نیاز علی نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور لپک کر پے در پے اس کی پسلیوں میں تین چار ٹھوکریں رسید کیں۔ نیاز علی اپنے لمبے چوڑے جسے کے باوجود نہایت پھرتیلا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اتنی پٹائی سے ہی ڈیو کے کس بل نکل گئے۔ وہ بھینسے کی طرح ڈکرانے لگا۔ پھر اس نے نیاز علی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "معافی چاہتا ہوں سائیں ! یہ خبیث میرے دماغ کو چڑھ گئی تھی ———" اس نے کارنس پر رکھے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔

"جس کے دماغ کو جو کچھ بھی چڑھ جائے وہ ہمیں اتارنا بھی خوب آتا ہے میری جان !" نیاز علی نے مونچھ کو بل دیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے واسکٹ کی جیب سے ٹی ٹی نکال کر ڈیو کی کھوپڑی کا نشانہ لیا۔

ڈیو تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کا رہا سہا نشہ بھی ہرن ہوگیا۔ رنگت زرد پڑگئی۔ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بری طرح گڑگڑانے لگا۔ "سائیں ! مجھے معاف کر دیں ——— میں آئندہ زندگی میں کبھی ایسی گستاخی نہیں کروں گا ——— میں ہمیشہ کی طرح آپ کا وفادار ہوں ——— آپ کے پیروں کی خاک ہوں ——— آپ کا کتا ہوں۔"

نیاز علی نے گونجیلا سا قہقہہ لگایا۔ سارہ اب بھی اپنی جگہ کھڑی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ پہلے بدتر صورتحال کا شکار تھی یا اب بدتر صورتحال سے دوچار تھی۔ نیاز علی نے آکر بے شک اسے تباہی سے بچایا تھا لیکن وہ اپنی آنکھوں کے سامنے کوئی قتل ہوتے دیکھنا نہیں چاہتی تھی اور پھر خود نیاز علی کے چہرے پر کونسی کم شیطانیت تھی۔ وہ تو ڈیو سے بھی بڑا خبیث معلوم ہوتا تھا۔ سارہ کا بس چلتا تو



[illegible] ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتی مگر اس طرف راستے میں نیاز حائل تھا اور اوپر سیڑھیوں کے دروازے سے ان لوگوں کے خوفزدہ سے چہرے جھانک رہے تھے جنہیں کچھ دیر پہلے تک سارہ نے ڈیو کے ساتھ دیکھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نیاز یا وہ لوگ اسے اس طرح بھاگ کر آسانی سے باہر نہیں جانے دیں گے۔

دفعتہً" تہہ خانے میں گولی چلنے کا دھماکا سنائی دیا اور سارہ نے آنکھیں بند کرلیں۔

○

سارہ کو یقین تھا کہ نیاز علی نے کچھ زیادہ ہی غیظ و غضب کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈیو گولی مار دی تھی لیکن پھر ڈیو کی گھگیائی ہوئی سی آواز سن کر اس نے ڈرتے ڈرتے [illegible] میں کھولیں تو ڈیو کو زندہ فرش پر بیٹھے پایا' البتہ اس کی پگڑی اس کے سر سے کچھ کھسک [illegible] تھی۔ شاید گولی اس کی پگڑی کو چھوتی ہوئی گزری تھی۔ اس کی رنگت کچھ اور زرد پڑگئی [illegible]۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نیاز علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نیاز علی نے گویا اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے قہقہہ لگایا اور خوشدلی سے [illegible]۔ "لوگ تم سے اتنا ڈرتے ہیں ڈیو ——— اور تم موت سے اتنا ڈرتے ہو' ابھی تو گولی [illegible]ری کھوپڑی سے کچھ دور سے گزری ہے' یہ کھوپڑی کے بیچ میں سے بھی گزر سکتی تھی [illegible] ابھی میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا ——— ابھی تم کام کے آدمی ہو لیکن راستے سے تھوڑا بھٹک گئے تھے' تمہیں سبق ملنا ضروری تھا' اتنا ہی سبق کافی ہے یا کچھ اور سبق [illegible]وں؟"

ڈیو ایک بار پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "سائیں ! میرا دماغ بالکل [illegible]نے پر آگیا ہے' آئندہ آپ کو زندگی میں کبھی شکایت نہیں ہوگی۔"

"اپنے یہ الفاظ یاد رکھنا ———" نیاز علی بولا پھر اس نے مڑ کر سیڑھیوں کے [illegible]زے سے جھانکتے خوفزدہ چہروں کی طرف دیکھا اور بارعب لہجے میں بولا۔ "اس بار میں [illegible]لوں کو معاف کر رہا ہوں' آئندہ اگر تم نے اکیلے ڈیو کے حکم پر عمل کیا اور میری [illegible] اس میں شامل نہ ہوئی تو تمہارا ڈیو سے کہیں زیادہ برا حشر ہوگا۔"

پھر اس نے ٹی ٹی سے ڈیو اور ان سب کو اشارہ کیا۔ "دفع ہو جاؤ سارے کے [illegible]ے میری نظروں سے' دور ہو جاؤ میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔"

ڈیو جلدی سے اٹھ کر گرتا پڑتا سیڑھیوں کی طرف بھاگا' دروازے سے جھانکتے [illegible] وہ چہرے بھی غائب ہوگئے۔ جب ڈیو بھی دروازے سے باہر جا چکا تو نیاز علی بدلے [illegible] تاثرات کے ساتھ مسکراتے ہوئے سارہ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بڑے نرم اور شائستہ [illegible] میں بولا۔ "میں اپنے آدمیوں کی ذلالت کے سلسلے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں

سارہ! انہوں نے پہلی مرتبہ اس قسم کی حرکت کی ہے' آپ نے دیکھ ہی لیا کہ میں نے ڈیو کو اس کی معقول سزا دی ہے جو اس بے ہودہ کارروائی کا اصل ذمے دار تھا' مجھے اس سے امید نہیں تھی۔ کہ وہ اتنی سرکشی اختیار کرلے گا حالانکہ اسے بھی معلوم تھا کہ آپ کون ہیں کس کی بیٹی ہیں ——— اور کچھ نہیں تو کمبخت یہ لحاظ ہی کرلیتا کہ آپ لوگ یہاں مہمان ہیں ———"

اس نے ٹی ٹی واپس واسکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے افسوس زدہ سے انداز میں کندھے اچکائے اور بات جاری رکھی۔ "بہرحال ——— کبھی کبھی اس قسم کے لوگوں کے سر پر شیطان سوار ہو جاتا ہے' آپ کو یقیناً" بہت ذہنی و جسمانی تکلیف اٹھانا پڑی لیکن یقین کریں یہ سب کچھ میری لاعلمی میں ہوا' میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں اور تہہ دل سے معافی چاہتا ہوں' یہ ہماری روایت نہیں ہے' امید ہے آپ اس ناخوشگوار تجربے کو ذہن سے جھٹک دیں گی' میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب آپ جتنے دن بھی یہاں قیام کریں گی' کوئی آنکھ اٹھا کر بھی آپ کی طرف نہیں دیکھے گا۔"

سارہ دیوار کے سہارے کھڑی ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی' اس نے اپنے جسم کی اندرونی لرزش پر قابو پالیا تھا' اب وہ پہلے کی طرح خوفزدہ نہیں تھی' اس کی خود اعتمادی دھیرے دھیرے واپس آرہی تھی' وہ اب اپنے آپ کو صحیح طور پر سوچنے سمجھنے کے قابل محسوس کر رہی تھی اسی لئے وہ نیاز علی کے لہجے پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی' وہ اس لہجے میں بات کرنے والا یا اس قسم کے خیالات اور جذبات رکھنے والا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا' وہ یقیناً" کسی مصلحت کے تحت خود کو اتنا مہذب' شائستہ اور نیک نیت ظاہر کر رہا تھا۔

اسے یا تو یہ احساس ہوگیا تھا کہ سارہ ایک بڑے آدمی کی بیٹی تھی' اگر اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی اور پھر خواہ زبان بند رکھنے کے لئے اسے قتل بھی کر دیتا تب بھی نیاز علی کے لئے بڑا مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا' خواہ وہ علاقے کا کتنا ہی بڑا آدمی اور کتنا ہی بڑا بدمعاش تھا لیکن صرف اس کے خاص آدمی ڈیو کو ہی نہیں اسے بھی نتائج ضرور بھگتنا پڑتے اور شاید اس کے دوسرے بہت سے کرتوت سامنے آجاتے۔ بہت سی باتیں کھل جاتیں۔

اس طرف تو وہ ان سب خطرات سے بچنے کا سامان کر رہا تھا دوسرے سارہ کو اپنے اخلاق' شائستگی اور نوازشات سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا' آدمی تو وہ بدنیت ہی تھا' سارہ کے بارے میں اس کا باطن صاف تو نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن شاید اس نے محسوس کیا تھا کہ ہر جگہ طاقت کے استعمال اور زبردستی اپنا مطلب نکالنے میں ہی سارا لطف پوشیدہ نہیں تھا' کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے مہذب' شائستہ اور خوش اطوار بننے کی کوشش بھی



لینی چاہئے۔

یہ تو سارہ کا محض ایک اندازہ تھا لیکن اس کے خیال میں نیاز علی کی کچھ دوسری صلحتیں بھی ہو سکتی تھیں' اس کے رویے کی کچھ دوسری وجوہات بھی ہو سکتی تھیں' جنہیں ، سمجھنے سے قاصر تھی بہرحال وہ اس لہجے' اس خوش خلقی اور اس شائستگی پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھی تاہم اس نے زبان سے اس کا اظہار نہیں کیا اور خاموش کھڑی ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی' اسے یقین تھا کہ اس بدنما چہرے کے پیچھے بھی بدصورتی ہی چھپی ہوئی تھی۔

نیاز علی اپنی آنکھوں اور تاثرات سے خود کو ایک نیک دل اور شریف انسان ظاہر کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی شخصیت کی شیطانیت اور مکاری چھپنے میں نہیں آرہی تھی' وہ گہری نظروں سے سارہ کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔"

"میں فی الحال معاف کرنے یا نہ کرنے کے موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتی' میں گھر جانا چاہتی ہوں۔" سارہ خشک لہجے میں بولی۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے ———" نیاز علی مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھے کم از کم ر منٹ تو میزبانی کا موقع دیجئے' یہ جگہ تو بہت بے ہودہ ہے' چلئے میں آپ کو اپنے غریب خانے پر لے چلتا ہوں۔" اس نے یوں اعتماد سے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا جیسے اسے یقین ہو کہ سارہ اس کے ساتھ چلنے سے قطعاً" انکار نہیں کرے گی۔

سارہ کو اس کی دعوت سے اپنے خیال کی تصدیق ہوتی محسوس ہوئی۔ ارادے اس کے بھی یقیناً" اپنے آدمیوں سے مختلف نہیں تھے لیکن وہ سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنا چاہتا تھا' وہ اپنی دانست میں اسے اپنے اخلاق سے متاثر کرکے لوٹنے کی فکر میں تھا لیکن سارہ اتنی احمق نہیں تھی کہ اس کی مصنوعی خوش خلقی اور جھوٹی شائستگی پر آنکھیں بند کرکے بھروسہ کرلیتی' وہ اس وقت سے ہی اس پر کسی قیمت پر اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھی جب سے اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا' اس وقت ہی اس کی نہ جانے کونسی حس نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ وہ شخص سرتاپا برائی تھا' اس کے باطن میں خباثت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

وہ پہلے سے زیادہ بے رخی اور رکھائی سے بولی۔ "جی نہیں ——— میرا آپ کی میزبانی سے مستفید ہونے کا کوئی ارادہ نہیں میں صرف اور صرف ڈاکٹر تحسین کے گھر جانا چاہتی ہوں۔ جہاں میں اور میرے ڈیڈی ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ———" وہ مجبوری آمیز سے انداز میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ مجھے اپنی میزبانی کا اعزاز بخشنا نہیں چاہتیں تو میں آپ کو مجبور نہیں کرسکتا' غالباً" آپ

کا دل ابھی میری طرف سے صاف نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ کچھ دن نشاط نگر میں رہیں گی تو رفتہ رفتہ آپ کو یقین آجائے گا کہ میں اتنا برا آدمی نہیں ہوں جتنا نظر آتا ہوں یا جتنا مجھے بعض لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے۔"

"مجھے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ آپ کتنے برے ہیں اور کتنے اچھے ــــــ" وہ بدستور خشک لہجے میں بولی۔ "اور میں جاننا بھی نہیں چاہتی۔ آپ بس براہ مہربانی ذرا میرے راستے سے ہٹ جایئے' میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"اوہ ــــــ اب ایسی بھی کیا خفگی مس عثمانی!" نیاز علی سچ مچ کچھ حیران نظر آنے لگا۔ "مانا کہ آپ مجھے اپنی میزبانی کا شرف بخشنا نہیں چاہتیں لیکن اب ایسا بھی نہیں ہے کہ میں آپ کو رات کے اس پہر اس سناٹے میں ویران اور خطرناک راستے سے گزر کر تنہا گھر جانے کی اجازت دیدوں یہ تو نہ صرف آپ کی بلکہ میری بھی بڑی بے وقوفی ہوگی' کچھ دیر پہلے میرے آدمی کمینگی دکھا چکے ہیں لیکن اس گاؤں میں صرف میں اور میرے آدمی ہی نہیں رہتے' ہم سے کہیں برے کچھ اور لوگ بھی ہیں' آس پاس کچھ دوسرے گاؤں بھی ہیں' کبھی کبھار وہاں سے بھی کچھ شرارتی لوگ آکر ان ویرانوں اور بیابانوں میں منڈلاتے رہتے ہیں' یہ تو ایک اتفاق ہے کہ آپ کسی ناخوشگوار واقعے سے بچ گئیں۔ میں بروقت آن پہنچا لیکن اب جانتے بوجھتے دوبارہ خود کو خطرے میں ڈالنا تو کوئی عقلمندی نہیں ــــــ آپ میری مہمان نہیں بننا چاہتیں تو نہ بنیے ــــــ شاید پھر کسی وقت آپ میری دعوت قبول کرلیں ــــــ لیکن آپ کو تنہا گھر جانے کی اجازت تو میں ہرگز نہیں دے سکتا' باہر میری پجیرو کھڑی ہے' چلئے ــــــ میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

"جی نہیں ــــــ" سارہ نے سخت اور فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ "میں آپ کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

ویران اور تاریک راستے سے گزر کر جانے کے خیال سے خود اس کا دل بھی بری طرح دھڑک رہا تھا۔ نیاز علی جن خطرات اور خدشات کا ذکر کر رہا تھا' وہ محض اس کی مبالغہ آرائی نہیں' بلکہ سچ بھی ہوسکتے تھے' اس کے باوجود وہ ان خطرات کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھی لیکن نیاز علی کے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں تھی۔

"حیرت ہے ــــــ!" نیاز علی کے چہرے پر واقعی حیرت اور صدمے کے تاثرات ابھر آئے۔ "آپ تو مجھ سے کچھ زیادہ ہی بدگمان اور ناراض معلوم ہوتی ہیں سارہ صاحبہ! مانا کہ جب آپ اور آپ کے والد محترم اس گاؤں میں تشریف لا رہے تھے تو آپ لوگوں سے ناواقفیت کے باعث معمولی سی ناگوار صورتحال پیدا ہوگئی تھی لیکن اس کے بعد جونہی مجھے پتہ چلا کہ آپ دونوں کون ہیں اور یہ معلوم ہوا کہ آپ نشاط نگر میں مہمان ہیں تو میں دل ہی دل میں بے حد شرمندگی اور پچھتاوے کا شکار تھا' میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس وقت



قدرت نے مجھے اپنی غلطی کی تلافی کا موقع دیا ہے اور آپ کے دل سے میرے بارے میں کدورت نکل گئی ہوگی لیکن لگتا ہے کہ آپ نے تو میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی بری رائے قائم کرلی ہے اور اس پر قائم رہنے پر بھی بضد ہیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ نہایت شائستہ اور مہذبانہ انداز میں گفتگو کرنے پر بھی قادر تھا لیکن سارہ کو اس کے ایک لفظ میں بھی خلوص اور صداقت کا شائبہ تک محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

وہ اب قدرے چڑچڑاہٹ سے بولی۔ "میں اس لمبی بحث میں الجھنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ آپ کیسے آدمی ہیں اور میں آپ کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہوں ــــــ کھل رکھتی ہوں' ان فضول باتوں کو رہنے دیجئے اور مجھے جانے دیجئے۔"

سارہ اس کے ہٹنے کا انتظار کئے بغیر اس کے قریب سے گزر کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ نہ جانے کیوں اسے اندیشہ تھا کہ شاید وہ اپنی تمامتر خوش خلقی اور شائستگی کو بالائے طاق رکھ کر یکدم جھپٹ کر اسے دبوچ لے گا' شاید وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ لڑکی اس کے ان ہتھکنڈوں سے بھی متاثر ہونے والی نہیں تھی۔ اس لئے اب اپنے اصل طریقہ واردات کے مطابق ٹیڑھی انگلیوں سے ہی گھی نکالا جائے ــــــ لیکن ایسا نہیں ہوا' نیاز علی نے اس پر جھپٹنے یا اس کا راستہ روکنے کی قطعاً کوشش نہیں کی۔

البتہ وہ اب بھی اسے سمجھاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ضرور آنے لگا۔ "دیکھیں ــــــ آپ اس وقت برہمی اور جوش میں ایک اور غلطی کرنے جا رہی ہیں ــــــ بہرحال ــــــ اگر آپ تنہا جانے پر تلی ہی ہوئی ہیں تو کم از کم راستہ صحیح طور پر سمجھ لیں ــــــ ذرا ایک بار پھر سوچ لیں ــــــ راستے میں قبرستان بھی پڑتا ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا ــــــ قبرستان میں تو مردے ہی ہوتے ہیں' مردے بے چارے بھلا کسی کو کیا کہتے ہیں۔" سارہ بے نیازی سے بولی۔ وہ خود کو بالکل بے خوف ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

"ایسا نہ کہئے ــــــ" نیاز علی عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "کبھی کبھی مردے بھی زندہ ہو جاتے ہیں' لاشیں چلنے لگتی ہیں' بظاہر مرجانے والوں کو ایک نئی زندگی مل جاتی ہے' آپ اتنے یقین سے نہ کہیں کہ مردے کسی کو کچھ نہیں کہتے۔"

"یہ باتیں صرف پراسرار اور ہیبت ناک فلموں یا کہانیوں میں ہوتی ہیں۔" سارہ نے کہا۔

"زندگی میں بھی نہ جانے کیا کچھ ہوتا ہے سارہ صاحبہ ــــــ!" نیاز علی گہری سنجیدگی سے بولا۔ "بلکہ حقیقی زندگی میں بہت کچھ فلموں اور کہانیوں سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔"

"میں آپ کو جھٹلانا یا آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔" سارہ نے بات ختم کرنے کی

کوشش کی۔ "آپ کو یقیناً" زندگی کا تجربہ مجھ سے زیادہ ہے۔"

"کہیں زیادہ ----" نیاز علی بولا۔ "بہرحال آپ قبرستان سے بچ کر گزرنے کی کوشش کیجئے گا' آپ اس کے اندر سے نہ گزریں تو بہتر ہے' اس کے علاوہ آپ کو راستے میں ایک پرانے گودام کے کھنڈرات نظر آئیں گے' آپ ان کے قریب بھی رکنے یا ان میں داخل ہونے کی قطعاً" کوشش مت کیجئے گا خواہ آپ کو وہاں کچھ بھی نظر آئے اور خواہ کوئی بھی چیز آپ کے تجسس کو کتنا ہی ابھارے ----"

"میں کوشش کروں گی کہ آپ کی ہدایات پر عمل کرسکوں۔" سارہ اب قدرے نرم لہجے میں بولی۔ نیاز علی نے اسے راستے کے بارے میں چند ہدایات دیں جو اس نے ذہن نشین کرلیں۔ نیاز علی اپنے رویئے اور لہجے سے ایک ہمدرد اور دوست معلوم ہو رہا تھا لیکن سارہ اب بھی اس پر اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اسے تو اس بات کا بھی پوری طرح یقین نہیں تھا کہ وہ راستہ اسے واقعی صحیح سمجھا رہے تھا' اسے اندیشہ تھا کہ شاید اس میں بھی اس کی کوئی سازش پنہاں ہو لیکن اس نے یہ سوچ کر اس کی ہدایات ذہن نشین کرلی تھیں کہ وہ آنکھیں بند کرکے ان پر عمل نہیں کرے گی' بلکہ اپنی عقل اور یادداشت کے سہارے بھی دیکھ بھال کرکے چلے گی۔ وہ جن راستوں سے یہاں تک پہنچی تھی ان کی نشانیاں اسے یاد تھیں۔

وہ اس نیم شکستہ عمارت سے نکلی تو دھندلی دھندلی چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی' عمارت کے احاطے میں نیاز علی کی بھجرو کھڑی تھی' نیاز علی ابی کے پاس رک گیا۔ وہ اسے چھوڑنے نیم شکستہ گیٹ تک بھی نہیں آیا' وہیں کھڑا پرخیال انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ سارہ نے گیٹ پر پہنچ کر ایک لمحے کے لئے رک کر گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ شاید نیاز علی کو امید تھی کہ وہ باہر کے ہولناک سناٹے اور ویرانی سے گھبرا کر اس کی پیشکش قبول کرلے گی مگر سارہ دل مضبوط کرکے ایک عزم نو کے ساتھ چاندنی میں نہائی ہوئی شکستہ سڑک پر چل دی۔ کافی آگے جاکر اس نے پلٹ کر دیکھا کہ کہیں نیاز علی یا اس کا کوئی آدمی اس کے تعاقب میں تو نہیں آرہا تھا لیکن اسے کوئی نظر نہ آیا تاہم تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس ویرانے میں بھی کوئی نہ کوئی خفیف سا کھٹکا یا آہٹ سنائی دے جاتی جس سے سارہ کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں' اس کے قدم کچھ اور تیز ہو جاتے لیکن اپنے تمامتر خوف اور اندیشوں کے باوجود اس کا یہ عزم برقرار تھا کہ وہ تنہا ہی گھر واپس پہنچے گی۔

اس نے کافی فاصلہ طے کرلیا تھا تو اسے دور سے متروک گودام کی پرانی اور نیم شکستہ عمارت ہیولوں کی طرح دکھائی دی' وہ اس کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا عمارت کے سب سے بلند حصے پر لکڑی کے بڑے بڑے پروں والا ویسا ہی ایک پنکھا سا نصب تھا جیسا کسی زمانے میں پن چکیوں پر دیکھنے میں آتا تھا۔ ہوا گو کہ مدھم تھی اور سارہ کے اندازے کے



مطابق اتنے بڑے بڑے پروں کو حرکت دینے کے لئے ناکافی تھی جبکہ اس کا میکنزم بھی پرانا اور زنگ خوردہ ہوکر شاید جام ہی ہو چکا ہوگا مگر یہ دیکھ کر سارہ کو ایک عجیب سا خوف محسوس ہوا کہ وہ پنکھا ایک مخصوص چرچراہٹ کے ساتھ خاصی تیزی سے گھوم رہا تھا جیسے کوئی مشین یا پھر کوئی غیبی طاقت اسے چلا رہی ہو۔

سارہ نے تقریباً" دوڑنا شروع کر دیا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد ان کھنڈرات نما عمارتوں سے دور نکل جائے' اسے معلوم تھا کہ مزید کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد قبرستان شروع ہو جائے گا جو خاصے بڑے رقبے میں پھیلا ہوا تھا' وہ اگر خیر و عافیت سے ان دونوں چیزوں کے قریب سے گزر جاتی تو پھر اسے امید تھی کہ باقی راستے میں کوئی خاص خوف محسوس نہیں ہوگا۔ قبرستان کے بعد ویسے بھی گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ آسیہ ان دونوں چیزوں کے درمیان ہی کہیں اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ وہ تو درحقیقت آسیہ ہی کے تعاقب میں گھر سے نکلی تھی اور اسے کھو بیٹھی تھی لیکن اپنی افتاد میں پھنس کر وہ اسے بھول ہی گئی تھی۔ آسیہ کی یاد آتے ہی اس کے ذہن میں ایک نئی کشمکش شروع ہوگئی۔ کیا اسے تنہا ہی آسیہ کو تلاش کرنے کی مزید کوشش کرنی چاہئے یا گھر پہنچ کر ڈاکٹر تحسین اور اپنے ڈیڈی کو اس کے رے میں بتانا چاہئے؟

اس کشمکش میں وہ چلتے چلتے تقریباً" رک ہی گئی۔ ابھی اسے اپنے سوال کا کوئی جواب نیں ملا تھا کہ کھنڈرات کے عقب سے اسے دو سائے نمودار ہوتے دکھائی دیئے۔ اس کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس نے سختی سے خود ہی اپنے منہ پر ہاتھ جمالیا اور جلدی سے ایک درخت کی اوٹ میں ہوگئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ سائے ہی نہیں' کھنڈرات بھی اس کی نظروں سے غائب ہوگئے تھے۔

ہوا دراصل یہ تھا کہ ایک تاریک بادل کا بڑا سا ٹکڑا چاند کے سامنے آگیا تھا اور چند لحوں کے لئے ہر چیز تاریکی کی چادر میں چھپ گئی تھی۔ چاند بادل کی اوٹ سے نکلا تو سارہ نے دیکھا کہ اس دوران میں سائے آگے آچکے تھے اور کھلی جگہ میں پہنچ چکے تھے۔ اب درحقیقت وہ سائے بھی نہیں رہے تھے' سارہ انہیں واضح طور پر دیکھ سکتی تھی۔

وہ درحقیقت دو کفن پوش مردے تھے جو سفید دھوئیں سے بنے ہوئے ہیولوں کی طرح دھیرے دھیرے حرکت کر رہے تھے' یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہوا کے دوش پر زمین سے ذرا وپر ہلکورے لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے' ان میں سے ایک نے بازوؤں پر ایک انسانی سم کو اٹھا رکھا تھا' وہ کوئی عورت معلوم ہوتی تھی کیونکہ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔

وہ ایک لرزہ خیز منظر تھا۔ سارہ کی ہڈیوں میں بھی گویا یخ بستگی کی لہر اتر آئی اور لہو اس کی رگوں میں جمنے لگا' اس نے بھاگنا چاہا مگر پیروں نے اس کا ساتھ نہ دیا وہ ساکت اپنی جگہ کھڑی رہ گئی' کفن پوش مردے لحہ بہ لحہ قریب آتے جا رہے تھے' اب تو سارہ ان کی صورت بھی دیکھ سکتی تھی کیونکہ ان کے چہرے کفن سے باہر تھے۔

ان کے چھدرے بال نہ جانے کیوں ان کی کھوپڑیوں پر دھات کی تاروں کی طرح سیدھے کھڑے تھے' گڑھوں میں اتری ہوئی بے نور آنکھیں جیسے ہوا میں بہت دور کہیں گھور رہی تھیں' ان کے چہروں کی رنگت سلیٹی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اسی لمحے سارہ نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے عقب میں بڑے سے پنکھے کے پر ساکت ہوچکے تھے پھر سارہ کو اس عورت کا چہرہ نظر آیا جسے ایک مردے نے بازوؤں پر اٹھا رکھا تھا اور دوسرے ہی لمحے سارہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا' وہ اس کی عزیز دوست اور ڈاکٹر تحسین کی بیوی آسیہ کی لاش تھی' سارہ کو اس پر لاش ہونے کا گمان اس لئے گزرا کہ اس کا لباس اور چہرے کا بیشتر حصہ خون میں تر دکھائی دے رہا تھا۔

سارہ گو کہ درخت کی اوٹ میں تھی لیکن اسے یوں لگا جیسے مردے اپنی بے نور آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے اور سیدھے اسی کی طرف آرہے تھے پھر اس مردے نے منہ کھولا' جس نے آسیہ کی لاش اٹھا رکھی تھی' اس کا منہ چھوٹے سے ایک تاریک گڑھے کی طرح تھا' ویرانے میں ایک تیز وسل کی سی بھیانک اور کریہہ آواز گونجی جسے سن کر سارہ کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس آواز کے اثر سے وہ درخت بھی لرز گیا تھا جس کی آڑ میں وہ کھڑی تھی اور اس کے کچھ پتے جھڑ گئے تھے' مردے نے شاید قہقہہ لگایا تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ سارہ کو اس مردے کی صورت کچھ مانوس سی محسوس ہو رہی تھی جس نے سارہ کی لاش اٹھا رکھی تھی۔ اسے یاد آرہا تھا کہ وہ جب اپنے والد کے ساتھ نشاط نگر میں داخل ہو رہی تھی تو نیاز علی کے آدمیوں کی وجہ سے ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آیا تھا' ان کی بجیرو ایک چارپائی سے جا ٹکرائی تھی' گاؤں کے کچھ لوگ اس چارپائی پر ایک لاش ڈالے تجہیز و تکفین کے لئے لے جا رہے تھے' وہ لاش بجیرو کی ٹکر سے زمین پر گر گئی تھی اور باپ بیٹی نے اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔

وہ چہرہ اس وقت بھی انہیں مہینوں سے مدفون کسی مردے کا چہرہ دکھائی دیا تھا اور بعد میں انہیں معلوم ہوا تھا کہ اس دیہاتی کا انتقال بھی اسی پراسرار بیماری سے ہوا تھا جس نے گاؤں میں دہشت پھیلائی ہوئی تھی۔ اس شخص کا نام احمد علی تھا جس کی لاش چارپائی سے گری تھی۔ اس کا بھائی محمد علی بھی میت کے ساتھ تھا۔

سارہ کو کچھ یوں لگا کہ جو مردہ آسیہ کی لاش اٹھائے آرہا تھا' وہ احمد علی ہی تھا جسے



آج شام ہی دفن کیا گیا تھا لیکن یہ بات وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ مردے کی صورت ـــــ بشرطیکہ اسے صورت کہا جاسکتا ـــــ اب کچھ اور بدلی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ درحقیقت اب وہ اور بھی پرانا مردہ لگ رہا تھا' ایسا لگتا تھا جیسے وہ مہینوں دفن رہنے کے بعد اچانک قبر سے نکل آیا تھا' اس کے چہرے کی جگہ محض ایک کھوپڑی ہی نظر آرہی تھی اور کفن سے نکلے ہوئے اس کے بازو لمبی لمبی ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں تھے لیکن اس نے آسیہ کی لاش کو یوں آسانی سے اٹھا رکھا تھا جیسے وہ محض ایک ہلکا پھلکا کھلونا ہو۔

اپنے تمامتر خوف کے باوجود سارہ قطعی غیر ارادی طور پر آسیہ کا نام لے کر چلا اٹھی۔ اپنی آواز سن کر وہ حیران رہ گئی۔ اس کے حلق سے عجیب پتلی' کرخت اور اس کے اپنے جسم میں ہی مزید سنسنی دوڑا دینے والی آواز نکلی تھی۔ جس طرح غیر ارادی طور پر وہ چیخی تھی۔ اسی طرح غیر ارادی طور پر درخت کی اوٹ سے نکل کر مردے کی طرف دوڑ پڑی۔ وہ دراصل آسیہ کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ زندہ تھی یا واقعی مرچکی تھی' اس کے لباس اور چہرے پر خون تازہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اسے کس نے ہلاک کیا تھا اور کس طرح ہلاک کیا تھا؟ کیا یہ دونوں "زندہ لاشیں" ہی اس کی ہلاکت کی ذمے دار تھیں؟ یہ سوالات سارہ کے ذہن کو ڈس رہے تھے اور درحقیقت انہی کی اذیت سے بے تاب ہوکر وہ درخت کی اوٹ سے نکل آئی تھی۔

"آسیہ ـــــ!" غیر ارادی طور پر وہ ایک بار پھر دلدوز انداز میں چیخی اور دونوں بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھی۔

اس لمحے ایک عجیب بات ہوئی جس کی سارہ کو ہرگز توقع نہیں تھی۔ وہ تو مردوں سے دہشت زدہ تھی کہ اب وہ نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے' شاید وہ اس کا حشر بھی آسیہ جیسا ہی کردیں لیکن اس کے برعکس مردے نے اچانک ہی آسیہ کی لاش اس کے سامنے پھینک دی اور وہ دونوں الٹے قدموں ہوا میں تقریباً" تیرتے ہوئے تیزی سے واپس روانہ ہوگئے' ان کے کفن ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔

سارہ کی دہشت کچھ کم ہوگئی۔ وہ دوزانو ہوکر آسیہ کے قریب بیٹھ گئی اور اسے ہلاتے ہلاتے ہوئے پکارنے لگی۔ "آسیہ ـــــ آسیہ ـــــ"

اس کے ہاتھ خون میں لتھڑ گئے۔ اسے آسیہ سے کوئی جواب ملنے کی توقع نہیں ی۔ وہ صرف ایک موہوم سی امید کے سہارے اسے پکارے جا رہی تھی پھر اس نے آسیہ چہرہ اپنی طرف کیا' وہ چہرہ اسے زندگی سے محروم نظر آیا' اس نے آسیہ کی نبض دیکھنے کی شش کی نبض بھی ساکت تھی' آسیہ یقیناً" اس دنیا سے دور جاچکی تھی۔ مگر سارہ اس ت پر یقین کرنا نہیں چاہتی تھی' اس کے باوجود وہ آسیہ کا خون میں لتھڑا ہوا ہاتھ دونوں وں میں تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

○

خالد نے یہ تو دیکھا تھا کہ شرافت علی کو جیل سے رہا کرانے کے بعد اسی بلڈنگ میں لایا گیا تھا جس میں فرم کے لوگوں کی رہائش تھی لیکن اس کے بعد اس نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ خالد تو اپنے اپارٹمنٹ میں چلا گیا تھا۔ اس نے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ شرافت علی کو کامران کہاں لے جا رہا تھا۔ اس کا اندازہ یہی تھا کہ شرافت کو فوری طور پر جمشید کی خدمت میں پیش کیا گیا ہوگا' اس کے بعد اس کا کیا بنا ——— یا اسے کہاں بھیجا گیا ——— خالد کو اس سلسلے میں کچھ علم نہیں ہوسکا اور نہ ہی اس نے جاننے کی کوشش کی۔

شام تک گھر میں آرام کرنے کے بعد وہ دوبارہ تیار ہوکر نکلا۔ رات کے کھانے پر ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک کلائنٹ کے ساتھ اس کی ملاقات طے تھی' کلائنٹ نے ہی اسے کھانے پر مدعو کیا تھا' آفس میں بھی ان کی دو تین ملاقاتیں ہوچکی تھیں لیکن درحقیقت انہیں اب تفصیل سے کیس کے بارے میں تبادلہ خیال کرنا تھا۔ وہ شخص ضمانت پر رہا تھا' اس پر شبہ تھا کہ اس نے اپنے کروڑوں کے فراڈ پر پردہ ڈالنے کے لئے ایک بینک کے ہیڈ آفس کے ایک خاص شعبے میں کرائے کے آدمیوں سے آگ لگوا دی تھی۔ جس میں صرف اسی کا نہیں بلکہ دوسرا بہت سا ضروری ریکارڈ بھی جل کر تباہ ہوگیا تھا۔

زیادہ افسوسناک بات یہ تھی کہ تباہی صرف یہیں تک محدود نہیں رہی تھی' اس آتشزدگی میں نہایت دردناک انداز میں بے چارے تین ملازمین بھی دروازے جام ہو جانے کی وجہ سے جھلس کر اور دم گھٹ کر ہلاک ہوگئے تھے' اس وقت تک فائر بریگیڈ بھی نہیں پہنچا تھا' لوگوں نے ان کی چیخیں سنیں لیکن ان کی کوئی مدد نہ کرسکے۔

واقعے کے بہت دن بعد خالد کے کلائنٹ کو ایف آئی اے نے گرفتار کیا تھا لیکن اس کے خلاف صرف شبہات ہی شبہات تھے' کوئی ثبوت نہیں تھا' اس کی ضمانت تو ہوگئی تھی لیکن اسے دھڑکا تھا کہ اس کے خلاف واقعاتی شہادتوں کے علاوہ کوئی ثبوت سامنے نہ آجائے' اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل ہو چکا تھا اس کے باوجود شاید وہ ملک سے فرار ہو جاتا لیکن اس کی ضمانت کچھ اس قسم کی تھی کہ وہ فرار نہ ہوسکا۔

خالد کے خیال میں دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ تھی کہ اس شخص کو ان واقعات پر یا اپنے کئے پر ذرا بھی افسوس نہیں تھا' وہ اسی طرح خوش نظر آتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو' قہقہے لگاتے ہوئے اس موضوع پر بات کرتا تھا' خالد کے سامنے تنہائی میں بڑی ردو قدح کے بعد اس نے یہ اعتراف تو کرلیا تھا کہ فراڈ اس نے واقعی کیا تھا لیکن اتنی عمدگی سے کیا تھا کہ کوئی اسے پکڑ نہیں سکتا تھا' وہ تین آدمیوں کے زندہ جل مرنے کا تذکرہ بھی ہنستے



ہوئے کرتا تھا' خالد کو اب اس کی خباثت اور سنگدلی پر حیرت نہیں ہوتی تھی' آخر وہ ان کی فرم کا کلائنٹ تھا اور ان کی فرم کے کلائنٹ اسی قسم کے ہوتے تھے۔

اس رات خالد اس سے ملنے پہنچا تو کھانے اور کیس کے بارے میں باتیں کرنے میں ہی کافی وقت صرف ہوگیا' اس کے ساتھ ساتھ اس سے گپ شپ بھی ہوتی رہی' اپنی تمامتر خباثت اور سفاکی کے ساتھ ساتھ وہ ایک زندہ دل آدمی بھی تھا' گفتگو دلچسپ کرتا تھا' خالد کو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوسکا۔

وہ واپس روانہ ہوا تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں آیا تھا جن کاموں میں زیادہ دیر ہو جانے کا امکان ہوتا تھا' ان کے سلسلے میں وہ لوگ کامران کو زحمت نہیں دیتے تھے۔ وہ اپارٹمنٹ بلڈنگ پر پہنچا تو مین گیٹ بند تھا اور رات کا چوکیدار غالباً" اندر گیٹ کے قریب ہی بنے ہوئے چھوٹے سے کیبن میں بھی موجود نہیں تھا۔ ان کے ہاں تین شفٹوں میں تین چوکیدار چوبیس گھنٹے باری باری کیبن میں موجود رہتے تھے لیکن اگر کسی وقت کسی وجہ سے چوکیدار ادھر ادھر ہوتا تھا' تب بھی انہیں کوئی زحمت نہیں ہوتی تھی' گیٹ میں جدید ترین خود کار نظام موجود تھا اور وہ ریموٹ کنٹرول سے مخصوص کوڈ نمبر کے ساتھ کھل جاتا تھا' عمارت میں رہنے والے تمام افراد کے پاس اور ان کی گاڑیوں میں ننھا سا ریموٹ کنٹرول موجود رہتا تھا۔

خالد نے بھی اپنی گاڑی کے گلو کمپارٹمنٹ میں سے وہ ننھا سا ریموٹ کنٹرول نکال کر چند بٹن دبا کر مخصوص نمبروں کا کوڈ ملایا اور گیٹ بے آواز طریقے سے آہستگی سے کھلتا چلا گیا۔ اس کی گاڑی گزر چکی تو گیٹ اسی طرح آہستگی سے بند ہوگیا۔ اس نے گاڑی تہہ خانے میں مخصوص جگہ پر پارک کی اور لفٹ کی طرف روانہ ہوا ہی تھا کہ ایک گوشے میں ے کھڑکی کے شیشے پر کوئی سایہ سا حرکت کرتا دکھائی دیا۔

اسے معلوم تھا کہ تہہ خانے میں اس طرف ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ موجود تھا۔ اس مقصد تو بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ بلڈنگ کی نگرانی اور چھوٹے موٹے مرمت وغیرہ کے اموں کے لئے اگر کوئی آدمی رکھا جائے تو اسے وہاں رہائش مہیا کی جاسکے لیکن اس بلڈنگ ں یہ اپارٹمنٹ فالتو ہی تھا کیونکہ اس سے ذرا اوپر پچھلی طرف گراؤنڈ فلور پر ایک اور اعدہ سرونٹ کوارٹر موجود تھا جو کئی کمروں پر مشتمل تھا' ایک گارڈ' مالی اور دیکھ بھال کے وٹے موٹے کام کرنے والے تین چار افراد وہاں رہتے تھے۔ تہہ خانے کے اس چھوٹے ے اپارٹمنٹ کا فی الحال کوئی مصرف نہیں تھا اور یہ مقفل رہتا تھا لیکن آج رات اس میں شنی نظر آرہی تھی اور کھڑکی کے شیشے پر کسی کا سایہ نظر آیا تھا۔

خالد تجسس سے مجبور ہوکر اس کھڑکی پر جاپہنچا۔ وہ چھوٹی سی ایک کھڑکی تھی اور عام ھڑکیوں کی نسبت ذرا بلندی پر تھی جبکہ اپارٹمنٹ کی چھت نیچی تھی۔ اس طرح وہ کھڑکی

گویا روشندان ہی کا کام دیتی تھی۔ اس کے عقب میں بلائنڈز بھی موجود تھے لیکن وہ اس وقت اٹھے ہوئے تھے اور اندر تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ خالد نے محتاط انداز میں کھڑکی کے ایک کونے سے اندر جھانکا اور دوسرے ہی لمحے اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس کے سامنے ایک بھیانک منظر تھا۔

اس کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ سفید ماربل کے فرش پر کوئی قالین وغیرہ بھی نہیں تھا اور اس فرش پر ایک عورت کے کٹے ہوئے اعضا بکھرے پڑے تھے' ایک طرف دونوں ٹانگیں آڑی ترچھی پڑی تھیں جو پیروں سے محروم تھیں' ان کے پاس ہی پاؤں علیحدہ کٹے پڑے تھے۔ ایک طرف دھڑ پڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ بازو نہیں تھے' بازو الگ الگ جگہ اس طرح پڑے تھے کہ ان سے کراس کا نشان بن گیا تھا۔

ان سب کے وسط میں عورت کا کٹا ہوا سر رکھا تھا' اس کے تراشیدہ بال اس کی پیشانی پر جھکے ہوئے تھے مگر خالد کے لئے اس چہرے کو پہچاننا مشکل نہیں تھا وہ نسرین کا سر تھا' اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے چہرے پر کرب یا اذیت کا کوئی تاثر نہیں تھا بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

حیرت اور ایک بے عنوان سے خوف کے جھٹکے کے باوجود خالد نے ایک بات بطور خاص محسوس کی کہ ایک انسانی جسم کے اس طرح کاٹے جانے کے باوجود فرش پر خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا اور نہ ہی کسی کٹے ہوئے عضو سے خون رستا دکھائی دے رہا تھا' ایسا معلوم ہوتا تھا' جیسے وہ انسانی جسم نہیں بلکہ موم کا کوئی مجسمہ تھا جسے ماہر ہاتھوں نے کسی انتہائی تیز دھار چیز سے ٹکڑے ٹکڑے کرکے فرش پر بکھیر دیا۔ وہ ماہر ہاتھ جس شخص کے تھے وہ بھی خالد کو فوراً ہی نظر آگیا۔

وہ شرافت علی تھا وہ کمرے کے عین وسط میں بالکل پیشہ ور قصابوں کی طرح آلتی پالتی مارے لکڑی کی ڈھمی سامنے رکھے اور ایک نہایت شاندار چمکتا ہوا چاپڑ ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ وہ اعضا بریدگی یقیناً اسی کا کارنامہ تھا اور وہ اپنی اس کارکردگی پر بڑا خوش نظر آرہا تھا۔ وہ باچھیں پھیلائے دور دور سے ان تمام اعضاء کا جائزہ لے رہا تھا۔ ابھی گویا اس کا کام ختم نہیں ہوا تھا۔

خالد دم بخود کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس دیوانے اور جنونی قاتل کو اس اپارٹمنٹ میں کس نے گھسا دیا تھا اور نسرین کیونکر اس کے ہتھے چڑھ گئی تھی؟ اس بدبخت کی یہ جرات کہ اس نے اس عمارت میں قدم رکھنے کے بعد پہلی ہی رات فرم کے ایک سینئر پارٹنر کی بیوی کے ٹکڑے کر دیئے تھے اور اب یوں فخریہ انداز میں بیٹھا ان کا جائزہ لے رہا تھا جیسے گلی محلے کے کسی قصاب نے بہت عمدہ بکرا یا بچھیا ذبح کرنے کے بعد اس کے ٹکڑے دکان میں سجا رکھے ہوں اور گاہکوں کا انتظار کر رہا ہو۔



خالد کو غصہ بھی آرہا تھا اور ایک عجیب سا خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے شرافت علی نے جھک کر اور ہاتھ بڑھا کر نسرین کا ایک سڈول بازو اٹھایا اور اسے ڈھمی پر رکھ کر ٹھک ٹھک کی دو ہلکی سی آوازوں کے ساتھ چاپڑ کے دو وار کرکے اس کی پانچوں انگلیاں الگ کر دیں۔ ایک وار میں دو انگلیاں الگ ہو کر نیچے آگریں اور دوسرے وار میں باقی تینوں انگلیاں فرش پر بکھر گئیں۔

شرافت علی نے اسی پر بس نہیں کی اس نے مزید تین زور دار وار کرکے بازو کو بھی چھوٹے چھوٹے تین ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ وہ گویا اس کام سے بے حد لطف اندوز ہو رہا تھا اور بڑی ترنگ میں تھا۔ شاید وہ دھیمے سروں میں کچھ گنگنا بھی رہا تھا لیکن کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند ہونے کی وجہ سے آواز اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

پھر اس نے نسرین کا دوسرا بازو اٹھایا اور اسے بھی اسی طرح مزید ٹکڑوں میں تقسیم کرنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نسرین کے وجود کے ان گنت ٹکڑے کر دینا چاہتا تھا۔ بش شرٹ اور نیکر میں آلتی پالتی مارے وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ کوئی عفریت دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر لطف و لذت کشی کے تاثرات گویا اس کی شخصیت کی خوفناکی میں اور بھی اضافہ کر رہے تھے۔

خوف کی لہر گزر چکی تو خالد کو اس پر غصہ آنے لگا۔ کیا اس نے اس درندے کو اس لئے جیل سے رہا کرایا تھا کہ وہ اس بلڈنگ میں آکر مکینوں کا یہ حشر کرنا شروع کر دے؟ اس لمحے وہ یہ بھی بھول گیا کہ شرافت علی کے ہاتھ میں چمکتا ہوا وزنی اور تیز دھار چاپڑ تھا' صرف یہی نہیں وہ ذہنی طور پر بھی پسماندہ اور خطرناک ذہنی مریض تھا' انسانوں کو ذبح کرنے' ان کے ٹکڑے کرنے اور ان کا خون پینے کے اعترافات وہ خود خالد کے سامنے کر چکا تھا۔

ان سب باتوں کے باوجود خالد کا دل چاہا کہ دروازہ کھول کر اندر گھسے اور اس کی بھینسے جیسی موٹی اور مضبوط گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر اس وقت تک اس کا گلا دباتا رہے جب تک اس کے جسم سے زندگی کی آخری رمق بھی معدوم نہ ہو جائے۔ لاشعوری سے انداز میں اس ارادے پر عمل کرنے کے لئے وہ دروازے پر بھی جا پہنچا' اس نے ناب گھمانے کی کوشش کی لیکن دروازہ مقفل تھا۔

وہ ایک بار پھر کھڑکی پر لوٹ آیا۔ شرافت علی بدستور گویا دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے شغل میں مصروف تھا۔ ایک لمحے کے لئے خالد کا دل چاہا کہ کوئی چیز مار کر کھڑکی کا شیشہ توڑ دے اور للکار کر شرافت علی کو دروازہ کھولنے کا حکم دے۔ اندر کا منظر دیکھتے ہوئے اسے ایک بار پھر حیرت ہوئی کہ شرافت علی کی اس سفاکانہ کارروائی کے دوران میں کہیں خون کیوں دکھائی نہیں دے رہا تھا' کیا وہ خون کا ایک ایک قطرہ پی گیا تھا اور ادھر ادھر پھیل

جانے والی ایک ایک بوند چاٹ گیا تھا؟

یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا' کہیں نہ کہیں خون کی موجودگی کے آثار ضرور نظر آجاتے' یہاں تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ذبح کئے جانے سے پہلے نسرین کے جسم کا سارا خون خشک ہوگیا تھا یا پھر شاید اس کے جسم میں خون تھا ہی نہیں ——— وہ کسی معجزے کے تحت خون کے بغیر ہی زندہ تھی۔ درحقیقت اسی معمے میں الجھ کر وہ کھڑکی کا شیشہ توڑنے سے باز رہا ورنہ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اس ارادے پر عمل کرگزرتا۔

ابھی وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ کسی نے عقب سے اس کے کندھے پر بھاری سا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ہڑبڑا کر پلٹا لیکن یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی کہ وہ کامران تھا۔ وہ اس وقت بلڈنگ کے کسی اور مکین کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہا تھا اور یہ تو بہت ہی اچھا ہوا تھا کہ کامران اس طرف آنکلا تھا۔ اس وقت کی صورتحال میں وہ ایک موزوں ترین آدمی تھا۔ لمبا تڑنگا' مضبوط اور بے خوف ———

"کامران! ذرا دیکھو ———" خالد نے تیزی سے کہا لیکن اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ کامران نے پھرتی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے خالد کا بازو پکڑ رکھا تھا اور دونوں ہی جگہ اس کی گرفت آہنی تھی۔ خالد کو کچھ یوں لگا جیسے اس وقت اس کی حیثیت وہی تھی جو باز کے پنجوں میں چڑیا کی۔

کامران اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا وہاں سے دور لے گیا۔ وہ تہہ خانے ہی کے ایک ستون کے قریب جارکا۔ اب بھی وہ دونوں ملگجے اندھیرے میں تھے۔ خالد اس کا چہرہ صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ محسوس کر رہا تھا کہ کامران کے تاثرات اور رویے میں بے پناہ اجنبیت تھی وہ گویا خالد سے خفا تھا' اس نے تو جیسے خالد کو چوری کرتے ہوئے پکڑلیا تھا۔

وہ خالد کے کان کے قریب سانپ کی طرح پھنکارا۔ "خود اپنی بلڈنگ میں بھی اس طرح راتوں کو ادھر ادھر تاک جھانک کرتے پھرنا کوئی اچھی بات نہیں ———"

پھر اس نے گویا خالد کو خبردار کیا۔ "میں آپ کے منہ سے ہاتھ ہٹا لوں تب بھی اونچی آواز میں یہ بات مت کیجئے گا" یہ کہہ کر اس نے نہایت آہستگی سے خالد کے منہ سے ہاتھ ہٹایا۔

خالد کو اپنے کانوں کی لویں تپتی محسوس ہوئیں۔ ایک تو آج تک اس مردود کامران کی حیثیت کا تعین نہیں ہوسکا تھا۔ خالد نے غصے سے سوچا۔ جمشید بھی اس سلسلے میں کوئی وضاحت نہیں کرتے تھے بظاہر وہ ڈرائیور اور ادھر ادھر کے فالتو کام کرنے والا آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن اکثر اس کے انداز و اطوار اور لہجے میں ایک عجیب پراسراریت اور تحکم ہوتا تھا جیسے وہ جمشید کے سارے سیٹ اپ میں بہت ہی خصوصی اہمیت کا حامل ہو۔ آدمی بھی وہ



کچھ پراسرار سا ہی تھا۔ اکثر جگہوں پر وہ موجود ہوتا اور اگر موجود نہیں ہوتا تھا تب بھی بوقت ضرورت کسی آسیب کی طرح آن موجود ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ وہ دن اور رات کے کسی بھی حصے میں سوتا ہی نہیں تھا۔

اپنے تمامتر غصے کے باوجود وہ کامران کی ہدایت پر عمل کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ منہ سے ہاتھ ہٹنے پر جب وہ بولا تو اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ "تم نے کھڑکی سے جھانک کر اندر تو دیکھ لیا ہوتا ——— تمہیں معلوم ہے وہاں کون موجود ہے اور کیا کر رہا ہے؟"

"ہاں ——— مجھے معلوم ہے' وہاں شرافت علی موجود ہے۔" کامران نے اطمینان سے جواب دیا۔ اور جو کچھ وہ کر رہا ہے۔ اس کے بارے میں بھی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ——— عین ممکن ہے وہ کوئی ضروری کام کر رہا ہو۔ عین ممکن ہے وہ کام اس کے سپرد کیا گیا ہو ———"

یہ بات اس نے مبہم انداز میں کی تھی لیکن خالد کے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کتنا احمق تھا۔ بھلا شرافت علی جیسے ذہنی طور پر پسماندہ انسان کی کیا مجال تھی کہ جمشید کی مرضی کے بغیر اس بلڈنگ کے کسی حصے میں آن بیٹھتا ——— نسرین جیسی عورت اس کے قابو میں آجاتی اور وہ اس کے ٹکڑے کرنے بیٹھ جاتا۔ کامران کا لہجہ مبہم ہی سہی لیکن اشارہ بھی کافی تھا۔ اس سارے سلسلے کے پیچھے کسی کی مرضی' کسی کا حکم کام کر رہا تھا۔ شرافت علی پر یقیناً کسی کی نگاہ انتخاب پڑی تھی۔ اسے کسی خاص مقصد کے تحت جیل سے رہا کروایا گیا تھا اور شاید رہائی کے پہلے دن سے ہی اس کے ذریعے اس کام کا آغاز کرا دیا گیا تھا جس کے لئے اسے موزوں سمجھا گیا تھا۔

یکدم ہی اس کا سارا ہیجان اور غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا لیکن وہ تھکے تھکے سے لہجے میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "وہ ——— وہ ——— خبیث کا بچہ آخر نسرین کے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے؟"

"جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں' ضروری نہیں ہے کہ آپ ان میں سر کھپائیں۔" کامران نے رکھائی سے مشورہ دیا۔ "اور جن معاملات سے آپ کا کوئی تعلق نہ ہو' ضروری نہیں کہ آپ ان میں ٹانگ اڑائیں ——— آپ آرام سے اوپر اپنے گھر میں جاکر سو جائیں۔"

اس کا تحکمانہ لہجہ بتا رہا تھا کہ خالد کے لئے اس مشورے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کامران نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور وہ تھکے تھکے قدموں سے لفٹ کی طرف چل دیا۔ اوپر آکر اس نے کپڑے بدل کر سونے کی کوشش کی لیکن آج جیسے طویل و عریض اپارٹمنٹ کی تنہائی اور بھی گراں گزر رہی تھی۔ بڑی مشکل سے' بہت دیر میں جاکر اسے

نیند بھی آئی تو خوفناک سے خواب بے چین کرتے رہے۔
صبح اٹھ کر وہ تیار ہو کر باہر جانے کے لئے نکلا اور اس کے بٹن دبانے پر لفٹ آئی تو اس کا دروازہ کھلنے پر اسے گزشتہ رات سے بھی شدید جھٹکا لگا۔
لفٹ میں اس کے سامنے نسرین کھڑی مسکرا رہی۔تھی۔

○



خالد کئی سیکنڈ تک نسرین کی طرف ایک ٹک دیکھتا رہا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا واقعی یہ وہی عورت تھی جس کے اس نے گزشتہ رات شرافت علی کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھے تھے۔
نسرین کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ وہ دوستانہ لہجے میں بولی۔ "خالد صاحب! آپ تو یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہے ہیں جیسے میں بے پناہ حسین عورت ہوں اور آپ زندگی میں پہلی بار مجھے دیکھ رہے ہیں۔"
خالد سنبھلتے ہوئے بولا۔ "حسین تو خیر آپ ہیں——" وہ اس سے آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح گزشتہ رات کے واقعے کا حوالے دے۔
وہ ایک لمحے کیلئے خاموش ہوا تو نسرین لفٹ سے باہر آتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "عورت ہر عمر میں اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی ہے خالد صاحب! لیکن افسوس کہ ہم تو اب اس معصوم سی خود فریبی سے بھی خوشی حاصل نہیں کر سکتے' اب کہاں کی خوبصورتی اور کہاں کا حسن—— ہاں—— البتہ کبھی ہم بھی خوبصورت تھے——" اس کا لہجہ شاعرانہ سا ہو گیا لیکن پھر ادھر ادھر دیکھ کر وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "لیکن جب سے ہم شیطانی چکر میں پھنسے' ساری خوبصورتی تباہ ہو گئی' سارا حسن اجڑ گیا' سب کچھ ختم ہو گیا' شیطان اس دنیا سے ساری خوبصورتی ختم کر دینا چاہتا ہے' انسانوں کی خوبصورتی' ماحول کی خوبصورتی' روایات کی خوبصورتی' وہ خوبصورتی' اچھائی اور نیکی کا دشمن ہے۔"
"لیکن ہمارا شیطان سے کیا تعلق نسرین صاحبہ۔" خالد بھی ادھر ادھر دیکھ کر ذرا نیچی آواز میں بولا۔ قطعی غیر ارادی طور پر ہی اس کا انداز رازدارانہ ہو گیا تھا۔
نسرین گویا اس کی ناسمجھی پر دھیرے سے ہنسی۔ "تعلق——؟ تعلق کیوں نہیں ابھی تک تعلق ہی آپ کی سمجھ میں نہیں آیا؟ ہم شیطان کے ایک پجاری کے زیر سایہ ہی تو رہ رہے ہیں' اس کا ہاتھ تھام کر چل رہے ہیں۔ وہ شیطان کا چیلا ہے' ہم اس کے چیلے ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں نسرین صاحبہ!" خالد کو جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے خود بھی احساس تھا کہ اسے اب جمشید سے بہت

خوف آنے لگا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ان کا ایک حقیر غلام محسوس کرتا تھا۔ وہ ان کی پراسرار قوتوں کے جو مظاہرے دیکھ چکا تھا' ان کے بعد سے خود کو ان کے سامنے بہت حقیر محسوس کرنے لگا اور اس کے اندر جیسے کوئی غیبی سی قوت اسے ہر وقت احساس دلاتی رہتی تھی کہ اسے بس اب جمشید کی اطاعت اور فرمانبرداری میں زندگی گزارنی ہے' اسے یہ بھی احساس تھا کہ جمشید جب بھی چاہتے' کہیں بھی ہونے والی گفتگو سن سکتے تھے' کہیں بھی رونما ہونے والے واقعے کا منظر دیکھ سکتے تھے اس لئے وہ اس وقت نسرین کی "باغیانہ" سی گفتگو سن کر زیادہ خوفزدہ ہو رہا تھا۔ وہ اس پر حیران بھی تھا کہ نسرین ایسی باغیانہ گفتگو کرنے کی متحمل کیسے ہو رہی تھی۔

نسرین مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں لیکن آپ خوفزدہ ہونے کی وجہ سے میری باتوں کی تائید نہیں کر سکتے..... آپ ابھی نئے ہیں نا..... میں نہ صرف پرانی ہو گئی ہوں بلکہ کچھ طاقت بھی پکڑ گئی ہوں' جمشید صاحب مجھ سے جان چھڑانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں لیکن چھڑا نہیں پا رہے' کسی مرحلے پر ان کی طاقت جواب دے جاتی ہے اور کسی مرحلے پر میری طاقت ناکافی ثابت ہوتی ہے یونہی کشمکش چل رہی ہے' مجھے معلوم ہے شکست میری ہی ہو گی اور مجھے بالآخر فنا کے گھاٹ اترنا پڑے گا لیکن میں اس بات کی پرواہ نہیں کر رہی ہوں اور اس کشمکش کو جاری رکھے ہوئے ہوں' یہ میرے لئے ایک دلچسپ کھیل بن گئی ہے گو کہ میں جان پر کھیل رہی ہوں۔"

خالد ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میں تو اس وقت بھی آپ کو زندہ دیکھ کر حیران ہوں' معلوم نہیں وہ خواب تھا یا حقیقت..... بہرحال میں نے رات ایک شخص کے ہاتھوں آپ کے ٹکڑے ہوتے دیکھے تھے۔"

"اوہ....." نسرین بے پروائی سے ہنسی۔ "آپ اس مردود و خبیث کی بات کر رہے ہیں جس کا نام شرافت علی ہے' اس سے بڑی ستم ظریفی بھلا کیا ہو گی کہ ایسے شخص کا نام شرافت علی ہے' اس کی روح تک میں شیطانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور اس میں شیطان کا چیلا بننے کی بہت ہی زیادہ اہلیت موجود ہے' اسی لئے جمشید نے اسے آپ کے توسط سے اتنی محنت سے موت کے منہ سے نکالا ہے اور یہاں اپنے زیر سایہ رکھ لیا ہے۔"

خالد قدرے حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا' نسرین تو اس پس منظر سے آگاہ تھی' اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی' وہ اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "تو کیا وہ واقعی آپ کے ٹکڑے کر رہا تھا؟"

"ہاں....." نسرین نے طویل سانس لے کر گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اگر آپ کسی طرح اتفاق سے وہ منظر دیکھ چکے ہیں تو یہ جان لیں کہ وہ آپ کی نظر کا دھوکا نہیں تھا۔" خالد کو کچھ یوں لگا جیسے اس کے لہجے میں خفیف سی اداسی کی جھلک آئی تھی۔



"لیکن آپ تو میرے سامنے زندہ سلامت کھڑی ہیں۔" خالد بولا۔

"ہاں..... میں اتنی آسانی سے مرنے والی نہیں ہوں۔" نسرین کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ "میں نے کہا نا کہ میں بھی کچھ طاقت پکڑ چکی ہوں' جمشید کے لئے اس طرح ہو گئی ہوں جیسے سانپ کے گلے میں چھچھوندر..... وہ نہ تو اگل پا رہے ہیں اور نہ ہی نگل پا رہے ہیں..... لیکن..... بہرحال..... ایک نہ ایک دن نگل ہی جائیں گے۔"

خالد کی آنکھوں میں الجھن کے آثار دیکھ کر وہ گویا مزید وضاحت کے لئے بولی۔ "جمشید مجھے ٹھکانے لگانے کے لئے چھوٹے موٹے تو کئی طریقے آزما چکے ہیں لیکن انہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ میں کافی سخت جان ہو چکی ہوں' اب انہوں نے یہ ایک نیا شیطانی عمل شروع کیا ہے' آپ نے تو ابھی پہلی رات ہی میرے ٹکڑے ہوتے دیکھے ہیں لیکن ابھی اس طرح چالیس راتوں تک روزانہ رات کو میرے ٹکڑے ہوتے رہیں گے' چالیس راتوں تک یہ عمل بلاناغہ جاری رہنا چاہئے اگر ایک بھی ناغہ آ گیا تو عمل پھر نئے سرے سے شروع کرنا پڑے گا۔"

خالد حیرت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اور چالیس راتوں تک آپ روزانہ اسی طرح صبح کو زندہ سلامت نظر آیا کریں گی؟"

"ہاں....." نسرین نے جواب دیا۔

"اور جب چالیس دن کا یہ عمل پورا ہو جائے گا تو.....؟" خالد نے پوچھا۔

"تو پھر میں سچ مچ مر جاؤں گی' فنا کے گھاٹ اتر جاؤں گی' جمشید ہی کے زیر سایہ رہتے ہوئے میں نے جو تھوڑی بہت پراسرار طاقت حاصل کی ہے' وہ میرے مزید کام نہیں آ سکے گی۔" وہ اطمینان سے بولی۔

خالد کو اس کے اطمینان پر بھی حیرت ہوئی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "تو پھر آپ یہاں سے فرار کیوں نہیں ہو جاتیں..... غائب کیوں نہیں ہو جاتیں؟"

اس بار نسرین گویا اس کی سادگی اور کم علمی پر مسکرائی پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "کاش! یہ اتنا ہی آسان ہوتا' میں بھاگ نہیں سکتی کیونکہ میرے گرد حصار کھینچ دیا گیا ہے۔"

"حصار.....؟" خالد نے حیرت سے کہا اور یوں نسرین کے [illegible] کی طرف دیکھا گویا اسے امید ہو کہ اسے ان کے اردگرد کوئی دائرہ کھنچا ہوا دکھائی دے جائے گا۔

نسرین دھیرے سے ہنس دی اور بولی۔ "وہ ایک نادیدہ حصار ہے اور اتنا چھوٹا نہیں ہے کہ میں اس کے درمیان صرف کھڑی ہو سکوں' وہ خاصا بڑا حصار ہے' میں اس کے درمیان بظاہر آزادی سے ہی حرکت کرتی اور چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہوں لیکن اس سے باہر نہیں جا سکتی' وہ ایک طرح کی حد بندی ہے جو میرے لئے قائم کر دی گئی ہے' بوقت

ضرورت وہ حصار جمشید کی مرضی سے میرے ساتھ ساتھ کچھ دور تک سفر بھی کر سکتا ہے لیکن جمشید جب چاہیں گے' وہ حصار مجھے اپنے درمیان لئے یوں واپس لے آئے گا جیسے کسی مفرور قیدی کو رسی سے باندھ کر لایا جاتا ہے' فرار کی تو کوشش فضول ہے' اس نادیدہ حصار کو توڑنا میرے لئے اپنی پراسرار طاقتوں کی مدد سے بھی ممکن نہیں۔"

"چنانچہ آپ خاموشی سے اپنی اصل اور مکمل موت کا انتظار کر رہی ہیں؟"

"میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں' میں حسب توفیق مزاحمت کر رہی ہوں لیکن یہ مزاحمت کچھ ایسی ہی ہے جیسے کسی شریر اور ضدی بچے کو سکول لے جایا جا رہا ہو' وہ رو رہا ہو' چلا رہا ہو' پاؤں رگڑ رہا ہو لیکن اسے گھسیٹ کر لے جایا جا رہا ہو' دل میں اسے بھی علم ہو کہ اسے بہرحال سکول جانا ہی پڑے گا۔"

آپ کے شوہر پاشا صاحب کو بھی یہ سب کچھ معلوم ہے؟" خالد نے تصدیق چاہی۔

"یقیناً"...... لیکن وہ بھی کچھ نہیں کر سکتے اور وہ کرنا بھی کیوں چاہیں گے؟ وہ جمشید کے نہایت وفادار اور سعادت مند چیلے ہیں' بیوی تو ان کے لئے گھر میں رکھی جانے والی کسی چھوٹی موٹی ضرورت کی چیز کی طرح ہے اور جمشید کے حکم کے سامنے تو بیوی کی بالکل ہی کوئی اہمیت نہیں' اس جگہ کے اصولوں کے مطابق جمشید کے حکم کے سامنے کسی چیز' کسی انسان' کسی رشتے کی کوئی اہمیت ہونی بھی نہیں چاہئے' جب آپ جمشید کے حلقہ اطاعت میں آ جاتے ہیں تو پھر آپ کی روح ان کے پاس گروی رکھی جاتی ہے' جب آپ کی روح ہی آپ کی اپنی نہیں رہی تو باقی کیا رہ گیا؟"

خالد نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ نہ جانے روح گروی رکھے جانے کا مطلب کیا تھا اور اس کا احساس کیسے ہوتا تھا لیکن کم از کم وہ تو یہی محسوس کرتا تھا کہ اس کی روح اس کے پاس تھی' کہیں گروی نہیں رکھی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس سلسلے میں کیا سوال کرے' کس طرح تصدیق چاہے۔

نسرین گویا اس کے خیالات کو پڑھتے ہوئے خود ہی بولی۔ "آپ ابھی نئے ہیں' آپ کی روح ابھی مکمل طور پر آپ کے قبضے سے نہیں نکلی ہے لیکن دوسرے بہت سے واقعات آپ کے ساتھ بہت تیزی سے پیش آ رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ جمشید کے بہت قریب ہو گئے ہیں' یہاں کے رازوں سے واقف ہو گئے ہیں' آپ کی بیوی امید سے ہو گئی ہے لیکن تشویشناک بات یہ ہے کہ اس کی روح کے باغی ہو جانے کے باعث اسے ہسپتال کے نفسیاتی وارڈ میں پہنچا دیا گیا ہے' اس کی روح تو مکمل بغاوت پر تلی ہی ہوئی ہے لیکن آپ کی روح ابھی مکمل طور پر جمشید کی غلامی نہیں نہیں گئی ہے' اس لئے ابھی آپ کے پاس وقت ہے مسٹر خالد! آپ یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کر لیں۔"

"یعنی...... آپ کا مطلب ہے...... میں یہاں سے چلا جاؤں۔" خالد نے حیرت سے



پوچھا۔ اسے یہیں رہنے والی ایک عورت سے اس مشورے کی امید نہیں تھی۔

"ایسی آسانی سے آپ کو کون جانے دے گا۔" نسرین کی آواز کچھ اور اونچی ہو گئی۔

"کسی طرح اپنی بیوی کو اس وارڈ سے نکالیں اور یہاں سے فرار ہو جائیں' اگر آپ کو کہیں سے تھوڑی بہت روحانی مدد میسر آ گئی تو شاید جمشید آپ کو زیادہ نقصان نہ پہنچا پائیں' اگر آپ یہاں رہیں گے تو آپ مکمل طور پر شیطان کے چیلے بن جائیں گے اور آپ کی آنے والی نسل تو درحقیقت مکمل طور پر اور پیدائشی طور پر ویسی ہی ہو گی...... کیونکہ...... وہ دراصل آپ کی نسل ہی نہیں ہو گی۔"

خالد ایک لمحے دم بخود سا کھڑا رہا پھر بولا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ شاید اس وقت جمشید کہیں بیٹھے ہماری اس ملاقات کا منظر دیکھ رہے ہوں اور ہماری باتیں سن رہے ہوں؟"

"ہاں...... مجھے معلوم ہے۔" نسرین اطمینان سے بولی۔ "لیکن مجھے جہاں اور بہت سی باتوں کی پرواہ نہیں رہی' وہاں اس بات کی بھی پرواہ نہیں رہی' میری کوشش یہی ہے کہ اگر آپ اس دلدل کی زیادہ گہرائی میں جانے سے بچ سکتے ہیں تو بچ جائیں' مجھے افسوس ہے کہ ابتداء میں' میں نے خود بھی آپ کو اس دلدل میں دھکیلنے میں معمولی سا کردار ادا کیا ہے لیکن اب جبکہ مجھے اپنی موت اور فنا قریب دکھائی دے رہی ہے' میں چاہتی ہوں کسی کو تو جمشید کے شر سے بچانے کی اپنی سی کوشش کر جاؤں' ویسے بھی انہیں جھنجلاہٹ کا شکار دیکھ کر مجھے بہت لطف آتا ہے' زندگی میں اب میرے لئے یہی ایک لذت رہ گئی ہے۔"

خالد کو اپنی کنپٹیوں میں سنسناہٹ سی محسوس ہو رہی تھی' وہ خاموش کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد نسرین سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ "وہ ہسپتال جمشید کا اپنا ہے' میں تو اس کے نفسیاتی وارڈ سے بھی ہو کر آ چکی ہوں' وہ وہاں کا سب سے خطرناک وارڈ ہے لیکن میں تو اس وقت بھی کچھ طاقت حاصل کر چکی تھی' اس لئے زندہ واپس آ گئی تھی لیکن آپ کی بیوی شاید زندہ واپس نہ آ سکے کیونکہ اس کی روح تو باغی ہو چکی ہے لیکن بغاوت کے لئے جو طاقت درکار ہوتی ہے' وہ اس کے پاس نہیں ہے' اس لئے وہاں سے شیطان کے چیلے کی نسل کا ایک نوزائیدہ فرد تو شاید آ جائے لیکن اسے جنم دینے والی شاید واپس نہ آ سکے۔"

"مجھے کیا کرنا چاہئے؟" خالد نے گھٹی گھٹی سی آواز میں پوچھا۔ [illegible] اب سچ مچ خود کو [illegible] خوف زدہ محسوس کر رہا تھا۔

"مجھے اندیشہ ہے کہ شاید آپ اپنی بیوی کو تو اس وارڈ سے نہ نکال سکیں...... میں اب آپ کی کچھ مدد نہیں کر سکتی۔" نسرین کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "لیکن آپ کم از کم یہ ضرور کریں کہ جمشید اجازت دیں یا نہ دیں لیکن کسی نہ کسی طرح اپنی کسی قریبی ہستی کو چوبیس گھنٹے میمونہ کے ساتھ رہنے کے لئے ہسپتال میں بھیج دیں' آپ کی کوئی سمجھدار بہن'

ماں یا کوئی اور ایسی خاتون ہو جو صحیح معنوں میں آپ کی خیر خواہ ہو' آپ سے محبت کرتی ہو اور آپ کی خاطر تکلیف اٹھا سکتی ہو' جب تک میمونہ کو وہاں سے ڈسچارج نہیں کیا جاتا' تب تک وہ سائے کی طرح چوبیس گھنٹے میمونہ کے ساتھ رہے' یہ محض ایک احتیاطی تدبیر ہے لیکن اگر آپ اتنا بھی کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو غنیمت ہو گا۔"

خالد کے ذہن میں اپنی والدہ کا شفیق چہرہ ابھر آیا۔ والدہ کے سوا بھلا اس کا دنیا میں کون تھا جو دل و جان سے اس کا ہمدرد و خیر خواہ ہوتا اور اس کی خاطر کوئی بھی تکلیف اٹھا سکتا؟ وہی ماں جس نے اسے پاگلوں کی طرح دنیاوی ترقی کے پیچھے لپکتے دیکھ کر اس کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا اور حیدر آباد ہی میں اپنے غریبانہ سے گھر میں رہنا بہتر سمجھا تھا۔ اتنا بہرحال خالد کو یقین تھا کہ اگر وہ یہ کہہ کر انہیں بلائے گا کہ اس وقت وہ ذرا مشکل میں ہے اور اسے ان کی مدد کی ضرورت ہے تو وہ دوڑی آئیں گی' یہ محبت' بے غرضی اور خیر خواہی تو ہر ماں کے خمیر میں شامل تھی۔

نسرین کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "آپ غالباً ہسپتال ہی جانے کے ارادے سے نکلے ہیں؟"

"جی ہاں....." خالد نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے..... چلئے....." نسرین نے دوبارہ لفٹ کو بلانے کے لئے بٹن دبایا۔ "میں خاص طور پر بھی چند باتیں کرنے کے لئے آپ کی طرف آئی تھی' اچھا ہوا آپ راستے میں ہی مل گئے' میں آپ کے اپارٹمنٹ میں آنا نہیں چاہتی تھی' وہاں تو اس بات کا کچھ زیادہ ہی امکان ہوتا ہے کہ جمشید سب کچھ کہیں بیٹھے دیکھ رہے ہوں اور سن رہے ہوں' دوسری جگہوں پر تو پھر بھی کسی گفتگو اور کسی ملاقات کے بارے میں ان کے آگاہ نہ ہونے کا دو چار فیصد امکان ہوتا ہے۔"

وہ لفٹ کے ذریعے نیچے آئے۔ نسرین اپنے فلور پر اتر گئی اور خالد گراؤنڈ فلور پر آ گیا۔ اس نے انٹر کام پر پہلے ہی تصدیق کر لی تھی کہ کامران نیچے موجود نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں اسے اندیشہ تھا کہ کامران اسے ہسپتال نہیں لے کر جائے گا اور اگر کامران کے سامنے اس نے خود اپنی گاڑی میں جانے کی کوشش کی تو شاید وہ اس کے راستے کی رکاوٹ بنے۔ چنانچہ اس کی غیر موجودگی کا اطمینان کرنے کے بعد وہ چپکے سے اپنی گاڑی نکال کر روانہ ہوا۔

ہسپتال پہنچ کر لابی اسے سنسان ہی دکھائی دی' کبھی کبھار جو دو چار پراسرار قسم کے مریض دکھائی دے جاتے تھے' آج وہ بھی نہیں تھے شاید صبح اتنی جلدی مریضوں کی آمدورفت شروع نہیں ہوتی تھی۔ خالد فوری طور پر استقبالیہ پر بھی نہیں گیا جہاں سفید یونیفارم میں مضبوط سے جسم کی ایک عورت بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ خالد نے پوری پوری



کوشش کی کہ وہ اس کی نظر میں نہ آنے پائے' اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ شاید اسے میمونہ سے ملنے کے لئے نہ جانے دیا جائے۔

وہ کچھ دیر لابی سے باہر ہی ڈرائیو وے کے قریب ایک کونے پر اس طرح کھڑا رہا کہ ریسپشنسٹ کی نظر میں نہ آ سکے لیکن خود کبھی کبھار احتیاط سے جھانک کر اسے دیکھتا رہے آخر کار اس کی مراد بر آئی۔ عورت کو انٹر کام پر کوئی پیغام موصول ہوا اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔ تب خالد جلدی سے لابی سے گزر گیا۔ دیوار پر لگے ایک بورڈ پر اس نے تیر کے نشان کی مدد سے یہ پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ نفسیاتی وارڈ کس طرف تھا۔ بائیں طرف کی راہداری سے وہ اس جانب روانہ ہو گیا۔

راستے میں اس کا ایک میل اور ایک فیمیل نرس سے سامنا ہوا لیکن ان میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی' اس کی خوش قسمتی تھی کہ نفسیاتی وارڈ کے باہر بنا ہوا چھوٹا سا ڈیوٹی روم بھی خالی تھا لیکن اس میں موجود ریوالونگ چیئر پر لٹکا ہوا سفید کوٹ اور میز پر رکھی ہوئی ایک کھلی فائل بتا رہی تھی کہ ڈیوٹی پر موجود مرد یا عورت اٹھ کر آس پاس کہیں گئی ہوئی تھی۔ خالد جلدی سے اس راہداری میں داخل ہو گیا جس میں دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں باقی عمارت کی نسبت اس راہداری میں روشنی بہت کم تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ وارڈ آمنے سامنے کے صرف ۶ کمروں پر مشتمل تھا اور ان کمروں کو باہر سے ہی دیکھ کر نفسیاتی وارڈ کے بجائے کسی صاف ستھرے قید خانے کا گمان گزرتا تھا کیونکہ ہر کمرے کے سفید دروازے کے سامنے لوہے کی مضبوط گرل لگی تھی' ہر دروازے کے ساتھ چھوٹی سی ایک کھڑکی تھی' اس میں بھی گرل لگی ہوئی تھی۔

خالد نے پہلے ۵ کمروں میں سے ہر ایک کا دروازہ اور گرل چیک کی' دونوں چیزیں مقفل تھیں اور کھڑکیاں بھی مضبوطی سے بند تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کمروں میں کوئی مریض نہیں تھا لیکن خالد یہ بات یقین سے بھی نہیں کہہ سکتا تھا' عام طور پر اس قسم کے وارڈوں میں مریضوں کو خواب آور دواؤں کے زیر اثر رکھا جاتا تھا' کچھ بعید نہیں تھا کہ ان کمروں میں نیم تاریکی میں مریض دنیا و مافیہا سے بے خبر لیٹے ہوں' ایک تو اسے چوری چھپے تاک جھانک کرنے کی وجہ سے کچھ خوف محسوس ہو رہا تھا لیکن اس کے علاوہ بھی کسی نامعلوم خوف سے اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا' اس نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو وہ پسینے سے تر تھی۔

دھڑکتے دل کے ساتھ وہ چھٹے کمرے تک پہنچا' اس کا بھی دروازہ اور گرل تو مقفل تھا لیکن چھوٹی سی کھڑکی کھلی ہوئی تھی' اس نے اس کھڑکی سے اندر جھانکا تو اس بری طرح اچھل کر پیچھے ہٹا کہ گرتے گرتے بچا۔ اسے یقین نہ آیا کہ اس نے وہ بھیانک چہرہ سچ مچ کمرے میں دیکھا تھا' وہ کسی عورت کا چہرہ تھا اور اسے بدصورت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا'

اس کے باوجود خالد یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ایسا بھیانک چہرہ اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا' اس کے ہاتھ پیروں پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔

لیکن تصدیق ضروری تھی کہ واقعی وہ چہرہ کمرے میں موجود تھا یا یہ اس کا واہمہ تھا.....؟ شاید اس کی آنکھوں نے ایک لمحے کے لئے اسے دھوکا دیا تھا۔ تھوک نگل کر اس نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ سر آگے کیا اور احتیاطاً" کھڑکی کی گرل کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا تاکہ وہ ہڑبڑا کر غیر ارادی طور پر یکدم پیچھے نہ ہٹ جائے۔

چہرہ بدستور اپنی جگہ موجود تھا اور کھڑکی ہی کی طرف تک رہا تھا۔ پہلی مرتبہ بھی خالد نے جھانکا تھا تو چہرہ اسی طرح منتظر انداز میں کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ خالد اس کھڑکی سے جھانکنے والا تھا۔ اس بار بھی جی کڑا کر کے صحیح طور پر دیکھنے کے بعد ایک لمحے کی تاخیر سے خالد کو احساس ہوا کہ وہ تو میمونہ کا چہرہ تھا لیکن کیا وہ دو تین راتوں میں اتنا بدل گیا تھا؟

سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ ایک رنگ برنگا چہرہ تھا' ایک آنکھ سرخ تھی تو دوسری بند' ہونٹ جامنی تھے اور ان سے جھانکتے ہوئے لمبے لمبے نوکیلے دانت ہلکے نیلے رنگ کے تھے' ایک رخسار نارنجی تھا تو دوسرا ارغوانی..... رخساروں پر گوشت جیسے رہا ہی نہیں تھا' عجیب لمبوترا سا چہرہ ہو گیا تھا' اس کے خوبصورت لمبے بال جو اس نے پہلے خود ترشوا کر چھوٹے کر لئے تھے' اب گویا مزید تراش کر کچھ اور چھوٹے کر دیئے گئے تھے' بال بھی چہرے ہی کی طرح رنگ برنگے تھے اور سر پر تاروں کی طرح سیدھے کھڑے تھے' عجیب بات یہ تھی کہ یہ سب رنگ آتشیں قسم کے تھے' میمونہ کے پورے چہرے اور بالوں سے آگ سی نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

پھر خالد کو احساس ہوا کہ درحقیقت کمرے میں بھی اسی قسم کی رنگ برنگی روشنیاں چکرا رہی تھیں' ان روشنیوں کا منبع نہ جانے کہاں تھا لیکن انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے سٹیج کوئی ڈراؤنا قسم کا سین پیش کرنے کے لئے لائٹنگ کے خصوصی انتظامات کئے گئے ہوں فرق صرف یہ تھا کہ یہ کوئی سٹیج شو نہیں تھا' منظر مصنوعی طور پر تخلیق نہیں کیا گیا تھا اور پتہ نہیں چل رہا تھا کہ روشنیاں کہاں سے آ رہی تھیں۔

میمونہ درحقیقت لوہے کے ایک بیڈ پر نیم دراز تھی اور پلکیں جھپکائے بغیر ! خوفناک سی دکھائی دینے والی آنکھوں سے ایک ٹک کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی' اس - جسم پر دمکتا ہوا آتشیں سا ایک نارنجی لبادہ تھا' وہ بھی آگ ہی سے بنا ہوا معلوم ہوتا لیکن اس سے بستر وغیرہ میں آگ نہیں لگ رہی تھی' خالد کو خود حیرت تھی کہ اس - میمونہ کو کیسے پہچان لیا تھا؟ ورنہ اس کے چہرے میں تو اتنی خوفناک تبدیلیاں آ چکی تھیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق دکھائی دے رہی تھی اور وہ بھی انتہائی خوفناک..... خالد نے وا



پر دانت جما کر بمشکل خود پر قابو رکھا ورنہ شاید اس کے حلق سے چیخ نکل جاتی۔

وہ تو خاموش رہا لیکن میمونہ یکدم جنونی سے انداز میں اٹھ کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے عجیب کھرکھراتی سی خوفناک آواز میں تیزی سے بولی۔ "اب کیا لینے آئے ہو یہاں ذلیل..... کمینے انسان.....؟ تم میری بربادی کے ذمے دار ہو..... اور دیکھ لینا تمہارا انجام بھی اچھا نہیں ہو گا۔"

میمونہ کی آنکھیں تو پہلے ہی شعلہ بار تھیں' غضبناک لہجے میں یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ہی نہیں بلکہ گویا پورے چہرے پر آتش سا تاثر اور بڑھ گیا' رنگ برنگا ہونے کے باوجود اس کا پورا چہرہ دمکتا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا' خالد کے دل پر گھونسا سا لگا۔ یہ جہ' یہ انداز تخاطب' یہ آواز میمونہ کی تو نہیں تھی' اس کے اندر جیسے کوئی بدروح بول رہی تھی' کیا وہ اس سے اتنی بدگمان ہو چکی تھی؟ لیکن شاید اس کی یہ بدگمانی' یہ برہمی بجا تھی۔

ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں تاسف اور احساس زیاں کی لہر سی ابھری اور وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ سب کیا تھا؟ اس نے اپنے آپ کو کس گورکھ دھندے میں پھنسا لیا تھا؟ ان ساری باتوں کے لئے کیا واقعی وہ اکیلا خود ہی ذمے دار تھا یا اس میں حالات' اتفاقات اور تقدیر کا بھی کچھ دخل تھا؟ شاید بد نصیبی کی کوئی ہوا سی چلی تھی جس کی وہ لپیٹ میں آگیا تھا۔

میمونہ نے گویا غضبناک انداز میں اس کی طرف بڑھنا چاہا مگر وہ ایک جھٹکے سے بیڈ پر ر گئی تب خالد نے دیکھا کہ درحقیقت اس کے ہاتھ پاؤں لوہے کی زنجیروں اور ہتھکڑیوں کے ذریعے بیڈ کے چاروں پایوں سے بندھے ہوئے تھے' وہ زیادہ سے زیادہ صرف بیٹھ سکتی تھی' بیڈ سے اتر نہیں سکتی تھی ورنہ شاید وہ لپک کر کھڑکی پر آتی اور گرل سے دونوں ہاتھ نکال کر اس کا چہرہ نوچ لیتی یا پھر شاید اس سے بھی برا کوئی سلوک کرنے کی کوشش کرتی' بند کھڑکی سے بھی وہ اسے جتنا زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکتی' وہ پہنچا دیتی۔

تب ہی خالد نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے خوبصورت ہاتھ کسی چڑیل کے پنجوں سے مشابہ ہو چکے تھے' اس کی انگلیاں استخوانی اور لمبی لمبی سی ہو گئی تھیں اور ان کے سروں پر لمبے لمبے ناخن نکل آئے تھے' وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ دو تین راتوں میں اتنے انقلابات' اتنے تغیرات آ سکتے تھے' اسے لوہے کی زنجیروں سے بندھے دیکھ کر خالد کے دل ں تاسف کی لہر شدید ہو گئی مگر دوسرے ہی لمحے اس لہر پر جیسے کوئی اور لہر سی غالب آ گئی۔

وہ یکدم کچھ پرسکون اور بے خوف سا ہو گیا' گہری سانس لے کر اس نے جسم ڈھیلا وڑ دیا اور کچھ پرسکون انداز میں میمونہ کی طرف دیکھنے لگا' وہ اپنے آپ کو ایک ایسا ہی ں محسوس کر رہا تھا جس کی کوئی قریبی ہستی ڈاکٹروں کے زیر علاج تھی' وہ اسے انجکشن رہے تھے' اس کے زخم صاف کر رہے تھے' مریض تکلیف سے چیخ رہا تھا لیکن لواحقین کو

معلوم تھا کہ اس کی بھلائی کے لئے یہ ضروری تھا۔ علاج میں بھی اکثر کچھ نہ کچھ تکلیف تو برداشت کرنی ہی پڑتی ہے۔ خالد کے محسوسات یکدم کچھ اس قسم کے ہو گئے تھے۔

میمونہ اب بھی اپنے لمبے لمبے نوکیلے اور نیلے دانت نکوسے غضبناک نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی' اس کا دہانہ کسی بھیڑیئے کا سا دکھائی دے رہا تھا' باچھوں سے کچھ کف بہہ رہا تھا' خالد اسے تسلی دینے والے انداز میں دھیمی آواز میں بولا۔ "گھبراؤ مت میری جان! حوصلہ نہ ہارو...... سب ٹھیک ہو جائے گا' تمہارا علاج ہو رہا ہے۔"

"علاج کے بچے......! دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے...... دور ہو جاؤ میری نظروں سے...... میں تمہاری منحوس شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔" میمونہ ایک بار پھر اسی کھرکھراتی سی خوفناک آواز میں چلائی اور خالد کو پھر دھچکا لگا۔ ایک تو وہ میمونہ جیسی خوش آواز اور شیریں زباں عورت کے منہ سے ایسی آواز نکلنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا' دوسرے اس نے کبھی میمونہ کے منہ سے کوئی ناشائستہ لفظ بھی نہیں سنا تھا جبکہ اب اس کے منہ سے مغلظات کا سیلاب الڈ رہا تھا اور وہ بھی خالد کے لئے......!

خالد نے بدمزگی اور قدرے خوف کے سے عالم میں ادھر ادھر دیکھا ویسے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ بند کمرے سے محض اس چھوٹی سی کھڑکی سے میمونہ کی آواز زیادہ دور تک نہیں جا سکتی تھی پھر بھی بہرحال اس کرخت آواز کے سن لئے جانے کا خطرہ موجود تھا اور خالد چونکہ چھپ کر اندر آیا تھا' اس لئے خود کو چور چور سا بھی محسوس کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے ذرا سکون کی سانس لی کہ آس پاس کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

آخر وہ میمونہ کی نظروں' تاثرات اور اس کے پورے سراپا ہی کے نظارے کی تاب نہ لاتے ہوئے کھڑکی سے ہٹ گیا اور چوروں ہی کی طرح واپس چل دیا۔ اس کے اعصاب کو جو جھٹکا لگا تھا' وہ اس سے سنبھل تو گیا تھا لیکن اس کے وجود میں اندر ہی اندر ایک ہلچل اب بھی برپا تھی۔ ذہن کے کسی گوشے سے نسرین کی باتوں کی بازگشت بھی سنائی دے رہی تھی' میمونہ کی محبت بھی دل کے کسی نہاں خانے سے عود کر آ رہی تھی اور جمشید سے وفاداری کا تقاضا کرنے والی کوئی قوت بھی ذہن کے کسی گوشے میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی غرضیکہ وہ عجیب ہشت پہلو قسم کی کشمکش میں پھنسا ہوا تھا' ذہن کے کسی تاریک گوشے میں یہ احساس بھی موجود تھا کہ کچھ نہ کچھ غلط ہو رہا تھا بلکہ شاید بہت غلط ہو رہا تھا۔

وہ ریسپشنسٹ کی نظر بچا کر باہر آنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ اس وقت تک وہ کم از کم ایک فیصلے پر تو پہنچ ہی گیا تھا' اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ میمونہ کے پاس چھوڑنے کے لئے اپنی والدہ کو تو بلا ہی لے گا' اسے امید بلکہ خوش گمانی تھی کہ جب اس کی والدہ یہاں آئیں گی تو انہیں اس قدر محیر العقل یا خوفناک اور پراسرار واقعات اور مشاہدات سے



واسطہ نہیں پڑے گا اور کسی حد تک غیر معمولی باتوں کا سامنا کرنے کے لئے وہ انہیں ذہنی طور پر تیار بھی کر لے گا۔ نسرین کا مشورہ اس کے دل کو لگا تھا اس کی ساری ذہنی کشمکش اور حالات اپنی جگہ تھے لیکن ایک بات طے تھی کہ اسے آج میمونہ کو اس حالت میں' اس بند کمرے میں' اس طرح زنجیروں سے بندھے' بے یار و مددگار سی حالت میں پڑے دیکھنا اچھا نہیں لگا تھا۔

اس نے اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد قدرے اطمینان محسوس کیا لیکن ابھی اس کے دوسرے پہلوؤں پر غور کرنا باقی تھا۔

○

شمشیر علی' پجیرو میں بیٹھی عورت کو یوں بے باکی سے اپنی طرف دیکھتے اور مسکراتے پا کر ایک لمحے کے لئے شرما سا گیا گو کہ بھوک کی نقاہت نے اسے نڈھال کیا ہوا تھا' اس کے باوجود اسے اپنے رخسار اور کانوں کی لویں تپتی محسوس ہوئیں تاہم وہ عورت کے چہرے سے نظر نہ ہٹا سکا' وہ عمر میں اس سے کافی بڑی تھی لیکن بہرحال عورت تھی اور کافی خوبصورت تھی پھر عورت نے اشارے سے اسے قریب بلایا۔

شمشیر علی نے فٹ پاتھ سے اٹھنے سے پہلے احتیاطاً" ادھر ادھر دیکھ لیا کہ کہیں وہ خواہ مخواہ خوش فہمی کا شکار تو نہیں تھا' کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ عورت اس کے آس پاس موجود کسی اور شخص کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہو اور اسے ہی قریب بلا رہی ہو مگر اس کے آس پاس تو کیا' دور دور تک بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ اٹھا اور ہچکچاہٹ آمیز انداز میں پجیرو کے قریب جا پہنچا۔ عورت نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا تو ایئر کنڈیشنڈ پجیرو سے خوشبو کا ایک جھونکا سا باہر آ گیا۔

"کام کی تلاش میں ہو؟" عورت نے گویا اس کا چہرہ پڑھتے ہوئے کہا۔

"جی...... جی ہاں......" شمشیر نے تھوک نگل کر جواب دیا۔ اس کے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے' بھوک اور پیاس دونوں نے ہی برا حال کیا ہوا تھا' اسے احساس تھا کہ اگر وہ اتنا بھوکا اور پیاسا نہ ہوتا تو شاید کچھ اعتماد سے بات کر سکتا تھا۔

"اور کام نہیں ملا؟" عورت نے گویا محض رسماً" تصدیق چاہی۔ یہ بات اسے چہرے سے ہی معلوم ہو گئی تھی۔

"جی ہاں......" شمشیر علی نے اعتراف کیا۔

"کسی گاؤں سے آئے ہو" عورت نے ایک اور سوال کیا۔

"جی ہاں......" اس بار شمشیر نے ذرا سر جھکا کر اعتراف کیا۔ اس قسم کی عورت کے سامنے خود کو گاؤں کا نوجوان تسلیم کرتے ہوئے ایسے نہ جانے کیوں کچھ شرم سی محسوس

ہو رہی تھی۔

"میں تمہیں مستقل کام دلوا سکتی ہوں' کوئی بہت زیادہ محنت کا کام بھی نہیں ہے اور پیسے بھی بہت اچھے ملیں گے' بس یوں سمجھو کہ عیش کرو گے' پہلے کچھ عرصہ ٹریننگ لینی پڑے گی' اس کے دوران میں پیسے کچھ کم ملیں گے' اس کے بعد کافی پیسے اور کمیشن وغیرہ بھی ملے گا' اگر تم ذرا باصلاحیت ثابت ہوئے تو اور بھی عیش کرو گے' کیا خیال ہے؟"

عورت نہایت ٹھہرے لہجے میں بات کر رہی تھی اور اس کی مرمریں انگلیاں اسٹیئرنگ وہیل پر رقصاں تھیں۔

شمشیر علی کے جسم میں زندگی کی لہر عود کر آئی' امید کے ایک تازہ جھونکے نے اس کی مضمحل روح کو سہارا دیا' اسے اپنے لاشعور میں جس معجزے کا انتظار تھا' شاید وہ رونما ہونے کو تھا۔ اس نے اب کچھ سنبھل کر ذرا دلچسپی سے پوچھا۔ "مجھے کام کیا کرنا ہو گا؟"

"اب ساری باتیں سڑک پر ہی کھڑے ہو کر تو طے نہیں ہو سکتیں نا۔" عورت مسکراتے ہوئے بولی۔ "گاڑی میں بیٹھو اور میرے ساتھ گھر چلو' میرے گھر پر اس وقت ایک صاحب آئے ہوئے ہیں اور میرے انتظار میں بیٹھے ہیں' میں تمہیں ان سے ملواؤں گی دراصل تمہیں انہی کے لئے کام کرنا پڑے گا' وہی تمہیں سب کچھ بتائیں گے' وہی تم سے معاملات طے کریں گے' اگر تم راضی ہو گئے تو وہی تمہارے لئے ٹریننگ وغیرہ کا بندوبست کریں گے' بہت اچھے آدمی ہیں' اپنے کاروبار کو پھیلانے کے لئے انہیں تم جیسے نوجوان کی ضرورت رہتی ہے' میں تو صرف ان کی دوستی میں اور تمہاری ہمدردی میں تم دونوں کی ملاقات کا ذریعہ بن رہی ہوں' تمہیں اس طرح سڑک کے کنارے نڈھال اور پریشان حال بیٹھے دیکھ کر مجھے تم پر ترس آ گیا' مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تمہارے حالات کیا ہوں گے' تمہاری کہانی تمہارے چہرے پر لکھی ہے بہرحال..... پھر بھی ذرا واضح طریقے سے تمہاری داستان گھر بیٹھ کر سن لیں گے۔"

پھر اس نے پیچھے ہاتھ لے جا کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور شمشیر علی کو اشارہ کیا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

شمشیر علی ہچکچاہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پجیرو میں چڑھ کر بیٹھ گیا اور ایک لمحے کے لئے اسے شبہ ہوا کہ شاید یہ کوئی خواب تھا جو اس کے ذہن کے اندھیرے کونے میں چھپی ہوئی خواہشیں اسے دکھا رہی تھیں۔ اس نے پجیرو کو زندگی میں بارہا دیکھا تھا' ایک آدھ مرتبہ نہایت قریب سے بھی دیکھا تھا لیکن یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اسے اس میں بیٹھنے کا موقع بھی نصیب ہو گا۔ دروازہ اور پھر کھڑکی کا شیشہ بند ہو گیا اور ایک چلتا پھرتا راحت کدہ گویا اسے اپنی آغوش میں لے کر روانہ ہو گیا' شیشے تاریک ہونے کے باوجود اندر سے وہ نہایت آسانی سے گردوپیش کا نظارہ کر سکتا تھا۔



عورت کے وجود کی خوابناک خوشبو اب اس کے حواس پر چھا رہی تھی لیکن اس کے ساتھ اپنی مفلوک الحالی کا احساس کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا' ایئر کنڈیشنڈ اور بند گاڑی میں اسے خود اپنے بدن سے اٹھتی ہوئی پسینے کی بو آنے لگی تھی' یہ رائیگاں مشقت کا پسینہ تھا' اسے اپنے آپ پر شرم آنے لگی' بڑی خدا ترس اور نیک دل عورت تھی جس نے اسے گاڑی میں اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا' اس کی حالت اس قابل تو نہیں تھی کہ وہ اس جیسی عورت کے ساتھ بیٹھتا۔ شاید قدرت کو اس پر ترس آ گیا تھا' اس کے دن بھی پلٹنے والے تھے' یونہی تو بہانے بنتے ہیں جب کسی کے کام سنورنے ہوتے ہیں تو راہ چلتے سہارے میسر آنے لگتے ہیں۔

شمشیر علی یہ سب کچھ سوچے جا رہا تھا اور کبھی سڑک کے ایک طرف اور کبھی دوسری طرف سے گزرتے عالی شان مکانوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ ہر مکان' ہر بنگلہ' ہر کوٹھی اپنی جگہ کوئی انفرادیت لئے ہوئے تھی اور ایک دوسرے سے زیادہ شاندار لگ رہی تھی' یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون سا بنگلہ کس سے زیادہ شاندار تھا۔ شمشیر علی نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک ہی علاقے میں اتنے شاندار بنگلے ہو سکتے تھے۔ اتنا اسے اندازہ تھا کہ گاڑی ابھی ایک ہی علاقے سے گزرتی جا رہی تھی لیکن اسے یہ اندازہ نہیں رہا تھا کہ علاقہ اتنا بڑا بھی ہو سکتا تھا۔

آخر کار پجیرو ایک ایسی بلند و بالا سی دیوار کے سامنے جا رکی جو پہلی نظر میں شمشیر علی کو کسی قلعے کی دیوار محسوس ہوئی۔ یہ کنکریٹ کی دیوار معلوم ہوتی تھی اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اس کے عقب میں کوئی بنگلہ بھی موجود تھا مگر دیوار میں بہرحال ایک اونچا اور مضبوط آہنی گیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ عورت نے ہارن بجایا' گیٹ میں چھوٹی سی ایک کھڑکی کھلی اور بڑی بڑی مونچھوں والے ایک پہرے دار نے باہر جھانکا' اس کے سر پر سپاہیوں جیسی ٹوپی تھی مگر اس کا رنگ سرخ تھا۔

دوسرے ہی لمحے گیٹ گویا خود بخود کھل گیا اور پجیرو اندر جا پہنچی۔ تب شمشیر علی نے دیکھا کہ گیٹ کے عقب میں ایک نہیں' لال ٹوپیوں والے دو لمبے تڑنگے آدمی موجود تھے' ان کے کندھوں پر کلاشنکوفیں لٹکی ہوئی تھیں۔ گیٹ جتنی تیزی سے کھلا تھا' اتنی ہی تیزی سے بند ہو گیا اور وہ گویا باہر کی دنیا سے کسی حد تک کٹ گئے۔ اندر ایک طویل و عریض بنگلہ ایک الگ تھلگ چھوٹی سی دنیا کی طرح پھیلا ہوا' سرسبز' خوبصورت لان اور اس کے پیچھے خوبصورت عمارت.....

عورت کی رہنمائی میں شمشیر علی بنگلے میں داخل ہوا تو اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ عورت ساتھ نہ ہوتی تو اس کی تو شاید یہ بھی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کدھر سے اندر داخل ہو۔ وہ ایک طویل و عریض اور نہایت شاندار آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم

میں داخل ہوا۔ شمشیر علی نے جلدی سے اپنے خستہ حال جوتے دروازے پر ہی اتار دیئے جس کے بعد اسے اپنے پاؤں دبیز قالین میں دھنستے محسوس ہوئے' ہر قدم پر وہ جھجکا جا رہا تھا مگر عورت اسے مسلسل آگے آنے کا اشارہ کئے جا رہی تھی۔

ڈرائنگ روم میں ایک شخص شاندار صوفے پر نیم دراز تھا' پاؤں اس نے جوتوں سمیت نہایت بے تکلفی سے تپائی پر ٹکائے ہوئے تھے' سامنے کی دیوار میں ٹی وی' ڈیک اور نہ جانے کیا کچھ نصب تھا' وہ شخص ٹی وی دیکھ رہا تھا' انہیں دیکھ کر اس نے ریموٹ سے ٹی وی بند کر دیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے نوجوان تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن وہ کچھ ایسا بڑی عمر کا بھی نہیں تھا۔ وہ اک پختہ عمر' وجیہہ اور دراز قد شخص تھا' جس کا پیٹ تھوڑا سا باہر آ گیا تھا مگر مجموعی طور پر وہ اب بھی دلکش شخصیت کا مالک تھا تاہم تمام تر وجاہت کے باوجود اس کے چہرے پر ایک عجیب سا پتھریلا پن تھا' اس کا چہرہ جیسے کسی پتھر کو تراش کر بنایا گیا تھا اور اس کی بلوری آنکھوں میں زندگی کی گرمجوشی نہیں' ایک عجیب سا خالی پن تھا جیسے وہ آنکھیں اصلی نہ ہوں' شیشے کی بنی ہوئی ہوں مگر جب اس نے گہری نظر سے شمشیر علی کی طرف دیکھا تو نہ جانے کیوں اسے ہلکی سی جھرجھری آ گئی۔

اس نے صرف ایک لمحے کے لئے شمشیر علی کا جائزہ لیا اور اس ایک لمحے میں جیسے سب کچھ دیکھ لیا' سب کچھ پڑھ لیا' فوراً" ہی وہ عورت کی طرف متوجہ ہو گیا اور اپنے لہجے میں بیک وقت محبت اور شکوے کی آمیزش لئے بولا۔ "بہت انتظار کرایا تم نے..... کیا تم ہمیشہ ایسی ہی ظالم اور سفاک رہو گی؟"

عورت نے اپنی سڈول کلائی پر بندھی خوبصورت گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور بولی۔ "موبائل فون پر تمہارا پیغام ملنے کے ٹھیک گیارہ منٹ بعد میں گھر پہنچ گئی ہوں' یہ کوئی اتنا طویل وقت تو نہیں' میں تو کہیں اور جا رہی تھی' تمہارا پیغام ملتے ہی واپس آئی ہوں' تم ہمیشہ اسی طرح اچانک نازل ہوتے ہو' کیا گھر سے نکلتے وقت تم مجھے اطلاع نہیں دے سکتے تھے کہ تم آ رہے ہو' تب شاید میں گھر سے ہی نہ نکلتی۔"

مرد عجیب سے انداز میں ہنسا۔ اس کی ہنسی تقریباً" بے آواز تھی۔ "میں بھی کہیں اور جا رہا تھا لیکن تمہارے گھر کے قریب سے گزرا تو گاڑی کا سٹیئرنگ وہیل خود بخود اس طرف مڑ جاتا ہے۔"

"باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔" عورت کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ ایک صوفے پر ڈھیر ہو گئی' اس نے شمشیر علی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا' وہ نیچے قالین پر ہی بیٹھنے لگا مگر عورت جلدی سے بولی۔ "نہیں..... نہیں..... اوپر صوفے پر بیٹھو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بیٹھ چکا تو مرد نے عورت کی بات کا جواب دیا۔ "ہم تو صرف باتیں ہی بناتے رہ گئے..... لوگوں نے تمہیں کیا سے کیا بنا دیا۔" اس کے لہجے میں حسرت



سی تھی۔

"تم چاہو تو یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ میں نے لوگوں کو کیا سے کیا بنا دیا۔" عورت دلکشی سے مسکرائی پھر گویا اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے شمشیر کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے لئے ایک نیا رنگروٹ لائی ہوں۔"

"میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔" وہ شخص کن انکھیوں سے شمشیر کی طرف دیکھ کر بولا۔

"میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ بہت اچھا ثابت ہو گا۔" عورت بولی۔

"تمہاری پیش گوئی کبھی غلط نہیں ہوتی' تمہاری نظر جوہر شناس ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ رنگروٹوں پر محنت بہت ہوتی ہے۔"

"اچھے نتائج حاصل کرنے کے لئے محنت تو کرنا ہی پڑتی ہے۔" عورت سنجیدگی سے بولی۔ "ہماری تو اب لائن تم سے الگ ہو چکی ہے اور ہم بہت آگے نکل گئے ہیں ورنہ اسے میں ہی رکھ لیتی' اسے ہمارے کام کا بننے میں تو بہت عرصہ لگ جائے گا لیکن تمہارے کام کا یہ بہت جلدی بن جائے گا' آج کل تمہیں نئے آدمیوں کی ضرورت بھی ہے۔"

"ہاں....." مراد نے سر ہلایا۔ "پرانے تو زیادہ تر خود باس بنتے جا رہے ہیں' بعض ساتھ چھوڑ گئے ہیں' بعض دنیا چھوڑ گئے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کے حواس ان کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں' کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ ان کو....." وہ غصے سے کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ صرف ایک لمحے کے لئے اس کے پتھریلے سے چہرے پر تاثرات ابھرے تھے مگر فوراً" ہی غائب ہو گئے اور وہ پہلے ہی کی طرح مشینی انداز میں مسکرانے لگا تھا۔

عورت شمشیر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ "سب سے پہلے تم کھانا کھا لو' تم کم از کم دو وقت کے بھوکے دکھائی دے رہے ہو' پیٹ خالی ہو تو کوئی عقل کی بات بھی انسان کی سمجھ میں نہیں آتی' پہلے ہم تینوں کھانا کھاتے ہیں پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

شمشیر نے نہ تو اس کے اندازے کی تردید کی اور نہ ہی اس کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا۔ بھوک سے اب اسے چکر آ رہے تھے' عورت نے اس کے دل کی بات کر دی تھی۔

عورت نے تپائی پر سے ریموٹ کنٹرول سے مشابہہ چھوٹی سی ایک ڈبیا اٹھائی اور اس کا بٹن دبایا' کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی مگر چند سیکنڈ بعد ہی ایک ملازم چراغ کے جن کی طرح دروازے پر آن موجود ہوا۔

○

"کھانا لگاؤ......" عورت نے ملازم کو اشارہ کیا' ملازم سعادت مندی سے سر ہلا کر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم سے ملحق ہی بڑا سا ڈرائنگ روم تھا' بیچ میں ایک بہت بڑا محرابی دروازہ تھا۔ شمشیر نے دیکھا چند لمحے بعد ہی وہاں ایک لمبی سی میز پر طرح طرح کے برتن وغیرہ سجائے جانے لگے' میز کے گرد بہت سی کرسیاں تھیں' کچھ دیر بعد کھانوں کی خوشبوئیں آنے لگیں۔ کچن' شمشیر کی نظر سے اوجھل تھا لیکن وہ بار بار ایک طرف سے دو ملازموں اور ایک ملازمہ کو کھانے کی میز تک آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔

عورت اور مرد باری باری کبھی کبھار اچٹتی سی نظر شمشیر پر ڈال لیتے تھے ورنہ زیادہ تر وہ ایک دوسرے ہی کی طرف دیکھے جا رہے تھے' بظاہر وہ زیادہ باتیں نہیں کر رہے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرنے میں ماہر تھے۔ شمشیر کبھی محسوس کرتا کہ ان کے درمیان کوئی بہت قریبی رشتہ تھا جسے شاید کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا اور کبھی وہ محسوس کرتا کہ ان کے درمیان کوئی خلیج یا شاید کوئی دیوار بھی حائل تھی' اگر کوئی اسے اس بارے میں پوچھتا تو وہ اپنے احساس کو بیان نہیں کر سکتا تھا' اس کی وضاحت نہیں کر سکتا تھا لیکن ایسی باتوں کو بھی وہ کم از کم محسوس ضرور کر سکتا تھا' وہ دیہاتی ضرور تھا لیکن بے وقوف نہیں تھا' وہ ایک ذہین اور حساس نوجوان تھا' اگر اس کی قسمت میں تعلیم یا اچھا ماحول ہوتا تو شاید وہ بہت مختلف حال میں ہوتا۔

عورت کا شولڈر بیگ اس کے قریب ہی صوفے پر رکھا ہوا تھا' دفعتاً اس میں عجیب سی آواز گونجی جیسے کوئی مینڈک ایک خاص انداز میں ٹرایا ہو' عورت نے جلدی سے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک موبائل فون نکالا' اس کی گھنٹی بج رہی تھی' بٹن دبا کر اس نے فون کان سے لگایا۔ چند لمحے وہ بات کرتی رہی لیکن اس کی گفتگو کا سر پیر شمشیر کی سمجھ میں نہ آیا آخر اس نے فون بند کر کے تپائی پر رکھ دیا' اس کے چہرے پر خوشی جھلک آئی تھی۔

"مجھے مبارک باد دو قیصر ڈیئر......!" عورت' مرد سے مخاطب ہوئی۔ "ہمارا مال بھٹھرو ایئرپورٹ سے خیر و عافیت سے نکل گیا ہے' بہت بڑی کھیپ تھی' یہ انگریز اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتے ہیں مگر ہم ان کے بھی استاد ہیں۔"

"بے شک......" قیصر دھیرے سے ہنسا۔ "انگریزوں نے تو دھوکے سے ہمارے آباؤ



اجداد کے ملک پر قبضہ کر لیا تھا اور اسی طرح کھینچ تان کر دو سو سال ہم پہ حکمرانی کر گئے ورنہ ہم تو ہر میدان میں انہیں ناکوں چنے چبوا دیں۔"

"ہاں...... خاص طور پر راتوں رات کروڑ پتی بننے کے فنون تو انہیں ہم سے سیکھنے چاہئیں۔" عورت بھی ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولی۔

مرد نے کن انکھیوں سے ایک نظر شمشیر کی طرف دیکھا اور عورت سے گفتگو جاری رکھی۔ "میں فون پر تمہارا پہلا جملہ سن کر ہی سمجھ گیا تھا کہ کیا خبر آئی ہے' تمہاری پلاننگ نے سیٹھ قاسم کو کیا سے کیا بنا دیا ہے شہ پارہ!"

شہ پارہ دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "وہ خود بھی کچھ کم نہیں ہے۔"

"لیکن تم دونوں مل کر تو دو آتشہ ہو گئے ہو۔" قیصر بولا۔

"اور کبھی کبھی جب ہمیں تمہارے تعاون کی ضرورت پڑتی ہے اور تم تعاون کرنے پر تیار ہو جاتے ہو تو ہم سہ آتشہ ہو جاتے ہیں۔" عورت بولی۔

دفعتاً ایک بار پھر ٹراہٹ کی سی آواز ابھری لیکن یہ پہلی آواز سے کچھ مختلف تھی اور یہ عورت کے فون سے نہیں بلکہ قیصر کی قمیض کی جیب سے ابھری تھی' اس کی جیب سے بھی ایک موبائل فون جھانک رہا تھا' اس نے اسے جیب سے نکال کر پہلے اس کی چھوٹی سی روشن سکرین پر نمبر دیکھا پھر بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا' اس نے صرف "ہوں...... ہوں" کرنے پر اکتفا کیا پھر چند سیکنڈ بعد "ویری گڈ" کہہ کر فون بند کر دیا۔

شہ پارہ بغور اس کے چہرے کا مشاہدہ کر رہی تھی گویا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو کہ دوسری طرف سے کیا کہا گیا تھا۔ قیصر کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی' وہ اپنی اصل کیفیات چھپائے رکھنے میں شہ پارہ سے زیادہ ماہر معلوم ہوتا تھا تاہم شہ پارہ اندازہ ظاہر کئے بغیر نہ رہی۔

"میرا خیال ہے تمہارے لئے بھی خوشی کی خبر آئی ہے؟" وہ بولی۔

"ہاں......" قیصر نے اب مسکراتے ہوئے اعتراف کیا۔ "لڑکوں نے رات ہمارے لئے جو خطرہ کھڑا کر دیا تھا' وہ ٹل گیا ہے' کچھ خرچہ تو ہو گیا ہے لیکن کام بہرحال آسانی سے ہو گیا۔"

"مبارک ہو......" شہ پارہ مسکرائی۔ "یہ تو بہت بڑا مسئلہ حل ہوا ہے' تم تو کافی خطرہ محسوس کر رہے تھے۔"

"ہاں...... اصل میں زیادہ خطرہ علاقے کے نئے ایس پی کی طرف سے تھا' وہ ابھی میرے قابو میں نہیں آیا ہے' لگتا ہے اس کے لئے بھی آخر کار مجھے تمہاری ہی خدمات مول لینا پڑیں گی۔" قیصر بولا۔

شہ پارہ نے مسرور انداز میں ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ "پہلے تم اپنی سی کوشش کر

لو' کام نہ بنے تو مجھے بتانا۔"

"یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔" قیصر مسکرایا۔ "تمہیں معلوم ہی ہے جہاں کام اٹکتا ہے' وہاں قیصر تمہاری ہی خدمت میں حاضری دیتا ہے۔"

پھر اس نے ایک نظر شمشیر کی طرف دیکھا اور شہ پارہ ہی سے بات جاری رکھی۔ "لگتا ہے اس نوجوان کے قدم بڑے مبارک ہیں جسے تم اپنے ساتھ لائی ہو' اس کے آتے ہی ہمیں ایک ساتھ دو بڑی خوشخبریاں سننے کو ملی ہیں۔"

اس بات پر شمشیر افسردگی سے دل ہی دل میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ تو آج تک خود اپنے لئے خوش بخت ثابت نہیں ہو سکا' کسی دوسرے کے لئے کیسے خوش بخت ثابت ہو سکتا تھا؟ لیکن پھر اس نے خود کو یہی سمجھایا کہ اگر وہ شخص خود بخود ہی اسے خوش بخت سمجھنے پر تیار تھا تو اس میں اس کا کیا نقصان تھا؟

شہ پارہ اپنے خوبصورت بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "میں نے آج تک تمہارے لئے جو کچھ بھی کیا ہے' وہ تمہارے حق میں اچھا ہی ثابت ہوا ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔" قیصر نے بلا تامل تسلیم کیا۔

اس اثناء میں ملازم نے محرابی دروازے پر آکر اطلاع دی کہ کھانا لگ گیا تھا' وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور شہ پارہ نے شمشیر علی کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ شمشیر اب بھی اس حقیقت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ اس قسم کی میز' کرسیوں پر' اس قسم کے گھر میں' اس قسم کے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتا تھا لیکن انہوں نے اصرار کر کے اور اس کی ہمت افزائی کر کے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ میز پر کئی اقسام کے کھانے موجود تھے۔ ان کی خوشبوؤں سے شمشیر پر نشہ سا طاری ہونے لگا۔

کھانے کے دوران میں قیصر نے اس سے دھیرے دھیرے اس کے بارے میں پوچھنا شروع کیا اور شمشیر بلا کم و کاست سب کچھ بتاتا چلا گیا' کھانے کے بعد جب چائے وغیرہ کا دور بھی چل چکا تو شمشیر کو احساس ہوا کہ وہ انہیں اس آدھے پونے گھنٹے میں ہی اختصار سے اپنی پوری داستان حیات سنا چکا تھا جس میں اس کی بہن شاہدہ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ..... اس کی وجہ سے ان کی نقل مکانی اور تازہ ترین حالات بھی شامل تھے۔

قیصر اور شہ پارہ نے نہایت ہی انہماک سے اس کی ہر بات سنی تھی اور کئی موقعوں پر معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ شمشیر خاموش ہوا تو کمرے میں چند لمحے گہرا سکوت رہا آخر قیصر گہری سانس لے کر بولا۔ "زندگی نے تمہارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا' شمشیر ڈیئر! بہرحال..... تم چاہو تو ان نا انصافیوں کی تلافی ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیسے.....؟" شمشیر نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ اور محنت و جانفشانی سے کام کرو' جتنی محنت کرو گے'



اتنی ہی تیزی سے ترقی کرو گے۔" قیصر بولا۔

شمشیر نے تمام تر تکلف اور ہچکچاہٹ کے باوجود ڈٹ کر کھانا کھایا تھا' اس نے یہی سوچا تھا کہ زندگی میں پھر نہ جانے ایسے ماحول میں بیٹھ کر اتنی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے یا نہ ملے' اس لئے اس نے رسماً "نہیں نہیں" کہتے کہتے بھی تقریباً ہر چیز پر ہاتھ صاف کر ڈالا تھا اور اب اس پر ایک خمار سا طاری تھا' اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آرام دہ صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر سو جائے اور تمام تفکرات کے بادل چھٹ جانے پر ہی اٹھے' گرم گرم چائے نے اسے آنکھیں کھلی اور ذہن حاضر رکھنے میں مدد دی تھی۔

"میں تیار ہوں..... مجھے کیا کرنا ہو گا؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بتا دیں گے' ایسی جلدی کیا ہے اور مجھے امید ہے تم تیار ہو جاؤ گے' تم جب غور کرو گے تو تمہیں اندازہ ہو گا کہ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی چارہ نہیں۔" قیصر نے بڑے اعتماد سے کہا پھر اس نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر ان میں سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ اس کے سامنے رکھ دیئے۔

"فی الحال یہ پانچ ہزار روپے تو رکھو' یہ تمہاری فوری ضروریات اور فوری مسائل کے لئے ہیں' جب تم ہمارے لئے کام شروع کرو گے تو تمہیں کم از کم مالی پریشانی کوئی نہیں ہو گی۔"

شمشیر نے حیرت سے نوٹوں کی طرف دیکھا۔ اس نے تو کبھی پورا مہینہ کام کر کے بھی اتنے پیسے کمانے کے بارے میں سوچا نہیں تھا' چہ جائیکہ اسے کام شروع کرنے سے پہلے ہی یہ رقم مل رہی تھی' وہ اپنے ہاتھ کو نوٹوں کی طرف بڑھنے سے بمشکل باز رکھتے ہوئے بولا۔ "کام تو آپ نے بتایا ہی نہیں..... ہو سکتا ہے وہ کام نہ کر سکوں' کوئی بات طے ہوئے بغیر آپ مجھے ایڈوانس نہ دیں تو اچھا ہے' میں ضرورت مند آدمی ہوں' مجھ سے خرچ ہو جائیں گے۔"

قیصر ہنس کر بولا۔ "بے فکر رہو..... ہم تم سے واپس نہیں مانگیں گے' تم کام کرو یا نہ کرو' یہ رقم تمہاری ہوئی' کام تو دنیا میں چلتے ہی رہتے ہیں' انسانیت کے ناطے بھی تمہارا ہم پر کچھ حق بنتا ہے۔" اس نے خود ہی نوٹ اٹھا کر شمشیر کی جیب میں ڈال دیئے' ممنونیت سے شمشیر کی آنکھوں میں نمی جھلملانے لگی۔ سہ پارہ خاموشی سے سامنے بیٹھی ان کی طرف دیکھ رہی تھی' اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

قیصر اٹھتے ہوئے شمشیر سے مخاطب ہوا۔ "آؤ اب میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں' میں تمہارا گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

شمشیر کو اسے اپنے ساتھ گوٹھ لے جانے کے تصور سے شرم محسوس ہوئی لیکن مجبوری تھی۔ قیصر کے فیصلہ کن لہجے سے ظاہر تھا کہ اس کے خیال میں شمشیر کا گھر دیکھنا

بہت ضروری تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا' وہ عورت کا شکریہ ادا کرنا نہیں بھولا' اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ فرط ممنونیت سے عورت کے پاؤں چھو لے لیکن اس نے صرف ہاتھ جوڑ کر شکریہ ادا کرنے پر اکتفا کیا۔

شہ پارہ بھی ان کے ساتھ ساتھ اٹھ کر باہر آتے ہوئے قیصر سے مخاطب ہوئی۔ "تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم نے مجھے موبائل پر فون کر کے راستے میں سے کیوں بلایا تھا؟"

"میں نے تم سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم راستے سے میرے لئے آدمی لے آنا۔" قیصر مسکرایا۔ "چنانچہ یوں سمجھو کہ اب وہ بات بعد میں ہو گی' پہلے یہ کام نمٹا لیا جائے' ویسے بھی فی الحال تو سیٹھ قاسم جرمنی میں بیٹھا ہے' چند دن کی تو بے فکری ہے' میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔" اس کی مسکراہٹ میں ایک خاص معنی خیز سا رنگ جھلک آیا۔

شہ پارہ کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا' وہ ایک ٹک قیصر کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔ "لیکن جب بھی آؤ' فون کئے بغیر نہ آنا۔"

"بہت بہتر میڈم.....!" قیصر نے اسے سیلوٹ کیا اور برآمدے سے نکل کر ڈرائیو وے میں آ گیا جہاں اس کی گاڑی موجود تھی۔ شہ پارہ وہیں کھڑی رہی اور قیصر شمشیر کو اپنے ساتھ بٹھا کر روانہ ہو گیا۔

قیصر نے جب اپنے گوٹھ میں پہنچ کر گاڑی گلی کے قریب رکوائی تو اس کا خیال تھا کہ قیصر کو یہ دیکھ کر مایوسی ہو گی کہ جسے وہ غالباً" اپنی کمپنی یا فیکٹری میں ملازم رکھنے والا تھا' وہ شہر سے اتنی دور ایسی اجاڑ بیابان اور غربت زدہ بستی میں رہتا تھا' جہاں تقریباً" ہر وقت ہی خاک سی اڑتی محسوس ہوتی تھی مگر وہ اس وقت حیران رہ گیا جب قیصر نے گاڑی سے اترنے کے بعد گہری نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد ستائشی انداز میں بولا۔ "یہ تو بہت اچھی جگہ ہے' ایسی جگہوں کی تو ہمیں تلاش رہتی ہے' اگر تم نے ہمارے لئے کام شروع کر دیا پھر خواہ تمہارے مالی حالات اچھے بھی ہو جائیں' تب بھی تم اس وقت تک یہیں رہنا' جب تک میں تمہیں کہیں اور جانے کا مشورہ نہ دوں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" شمشیر کچھ حیرت اور مایوسی سے بولا۔ "ہم تو یہاں مجبوراً" رہ رہے ہیں اور جس کے گھر میں رہ رہے ہیں' وہ اور اس کی بیوی بچے وغیرہ انتظار کر رہے ہیں کہ ہم کب ان کی جان چھوڑتے ہیں۔"

"ان کی جان تم بے شک چھوڑ دو۔" قیصر بولا۔ "لیکن فی الحال کوئی کرائے کا مکان تلاش کر لو اور اس میں منتقل ہو جاؤ۔"

"کرائے کا ملنا تو مشکل ہے۔" شمشیر بولا۔ "یہاں زیادہ تر لوگوں کے ذاتی مکان ہیں جو انہوں نے خود اپنے رہنے کے لئے کھینچ تان کر بنائے ہیں البتہ کبھی کبھار کوئی کہیں اور جگہ منتقل ہوتا ہے یا اپنے اصل گوٹھ واپس جاتا ہے تو مکان بیچ جاتا ہے۔"



"ٹھیک ہے..... ضرورت پڑی تو ایسا ہی کوئی مکان تمہارے لئے خرید لیں گے یا یہیں کوئی پلاٹ لے کر بنوا لیں گے' ایسے مکانوں پر کون سا زیادہ خرچہ آتا ہے' بعد میں حساب کتاب ہوتا رہے گا۔" قیصر بے پروائی سے بولا پھر اس کی فرمائش پر شمشیر نے اشارے سے اسے اپنا گھر دکھایا اور وہ اس کے ساتھ آئندہ ملاقات کا پروگرام طے کر کے اسے حیران پریشان سا چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔

○

سرجن جمال اور ڈاکٹر عثمانی کئی گھنٹوں کی بے کار مشقت کے بعد گھر واپس آئے تو مٹی اور پسینے میں لتھڑے ہوئے تھے' قبرستان میں قبر کھودنا' اس دوران میں انسپکٹر اور دو سپاہیوں کا ان کے سر پر آ کھڑے ہونا اور پھر قبر کو پاٹنا ان کے لئے اعصاب شکن تجربہ رہا تھا لیکن یہی غنیمت تھا کہ انسپکٹر نے نہ صرف ان کی جان چھوڑ دی تھی بلکہ انہیں پوسٹ مارٹم کے لئے لاش تلاش کرنے کے سلسلے میں مزید کوشش کی بھی اجازت دے دی تھی۔

واپس آتے وقت راستے میں تحسین نے جمال صاحب کو بتایا تھا کہ انسپکٹر کا نام ولی محمد تھا اور گو کہ وہ ایک روایتی پولیس آفیسر تھا لیکن دل کا برا نہیں تھا' اس کی سروس کا بیشتر حصہ انہی علاقوں میں گزرا تھا' بیشتر لوگوں کو وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا اور ان کی بہتری کا خیال بھی رکھنے کی کوشش کرتا تھا' خرابی بس یہی تھی کہ دیہات کے روایتی پولیس آفیسرز کی طرح وہ بھی علاقے کے بڑے زمیندار نیاز علی کے زیر اثر تھا اور کبھی کبھی اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے چکر میں کوئی غلط کام بھی کر جاتا تھا۔

وہ دونوں اس کے بارے میں اور اپنے مقصد میں ناکامی کے سلسلے میں باتیں کرتے ہوئے گھر پہنچے تو تھکن سے چور تھے' چپکے چپکے انہوں نے ہاتھ منہ وغیرہ دھو کر کپڑے بدلے' اپنا حلیہ درست کیا اور کچھ دیر سونے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ان پر انکشاف ہوا وہ تو خواہ مخواہ ہی اتنی احتیاط کر رہے تھے اور رازداری برتنے کی کوشش کر رہے تھے' ان کا مقصد تھا کہ آسیہ اور سارہ نیند سے بیدار نہ ہوں اور یہ نہ پوچھیں کہ رات کے پچھلے پہر ہ کیا کرتے پھر رہے تھے لیکن تحسین نے جب اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر نہایت محتاط نداز میں اندر جھانکا تو اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"انکل.....!" وہ گھبرائے ہوئے انداز میں جمال صاحب کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ سارہ اور آسیہ تو کمرے میں موجود ہی نہیں ہیں۔"

جمال صاحب بھی یہ سن کر پریشان ہو گئے' انہوں نے خود آگے بڑھ کر کمرے میں مانکا۔ اس وقت زیرو کے بلب کی روشنی میں بھی کمرہ منور دکھائی دے رہا تھا اور صاف نظر رہا تھا کہ ڈبل بیڈ اور کمرے میں پڑا ہوا ایک چھوٹا سا فاضل بیڈ دونوں ہی خالی دکھائی

دے رہے تھے تب انہیں احساس ہوا کہ گھر میں غیر معمولی سکوت پھیلا ہوا تھا' یہ سکوت احساس دلا رہا تھا کہ سارہ اور آسیہ گھر کے کسی اور حصے میں بھی موجود نہیں تھیں۔ ان کا دل بھی دھک سے رہ گیا' کہیں ان کی عدم موجودگی میں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا تھا؟ وہ گھر سے غائب بھی تو بہت دیر رہے تھے۔

بہرحال ایک موہوم سی امید کے سہارے انہوں نے پورا گھر چھان مارا لیکن سارہ یا آسیہ دونوں میں سے کوئی بھی انہیں کہیں دکھائی نہ دیں۔ یہ ایک نئی پریشانی تھی جس سے ان کے دل ہولنے لگے۔ ابھی وہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ دونوں لڑکیوں کی تلاش کی سلسلے میں ان کا اگلا قدم کیا ہونا چاہیئے کہ کال بیل بج اٹھی ایسا لگتا تھا کہ کسی نے بے تابانہ انداز میں کئی سیکنڈ کے لئے بٹن دبا ڈالا تھا۔

تحسین نے جونہی آگے بڑھ کر بولٹ گرایا اور تالا کھولا' سارہ گرتی پڑتی اندر آئی' اگر جمال صاحب نے فوراً" بانہوں میں نہ تھام لیا ہوتا تو شاید وہ اس صحن میں ہی ڈھیر ہو جاتی' جو پورچ کا کام بھی دیتا تھا۔ تحسین نے اس امید پر باہر جھانکا کہ شاید آسیہ بھی اس کے پیچھے آ رہی ہو لیکن اسے دور دور تک کوئی اور دکھائی نہ دیا۔ گیٹ مقفل کر کے وہ پلٹا۔ جمال صاحب فوری طور پر سارہ سے کچھ پوچھنے کے بجائے اسے سہارا دے کر ڈرائنگ روم میں لے گئے' اسے صوفے پر بٹھایا اور تحسین کو فریج سے ٹھنڈا پانی لانے کی ہدایت کی۔

سارہ نے پانی پیا جس کے بعد جمال صاحب اس کے برابر بیٹھے رہے کچھ دیر تک اس کا کندھا تھپکتے رہے' اسے بچوں کی طرح چمکارتے رہے اور دلاسا دیتے رہے۔ سارہ کی حالت واقعی ایک ایسے بچے کی سی تھی جس نے بہت ہی بھیانک خواب دیکھ لیا تھا' اس کے ہاتھ سرد تھے' آنکھیں وحشت زدہ انداز میں پھیلی ہوئی تھیں اور چہرہ کچھ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے اس کے جسم سے خون کی آخری بوند بھی نچوڑ لی گئی ہو تاہم اس نے جلد خود کو سنبھال لیا۔

جمال صاحب اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولے۔ "اب تم ہمیں بتاؤ کہ کہاں سے آ رہی ہو اور آسیہ کہاں ہے؟"

سارہ نے جھرجھری سی لی اور گویا ایک بار پھر اس بھیانک خواب کے زیر اثر چلی گئی جسے وہ ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جمال صاحب اس کے چہرے پر تغیر دیکھ کر جلدی سے اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے بولے۔ "اگر تم فی الحال کچھ بتانے کی ہمت محسوس نہیں کر رہیں تو تھوڑی دیر آرام کر لو' بعد میں بتا دینا..... ویسے آسیہ خیریت سے تو ہے نا؟ تمہیں اس کے بارے میں معلوم تو ہے نا.....؟"

"جی ہاں..... اور میں آرام نہیں کر سکتی۔" سارہ عجیب پھٹی پھٹی سی آواز میں بولی۔ "مجھے آپ کو اس کے بارے میں بتانا ہے' پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے' میں آپ دونوں کو



ساتھ لینے آئی ہوں' آسیہ مر چکی ہے' اس کی لاش وہاں ویرانے میں قبرستان اور پرانے گودام کے درمیان پڑی ہے' ہمیں اس کو اٹھا کر لانا ہے۔"

"کیا.....؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو..... آسیہ مر چکی ہے؟" تحسین بے ساختہ چلا اٹھا۔ "تم نے کہیں کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں..... میں نے تو کوئی خواب نہیں دیکھا لیکن میں نے آسیہ کو خواب کے عالم میں چپکے سے گھر سے نکل کر جاتے دیکھا تھا اور میں خود بھی یہ دیکھنے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے چل دی تھی کہ وہ کہاں جا رہی ہے..... لیکن میں اس کی کوئی مدد کرنے کے بجائے خود بڑی مصیبت میں پھنس گئی' وہ تو بھلا ہو نیاز علی کا..... جس کے بارے میں ہم نے یہی رائے قائم کی تھی کہ وہ بہت برا آدمی ہے..... وہ میرے کام آیا..... اس نے مجھے شیطانوں کے چنگل سے چھڑایا۔" اس کی آواز یکدم بہت نیچی ہو گئی تھی۔

اسے گویا اپنی آواز کے زیروبم پر کوئی اختیار نہ تھا اور اس کی آنکھیں اب بھی کچھ پھیلی پھیلی سی تھیں پھر اس نے باری باری جمال صاحب اور تحسین کی طرف دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ انہیں اس کی بات سمجھنے میں کچھ دشواری پیش آ رہی تھی' اس نے اپنے دل کو سنبھالا اور اختصار کے ساتھ لیکن ذرا ربط و ترتیب سے بتانے کی کوشش کی کہ واقعات کس طرح پیش آئے تھے۔

آخر کار جب وہ یہ بتا کر خاموش ہوئی کہ وہ آسیہ کی خون میں لتھڑی لاش کو پرانے متروک گودام کے قریب پڑی چھوڑ کر آئی تھی تو تحسین دھاڑیں مار مار کر رونے لگا' وہ اپنے آپ کو بھی ملامت کر رہا تھا۔ "میں یہاں کے حالات میں ایسا الجھا کہ اپنی بیوی کی طرف سے بالکل ہی بے پرواہ ہو گیا..... مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ خود یہاں کے پراسرار حالات کی لپیٹ میں آ چکی ہے۔"

اب جمال صاحب کو اسے بھی سنبھالنے کا فریضہ انجام دینا پڑا' انہوں نے اسے بھی ٹھنڈا پانی پلایا' دلاسے دیئے' سمجھانے بجھانے لگے آخر تحسین نے گویا خود پر کچھ قابو پایا اور یکدم ہی ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "چلئے انکل.....! آسیہ کی لاش اٹھائیں..... میں تو بالکل ہی برباد ہو گیا..... میرا گھر اجڑ گیا۔"

"حوصلہ رکھو میرے بچے.....!" جمال صاحب ایک بار پھر اسے تسلیاں دینے لگے۔ اچانک گویا انہیں کوئی خیال آیا اور وہ تحسین کے ساتھ باہر جاتے جاتے رک کر بولے۔ "سارہ بتا رہی ہے کہ آسیہ کی لاش خون میں لتھڑی ہوئی تھی ممکن ہے یہ کوئی پراسرار معاملہ نہ ہو بلکہ پولیس کیس ہو بہتر ہو گا کہ ہم لاش لینے کے لئے جاتے وقت اس پولیس انسپکٹر کو بھی ساتھ لے لیں جو ہمیں قبرستان میں ملا تھا' کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا.....؟"

"ولی محمد....." تحسین مردہ سی آواز میں بولا۔

وہ تینوں گھر سے نکل کر جمال صاحب کی پجیرو میں بیٹھے اور تحسین کی رہنمائی میں پہلے تھانے پہنچے لیکن وہاں صرف ایک ہیڈ کانسٹیبل بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ تھانے دار صاحب ڈیوٹی ختم کر کے کوارٹر میں سونے چلے گئے تھے۔ چند پولیس کوارٹرز تھانے کے پیچھے ہی تھے' جمال صاحب اور تحسین جلدی سے دل محمد کو بلانے وہیں جا پہنچے۔

وہ ابھی سونے کی تیاری ہی کر رہا تھا اور اس کے چہرے سے تھکن عیاں تھی۔ جمال صاحب کی بات سن کر وہ یوں کراہ اٹھا جیسے یہ نئی افتاد ایک بھاری بوجھ کی طرح اس کی کمر پر آن گری ہو لیکن پھر اس نے گویا اخلاقیات کا خیال کرتے ہوئے تحسین کا کندھا تھپک کر اسے تسلی دی اور پھر سارہ سے کرید کرید کر پوچھا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ سارہ نے جب اسے بتایا کہ اس نے ایک مردے کو آسیہ کی لاش بازوؤں پر اٹھائے ہوئے دیکھا تھا تو پہلے اس کی آنکھوں میں بے یقینی ابھری لیکن پھر اس کی رنگت کچھ زرد سی پڑ گئی شاید سارہ کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔

آخرکار اس نے جوتے وغیرہ پہنے' سرکاری ریوالور کی بیلٹ باندھی' برابر کے کوارٹر سے انہی دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا جنہیں جمال صاحب اور تحسین قبرستان میں بھی دیکھ چکے تھے' ان کے پاس تھری ناٹ تھری کی رائفلیں تھیں' انسپکٹر دل محمد نے اپنی سرکاری جیپ نکالی یوں ہوتے ہوتے ان کے روانہ ہونے کی نوبت آنے میں خاصی دیر لگ گئی۔

جب دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہوئیں تو رات کا پچھلا پہر بھی ختم ہونے کو تھا' متروک گودام بہرحال وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا' وہ چند منٹ میں ہی وہاں جا پہنچے' بے ہنگم جھاڑیوں کی وجہ سے انہوں نے گاڑیاں اصل جگہ سے کچھ دور ہی چھوڑ دیں اور چھوٹا سا وہ قافلہ پیدل ہی آگے بڑھا' سارہ ان کی رہنمائی کر رہی تھی۔

زرد چاندنی اس وقت بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی مگر اس میں ایک عجیب سی دھندلاہٹ تھی اور اس میں ذرا دور کی چیزیں دیکھنا مشکل تھی' پولیس والوں کے پاس ایک بڑی ٹارچ بھی تھی جسے وہ کبھی کبھی روشن کر لیتے تھے' درختوں اور جھاڑیوں کے ہیولے نہایت پراسرار دکھائی دے رہے تھے۔ پورا ویرانہ ہی بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن تھا جو ان درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے کہیں گھات لگائے بیٹھی تھیں اور کسی خاص لمحے کی منتظر تھیں۔ انسپکٹر دل محمد کا ہاتھ اس کے ریوالور کے ہولسٹر پر تھا اور ایک کانسٹیبل نے تھری ناٹ تھری کی رائفل یوں سیدھی کر رکھی تھی جیسے وہ سامنے کسی کو دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔

اچانک دوسرے کانسٹیبل کی ٹارچ کی روشنی کسی چیز پر پڑی اس کے منہ سے ایک گھگھیائی ہوئی سی آواز نکلی اور ٹارچ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ سب رک گئے' انسپکٹر دل محمد نے اسے ڈانٹا اور ٹارچ اس کے ہاتھ سے لے کر دوبارہ جھاڑیوں کے نیچے



روشنی ڈالی' جھاڑیوں کے نیچے سے دو جوتوں کے تلے جھانکتے دکھائی دے رہے تھے' انہوں نے ذرا غور سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ جھاڑیوں کے زیر سایہ کوئی اوندھا پڑا ہوا ہے' وہ مردانہ جوتے تھے' اس لئے وہ آسیہ کی لاش تو نہیں ہو سکتی تھی۔

خوفزدہ ہو جانے والے کانسٹیبل نے بھی اپنی رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لی اور وہ آگے بڑھے' قریب پہنچ کر انسپکٹر دل محمد نے ہی ہمت کر کے نیچے بیٹھ کر اس شخص کو سیدھا کیا اور بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ "ارے..... یہ تو محمد علی ہے....." پھر اس نے ذرا جھک کر اسے سونگھا اور بولا۔ "گھٹیا دیسی شراب کے نشے میں بدمست پڑا ہے لیکن شکر ہے زندہ ہے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ہمراہ آنے والوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اب یہ گدھا ہوش میں آئے گا تو کہے گا چونکہ میرے جوان بھائی کا انتقال ہو گیا ہے' اس لئے میں نے پی رکھی ہے' غم بھلانے کے لئے....."

یہ کہہ کر اس نے ذرا غصے سے محمد علی کو ایک ٹھوکر رسید کی اور گرج کر بولا۔ "اٹھ اوئے الو کے بچے۔"

محمد علی نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ آنکھیں تھوڑی سی کھولیں اور شاید اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی پولیس کی وردی میں اس کے قریب کھڑا تھا' پولیس والے کو سر پہ کھڑا دیکھ کر شاید اس کا نشہ ہرن ہو گیا اور وہ اٹھ کر یکدم ہی پھرتی سے ایک طرف کو دوڑ پڑا' پولیس والے بھی اس کے تعاقب میں دوڑے۔

دل محمد نے للکارا۔ "اوئے کھوتے کے پتر..... رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

مگر وہ گدھا اس وقت گھوڑے کی رفتار سے بھاگ رہا تھا' پولیس والے شاید تذبذب میں تھے کہ گولی چلائیں یا نہ چلائیں..... ان کی خوش قسمتی تھی کہ محمد علی کچھ آگے جا کر کسی چیز سے ٹکرا کر بری طرح گر پڑا اور جلدی نہیں اٹھ سکا۔ انسپکٹر دل محمد نے اپنے تمامتر بھاری بھرکم جثے کے باوجود سب سے پہلے جا لیا اور وہ اس کی کمر پر چڑھ بیٹھا شاید اسے قابو میں کرنے اور بھاگنے سے باز رکھنے کا یہی طریقہ اسے سب سے کارگر دکھائی دیا تھا۔

جب باقی لوگ ان کے قریب پہنچے تو ایک کانسٹیبل نے محمد علی کو ہتھکڑی لگا دی' وہ پہلے ہی قابو میں آ چکا تھا اور مزاحمت نہیں کر رہا تھا شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ معاملہ بہت سنگین تھا' اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انسپکٹر دل محمد نے آسیہ کی لاش کا معائنہ شروع کیا۔ تحسین اسے دیکھ کر سسکیاں لیتے ہوئے نیچی آواز میں رو رہا تھا' آسیہ کی لاش واقعی خون میں لتھڑی ہوئی تھی لیکن بیشتر خون اب خشک ہو چکا تھا' لباس میں کہیں تو اس کی پیڑیاں سی بن گئی تھیں لیکن کہیں کہیں خون میں نمی بھی موجود تھی' انسپکٹر دل محمد نے انگلی سے چھو کر خون کی نمی کو محسوس کیا۔

اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے پھر وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ "عجیب بات ہے..... ایک طرف تو خون کی پپڑیاں ظاہر کرتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی بیگم کو مرے بہت دیر گزر چکی ہے دوسری طرف کہیں کہیں اسی خون کی نمی ظاہر کرتی ہے کہ انہیں مرے زیادہ دیر نہیں گزری ظاہر ہے مرنے کے بعد تو انسان کے جسم سے خون رستا نہیں رہتا ادھر ان کی گردن کی حالت ظاہر کرتی ہے کہ ان کی موت فوراً" واقع ہو گئی ہو گی' خون کی مقدار ظاہر کرتی ہے کہ یہ دھیرے دھیرے رس رس کر نہیں نکلا ہے۔"

ایک سرجن کی حیثیت سے جمال صاحب کو دل ہی دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ انسپکٹر دل محمد بے وقوف بہرحال نہیں تھا' تفتیش کرنا جانتا تھا' آسیہ کی گردن کی حالت لرزہ خیز تھی' اس کا گلا اس طرح کٹا پھٹا تھا جیسے کسی طاقتور درندے مثلاً" شیر' چیتے یا بھیڑیے نے چبا ڈالا ہو' حلقوم کا کچھ حصہ غائب تھا اور شگاف سے کٹی پھٹی نسیں اور نرخرہ جھانک رہا تھا' اس ہولناک شگاف پر بھی خون خشک ہو چکا تھا' آسیہ کا چہرہ اذیت سے گویا مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔

انسپکٹر دل محمد لاش کا اور اس کے چاروں طرف زمین کا معائنہ کر کے گویا اہم نکات ذہن نشین کر رہا تھا' اس وقت اور اس جگہ تمام اہم باتیں کسی ڈائری وغیرہ میں نوٹ کرنا اس کے لئے مشکل تھا' اس کے معائنے کے دوران میں ویرانے میں سناٹا طاری تھا صرف تحسین کی دبی دبی سسکیوں کی آواز ابھر رہی تھی' ہوا نے بھی جیسے درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان سرسرانا بند کر دیا تھا۔ سارہ واپس جا کر پجیرو میں بیٹھ گئی تھی یہ گویا اس کا ایک بھیانک حقیقت سے فرار تھا جس کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی' اگر وہ وہاں رکتی تو شاید دہاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیتی۔

لاش کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد انسپکٹر فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "یہ بہرحال کسی انسان کا کام معلوم نہیں ہوتا۔" پھر وہ تحسین سے مخاطب ہوا۔ "لیکن ڈاکٹر صاحب! آپ چاہیں تو رپورٹ درج کرا سکتے ہیں' میں تفتیش کروں گا' اس کے لئے ہمیں لاش کو تھانے لے جانا پڑے گا اور ممکن ہے پوسٹ مارٹم کے لئے حیدر آباد بھی بھیجنا پڑے' اگر آپ پولیس کارروائی کی فرمائش نہیں کریں گے تب بھی میں اس محمد علی کے بچے سے تو تفتیش اور پوچھ کچھ کروں گا کیونکہ اسے ہم نے لاش کے قریب نشے میں دھت پڑے ہوئے پکڑا ہے' میں ان آفیشلی آپ کو اپنی پوچھ کچھ کے نتائج سے آگاہ کر دوں گا' آپ بہرحال شریف اور معزز لوگ ہیں' ہمارے محسن ہیں' میں آفیشلی یا ان آفیشلی ہر طرح آپ سے تعاون کے لئے تیار ہوں۔"

تحسین کی ہچکیاں اور سسکیاں کچھ اور بے آواز سی ہو گئیں' اس نے جمال صاحب کی طرف دیکھا' ان میں گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں مشورہ ہوا اور تحسین بولا۔ "میں اس معاملے کو اچھالنا نہیں چاہتا اگر اس میں کسی انسان کا ہاتھ ہوا تو خواہ مخواہ سکینڈل نہ بن



جائے اور اگر یہ کسی درندے کی حرکت ہوئی یا کوئی پراسرار معاملہ ہوا تو گاؤں میں اور زیادہ خوف و ہراس پھیلے گا۔ لوگ پہلے ہی دہشت زدہ ہیں۔"

"آپ بہت سمجھدار آدمی ہیں' آپ لاش کو اپنے گھر لے جا سکتے ہیں' بہرحال میں آپ کی ہر ممکن مدد کی کوشش کروں گا۔" انسپکٹر دل محمد کے لہجے میں خلوص کی جھلک تھی۔ "فی الحال تو یہ معاملہ میری سمجھ سے باہر ہے' اس علاقے میں شیر' چیتا تو کیا بھیڑیا بھی نہیں پایا جاتا' جنگلوں میں اکا دکا گیدڑ ضرور موجود ہیں لیکن گیدڑ ایک زندہ انسان کا گلا اس طرح ادھیڑ اور چبا نہیں سکتا' آپ یہی مشہور کریں تو بہتر ہو گا کہ بیگم صاحبہ کا انتقال حادثے میں ہوا ہے' کیا خیال ہے؟"

"ہاں..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" تحسین آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولا۔

پولیس والوں نے آسیہ کی لاش پجیرو میں رکھوا دی اور خود محمد علی کو اپنے ساتھ جیپ میں بٹھا کر تھانے کی طرف روانہ ہو گئے جبکہ تحسین وغیرہ آسیہ کی لاش لے کر گھر آ گئے۔

○

خالد نے فیصلہ کیا کہ وہ میمونہ کی دیکھ بھال اور اس کے قریب موجود رہنے کے لئے پنی والدہ کو بلائے اور جمشید صاحب کو اس بات کی اطلاع نہیں دے گا۔ اس نے حیدر آباد اپنی والدہ کو فون کر کے بتایا کہ ذہنی و جسمانی صحت کی خرابی کی وجہ سے میمونہ ہسپتال میں خل تھی' اس کے پاس ایک فرد کا رہنا ضروری تھا اگر وہ کچھ دنوں کے لئے آ جائیں تو ت اچھا ہو گا۔

خالد کی والدہ جہاں آراء بیگم بے چاری یہ خبر سن کر پریشان ہو گئیں اور فوراً" آنے کے لئے تیار ہو گئیں تاہم خالد نے گویا اپنے دل پر پتھر کی سل رکھتے ہوئے انہیں تسلی ا۔ "بہرحال گھبرانے کی کوئی بات نہیں..... بہت شاندار ہسپتال میں اس کا بہت عمدہ علاج رہا ہے' حقیقت میں تو دیکھ بھال کے لئے بھی اس کے پاس کسی کا موجود رہنا ضروری ں لیکن اس کی تنہائی کے خیال سے میں آپ کو بلا رہا ہوں' آپ پاس رہیں گی تو اسے ی صحت یاب ہونے میں مدد ملے گی۔"

جہاں آراء بیگم جو ایک نہایت نیک دل خاتون تھیں اور بہو کو بیٹیوں ہی کی طرح ن تھیں' ویسے بھی ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ وہ میمونہ کے بارے میں سخت تشویش میں ہو چکی تھیں' ایک بار پھر انہوں نے پوچھا۔ "آخر اسے ہوا کیا.....؟ یہاں سے تو وہ ٹھیک ٹھاک گئی تھی اور اس کی تو صحت بھی نہایت شاندار ہے' سرخ و سفید اور ت و توانا لڑکی ہے' اسے بھلا کیا ہوا؟"

"ایسی کوئی تشویش اور فکر کی بات نہیں ہے امی.....!" یہ کہتے ہوئے خالد کے حلق میں گویا کچھ پھنسنے لگا لیکن اس نے کوشش کی کہ اس کے لہجے سے کچھ ظاہر نہ ہونے پائے۔ "بس..... کچھ ماحول اور حالات کی تبدیلی کے اثرات ہیں' بڑے شہروں کے مسائل بڑے ہوتے ہیں اور پھر ویسے بھی آپ کچھ عرصہ بعد دادی بننے والی ہیں۔" اس نے شرمیلے سے انداز میں بات بتانے کی کوشش کی۔

"اوہ..... اچھا..... تو یوں کہو نا.....!" جہاں آراء بیگم نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ گویا یکدم ہی سب کچھ سمجھ گئی تھیں۔ "ٹھیک ہے..... میں آج ہی آ جاتی ہوں' مجھے کون سی لمبی چوڑی تیاریاں کرنی ہیں۔"

"آپ بس سے نہ آیئے گا۔" خالد نے خاص طور پر ہدایت کی۔ "اس طرح میں آپ کو ریسیو نہیں کر سکوں گا' ٹرین سے آیئے گا۔" پھر اس نے ایک ٹرین کا نام بتایا جس میں فوری طور پر سیٹ ملنے کی امید ہوتی تھی۔ "اس ٹرین سے آیئے گا آپ کل اطمینان سے آ جائیں' میں آپ کو سٹیشن پر ریسیو کر لوں گا تاکہ آپ کو گھر تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔"

جہاں آراء بیگم نے دوسرے دن پہنچنے کا وعدہ کر لیا اور خالد کے دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ مصروفیات میں اسے وہ دن اور اس سے اگلا دن گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا' شام کو بھاگم بھاگ سٹیشن پہنچا تو ٹرین آ چکی تھی تاہم اسے آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ اپنی والدہ اسے پلیٹ فارم پر ایک جگہ اپنا چھوٹا سا بیگ فرش پر رکھے نظر آ گئیں۔ ایک ہاتھ سے انہوں نے چھوٹا سا ایک قرآن پاک سینے سے لگا رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں تسبیح تھی' وہ صبر و سکون سے خالد کا انتظار کر رہی تھیں' انہوں نے اسے سینے سے لگا کر پیار کیا اور خالد ان کا بیگ اٹھا کر انہیں ساتھ لئے باہر آ گیا۔

خالد اپنی گاڑی لے کر آیا تھا اور اس نے کسی سے تذکرہ نہیں کیا تھا کہ اس کی والدہ آ رہی تھیں' وہ انہیں گاڑی میں بٹھا کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا' راستے میں وہ کچھ اس طرح کی باتیں اور نصیحتیں وغیرہ کرتی رہیں جیسی زیادہ تر مائیں کرتی ہیں خواہ ان کے بچے خود بھی بال بچے دار ہو چکے ہوں مثلاً" یہ کہ وہ کمزور لگ رہا تھا' وہ یقیناً" اپنی صحت کا خیال نہیں رکھ رہا تھا' بڑے شہر کی زندگی میں اس نے یقیناً" اپنے آپ کو بہت زیادہ کاموں میں الجھا لیا تھا وغیرہ وغیرہ.....

خالد ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا' اس کا ذہن درحقیقت کہیں اور الجھا ہوا تھا' اس کی خواہش تھی کہ جمشید کو اس کی والدہ کی آمد کا کم از کم اس وقت تک پتہ نہ چلے جب تک وہ انہیں دوسرے روز ہسپتال نہ پہنچا دے۔

اس کی یہ خواہش اور کوشش دھری کی دھری رہ گئی۔ رہائشی بلڈنگ میں اپنے فلور پر



آج تک کبھی اس کا جمشید سے سامنا نہیں ہوا تھا لیکن اس روز وہ جونہی لفٹ سے اپنی والدہ کے ساتھ نکلا' جمشید سامنے کھڑے شعلہ بار سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ خالد بوکھلا سا گیا' ہڑبڑا کر وہ جہاں آراء بیگم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"سر.....! یہ میری والدہ ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" جمشید سرد لہجے میں بولے۔ "کیا انہیں یہاں بلانے کا تمہیں کسی نے مشورہ دیا تھا؟ یا تم نے اس سلسلے میں کسی سے مشورہ کیا تھا؟"

"جی نہیں.....۔" خالد اپنی والدہ کی موجودگی میں باس کے اس رویئے پر کچھ خجالت محسوس کرتے ہوئے بولا۔ "وہ..... دراصل ان کا اچانک ہی پروگرام بن گیا..... اب میں منع نہیں کر سکتا تھا۔" اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"خواہ مخواہ کے جواز گھڑنے کی ضرورت نہیں۔" جمشید پہلے سے زیادہ سرد لہجے میں بولے۔ "مجھے معلوم ہے تم نے انہیں میمونہ کے پاس چھوڑنے کے لئے بلایا ہے اور تم نے اس سلسلے میں مجھ سے مشورہ کرنے کی بھی زحمت نہیں کی' معلوم نہیں تمہیں میمونہ کے بارے میں اتنی تشویش کیوں ہے' وہ بالکل ٹھیک ہے اور اس کی مناسب دیکھ بھال ہو رہی ہے لیکن تم خواہ مخواہ بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر بھاگے پھر رہے ہو' ہسپتال اور فرم دونوں کی ریپوٹیشن خراب کر رہے ہو جیسے ہم اتنی دولت خرچ کرنے اور اتنے انتظامات کرنے کے باوجود اپنے آدمیوں کا خیال نہیں رکھ سکتے۔"

"یہ بات نہیں ہے سر.....۔" خالد دھیمے لہجے میں بولا۔ وہ بیک وقت کئی مختلف کیفیات کا شکار تھا' اسے جمشید سے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا لیکن ان کے رویئے پر خجالت کے احساس سے کانوں کی لویں بھی تپتی محسوس ہو رہی تھیں اور غصہ بھی آ رہا تھا' اسے جمشید صاحب کی خفگی کا اندیشہ تو تھا لیکن یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ وہ اسے والدہ کے سامنے ہی اس طرح ذلیل کرنا شروع کر دیں گے۔

اس نے کن انکھیوں سے والدہ کی طرف دیکھا' وہ عینک ناک پر درست کرنے کے بعد سر اٹھائے ایک ٹک جمشید کی طرف دیکھے جا رہی تھیں' ان کا ہاتھ عینک پر ہی تھا اور منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا تھا۔ خالد نے محسوس کیا کہ وہ اس بات پر حیران نہیں تھیں کہ ان کے بیٹے کا باس انہی کے سامنے ان کے بیٹے کی توہین کر رہا تھا بلکہ وہ کسی اور ہی وجہ سے دم بخود تھیں تاہم اس سے خالد کے احساس اہانت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

وہ گہری سانس لے کر ذرا سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے جمشید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "اگر آپ کو اصل بات معلوم ہو ہی گئی ہے تو میرا خیال ہے آپ کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہونا چاہئے' یہ ایک قسم کی خاندانی سی روایت ہے' ایسے وقت میں عام طور پر خاندان کی کوئی بڑی بوڑھی ہسپتال میں داخل ہونے والی نوجوان عورت کے

قریب موجود رہتی ہے۔"

"اس عمارت میں رہائش اختیار کرنے والے اپنی خاندانی روایات باہر ہی چھوڑ آتے ہیں۔" جمشید کی گونجیلی آواز میں اجنبیت اور غیریت سی تھی جس کا خالد نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

خالد کوئی سخت جواب دینے کا دل ہی دل میں فیصلہ کر ہی رہا تھا کہ جہاں آراء بیگم اچانک اپنا تسبیح والا ہاتھ جمشید کی طرف بڑھاتے ہوئے اور خود بھی غیرارادی سے انداز میں ایک قدم ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔ "سنئے..... کیا..... آپ..... کیا آپ....."

وہ ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں نہ جانے کیا پوچھنا چاہتی تھیں لیکن جمشید ان کے بڑھتے ہوئے ہاتھ سے کچھ اس طرح بوکھلا کر یکدم کئی قدم پیچھے ہٹ گئے جیسے کسی نے بھرے ہوئے ریوالور کا رخ ان کی طرف کر دیا ہو یا کوئی خوفناک قسم کا خنجر لے کر ان کی طرف بڑھا ہو۔

"میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔" انہوں نے کچھ بوکھلائے ہوئے سے انداز میں خالد سے کہا اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ انہوں نے لفٹ کی طرف بھی آنے کی کوشش نہیں کی شاید اس لئے کہ بیچ میں جہاں آراء بیگم حائل تھیں' دوسرے ہی لمحے وہ سیڑھیوں کی اوٹ میں غائب ہو چکے تھے' ان کے رویئے میں یہ اچانک اور غیر متوقع سی تبدیلی خالد کے لئے حیران کن تھی۔

○



جمشید غالباً" سیڑھیوں کے ذریعے اوپر اپنے اپارٹمنٹ میں چلے گئے تھے۔ خالد نے گہری سانس لے کر پلٹ کر اپنی والدہ کی طرف دیکھا تو وہ ابھی تک حیران و پریشان تھیں اور ایک ٹک سیڑھیوں ہی کی طرف دیکھے جا رہی تھیں حالانکہ جمشید صاحب کو غائب ہوئے کئی سیکنڈ ہو گئے تھے۔

"کیا واقعی یہی تمہارے باس تھے؟ تم جب سے حیدر آباد سے آئے اور انہی کے پاس نوکری کر رہے ہو؟" جہاں آراء بیگم نے گویا کسی ڈراؤنے خواب سے بیدار ہوتے ہوئے جھرجھری لے کر پوچھا۔

"جی ہاں..... اس میں اتنی حیرت اور پریشانی کی کیا بات ہے؟" خالد کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

"تم یہ نوکری فوراً" چھوڑ دو۔" جہاں آراء بیگم نے اس کے سوال پر توجہ دیئے بغیر یکدم ہی گویا فیصلہ سنا دیا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی.....! اتنی کم عمری میں مجھے اتنی شاندار نوکری..... اتنی تنخواہ..... فرم میں پارٹنرشپ..... یہ سہولیات..... یہ آسائشیں کہاں مل سکتی ہیں۔"

"ارے دفع کرو بڑی نوکری کو..... آسائشوں کو..... اور سہولتوں کو..... انہی ساری چیزوں کے لالچ نے تو انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔" خالد کی والدہ نے قدرے غصے کے سے عالم میں اپنا تسبیح والا ہاتھ زور سے ہلایا اور اس لمحے خالد کو بھی ایک عجیب سا احساس ہوا۔

اسے کچھ یوں لگا جیسے اسے ایک لمحے کے لئے چکر سا آ گیا ہو لیکن پھر وہ سنبھل گیا۔

جہاں آراء بیگم بات جاری رکھتے ہوئے بولیں۔ "اگر تم نے جلد اس شخص کی نوکری نہ چھوڑی تو تم ضرور کسی شیطانی چکر میں پھنس جاؤ گے۔"

اب خالد انہیں کیا بتاتا کہ شیطانی چکر میں تو وہ پھنس ہی چکا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان سارے چکروں میں اسے خود بھی کچھ لطف محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کا ان چکروں سے نکلنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ کبھی کبھار شاید دل کے کسی تاریک گوشے سے کوئی ایسی

کمزور سی خواہش سر ابھارتی تھی لیکن دوسری طاقت اور ترغیبات شاید زیادہ طاقتور تھیں۔ وہ خواہش فوراً ہی دب جاتی تھی۔

اس نے اپنی ان کیفیات کا تذکرہ کرنے کے بجائے قدرے حیرت سے اپنی ماں سے پوچھا۔ "کیا آپ جمشید صاحب کو جانتی ہیں؟"

جہاں آراء بیگم نے عینک درست کرتے ہوئے قدرے خوفزدہ سی نظروں سے ایک بار پھر سیڑھیوں کی طرف دیکھا گویا انہیں اندیشہ ہو کہ جمشید واپس نہ آ جائیں پھر وہ نیچی آواز میں بولیں۔ "میں اسے جمشید کے نام سے تو نہیں جانتی۔ شاید اَب اس نے اپنا یہ نام رکھ لیا ہو۔ ویسے اس شخص کا کوئی بھروسہ نہیں.....نہ جانے اس کے کتنے کام ہوں اور یہ کس کس دور میں کس کس جگہ پایا گیا ہو۔ اس کے قصے کا تو سر پیر ہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ بہرحال جتنی باتیں میرے علم میں ہیں وہی مجھے تو ڈرا دینے اور ہولا دینے کے لئے کافی ہیں.....اور اب تو اس کے ٹھاٹ باٹ بھی حیران کن ہیں۔ اس نے اپنے ملازموں کو اتنے ٹھاٹ سے رکھا ہوا ہے تو یہ خود کیا چیز ہو گا..... لیکن جب میں نے اسے دیکھا تھا اس وقت یہ ایک زمیندار کا معمولی سا مزارع تھا.....ہاری تھا..... لیکن اس وقت بھی اس کے بارے میں کچھ قصے ضرور سننے میں آئے تھے کہ نہ جانے کیوں اس نے ایک معمولی ہاری کا روپ دھار رکھا تھا.....وہ اس کی اصل حیثیت نہیں تھی.....یہ چاہتا تو اپنے مالک زمیندار کو خرید کر پھینک دیتا.....یہ تو کسی مصلحت کے تحت اس کا ہاری بنا ہوا تھا.....اس کے کارندوں میں گھسا ہوا تھا..... لیکن ان باتوں کی کبھی تصدیق نہیں ہو سکی۔ یہ محض افواہیں ہی رہیں اس وقت اس کا نام جمال ہوا کرتا تھا....."

خالد ان کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "آیئے..... آرام سے گھر میں بیٹھ کر ان کے بارے میں مزید بات کریں گے۔ میں تو پہلے ہی کچھ حیران پریشان تھا۔ آپ نے مجھے اور بھی حیران کر دیا ہے۔"

"میرا دل تو کہتا ہے کہ اس کے ساتھ رہو گے تو رفتہ رفتہ حیرانی تو ختم ہو جائے گی' صرف پریشانیاں ہی پریشانیاں رہ جائیں گے۔" جہاں آراء بیگم اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولیں۔

اپارٹمنٹ میں پہنچ کر انہوں نے تنقیدی نظر سے ہر چیز کا اچھی طرح گھوم پھر کر جائزہ لیا۔ خالد کے کراچی آنے کے بعد وہ پہلی بار بیٹے کے گھر آئی تھیں۔ اپارٹمنٹ کی کشادگی اور اس میں عیش و آرام کا تمام جدید ترین سازوسامان دیکھنے کے باوجود اس طرح تاسف سے سر ہلاتی رہیں جیسے خالد بڑی مصیبت اور پریشانی میں پھنس گیا ہو اور یہ مصیبت اس نے خود ہی مول لی ہو۔ اس دوران میں خالد نے ان کے لئے کھانے کی کچھ چیزیں اور چائے وغیرہ مائیکروویو اوون میں گرم کر لیں۔



منہ ہاتھ دھو کر ذرا تازہ دم ہونے کے بعد جہاں آراء بیگم بیٹے کے اصرار پر ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھیں اور کھانے کے دوران میں بولیں۔ "جال کتنا ہی خوبصورت ہو لیکن قیدی بہرحال قیدی ہی ہوتا ہے۔ مجھے تم یہاں قیدی لگتے ہو۔ کسی شیطانی مخلوق کے قیدی۔"

خالد ملائمت سے بولا۔ "آپ جمشید صاحب کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں....."

"جمشید صاحب کون.....؟" جہاں آراء بیگم منہ چلاتے ہوئے چونکیں۔ "اچھا..... تمہارا مطلب ہے جمال.....! ہاں.....اس کا نام بھی جمال تھا اور یہ آدمی بھی بڑے کمال کا معلوم ہوتا تھا۔ ان دنوں ہم حیدر آباد میں نہیں' نشاط نگر میں رہا کرتے تھے اور تمہارے والد ایک زمیندار کے منشی تھے۔ یہ شخص.....جمال اچانک ہی نہ جانے کہاں سے نمودار ہوا تھا اور گاؤں میں ایک چھوٹا سا مکان خرید کر رہنے لگا تھا۔ زمینوں وغیرہ پر اگر کوئی نیا کام کرنے والا آتا تھا تو وہ عام طور پر تمہارے والد ہی کے توسط سے آتا تھا لیکن یہ شخص نہ جانے کس طرح زمیندار سے مل ملا کر خود ہی براہ راست بھرتی ہو کر آ گیا۔ بہرحال..... تمہارے والد کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ محنتی تھا۔ اپنا کام گویا چٹکی بجاتے ہی کر دیتا تھا.....بلکہ اس معاملے میں تو پریشان کن حد تک حیرت انگیز آدمی تھا۔"

"کیا مطلب؟" خالد نے وضاحت چاہی۔

"بھئی کبھی کبھی وہ دس دس آدمیوں کا کام اکیلا کر دیتا تھا۔ اب یہ بھی تو پریشانی کی بات ہے نا....." جہاں آراء بیگم بولیں۔ "اگر فطرت کی حدود سے بڑھ کر اور انسانی طاقت سے کہیں زیادہ کسی کی کارکردگی نظر آئے تو اس پر بھی حیران پریشان تو ضرور ہونا چاہئے۔ چنانچہ تمہارے ابا اگر کچھ پریشان ہوتے تھے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ جمال کے بارے میں ادھر ادھر سے مختلف باتیں بھی سننے میں آتی تھیں۔"

"کیسی باتیں۔" خالد نے دریافت کیا۔

"کبھی کوئی شخص دعویٰ کرتا کہ برسوں پہلے اس نے جمال کو کسی اور مقام پر دیکھا تھا مگر اس وقت وہ بوڑھا تھا اور اس کا نام جمال نہیں تھا.....کچھ اور تھا.....اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص تیس چالیس سال پہلے تو بوڑھا نظر آئے اور تیس چالیس سال بعد وہ نوجوان دکھائی دے؟ چنانچہ یہی سمجھا جاتا تھا کہ دیکھنے والے کو دھوکا ہوا ہو گا اور اس نے جمال سے ملتی جلتی شکل کے کسی اور آدمی کو دیکھا ہو گا.....اور اب جمال مجھے کچھ بڑی عمر کے آدمی کے روپ میں نظر آیا ہے لیکن پھر بھی یہ اتنا بوڑھا نہیں ہے جتنا میرے حساب سے اسے ہونا چاہئے تھا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ شخص سینکڑوں سال سے دنیا میں موجود ہے اور کبھی بوڑھا اور کبھی جوان نظر آتا رہتا ہے۔"

"آپ نے اس وقت گاؤں میں اسے دیکھا تھا؟" خالد نے دریافت کیا۔

"بہت اچھی طرح.....اور کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ اسی لئے تو پہچان لیا ہے گو کہ میری

اس سے کبھی بات نہیں ہوئی اور نہ ہی کبھی صحیح طور پر آمنا سامنا ہوا لیکن میں نے اسے اتنی مرتبہ دیکھا ہوا ضرور ہے کہ پہچاننے میں دھوکا نہیں کھا سکتی.....اور بھی کئی مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس لڑکی سے اس کی شادی ہوئی وہ بھی ہمیشہ پریشان ہی رہی۔"

"کیوں؟" خالد نے جاننا چاہا۔

"اسے بھی یہ شخص بہت پراسرار لگتا تھا اور جس طرح ایک نوبیاہتا لڑکی کو اپنے شوہر سے محبت و پیار اور انسیت ہونی چاہئے.....اسے وہ نہیں ہو سکی تھی۔ اس کے بجائے وہ اس سے خوف کھانے لگی تھی۔"

"وہ کیوں؟"

"اس کی پراسراریت ہی کی وجہ سے....." جہاں آراء بیگم نے جواب دیا۔ "یہ کبھی بھی اسے ایک آدمی محسوس نہیں ہوا۔ اس نے کئی بار مجھے قسمیں کھا کھا کر بتایا کہ رات کو اس کا شوہر اکثر اس کے برابر سے غائب ہوتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ دروازے اور کھڑکی کی کنڈی وغیرہ اندر کی طرف سے چڑھی ہی ہوتی تھی۔ کھڑکی تو خیر ویسے بھی سلاخوں والی تھی.....اس کا تو پٹ کھول کر بھی کوئی باہر نہیں جا سکتا تھا یا باہر سے اندر نہیں آ سکتا تھا.....لیکن سنبل دیکھتی تھی کہ اس کی بھی کنڈی اندر کی طرف سے چڑھی ہوئی تھی....."

"سنبل اس لڑکی کا نام تھا جس سے جمال کی شادی ہوئی تھی؟" خالد نے تصدیق چاہی۔

"ہاں....." جہاں آراء بیگم چائے کا گھونٹ حلق سے اتار کر بولیں۔ "ایک بار اس نے مجھے بتایا کہ رات کو اس کی آنکھ کھلی تو اس نے کھڑکی کے پاس ایک شخص کو کھڑے دیکھا۔ اس کی پشت سنبل کی طرف تھی اور اس کا سر چھت سے لگا ہوا تھا۔ وہ لوگ جس مکان میں رہ رہے تھے وہ بہت پرانی ساخت کا تھا اور اس کی چھت کم از کم پندرہ فٹ اونچی تھی۔ وہ شخص دھیرے سے گھوما تو بے اختیار سنبل کی چیخ نکل گئی۔ وہ اس کا اپنا شوہر جمال ہی تھا لیکن جونہی سنبل کی اس پر نظر پڑی اس کا قد فوراً معمول پر آ گیا اور سنبل کو یوں لگا جیسے وہ اس کی نظر کا دھوکا تھا.....اور ظاہر ہے جمال نے بھی بعد میں اسے یہی یقین دلانے کی کوشش کی۔ عجیب بات یہ بھی تھی کہ سنبل اپنی دانست میں چیخی تھی لیکن درحقیقت اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی....."

جہاں آراء بیگم چائے کا ایک اور گھونٹ بھرنے کے لئے ایک لمحے کو خاموش ہو گئیں پھر بولیں۔ "اس قسم کے پراسرار واقعات اور دوسری بہت سی باتوں کی وجہ سے سنبل شادی کے بعد کھلنے اور زیادہ تر و تازہ نظر آنے کے بجائے سوکھتی چلی گئی۔ اس کا چہرہ مرجھا گیا۔ وہ برسوں کی بیمار دکھائی دینے لگی۔ آخر کار شادی کے ایک ڈیڑھ سال بعد ہی وہ ایک بچے کو جنم دینے کے بعد مر گئی۔"



"مر گئی.....؟" خالد نے حیرت سے دہرایا۔ "کیا زیادہ بیمار ہو گئی تھی؟"

"گاؤں میں ڈاکٹر وغیرہ تو کوئی خاص تھے نہیں.....اور بظاہر اسے کوئی خاص بیماری بھی نظر نہیں آتی تھی بچے کی پیدائش میں بھی کوئی پیچیدگی یا الجھن نہیں ہوئی تھی.....لیکن میں نے بتایا نا کہ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی وہ بس مریضہ سی ہی دکھائی دینے لگی تھی۔ ماں بننے کے غالباً مہینے ڈیڑھ مہینے بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ اس معاملے میں ہر ایک نے اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق رائے دی تھی۔ جتنے منہ اتنی باتیں.....لیکن سب سے خاص بات بس یہ ہے کہ اس کے چہلم سے بھی پہلے جمال اس نوزائیدہ بچے کو لے کر غائب ہو گیا تھا۔ جس طرح پراسرار انداز میں وہ نمودار ہوا تھا اسی طرح پراسرار انداز میں غائب ہو گیا۔ کسی کو صحیح طور پر پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آیا تھا اور کسی کو بھی علم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ حالانکہ جب سنبل کا انتقال ہوا تو سب اس کے ساتھ حسب توفیق ہمدردی کر رہے تھے اور فکرمند ہو رہے تھے کہ اب وہ اکیلا اس ننھے سے بچے کی پرورش کیسے کرے گا۔ سب اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق تدبیریں بھی بتا رہے تھے لیکن اسے تو گویا کسی کے مشورے کی ضرورت ہی نہیں تھی اور اس ننھے سے بچے کو پالنا اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لئے وہ اسے لے کر غائب ہو گیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس بچے کا نام کامران رکھا گیا تھا۔"

"کامران.....؟" خالد بری طرح چونکا۔ اس کی نظر میں اس مضبوط قد آور اور خوش شکل نوجوان کا سراپا ابھر آیا جو اسے شروع ہی سے کچھ پراسرار معلوم ہوا تھا۔ کہنے کو وہ صرف ڈرائیور اور اوپر کے کام کرنے والا آدمی تھا لیکن خالد نے محسوس کیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ فرم کے سینئر پارٹنر سعید پاشا کو بھی گردن سے پکڑ سکتا تھا۔ اس کی یقیناً کوئی خصوصی اہمیت اور حیثیت تھی لیکن کسی مصلحت کے تحت اسے ڈرائیور اور ایک معمولی کارندے کا روپ دے کر فرم کے لوگوں کے ساتھ کر دیا گیا تھا۔ یوں تو جمشید کے لئے کسی کے بارے میں بھی پل پل کی خبر رکھنا مشکل نہیں تھا لیکن کامران کی وجہ سے انہیں مزید سہولت رہتی ہو گی۔

"کیا یہ کامران وہی بچہ تھا جس نے پچیس تیس سال پہلے نشاط نگر میں جنم لیا تھا؟" اس نے سوچا لیکن وہ اپنے اس خیال کو لفظوں کی صورت میں زبان پر نہیں لایا۔ اس کی والدہ پہلے ہی جمشید کے بارے میں پریشان تھیں۔ وہ انہیں کوئی نئی بات بتا کر مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

چنانچہ اس نے یہ تذکرہ چھیڑنے کے بجائے پوچھا۔ "ابا جی جس زمیندار کے پاس منشی کے طور پر کام کرتے تھے اس کا نام کیا تھا؟"

"مشعل خان" جہاں آراء بیگم نے جواب دیا۔ "وہ اس علاقے کا ایک چھوٹا زمیندار

تھا۔ وہاں دو تین دوسرے بڑے زمیندار تھے جن کا علاقے پر اصل کنٹرول تھا۔"

خالد کو یاد تھا کہ نیاز علی نامی جس شخص کا اس نے کیس لڑا تھا اور جس کی وجہ سے اس کی زندگی میں اہم موڑ آیا تھا' اس کے باپ کا نام مشعل خان نہیں تھا۔ خالد کو یاد پڑتا تھا کہ اس نے وکالت نامے کے کاغذات تیار کرتے وقت نیاز علی کے باپ کا نام فیروز علی درج کیا تھا۔ شاید وہ علاقے کے ان دو تین بڑے زمینداروں میں سے ایک تھا جن کا اس کی والدہ ذکر کر رہی تھیں۔ ممکن تھا اس زمانے میں نیاز علی کسی نہ کسی طرح جمشید کے زیر اثر آگیا ہو اور اسی وقت سے اس کی شخصیت میں شیطانی خصوصیات پیدا ہوئی ہوں۔ اس وقت وہ یقیناً بچہ ہی ہو گا لیکن شاید جمشید اس وقت ہی کسی طرح اس کی شخصیت کی بنیادوں میں خباثت کا عنصر شامل کر آئے ہوں.....اور کچھ بعید نہیں تھا کہ خود اس کے اپنے اوپر بھی اسی زمانے میں کسی طرح جمشید کا "سایہ" پڑا ہوا۔ اس کے ذہن میں بھی کچھ خاص قسم کے "جراثیم داخل ہو گئے ہوں جنہوں نے بہت بعد میں جا کر اثر دکھایا ہو.....شاید اتنے برسوں تک وہ جراثیم اس لئے دبے رہے ہوں کہ اس کے گھر کا ماحول نہایت پاکیزہ تھا۔ اس کی والدہ ایک سیدھی سادی مذہبی اور نہایت قناعت پسند عورت تھیں۔ خالد ان کا اکلوتا بچہ تھا۔ انہوں نے اسی کے سہارے بیوگی کاٹی تھی اور اسے بھی اپنی طرح ایک اچھا اور قناعت پسند انسان بنانے کی پوری پوری کوشش کی تھی اور اس میں کامیاب بھی رہی تھیں لیکن شاید کسی کمزور لمحے میں شیطان اسے اچک کر لے گیا تھا۔

خالد کے ذہن میں خیالات کی یلغار تھی اور اسے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے باطن میں کوئی تبدیلی کروٹیں لے رہی تھی۔ اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں شاید یہ خواہش نہایت مدہم انداز میں سر اٹھا رہی تھی کہ اسے واقعی جمشید کی عملداری سے نکل بھاگنا چاہئے لیکن اسے یہ بھی احساس تھا کہ یہ اتنا آسان کام نہیں تھا کہ بس وہ منہ اٹھا کر یکدم بھاگ نکلتا۔ اس میں اس کے اپنے لئے بھی بہت سی مشکلات تھیں اور پھر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جمشید اسے اتنی آسانی سے جانے نہیں دیں گے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ معاملہ اس کے لئے زندگی اور موت کی کشمکش ثابت ہو۔ اس کام کے لئے کوئی حکمت عملی ترتیب دینا اور پھر اس پر مرحلہ وار عمل کرنا ضروری تھا۔ وہ ذرا سکون اور یکسوئی سے اس پر غور کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال اگر اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال سر ابھار رہا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کے اندر بنیادی طور پر جو ایک اچھا آدمی موجود تھا.....جو نیک اور دیندار والدین کی اولاد تھا.....وہ دوبارہ طاقت پکڑ رہا تھا۔

خالد کو اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید جمشید ذہن میں ہونے والی شکست و ریخت اور سوچوں میں پیدا ہونے والے معمولی سے اتار چڑھاؤ سے بھی واقف ہو جاتے ہوں۔ اگر اس کا اندیشہ درست تھا تو اس کے خیالوں میں برپا ہونے والی یہ کشمکش ابتداء میں ہی اس



کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

جہاں آراء بیگم کھانے اور چائے کے فوراً بعد ہی اٹھتے ہوئے بولیں۔ "تم مجھے فوراً ہی بہو کے پاس لے چلو.....مجھے تو اس خیال سے ہی ہول آ رہا ہے کہ وہ بے چاری اکیلی ہسپتال میں پڑی ہو گی۔"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی تو آپ سفر سے آئی ہیں۔ تھکی ہوئی ہوں گی۔ ویسے بھی اب رات ہو چکی ہے۔ صبح ہی چلیں گے۔ مجھے آپ کو اس کے پاس چھوڑنے کے سلسلے میں کچھ انتظامات کرنے ہوں گے....." خالد بولا پھر اس نے انہیں جھوٹی سی تسلی دینے کی کوشش کی۔ "مطمئن رہئے.....وہ وہاں لاوارثوں کی طرح نہیں پڑی۔ اس کا خیال رکھنے کے لئے تمام ضروری عملہ موجود ہے۔"

"ارے چھوڑو.....میں خوب جانتی ہوں ان ہسپتالوں کو اور ان کے عملے کو....."

جہاں آراء بیگم ہاتھ ہلاتے ہوئے بولیں۔ "جب تک اپنا کوئی قریبی اور ہمدرد انسان قریب موجود نہ ہو تب تک بے چارے مریض کا کہاں گزارا ہوتا ہے۔ تیمارداری اور دلجوئی سے اس کی پریشانی اور مرض آدھا رہ جاتا ہے۔"

"بہرحال.....ہم جا تو صبح ہی سکیں گے۔ اس وقت تو ہسپتال میں مریض کے لواحقین کو گھسنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔" خالد نے بہانہ بنایا۔ وہ سوچ رہا تھا نہ جانے کل بھی اسے خود اندر گھسنے اور والدہ کو ساتھ لے جانے کی اجازت مل سکے گی یا نہیں؟ لیکن اس کا بہرحال یہ مرحلہ طے کرنے کا عزم پختہ تھا۔

○

شمشیر علی کو قیصر نے جو نوکری دلوائی وہ کسی دفتر یا فرم میں نہیں' ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں تھی۔ اسے چھ لڑکوں کے ایک گروپ میں شامل کیا گیا جس کے سربراہ کا نام متان موتی تھا۔ متان موتی شمشیر سے بھی کم عمر تھا لیکن وہ نہایت کم عمری سے چوری چکاری اور پھر ڈاکہ زنی کے پیشے میں آگیا تھا اس لئے اپنے کام میں بے پناہ ماہر تھا۔ چھوٹے بڑے کئی قسم کے ہتھیاروں کے استعمال میں اسے مہارت تھی۔ وہ چھلاوے کی طرح پھرتیلا اور کسی جلاد سے زیادہ سفاک تھا۔

ہر واردات کے لئے جیسا بھی منصوبہ بنتا تھا اس کے مطابق وہ آندھی طوفان کی طرح اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کسی گھر میں گھستا تھا اور ایک ماہر شکاری کی سی حکمت عملی سے کام کرتے ہوئے تمام افراد کو قابو میں کرنے کے ساتھ ساتھ صورت حال کو مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ ذرا سی بھی مزاحمت کرنے والا کوئی بھی فرد خواہ وہ بچہ ہوتا' بڑا ہوتا' عورت' مرد یا کوئی بزرگ ہوتا' اس کے غیظ و غضب سے نہیں بچ سکتا تھا۔ کسی کو وہ

ٹی ٹی کا دستہ' کسی کو گھونسے اور لاتیں' کسی کو دروازے توڑنے والی مخصوص ساخت کی ایک موٹی سلاخ مار مار کر لہولہان کر دیتا تھا اور ذرا سا بھی خطرہ محسوس کرنے پر گولی بھی مار دیتا تھا۔ شمشیر کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ اس کم عمری میں وہ کم از کم بارہ قتل کر چکا تھا۔ کئی بار اپنے ساتھیوں سمیت پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہوا تھا۔ پچھلے چھ سات برسوں پر پھیلی ہوئی اس کی کارکردگی حیران کن تھی۔ قیصر کو اس پر بڑا فخر تھا۔

شمشیر علی کو اسی منان موتی کی شاگردی میں دیا گیا تھا۔ شمشیر نہایت آسانی سے اور خوشی خوشی گروہ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ اس نے بہت سوچا تھا اور اس کے ضمیر نے بہت مزاحمت کی تھی لیکن ایک تو قیصر نہایت چرب زبان آدمی تھا۔ اسے لوگوں کو......اور خصوصاً" نوجوانوں کو شیشے میں اتارنے کا فن خوب آتا تھا۔ اس نے شمشیر علی کے سامنے مستقبل کی ایک ایسی بھیانک تصویر پیش کی جس میں اسے قیصر کی دکھائی ہوئی راہ منتخب کرنے کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔

قیصر نے کچھ ایسا سماں باندھا جیسے اس راستے پر شمشیر علی کے تمام مسائل کا خوبصورت ترین حل موجود تھا۔ شمشیر علی کے ناپختہ ذہن پر حالات کا دباؤ بھی بہت زیادہ تھا۔ وہ گھر سے بے گھر تھے' پرائے در پر پڑے تھے۔ دوسروں پر بوجھ بنے ہوئے تھے اور خود اپنی نظر میں شرمندہ تھے۔ ایک بیکراں اجنبی شہر میں تھے جہاں ہر کوئی دوسرے کو کچل کر آگے بڑھنے کی فکر میں تھا۔ فاقہ کشی کا عفریت روز ہی منہ کھولے اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیتا تھا۔ پھر وہ اپنی کمسن بہن کو اب بھی سر جھکائے ٹھنڈے چولہے کے قریب تیلی سے کچی زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے دیکھتا تھا تو رگ و پے میں آگ سی بھڑکنے لگتی تھی۔ ذہن کے کسی تاریک گوشے میں کہیں ایک انتقامی سی کیفیت کی چنگاری بھی سلگ رہی تھی۔ آخر اس کی معصوم بہن کا کیا قصور تھا جو اس کے ساتھ یہ سلوک ہوا تھا؟ بلکہ ان سب کا ہی کیا قصور تھا جو وہ اس طرح سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور تھے؟

اس قسم کی چنگاریوں کو قیصر نے نہایت ماہرانہ انداز میں ہوا دی تھی۔ ان سب عوامل نے مل کر اسے اس راستے کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا تھا جو قیصر اسے دکھا رہا تھا اس کے سامنے اپنی اور اپنی بہن کی پہاڑ سی زندگی بھی تھی؟ آخر وہ کیسے زندگی گزاریں گے؟ ان کے پاس تعلیم نہیں تھی۔ کوئی ہنر نہیں تھا۔ سر چھپانے کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ ایک وقت روٹی کھا لیتے تھے تو دوسرے وقت کا پتہ نہیں ہوتا تھا کہ کہاں سے کھائیں گے۔

قیصر نے پہلے ہی دن بغیر کسی کام کے پانچ ہزار روپیہ اس کے سامنے پھینک کر اسے گویا آسانی سے حاصل ہونے والی دولت کا ذائقہ چکھایا تھا اور آئندہ کے لئے بھی اس نے ہر ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ اس نے اسے یہ یقین بھی دلا دیا تھا کہ وہ اسے کوئی خطرناک راستہ سمجھ کر خوفزدہ نہ ہو۔ یہ تو بہت آسان کام تھا۔ اسے کسی بھی چیز سے ڈرنے



کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کام کے لئے فضا سب سے زیادہ سازگار تھی۔ ڈاکوؤں کو دیکھ کر سب کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ اکثر لوگ تو رپورٹ درج کرانے سے بھی بچنے کی کوشش کرتے تھے اور' یہ سوچ کر زیادہ خوفزدہ ہو جاتے تھے کہ ڈاکوؤں کی ڈوریاں نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچتی ہوں۔

قیصر نے یہ اطمینان بھی دلایا تھا کہ اگر کبھی گرفتار ہونے کی نوبت آ بھی جائے تب بھی گھبرانے یا خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مختلف طریقوں کے ذریعے پولیس سے معاملہ طے کرنے یا پھر نمٹنے کا بھی بندوبست تھا اور اگر کوئی معاملہ عدالت میں جانے کی نوبت آ ہی جاتی تو قانونی موشگافیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ خاص قسم کے وکیلوں کے ذریعے اپنے آدمی کو جلد از جلد باہر لانے اور دوبارہ اپنی سرگرمیوں میں مصروف کر دینے کا بندوبست موجود تھا۔ بس اتفاقاً" ہی کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ سکتا تھا......اور اتفاقاً" تو بھلا کس کے ساتھ کیا نہیں ہو سکتا تھا؟ دفتر جاتے ہوئے ایک شریف اور دیانتدار آدمی کو گولی بھی لگ سکتی تھی۔ اپنی ڈیوٹی دیتا ہوا ایک بے ضرر اور بے گناہ آدمی بھی لرزہ خیز انداز میں قتل کیا جا سکتا تھا۔

آخر کار شمشیر کی ذہنی مزاحمت دم توڑ گئی تھی۔ اس نے ہر طرف سے اپنے آپ کو بے حد مجبور محسوس کیا تھا۔ وہ گروہ میں شامل ہو گیا تھا اور منان موتی کا ایک ہونہار شاگرد ثابت ہوا تھا۔ چند ہی دن میں اس نے دو تین قسم کے ہتھیاروں کا عمدگی سے استعمال اور ڈاکہ زنی کے خاص خاص اسرار و رموز سیکھ لئے تھے۔ پہلی بار جب اس نے ٹی ٹی ہاتھ میں پکڑا' اسی روز اسے ایک عجیب سی طاقت کا احساس ہوا حالانکہ ابھی اسے اس کو استعمال کرنا نہیں آیا تھا۔ اسے ایک ویرانے میں لے جا کر ہتھیار استعمال کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ اس کام میں نشانہ بہت اچھا ہونا گو کہ ضروری نہیں تھا لیکن شمشیر نے خود ہی اپنی محنت سے نشانے بازی میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ پھر اسے مختلف علاقوں اور وہاں کے مکانوں اور مکینوں کی عمومی خصوصیات کے بارے میں بتایا گیا تھا۔

کئی ڈاکوؤں میں وہ ٹی ٹی یا ماؤزر ہاتھ میں پکڑے صرف "اپرنٹس" کے طور پر ساتھ رہا تھا۔ اس کے ذمے کوئی خاص کام نہیں تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ان راستوں سے بھی اتنی دولت سمٹ کر آ سکتی تھی۔ اس کا خوف دور ہو گیا اور اس نے محسوس کیا کہ واقعی یہ تو کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔

اس کام کے لئے قیصر کے پاس ایک مکمل نیٹ ورک موجود تھا اور وہ کسی صنعت کی طرح اسے چلا رہا تھا۔ شمشیر کو گروہ میں کافی دن گزر گئے تھے لیکن ابھی وہ صحیح اور مکمل طور پر اس نیٹ ورک کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ گروہ کے ہر آدمی کو ہر بات کا علم نہیں ہوتا تھا۔ اسے صرف اتنا ہی علم ہوتا تھا جتنا اس کے لئے ضروری ہوتا تھا تاہم بعض باتوں کے

بارے میں شمشیر نے اندازے لگائے تھے۔

جن مکانوں' دفتروں' بنکوں یا دکانوں میں ڈاکے ڈالے جا سکتے تھے۔ ان کے بارے میں کسی ذریعے سے اطلاعات آتی تھیں۔ بعض اطلاعات کی روشنی میں اطمینان سے تیاری کی جاتی تھی۔ بعض ڈاکوں کے لئے ہنگامی طور پر جانا پڑتا تھا۔ کامیاب واردات کے بعد سارا مال پہلے کسی کی بیشی کے بغیر ایک جگہ بھیجا جاتا تھا۔ دو دن بعد سب کو حسب مراتب اپنا اپنا حصہ مل جاتا تھا۔ شمشیر کو سب سے کم حصہ ملتا تھا لیکن اس کے لئے وہ بھی اس کے تصورات سے زیادہ تھا کیونکہ اس نے غربت اور قناعت کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔

اس نے محسوس کیا تھا کہ اصل باس قیصر بھی نہیں تھا۔ شاید وہ بھی کسی کو جواب دہ تھا لیکن وہ شخصیت پردہ راز میں تھی۔ اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا اور کسی کو جاننے کی پرواہ بھی نہیں تھی۔ گروہ صرف انہی چھ نوجوانوں پر مشتمل نہیں تھا جس میں شمشیر شامل تھا بلکہ پانچ پانچ چھ چھ نوجوانوں کی کئی ٹولیاں تھیں۔ مکمل گروہ اصل میں ان ٹولیوں کا مجموعہ تھا۔ عام حالات میں یہ ٹولیاں ایک دوسرے سے لاتعلق رہتی تھیں۔ صرف ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کے لئے پہنچتی تھیں یا ٹولیوں میں سے خاص خاص افراد کا تبادلہ ہوتا تھا۔

قیصر ان سب ٹولیوں کا انچارج تھا اور بڑی خطرناک شخصیت کا مالک تھا لیکن بظاہر وہ ایک معزز' شریف اور بے ضرر بزنس مین تھا۔ وہ ایک پوش علاقے میں امپورٹ اور ایکسپورٹ کا چھوٹا سا دفتر کھولے بیٹھا تھا جس میں نہایت خوبصورت لڑکیوں سمیت چار چھ آدمیوں کا باقاعدہ سٹاف موجود تھا لیکن شمشیر کو ابھی تک صحیح طور پر پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ کیا امپورٹ اور کیا ایکسپورٹ کرتا تھا۔ اس کا سرکاری اور سماجی حلقوں میں بہت اچھا میل جول تھا۔ وہ فائیو سٹار ہوٹلوں میں تقریبات میں شرکت کرتا تھا اور بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔

میڈم شہ پارہ اس کی خاص الخاص دوست تھی اور اس کے لئے شاید سب سے زیادہ کام کی عورت تھی۔ شہ پارہ کے بارے میں شمشیر علی نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ان غیر ملکیوں میں سے تھی جن کے خاندان برس ہا برس پہلے آ کر کراچی میں آباد ہو گئے تھے اور یہیں رچ بس گئے تھے۔ وہ شادی شدہ تھی اور اس کا شوہر سیٹھ قاسم زیادہ تر ملک سے باہر رہتا تھا جس کی عدم موجودگی میں قیصر سے اس کی ملاقاتیں جاری رہتی تھیں۔ سیٹھ قاسم کے بارے میں شمشیر علی نے کچھ اڑتی اڑتی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ سونے اور ہیروں کا کوئی بڑا سمگلر تھا اور بے اندازہ دولت کا مالک تھا۔ شہ پارہ' سیٹھ قاسم اور قیصر تینوں بوقت ضرورت مختلف انداز میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے اور ایک دوسرے کے کام آتے



تھے۔

بہت سی باتیں' بہت جلدی' کافی حد تک شمشیر کی سمجھ میں آ گئی تھیں اور ایک بار جب اس نے پر پرزے نکال ہی لئے تھے تو پھر بہت کم عرصے میں بہت ہی تیز و طرار ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک گوٹھ میں ہی رہ رہا تھا لیکن اب انہوں نے سستا سا ایک الگ پلاٹ لے کر اس پر اپنی ضروریات اور قیصر کی ہدایات کے مطابق سستی اور عارضی سی تعمیر کر کے کئی کمرے بنا لئے تھے۔

باہر سے دیکھنے میں یہ ایک معمولی اور غریبانہ مکان معلوم ہوتا تھا لیکن اندر سے اس کی حالت کافی بہتر تھی۔ اس میں تمام ضروریات زندگی موجود تھیں بلکہ ٹی وی اور وی سی آر وغیرہ تک آ چکا تھا۔ ان چیزوں کا تو شمشیر نے زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ یہ اس کے گھر میں ہوں گی۔ گوٹھ میں اس نے یہی مشہور کر رکھا تھا کہ وہ ایک ٹھیکیدار کے ساتھ مل کر کام کر رہا تھا جس کے ساتھ منافع میں بھی اس کا کچھ فیصد حصہ تھا۔ اس طرح اس نے تیزی سے اپنے حالات بہتر ہونے کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خود بھی گوٹھ میں کسی سے زیادہ میل جول نہیں رکھتا تھا اور اس نے گھر والوں کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ اتنی زیادہ خوش خلقی کا مظاہرہ نہ کریں کہ ان کے گھر میں سارے گوٹھ والوں ہی کی آمدورفت شروع ہو جائے۔ اپنی اس ہدایت کی وجہ اس نے یہ بتائی تھی کہ کچھ ہی عرصہ پہلے تک ان کی غربت اور بدحالی کی وجہ سے کوئی ان سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا لیکن اب ان کے گھر میں خوشحالی دیکھ کر ہر ایک راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کرے گا اور دل ہی دل میں حسد بھی کرے گا' جڑیں کاٹنے کی کوشش بھی کرے گا۔ اس کے والدین نے اس کی باتوں سے اتفاق کیا تھا اور اس بات پر خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ ان کے بیٹے کو نہ صرف خوشحالی کا راستہ مل گیا تھا بلکہ شہر آنے کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں وہ بہت سمجھدار بھی ہو گیا تھا۔ عقلمندی کی باتیں کرنے لگا تھا۔

شمشیر جس گینگ میں شامل تھا اس کے لڑکے شہر کے مختلف علاقوں میں رہتے تھے۔ ٹیلیفون وغیرہ پر آپس میں رابطہ رہتا تھا۔ منان موتی کے پاس تو موبائل فون بھی تھا۔ صرف منان ہی اکیلا رہتا تھا باقی پانچوں اپنے والدین کے ساتھ رہتے تھے۔ منان یوں تو فلیٹ میں رہتا تھا لیکن وہ ایسے علاقے میں اور ایسی عمارت میں تھا کہ اگر کبھی وہاں چھ کے چھ لڑکے بھی جمع ہوتے تھے اور رات بھر بھی قیام کرتے تھے تو کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ کبھی ذرا عیاشی کا پروگرام بن جاتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ رات رات بھر وی سی آر پر فلمیں چلتی تھیں اور پینے پلانے کا دور بھی چلتا تھا۔ انہوں نے شمشیر علی کو بھی ان چیزوں کا چسکا لگا دیا تھا۔

کبھی کبھی کوئی واردات خراب ہو جاتی یعنی ناکام ہو جاتی یا اس انداز میں پایہ تکمیل کو نہ پہنچتی جس طرح انہوں نے منصوبہ بندی کی ہوتی تھی اور انہیں کچھ خطرہ محسوس

ہونے لگتا تو سب لڑکے شمشیر کے گھر جا کر ٹھہرتے۔ وہ ایک محفوظ ٹھکانا تھا اور وہاں ہنگامی طور پر بھی مہمانوں کو ٹھہرانے کے انتظامات موجود تھے۔

اس زندگی میں ہیجان خیزی بے اطمینانی اور اعصابی تناؤ تھا۔ یہ شمشیر علی نے شروع میں ہی محسوس کر لیا تھا۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا۔ فرق کو محسوس کر سکتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ کچھ عرصہ پہلے تک ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے۔ وہ روکھی سوکھی کھاتے تھے اور پرائے گھر میں رہتے تھے لیکن رات کو وہ کھردری چارپائی پر بھی ٹانگیں پسار کر اطمینان سے سوتا تھا اور لیٹتے ہی اسے نیند آ جاتی تھی لیکن اب اگر اسے رات کو گھر پہ رہنے کا موقع ملتا تھا تو آرام دہ بستر پر بھی وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہتا تھا۔

زندگی کا کوئی لگا بندھا نظام بھی نہیں رہا تھا۔ نہ سونے کا کوئی وقت تھا اور نہ ہی جاگنے یا کھانے پینے کا۔ ڈاکوؤں کے لئے بھی وقت کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ وہ دن میں بھی ڈاکے مارتے تھے اور رات کو بھی۔ کبھی کام میں تیزی آ جاتی تھی' اوپر تلے کئی وارداتیں ہو جاتی تھیں۔ کبھی کئی کئی دن آرام کرتے' ادھر ادھر گھومتے یا کچھ نئی چیزیں سیکھتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ ویسے ہر واردات بھی اپنی جگہ بہت سے نئے تجربات جھولی میں ڈال جاتی تھی۔

بہرحال شمشیر علی اس زندگی کی ساری ہیجان خیزی' بے اطمینانی اور اعصابی تناؤ برداشت کر رہا تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ ابھی اس کے جسم اور اعصاب میں بہت کچھ سہنے کی جان تھی۔ اس کے باوجود اسے سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے جب اسے پینے پلانے کا چسکا لگایا تو یکدم ہی وہ اس مشغلے کی طرف کچھ زیادہ ہی تیزی سے کھنچتا چلا گیا۔ شاید یہی وہ سہارا تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ اس وقت کوئی سراب بھی اس کے لئے غنیمت تھا۔

جب شمشیر اس نئی زندگی کا کچھ عادی ہو چلا تو اسے اپنا عہد یاد آیا۔ انتقام کا جو شعلہ مصائب و مشکلات اور تنگ دستی کی دھول میں دب گیا تھا' اسے پھر ہوا ملنے لگی اور وہ جسم و جاں کو جلانے لگا۔ اب اس کے پاس ٹی ٹی بھی تھی' ماؤزر بھی تھا' ضرورت پڑنے پر کلاشنکوف حتیٰ کہ سب مشین گن بھی مل سکتی تھی تجربہ بھی حاصل ہو چکا تھا۔ مزاج میں بے خوفی اور خود اعتمادی بھی شامل ہو چکی تھی۔ پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ وسائل بھی میسر آ چکے تھے۔ اب اس وکیل خالد تیموری سے بھی نمٹ لینا چاہئے تھے جس کے خلاف نفرت کا زہر اس کے دل میں قطرہ قطرہ کر کے جمع ہوا تھا اور خون کے ساتھ اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ اس کے بعد اس مردود نیاز کی باری تھی۔

اسے احساس تھا کہ نیاز علی سے نمٹنے کے لئے اب بھی وہ اکیلا کافی نہیں تھا۔ وہ اسے گھات لگا کر قتل کرتا تب بھی شاید اسے مدد کی ضرورت پڑتی کیونکہ نیاز علی ہمیشہ اچھے



دو چار مسلح محافظوں یا ساتھیوں میں گھرا ہوتا تھا۔ شمشیر نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اسے کبھی تنہا نہیں دیکھا تھا۔ نیاز اور اس کے ساتھی یا محافظ اسلحے اور مار دھاڑ کے میدان کے بھی پرانے کھلاڑی تھے۔ وہ ان نہتے' شریف اور کم حوصلہ عام شہریوں کی طرح نہیں تھے جو ہتھیار دیکھ کر دو چار فائروں کی آواز سن کر ادھر ادھر دبک جاتے تھے۔

بہرحال شمشیر کو امید تھی کہ اس معاملے میں اس کے ساتھی' اس کی ٹولی کے ارکان اس کی مدد کر سکتے تھے۔ گو کہ وہ لوگ اپنے طور پر کبھی کوئی کارروائی نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ایسے کسی کام میں ٹانگ اڑاتے تھے جس کا انہیں حکم نہیں ملتا تھا۔ نوجوانی میں ہی وہ خالص پیشہ ور بن چکے تھے' اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ فارغ اوقات میں تو وہ یہی کوشش کرتے تھے کہ ان کی شکل بھی کم سے کم لوگ دیکھیں..... لیکن شمشیر کو امید تھی کہ وہ انہیں دوستی اور مروت کے ناطے اپنی مدد پر آمادہ کر لے گا۔ اسی خیال سے اس نے ان کے ساتھ صرف رسمی اور پیشہ ورانہ تعلق رکھنے کے بجائے ذاتی دوستی اور گہرا تعلق استوار کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ہر طرح سے ہر ایک کے کام کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اپنے آپ کو ان کا مخلص دوست ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا لیکن اسے صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس حد تک ان کا دل جیتنے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہ بہت شاطر لڑکے تھے۔ ان کے محسوسات کے بارے میں کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔

ایک روز اس نے منان موتی کے ساتھ اس کے فلیٹ پر وی سی آر پر فلم دیکھنے کے دوران میں سرسری سے انداز میں کہا۔ "یار! مجھے ایک وکیل کی تلاش ہے.....؟"

"کیوں.....؟ کیا رضاکارانہ گرفتاری دینے کا ارادہ ہے؟" منان نے شاطرانہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"توبہ کرو یار.....! خدا نہ کرے کہ میں کبھی گرفتاری دوں..... شمشیر علی یا تو پولیس مقابلے میں مرے گا اور اگر اس کا بھی موقع نہ ہوا' حالات بہت خراب ہوئے تو خود اپنی کنپٹی میں گولی مار لے گا..... گرفتاری کبھی نہیں دے گا۔"

"اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں..... باس کی ہدایت بھول گیا کیا؟ گرفتار ہونے کی نوبت آ جائے تو زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ ہمارے گروپ میں تو نہیں..... لیکن میں نے سنا ہے دوسرے گروپوں میں بعض لوگ کئی کئی مرتبہ گرفتار ہوئے ہیں مگر پھر باہر آ گئے ہیں....." منان ذرا سنجیدگی سے بولا۔

"لیکن بندوبست ہونے تک بھی ان میں سے بعض کے ساتھ بہت کچھ ہو گیا۔ میں اس قسم کا کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا۔ پولیس کے ہتھے چڑھنے سے مر جانا ہی بہتر ہے۔" شمشیر بولا۔

"ابے احمق! اسی طرح تو پکے ہوتے ہیں۔ جس نے پولیس کی مار سہہ لی سمجھ لو وہ

لوہا ہو گیا۔" منان موتی اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"خوش فہمی ہے تمہاری....." شمشیر بولا۔ "جس نے پولیس کی مار سہہ لی' سمجھ لو وہ زندگی بھر کے لئے روگی ہو گیا.....اور میں روگی بن کر جینا نہیں چاہتا۔ تم نے میری پوری بات تو سنی نہیں اور بات کو کہاں سے کہاں لے گئے۔ مجھے جس وکیل کی تلاش ہے وہ میرے گاؤں کا ہے اور مجھے اس سے اپنے گاؤں کے پرانے مکان کے سلسلے میں ایک کام ہے۔ میرا اس کو تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔"

"باس کو بول دو۔ وہ دس منٹ میں تلاش کرا دے گا۔" منان بے پروائی سے بولا۔

"یار! میں باس کو اس معاملے میں نہیں گھسیٹنا چاہتا۔" شمشیر بولا۔

"اچھا.....؟" منان نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد گویا اس کی مدد پر آمادہ ہوتے ہوئے بولا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ وہ ڈسٹرکٹ کورٹ کا وکیل ہے یا ہائیکورٹ کا؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔" شمشیر سادگی سے بولا۔

"یار! تو ہماری اتنی محنت کے باوجود گھامڑ کا گھامڑ ہی ہے۔" منان اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "بہرحال.....تیری سادگی دیکھ کر تجھے مایوس کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ دیکھ.....پریکٹس کرتے ہوئے کسی وکیل کو ڈھونڈنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اس شہر میں کل پانچ چھ ہزار وکیل ہیں اور وہ سب کے سب عدالتوں اور جائیداد کی رجسٹری وغیرہ کے دفتروں کے آس پاس پائے جاتے ہیں۔ تو سب سے پہلے ڈسٹرکٹ اور پھر ہائیکورٹ میں تلاش کر.....اور اس کے بارے میں صرف وکیلوں ہی سے پوچھ.....چند دن کے اندر اندر ضرور اس کا سراغ مل جائے گا.....لیکن اگر کوئی بہت ہی ضروری کام ہے تب تو اسے تلاش کر.....ورنہ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں....."

"کام تو بہت ضروری ہے یار!" شمشیر نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا اور گاؤ تکئے کے سہارے نیم دراز ہو کر ٹی وی کے بجائے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

دوسرے روز سے اس نے معمول بنا لیا کہ جب بھی اسے دن میں فاضل وقت میسر ہوتا وہ عدالت پہنچ جاتا اور وکیلوں سے خالد تیموری کے بارے میں معلوم کرتا۔ خالد تیموری کو تلاش کرنا اس کی توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوا۔ صرف دو چار دن ضائع ہوئے جو اس نے ڈسٹرکٹ کورٹ میں پوچھ گچھ کرتے ہوئے گزارے۔ ہائیکورٹ میں آتے ہی اسے پہلے دن ہی خالد تیموری کا سراغ مل گیا۔ اس تلاش کے دوران میں اسے دو چار دوسرے خالدوں کی طرف بھی بھیج دیا گیا لیکن آخر کار ایک وکیل نے اس کی صحیح رہنمائی کی۔

"خالد تیموری صاحب.....؟" وہ فوراً ہی بولا۔ "میں نے ابھی ابھی انہیں بار روم سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ شاید وہ اپنے آفس جا رہے ہوں۔ اگر تم جلدی سے باہر جا کر



سیڑھیاں اتر کر دیکھو تو' شاید وہ الٹے ہاتھ والے کونے کی طرف تمہیں جاتے ہوئے نظر آ جائیں۔ وہ سیاہ رنگ کی ایک بڑی سی مرسیڈیز میں بیٹھیں گے۔ بغیر وردی والا ایک لمبا تڑنگا نوجوان ڈرائیور گاڑی کے پاس کھڑا ہو گا....."

شمشیر نے اس سے آگے کچھ نہیں سنا اور باہر کی طرف لپکا۔ نہ جانے کیوں اس کے دل نے گواہی دی کہ اسے صحیح آدمی کا سراغ مل گیا تھا۔ خالد تیموری سے پہلے اس نے عدالت کے احاطے سے باہر اس کی گاڑی تلاش کر لی۔ بائیں کونے پر واقعی ایک سیاہ مرسیڈیز کھڑی تھی اور اس سے ٹیک لگائے پتھریلے سے چہرے والا ایک لمبا تڑنگا نوجوان کھڑا عدالت کی عمارت سے باہر آنے والوں کو سپاٹ سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی نہ جانے کیوں شمشیر کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہ ایک طرف کو دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ خالد شاید راستے میں کہیں رک گیا تھا۔

شمشیر کو صرف چند سیکنڈ ہی انتظار کرنا پڑا۔ وکیل نے اس کی صحیح رہنمائی کی تھی۔ اسے واقعی وہ خالد نظر آ گیا جس کی اسے تلاش تھی۔ سیاہ کوٹ اور سیاہ ٹائی میں خالد تیموری بریف کیس اٹھائے تیزی سے سیڑھیاں اترتا آ رہا تھا۔

○

خالد تیموری کو دیکھ کر شمشیر کے جسم میں چنگاریاں سی دوڑنے لگیں لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ خالد کو کسی بھرے پرے اور پرہجوم مقام پر قتل کرنا عقلمندی نہیں تھی۔ اس طرح تو وہ خود پھنس سکتا تھا۔ اسے یہ کام نہایت اطمینان اور منصوبہ بندی سے کرنا تھا۔ ہائیکورٹ کے عین سامنے اس قسم کی حرکت کرنا اور پھر فرار ہونے کی کوشش کرنا تو اور بھی بے وقوفی تھی۔ چاروں طرف دور دور تک علاقے پر ہجوم تھا۔ ٹریفک بہت زیادہ ہوتا تھا۔ قریب ہی اسمبلی کی بلڈنگ تھی۔ ہائیکورٹ اور اسمبلی کے اردگرد پولیس والے کافی تعداد میں موجود رہتے تھے۔ اسے یہاں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب جبکہ اس نے خالد تیموری کو انسانوں کے اس سمندر میں تلاش کر لیا تھا تو پھر باقی کام مشکل نہیں تھا۔

اس نے خالد تیموری کو بڑی سی سیاہ مرسیڈیز میں بیٹھتے ہوئے دیکھا جس کے شیشے بھی سیاہ نظر آ رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ شہر میں گاڑیوں کے رنگین شیشوں پر پابندی تھی لیکن قانون کی نمائندگی کرنے والا ایک شخص خود رنگین شیشوں والی گاڑی میں جا رہا تھا۔ شمشیر یہ سوچتے ہوئے تلخی سے مسکرا دیا کہ قانون شاید بڑے لوگوں کے لئے.....دولت مندوں کے لئے اور اثر رسوخ والوں کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ پھر اس خیال سے اس کی مسکراہٹ کچھ گہری ہو گئی کہ وہ خود بھی اب انہیں لوگوں میں شامل ہو گیا تھا جو قانون کا مذاق اڑا سکتے تھے' اس کی دھجیاں بکھیر سکتے تھے حالانکہ وہ تو کوئی بڑا آدمی نہیں تھا' دولت مند نہیں تھا اور اس کا کوئی اثر و رسوخ نہیں تھا مگر شاید وہ ایسے لوگوں کا آلہ کار بن کر ہی بہت کچھ کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔

وہ دیوار کی اوٹ سے نکل آیا اور کچھ فاصلے پر کھڑی اپنی طاقتور موٹر سائیکل پر جا بیٹھا۔ موٹر سائیکل اس نے سٹارٹ کی اور جونہی سیاہ مرسیڈیز روانہ ہوئی اس نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ تعاقب اس کے لئے زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا۔ پرہجوم سڑکوں پر بڑی سی گاڑی تو جگہ جگہ پھنس بھی جاتی تھی اور اسے رفتار بھی کم کرنی پڑتی تھی لیکن موٹر سائیکل اکثر جگہوں سے لہراتی ہوئی نکل جاتی تھی۔

شمشیر نے بہت ہوشیاری سے تعاقب کیا۔ اس روز اس کے پاس وقت بھی تھا۔



نہایت اطمینان سے وہ سیاہ مرسیڈیز کے پیچھے لگا رہا اور اس نے خالد تیموری یا اس کے ڈرائیور کو تعاقب کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اس روز شام تک اس نے خالد کا دفتر بھی دیکھ لیا اور وہ بلڈنگ بھی' جس میں خالد کی رہائش تھی۔ اب اسے اطمینان تھا۔ خالد کے تینوں ٹھکانے اس کی نظر میں آ گئے تھے۔ ہائیکورٹ' دفتر اور گھر.....اب اس سے اگلے مرحلہ طے کرنا قطعاً کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کسی بھی دن اطمینان سے وہ مناسب موقع دیکھ کر اپنا کام کر سکتا تھا۔ یہ اطمینان دل میں لئے وہ گھر لوٹ آیا۔

○

آسیہ کی اکڑی ہوئی لاش ایک لمبی سی میز پر پڑی تھی۔ ڈاکٹر تحسین اپنے چہرے پر اذیت کے آثار لئے ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ اپنی بیوی کی لاش دیکھنے سے گریز کر رہا تھا البتہ جمال صاحب نہایت غور سے اس کا معائنہ کر رہے تھے۔ شاید وہ اب اپنے پیشے میں اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں جذبات' رشتوں اور تعلقات کی اہمیت ثانوی ہو جاتی تھی اور فرض غالب آ جاتا تھا۔ اس وقت بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ بات یہ نہیں تھی کہ انہیں آسیہ کی پراسرار موت کا دکھ نہیں تھا۔ بلاشبہ ان کا دل بھی تاسف اور غم سے بوجھل تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ آسیہ کی پراسرار موت کی وجہ جاننا بھی ان کے خیال میں ضروری تھا جس سے گاؤں میں ہونے والی دوسری اموات کے بارے میں بھی کچھ رازوں پر سے پردہ اٹھنے کی امید تھی۔

وہ اس وقت گھر کے ایک فاضل سٹور میں کھڑے تھے جس میں سامان نہیں تھا۔ یہ بھی ایک اچھا خاصا کشادہ کمرہ تھا۔ اسے انہوں نے اپنے عارضی آپریشن تھیٹر کی شکل دے لی تھی۔ جمال صاحب نے پوسٹ مارٹم کے لئے اپنا تمام ضروری سامان اور کیمیکلز وغیرہ یہیں لا کر رکھ لئے تھے۔ قبرستان سے تو وہ کوئی تازہ لاش حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے اور یہ کام آئندہ بھی بہت دشوار ثابت ہو سکتا تھا اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ آسیہ ہی کی لاش کا پوسٹ مارٹم کر لیا جائے۔ تحسین نے بھی اپنے جذبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کی اجازت دے دی تھی۔

لاش کے معائنے کے بعد جمال صاحب سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولے۔ "عجیب بات ہے..... آسیہ کے دل کی دھڑکن رک چکی ہے..... نبض ساکت ہے اور بظاہر لاش بھی اکڑی ہوئی ہے۔ یعنی وہ تمام نشانیاں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی موت کو کافی دیر گزر چکی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کا گوشت سرد یا مردہ نہیں ہے۔ اس میں ابھی تک مردہ گوشت کی خصوصیات پیدا نہیں ہوئی ہیں..... حتیٰ کہ....."

جملہ ادھورا چھوڑ کر انہوں نے لاش کے بازو میں ایک سوئی چبھوئی اور پھر نکال لی۔ اس جگہ سے دھیرے دھیرے خون کی بوندیں ٹپ ٹپ فرش پر گرنے لگیں کیونکہ بازو اس بیچ نما میز سے نیچے جھول رہا تھا۔

"یہ دیکھو....." جمال صاحب حیرت زدہ انداز میں تیزی سے بولے۔ وہ خون کی بوندوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ تحسین کی آنکھیں بھی پھیل گئیں۔

جمال صاحب نے مناسب سمجھا کہ آسیہ کے بازو پر بندھی ہوئی پٹی کو بھی کھول دیا جائے۔ وہ جب سے آئے تھے انہوں نے یہ پٹی آسیہ کے بازو پر بندھی دیکھی تھی اور اس کی حالت بتاتی تھی کہ وہ اس سے بھی پہلے کی بندھی ہوئی تھی۔ تحسین کا کہنا تھا کہ پٹی اس نے نہیں باندھی تھی۔ شاید کسی کی مدد سے آسیہ نے خود ہی باندھ لی تھی۔ چھوٹے موٹے زخموں کی ڈریسنگ وہ خود ہی کر لیتی تھی اس کا کہنا تھا کہ وہاں کوئی کیل لگ گئی تھی۔

جمال صاحب نے جونہی پٹی کھولی انہیں آسیہ کے بازو پر تقریباً" ایک انچ لمبا زخم نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بازو کسی نوکیلی چیز پر ذرا زور سے رگڑ کھا گیا تھا اور گوشت میں چیرا سا آگیا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ پٹی کئی دن سے بندھی معلوم ہوتی تھی لیکن زخم بالکل تازہ دکھائی دے رہا تھا۔ پٹی کے ہٹتے ہی جیسے دوران خون کی رکاوٹ دور ہوئی اور خون رسنے لگا۔ اس زخم سے بھی خون ٹپ ٹپ فرش پر گرنے لگا۔

تحسین اور جمال صاحب دونوں دم بخود کھڑے تھے۔ آسیہ کی لاش کہنے کو ایک لاش ہی تھی۔ اس میں زندگی کی دوسری علامتیں موجود نہیں تھیں لیکن اس میں دوران خون جاری تھا۔ یہ ایک ناقابل یقین سی بات تھی۔

پھر جیسے جمال صاحب کو کوئی خیال آیا اور وہ چونکتے ہوئے بولے۔ "تحسین! ہمیں اس خون کا تجزیہ کرنا چاہئے۔"

انہوں نے جلدی سے ایک سلائیڈ اٹھائی اور اس پر ٹپکتے ہوئے خون کے دو تین قطرے لئے۔ انہوں نے اس پر دوسری سلائیڈ رکھی۔ خون کے قطرے دونوں سلائیڈوں کے درمیان گویا مقید ہو گئے اور پھیل گئے۔ جمال صاحب جلدی سے خوردبین کے قریب پہنچے اور وہ جڑواں سلائیڈ اس کے نیچے رکھ کر اس کا معائنہ کرنے لگے۔

چند سیکنڈ بعد وہ گھبرائے ہوئے سے انداز میں پیچھے ہٹے اور تقریباً" چلا اٹھے۔ "تحسین! جلدی سے یہاں آؤ! ایسی ناقابل یقین چیز شاید تم نے آج تک نہیں دیکھی ہو گی۔"

تحسین آگے آیا اور خوردبین پر جھک گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ بھی گھبرائے ہوئے سے انداز میں پیچھے ہٹ گیا اور پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔ "یہ خون آسیہ کا ہرگز نہیں ہو سکتا.....خلیات کی ساخت بتا رہی ہے کہ یہ تو کسی درندے کا خون ہے۔"



"لیکن تم خود دیکھ چکے ہو کہ یہ نمونہ میں نے آسیہ کے جسم سے.....یا یوں کہو کہ اس کی لاش سے ٹپکتے ہوئے خون سے حاصل کیا ہے۔" جمال صاحب زور دے کر بولے اور یہ ایک ایسی بات تھی جسے تحسین جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ خون کا نمونہ لئے جمال صاحب کو چند سیکنڈ بھی نہیں گزرے تھے۔ تحسین نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

"اف میرے خدا.....! یہ کیا معمہ ہے.....آسیہ کے جسم میں کسی درندے کا خون.....جو اس کے دل کی دھڑکن رک جانے کے باوجود جسم میں گردش کر رہا ہے.....!" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور چہرے پر وحشت تھی۔

جمال صاحب اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولے۔ "ہمت ہار کر مت بیٹھو۔ اس طرح کچھ حاصل نہیں ہو گا اور ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہو گا۔ اٹھو.....اور پوسٹ مارٹم میں میری مدد کرو۔"

آخر تحسین اٹھ کھڑا ہوا اور جمال صاحب کا ہاتھ بٹانے لگا۔ لاش سے خون کا بہاؤ جلد رک گیا۔ وہ تقریباً" ایک گھنٹہ پوسٹ مارٹم میں مصروف رہے۔ انہوں نے جگہ جگہ نشتر لگائے۔ کئی چیزوں کے تجزیئے کئے۔ دواؤں اور کیمیکلز سے مدد لی لیکن ان کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں جان سکے جس سے آسیہ کی پراسرار موت کی وجوہات پر کچھ روشنی پڑ سکتی۔ آخر کار جمال صاحب نے اعضا پر ٹانکے لگائے جنہیں انہوں نے نشتر سے چیرا تھا۔ پھر انہوں نے لاش کو سفید چادر سے ڈھانپ دیا۔ وہ دونوں اچھی طرح ہاتھ دھو کر اور جراثیم کش دوا سے بھی صفائی کر کے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ تحسین تھکے تھکے انداز میں ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ سارہ کو انہوں نے آرام کی غرض سے بصد اصرار بیڈ روم میں بھیج دیا تھا۔ شاید وہ سو گئی تھی۔ جمال صاحب نے اسے ایک خواب آور گولی دی تھی۔

"تحسین! تم بھی جا کر آرام کرو۔ پچھلے چوبیس گھنٹے سے تم سوئے نہیں ہو۔" جمال صاحب ملامت سے بولے۔

"میں کیسے سو سکتا ہوں۔ ابھی تو مجھے آسیہ کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کرنا ہے۔" تحسین بولا پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا اور اس نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "اگر ہمیں دوسری لاشوں کے پوسٹ مارٹم کا موقع ملتا تب بھی شاید ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکتے۔ یہ واقعی ایک پراسرار مسئلہ ہے۔ اس کے سامنے ہماری طب اور سائنس بے بس نظر آتی ہے۔"

"ہاں.....لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔" جمال صاحب نے نیم دلی سے اعتراف کیا۔

دفعتاً" باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی پھر ہولے سے دستک ہوئی۔ جمال

صاحب کی کوشش تھی کہ تحسین کو کم سے کم زحمت ہو۔ انہوں نے جلدی سے خود اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے انسپکٹر دل محمد کھڑا تھا۔ جمال صاحب نے اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ اس نے اندر آ کر بغور دونوں افراد کے چہروں کا جائزہ لیا۔

تحسین اچانک ہی اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں آسیہ کی تدفین کے انتظامات کرنے جا رہا ہوں۔"

جواب کا انتظار کئے بغیر وہ رخصت ہو گیا۔ اسے گویا انسپکٹر کی آمد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اس کے تاثرات سے کچھ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے دنیا کی کسی بھی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ جمال صاحب کے خیال میں اس حالت کو پہنچنے میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ انسپکٹر دل محمد بھی شاید اس کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا اس لئے اس نے تحسین کے اس طرح اٹھ کر جانے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور جمال صاحب سے مخاطب ہوا۔ "سر! میں آپ کو محمد علی کے بارے میں بتانے آیا تھا۔"

"ہاں..... کچھ معلوم ہوا اس سے؟ کوئی کام کی بات بتائی اس نے؟" جمال صاحب نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

"سر! مجھے تو اس کی باتیں بے سروپا سی لگ رہی ہیں..... بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تو کچھ خوف سا محسوس ہونے لگا ہے....." اس نے جھرجھری سی لی اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "وہ اپنے مرحوم بھائی کی لاش کے بارے میں کچھ بتا رہا ہے لیکن مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آ رہا۔ آپ اور ڈاکٹر تحسین صاحب مل کر اس کے بھائی کی قبر کھود رہے تھے جب میں نے آپ کو آن پکڑا تھا..... لیکن آپ کو احمد علی کی قبر خالی ملی تھی..... یاد ہے نا؟؟"

"ہاں..... یہ کوئی پرانی بات تو نہیں..... گزشتہ رات ہی کی تو بات ہے۔" جمال صاحب بولے۔

"مجھے یہ لگتا ہے کہ محمد علی کی باتوں کا تعلق اس خالی قبر سے ہے لیکن مجھے اس کی باتوں کا یقین نہیں آ رہا۔" انسپکٹر دل محمد بولا۔ "اگر آپ مناسب سمجھیں تو ذرا دیر کے لئے میرے ساتھ چل کر اس کی بات سن لیں۔ شاید اس سے آپ کی معلومات میں کچھ اضافہ ہو۔"

"ہاں..... ہاں..... میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں....." جمال صاحب فوراً اٹھتے ہوئے بولے۔ "تم نے بہت اچھا کیا جو میرے پاس آ گئے..... تمہارا بہت شکریہ۔ تم یقیناً ایک اچھے پولیس آفیسر ہو۔"

"جی..... جی..... اچھے برے آدمی تو ہر شعبہ زندگی میں ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اچھے اور برے لوگ اتنے ہی ہیں جتنے عام انسانوں میں ہیں لیکن ہم بدنام کچھ زیادہ ہیں۔"



سی محمد متانت سے بولا۔

جمال صاحب اس کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر تھانے پہنچے۔ محمد علی اس وقت حوالات کے بجائے دل محمد کے کمرے میں تھا۔ ایک کانسٹیبل اس وقت بھی اس کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا اور اسے ڈنڈا دکھا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک آدھ ہلکا سا نیل دکھائی دے رہا تھا۔ جمال صاحب اور دل محمد کو دیکھتے ہی وہ گڑگڑانے کے سے انداز میں بولا۔

"جناب! میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں..... جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں..... آپ لوگ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟ اور جو کچھ میں بتا چکا ہوں اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔"

دل محمد نے جمال صاحب کو کرسی پیش کی اور خود اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ "میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ ہم نے تمہیں ڈاکٹر صاحب کی بیگم کی لاش کے پاس نشے میں دھت پڑے دیکھا تھا..... یہ بڑے سرجن صاحب بھی اس کے گواہ ہیں۔" اس نے جمال صاحب کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے جناب.....! میں مانتا ہوں کہ میں لاش کے قریب گر گیا تھا اور میں نے پی بھی رکھی تھی..... لیکن آپ یقین کریں میں نے بیگم صاحبہ کو ہرگز قتل نہیں کیا۔ میں نے تو انہیں چھوا بھی نہیں تھا۔ میں انہیں تو کیا' کسی کو بھی قتل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے انہیں قتل نہیں کیا..... بلکہ میں نے تو جو کچھ دیکھا اس کی وجہ سے میں خود ڈر کے مارے مرتے مرتے بچا تھا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں نے کیا دیکھا تھا۔"

انسپکٹر دل محمد بولا۔ "اس بات کو چھوڑو کہ تم نے مجھے کیا بتایا تھا۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ کل تمہاری ہوٹل میں اچھی خاصی تلخ کلامی ہوئی تھی اور رات تم نشے میں دھت تھے۔ شاید نشے میں تمہیں ڈاکٹر صاحب کی بیگم راستے میں کہیں نظر آئی ہوں اور تم نے سوچا ہو کہ حساب برابر کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ جو کچھ تم بتا رہے ہو وہ شاید تم نے نشے کی وجہ سے خیالوں ہی خیالوں میں دیکھا۔ نشے میں تم جیسے انسانوں کا دماغ ذرا زیادہ ہی اونچی ہواؤں میں اڑتا ہے..... اور ہم دماغ کو ٹھکانے لانا اچھی طرح جانتے ہیں۔"

جمال صاحب نے اس موقع پر گفتگو میں مداخلت کی اور محمد علی سے مخاطب ہوئے۔ "تم بتاؤ تو سہی کہ تم نے کیا دیکھا تھا؟؟"

محمد علی نے کچھ یوں جمال صاحب کی طرف دیکھا جیسے اسے یقین ہو کہ وہ اس کے نجات دہندہ ہوں گے۔ وہ ایک نئے جوش و خروش سے بولا۔ "صاحب! میں نے اپنے بھائی احمد علی کو دیکھا تھا۔ وہی احمد علی جو مر چکا تھا اور جسے ہم دفنا چکے تھے۔ میں نے اسے بالکل اس طرح صاف اور واضح طور پر دیکھا جس طرح اس وقت آپ کو دیکھ رہا ہوں۔"

انسپکٹر نے جمال صاحب کی طرف دیکھ کر متاسفانہ سے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "دیکھا آپ نے؟ اس کا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔ یہ پاگل ہو چکا ہے۔ ہمیں اس کا دماغ ٹھیک کرنا پڑے گا۔"

محمد علی رو دینے والے انداز میں بولا۔ "قسم سے میں پاگل نہیں ہوں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ میرا بھائی ہی تھا۔ کیا میں اپنے بھائی کو بھی نہیں پہچان سکتا؟ اس کے جسم پر اس کا کفن بھی کہیں کہیں اٹکا ہوا تھا لیکن اس کی بندشیں کھلی ہوئی تھیں اور اس کے وجود سے گیلی گیلی مٹی کی خوشبو بھی آ رہی تھی جس کے ساتھ کافور کی خوشبو بھی ملی ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے اب وہ اپنی قبر میں ہی موجود ہو لیکن جس وقت میں نے اسے دیکھا اس وقت وہ قبر سے باہر ویرانے میں چلا جا رہا تھا......"

پھر اس نے اپنے بیان میں تصحیح کی۔ "نہیں......شاید وہ چل نہیں رہا تھا بلکہ زمین سے ذرا سا اوپر ہوا میں تیرتا جا رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب کی بیگم صاحبہ اس کے بازوؤں پر تھیں۔ وہ خون میں لتھڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ شاید وہ اس وقت ہی مر چکی تھیں۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں......میں نے تو انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

جمال صاحب نے اپنے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑتی محسوس کی۔ سارہ نے بھی انہیں یہی بتایا تھا کہ اس نے ایک کفن پوش مردے کو دیکھا تھا جو آسیہ کو بازوؤں پر اٹھائے ہوئے تھا اور وہ مردہ دکھائی دیتی تھی جبکہ اس مردے کی شکل سارہ کو کچھ جانی پہچانی سی لگی تھی۔ وہ تو اس لئے زیادہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس نے احمد علی کی لاش کو چارپائی سے گرتے ہوئے صرف اس وقت دیکھا تھا جب جمال صاحب اور سارہ بھجوو میں گاؤں کی طرف آ رہے تھے لیکن محمد علی بہرحال احمد علی کا بھائی تھا۔ وہ تو اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے بیان کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی تھی کہ جب جمال صاحب اور تحسین نے احمد علی کی قبر کھودی تھی تو انہیں وہ خالی ملی تھی۔ یہ منظر تو خود انسپکٹر ولی محمد نے بھی دیکھا تھا۔ کیا جس وقت وہ احمد علی کو اس کی قبر میں تلاش کر رہے تھے اس وقت وہ مردہ قبر سے باہر ویرانے میں آسیہ کی لاش بازوؤں پر اٹھائے ہلکورے لیتا ادھر ادھر پھر رہا تھا؟ اور قبر سے بھی وہ اس طرح نکلا تھا کہ اس میں ذرا سا شگاف بھی نہیں پڑا تھا؟ ذرا سی مٹی بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوئی تھی۔ جمال صاحب اور تحسین نے جب قبر کھودنی شروع کی تھی تو وہ انہیں بالکل صحیح حالت میں ملی تھی۔ دفنانے والوں نے اس پر مٹی کا جو لیپ سا کیا تھا وہ بھی نیم خشک حالت میں صحیح سلامت تھا۔

جمال صاحب کو جھرجھری اسی احساس سے آئی تھی کہ ان کا واسطہ واقعی پراسرار واقعات سے پڑ رہا تھا اور وہ زیادہ شدت سے ضرورت محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کی تہہ



تک پہنچا جائے لیکن انہیں یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ شاید سائنس اس معاملے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔

جمال صاحب نے محمد علی کو محض کچھ اور اچھی طرح کریدنے کے لئے اس بات کی تردید کی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تمہیں معلوم ہے تمہارا بھائی پراسرار بیماری کا شکار ہو کر مر چکا ہے اور تمہاری آنکھوں کے سامنے اسے دفن کر دیا گیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے جناب! میں کب اس سے انکار کر رہا ہوں۔" محمد علی بے بسی سے بولا۔ "اسی لئے تو میں زیادہ حیران پریشان ہوں بلکہ اس وقت تو میں اسی حیرت کی وجہ سے چکرا کر گر پڑا تھا......نشہ تو اپنی جگہ تھا لیکن اس منظر کی وحشت نے میرا زیادہ برا حال کر دیا تھا۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے بھائی کو دفن کیا تھا لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ویرانے میں جس کفن پوش مردے کو دیکھا وہ میرا بھائی ہی تھا......صرف میں نے ہی اسے نہیں دیکھا تھا' وہ بھی اپنی مردہ اور بے نور آنکھوں سے کافی دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ گو کہ مجھے اس کی آنکھیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آنکھوں کی جگہ بس دو سیاہ گڑھے تھے......شاید آنکھیں تھیں ہی نہیں......اس کے باوجود محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا اور اسے یوں اپنی طرف تکتے پا کر میری گھگھی بندھ گئی۔ حالانکہ وہ میرا سگا بھائی تھا۔ میں نے بیماری کے دوران میں دل و جان سے اس کی خدمت کی تھی۔ اس کی موت پر جیسے میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اسے دفنایا تھا لیکن اس وقت اسے سامنے دیکھ کر میرا وحشت سے برا حال ہو گیا۔ وہ مجھے اپنا بھائی ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا سامنا کسی بدروح سے تھا......"

محمد علی جیسے کسی نادیدہ طاقت کے زیر اثر اپنا مفہوم نہایت روانی سے بیان کرتا چلا گیا تھا۔ جمال صاحب ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر بغور جمال صاحب کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ پھر قدرے مایوسی سے بولا۔ "شاید انسپکٹر صاحب کی طرح آپ کو بھی میری بات کا یقین نہیں آیا؟"

"مجھے پورا یقین ہے کہ تم بالکل سچ بول رہے ہو۔" جمال صاحب گویا کسی خواب سے چونکتے ہوئے بولے۔ محمد علی کے چہرے پر کچھ اطمینان جھلک آیا۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ وہ کسی کو بھی اپنی بات کا یقین دلانے میں کامیاب ہو سکے گا۔

جمال صاحب نے انسپکٹر ولی محمد کو کمرے سے باہر چلنے کا اشارہ کیا اور باہر آ کر نیچی آواز میں بولے۔ "میرا خیال ہے اس بے چارے کا آسیہ کی موت سے کوئی تعلق نہیں۔ بہتر یہی ہو گا کہ تم مزید تھوڑی بہت پوچھ گچھ کرنے کے بعد اسے چھوڑ ہی دو ہمیں ان پراسرار واقعات کو کسی اور ہی زاویئے سے سمجھنے کی کوشش کرنا پڑے گی۔"

انسپکٹر پرخیال انداز میں سر ہلانے لگا۔

○

سارہ کو گہری نیند نہیں آ سکی تھی۔ خواب آور گولی کا اثر ہونے کے باوجود وہ سطحی سی نیند کی حالت میں تھی۔ اس کی یہ نیند بھی برقرار نہیں رہ سکی۔ کال بیل کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر غنودگی زدہ سے ذہن کے ساتھ دروازے پر پہنچی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اسے تھوڑا سا غصہ بھی آیا۔ دروازے پر سانولی سی ایک جوان عورت کھڑی تھی جو اپنے حلئے اور وضع قطع سے بھکارن معلوم ہوتی تھی۔ کال بیل بجا کر مانگنے والوں پر سارہ کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ غصہ آتا تھا لیکن وہ ضبط کر جاتی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ گاؤں میں بھی اس قسم کے مانگنے والے پائے جاتے تھے۔

تاہم وہ عورت پیسے یا کھانا وغیرہ مانگنے کے بجائے بڑی لجاجت سے بولی۔ "بی بی جی! ایک گلاس پانی تو پلا دو۔"

سارہ کو بے وقت اس قسم کے لوگوں کی آمد ناگوار تو گزرتی تھی لیکن وہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر بھگاتی نہیں تھی۔ زیادہ تر ان کی فرمائش پوری کر دیتی تھی۔ اسے معلوم تھا شہر میں تو اس بہانے چور ڈاکو وغیرہ بھی گھر میں گھس آتے تھے۔ گاؤں میں اسے یہ خطرہ تو نہیں تھا پھر بھی احتیاطاً" وہ دروازے کا بولٹ چڑھا کر واپس ہوئی۔ گیٹ تو ویسے ہی کھلا تھا جس سے وہ بھکارن احاطے میں آ چکی تھی۔

سارہ پرانے فریج سے بوتل نکال اور ایک معمولی سا گلاس تلاش کر کے دوبارہ دروازے پر آئی تو بھکارن نے کچھ زیادہ ہی بے تابی سے اس کے ہاتھ سے گلاس لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ دونوں کا ہاتھ کچھ زیادہ ہی زور سے ٹکرا گئے۔ بھکارن کی انگلی میں چاندی یا پھر شاید کسی اور سفید دھات کی موٹی سی انگوٹھی تھی جس کے نگینے کے گرد دائرے میں دھات ہی کے دندانے سے کھڑے تھے۔ دندانے نہایت نوکیلے تھے۔ سارہ کے ہاتھ کی پشت پر گہری خراش آ گئی اور فوراً" ہی کچھ خون رسنے لگا۔ عین ممکن تھا کہ چند قطرے زمین پر ٹپک جاتے مگر بھکارن نے فوراً" اپنا المونیم کا کٹورا آگے کر دیا۔

سارہ کے منہ سے بے اختیار سسکاری سی نکل گئی۔ اس کی گہری خراش سے حیرت انگیز طور پر محض دو چار قطروں کے بجائے اچھا خاصا خون ابل کر کٹورے میں ٹپک گیا۔ بھکارن کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی جیسے اسے بھیک میں کوئی قیمتی چیز مل گئی ہو مگر دوسرے ہی لمحے وہ بڑی لجاجت سے بولی۔ "مجھے معاف کر دیں بیگم صاب جی۔۔۔۔ میرے سے غلطی ہو گئی۔۔۔۔ آپ کو تکلیف ہوئی۔۔۔۔ میں بہت بہت معافی چاہتی ہوں جی۔۔۔۔"

پھر اس نے کٹورا نہایت احتیاط سے سنبھالا اور پانی پئے بغیر ہی تیزی سے واپس



روانہ ہو گئی جیسے اسے اندیشہ ہو کہ سارہ اسے مارنا شروع کر دے گی۔ چند سیکنڈ میں ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ سارہ دم بخود کھڑی رہ گئی۔ بھکارن کا رویہ بلاشبہ عجیب تھا۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ بہرحال۔۔۔۔ اب تو وہ غائب ہو چکی تھی۔ سارہ سر جھٹک کر دروازہ بند کر کے اندر آ گئی۔

جمال صاحب اور تحسین دونوں ہی گھر میں موجود نہیں تھے۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ تجہیز و تکفین کے انتظامات کرنے گئے ہوں گے۔ اس نے فرسٹ ایڈ باکس سے ایک بینڈیج نکال کر اپنے ہاتھ کی پشت پر چپکا لی۔ خون کا رسنا اب بند ہو چکا تھا اور سارہ کو کوئی تکلیف بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

دفعتاً" اسے آسیہ کا خیال آیا اور ایک بار پھر اس کا دل بھر آیا۔ وہ سٹور روم کی طرف چل دی۔ اسے معلوم تھا کہ تدفین کے انتظار میں آسیہ کی لاش وہاں رکھی تھی لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ جمال صاحب اور تحسین اس کا پوسٹ مارٹم بھی کر چکے تھے۔ اسے سٹور میں جا کر بھی یہ اندازہ نہیں ہو سکا کیونکہ جمال صاحب اپنا تمام سازوسامان وغیرہ صاف کر کے باکس میں بند کر کے رکھ گئے تھے۔ اس نے چادر سے ڈھکی ہوئی لاش کا بھی صرف چہرہ ہی کھولا اور ایک ٹک اسے تکنے لگی۔

اس کے دکھ پر حیرت غالب آ گئی۔ کل تک جب اس نے آسیہ کو زندہ دیکھا تھا تو وہ برسوں کی بیمار، مضمحل اور مرجھائی ہوئی دکھائی دیتی تھی لیکن اب وہ اپنے تروتازہ، شگفتہ اور صحت مند چہرے کے ساتھ شادی سے پہلے والی آسیہ دکھائی دے رہی تھی جو سارہ ہی کی طرح حسین اور دلکش ہوا کرتی تھی۔ اس چہرے کو دیکھ کر کوئی کسی قیمت پر بھی تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی مردہ عورت کا چہرہ تھا۔

سارہ خاصی دیر تک دم بخود سی کھڑی اسے تکتی رہی۔ یہ معمہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ تو کچھ ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا جیسے مرنے کے بعد آسیہ کو ایک نئی زندگی مل گئی تھی۔ اس کا چہرہ تو سرخ و سپید دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں یوں بند تھیں جیسے وہ کوئی سہانا خواب دیکھ رہی ہو۔

اچانک سارہ کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اسے کچھ یوں لگا تھا جیسے آسیہ کی لاش مسکرائی ہو۔۔۔۔ وہ جیسے بند آنکھوں سے بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور دیکھتے دیکھتے ہی مسکرائی تھی۔ سارہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دوبارہ دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے گویا آسیہ کے ہونٹ صحیح حالت پر آ چکے تھے۔ وہ گویا صرف ایک لمحے کے لئے مسکرائی تھی۔ سارہ نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ محض اس کا وہم تھا لیکن اس کے چہرے پر کپکپی سی طاری چکی تھی۔ اس نے جلدی سے لاش کا چہرہ چادر سے دوبارہ ڈھانپ دیا اور کمرے سے نکل ئی۔

○

اس شام آسیہ کی تدفین عمل میں آ چکی تھی۔ تحسین اور جمال صاحب تدفین سے واپس آنے کے چند گھنٹے بعد بھی مضمحل اور پژمردہ سے بیٹھے تھے۔ جمال صاحب بڑی عمر کے ہونے کے باوجود مضبوط جسم اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے لیکن انہیں تحسین کی حالت دیکھ کر زیادہ صدمے اور مایوسی کا احساس ہو رہا تھا۔ تاہم وہ اسے جتنی تسلیاں دے سکتے تھے' دے چکے تھے۔ ان کے ڈھارس بندھانے سے تحسین کی حالت کچھ نہ کچھ بہتر ہوئی تھی۔

جمال صاحب کو کم از کم اس بات کی خوشی تھی کہ وہ ان حالات میں تحسین کے قریب موجود تھے ورنہ اس نوجوان کا نہ جانے کیا حال ہوتا۔ انہیں ایک بار پھر قائل ہونا پڑا تھا کہ قدرت جو کرتی تھی' بہتر ہی کرتی تھی۔ اگر وہ تحسین کا خط ملنے پر بھی یہاں نہ آتے تو شاید بعد میں تمام حالات جاننے کے بعد انہیں زیادہ صدمہ اور پچھتاوا محسوس ہوتا۔ ہمیشہ کے لئے دل میں یہ کسک رہ جاتی کہ اگر وہ تحسین کے پاس چلے گئے ہوتے تو شاید اس کی کچھ مدد کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتے۔ اب خواہ ان کی کوشش کا کوئی نتیجہ نہ نکلا لیکن انہیں اطمینان تو تھا کہ انہوں نے تحسین اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کے کام آنے کی اپنی سی سعی کی تھی اور ابھی اپنی بساط کے مطابق مزید جدوجہد کرنے کے لئے بھی تیار تھے۔

آسیہ کی موت کے بعد گھر اجڑا اجڑا دکھائی دینے لگا تھا۔ پہلے تو اس پر کسی نامعلوم سی نحوست کے سائے ہی منڈلاتے محسوس ہوتے تھے' اب تو جیسے بالکل ہی سب کچھ اجڑ گیا تھا۔ جمال صاحب کے دل میں اب بھی یہ خواہش جاگزیں تھی کہ گاؤں کے لوگ بھی ان پراسرار حالات سے نجات پائیں ورنہ وہ تحسین کو ہدایت کرتے کہ وہ اسی وقت اپنا ضروری سامان باندھے اور ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر شہر واپس چلے۔

پاس پڑوس سے کسی نے ان کے لئے کھانا بھی بھیجا تھا لیکن وہ دونوں محض چند نوالے ہی زہر مار کر سکے تھے۔ کافی دیر کے سکوت کے بعد تحسین نے اچانک سر اٹھایا اور بوجھل سے لہجے میں پوچھا۔ "سر! آپ نے اب بھی یہاں کے حالات کے بارے میں کوئی رائے قائم کی یا نہیں؟"

"میری رائے بھی یہاں کے حالات ہی کی طرح الجھی ہوئی ہے....." جمال صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "جس طرح پراسرار انداز میں یہاں لوگوں کی اموات ہوئی ہیں ان کا گہری نظر سے مشاہدہ کرنے اور بہت غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس میں ووڈو کا بھی عمل دخل ہو سکتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں صرف ایک ڈاکٹر اور سرجن ہی نہیں ہوں' دنیا کے بہت سے علوم کے بارے میں بھی میرا مطالعہ اور مشاہدہ بے



حد وسیع ہے۔"

"جی ہاں..... مجھے معلوم ہے۔ اسی لئے تو میں نے خاص طور پر یہاں آپ کو زحمت دینے کے بارے میں سوچا تھا۔" تحسین بولا۔ "مجھے شروع سے ہی سر کھپانے کے بعد یہ احساس ہو گیا تھا کہ شاید سائنسی نکتہ نظر سے ان حالات کی کوئی تسلی بخش توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔"

"تمہارا خیال درست تھا۔" جمال صاحب نے تائید کی۔ "تمہیں شاید معلوم ہو گا کہ ووڈو (Woodo) دراصل ویسٹ انڈیز سے جنم لینے والا جادوگری کا ایک مخصوص انداز ہے لیکن ہمارے ہاں اسے کالا جادو کا ہی نام دے دیا جاتا ہے اور اسی میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہم بھی اپنی سہولت کے لئے اسے کالا جادو ہی کا نام دے سکتے ہیں۔ دراصل کالا جادو اب بہت وسیع معانی اختیار کر گیا ہے۔ یہاں لوگوں کی پراسرار اموات کا انداز بتا رہا ہے کہ یہاں کالا جادو کا ماہر کوئی شخص موجود ہے اور وہ لوگوں کو اپنی خباثت کا نشانہ بنا رہا ہے....."

تحسین نے اپنی کرسی جمال صاحب کے قریب کھینچ لی۔ اس کی آنکھیں ذرا پھیلی ہوئی تھیں۔ اب شاید اس کے غم و اندوہ میں خوف کی سنسنی بھی شامل ہو گئی تھی۔ وہ پوری توجہ اور انہماک سے جمال صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔

جمال صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "لیکن ہم نے جس طرح آسیہ کی گردن ادھڑی ہوئی دیکھی اور پھر بعد از مرگ اس کے جسم میں کسی درندے کا خون موجود پایا اس سے ان کہانیوں کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے جن کے مطابق بعض انسان مرنے کے بعد بھیڑیئے کا روپ اختیار کر لیتے تھے اور ان کی نسل بھی آگے چلتی تھی۔ پھر جب ہم محمد علی کے بھائی احمد علی کی قبر کھودنے پر اس کی لاش کو غائب پاتے ہیں تو اس میں ڈریکولا کی کہانیوں والا انداز جھلک آتا ہے جن میں خون آشام مخلوق راتوں کو اپنے تابوت سے غائب ہو جاتی تھی۔ پھر محمد علی اور سارہ نے جس طرح احمد علی کو کفن سمیت آسیہ کی لاش بازوؤں پر اٹھائے دیکھا اس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ کوئی پراسرار اور مافوق الفطرت طاقت ان لوگوں کو بعد از مرگ اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہی ہے۔ یہ لوگ درحقیقت مرتے نہیں ہیں۔ ان کی یہ موت شاید ہماری نظروں اور ہمارے حواس کا دھوکا ہوتی ہے۔ مرنے والے مرد تو شاید قبروں سے باہر آنے کے بعد واقعی خوفناک مردے دکھائی دیتے ہوں لیکن مرنے والی لڑکیاں اور عورتیں اپنی نوجوانی کے دور کی طرح حسین اور تازہ دم ہو جاتی ہوں..... اور یہ سب اس نامعلوم شخص کے اشاروں کے غلام اور کٹھ پتلیاں بن جاتے ہوں جس کے پاس شاید کئی طرح کی شیطانی طاقتیں جمع ہو گئی ہیں۔ شاید اس کے پاس کالا جادو بھی ہے ڈریکولا کی طاقت بھی ہے ہمیشہ زندہ رہنے والے بھیڑیئے کی خصوصیات بھی ہیں اور کچھ دوسری شیطانی طاقتیں بھی ہیں۔"

"آپ کے خیال میں ایسی شخصیت کون ہو سکتی ہے؟" تحسین نے دریافت کیا۔

"مجھے ایک شخص پر شبہ ہے لیکن ابھی چونکہ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا اس لئے میں اس کا نام نہیں لوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ میرے شبہات کی تصدیق ہو سکے۔" جمال صاحب بولے۔

"اگر تصدیق ہو گئی تو کیا آپ اس شخصیت سے نمٹنے اور اس بستی کو اس کے چنگل سے چھڑانے کی کوئی کوشش کر سکیں گے؟" تحسین نے دریافت کیا۔

"میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا کہ اس قسم کی کسی شخصیت سے نمٹنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے....." جمال صاحب کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "کوئی طے شدہ اور یقینی طریقہ میرے علم میں نہیں ہے لیکن میں ایک بات جانتا ہوں کہ اللہ کا کلام ہر شیطانی اور طاغوتی یا مافوق الفطرت طاقت کا توڑ ہے۔ میں اللہ کا ایک گنہگار سا بندہ ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات' اس کے کلام اور اس کلام کی طاقت پر میرا ایمان غیر متزلزل ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ طاقت ہر شیطانی طاقت سے نمٹنے کے لئے کافی ہے۔ اگر انسان کو باقاعدہ اور باضابطہ طور پر کوئی طریقہ نہ بھی آتا ہو تب بھی اللہ کے کلام میں شامل وہ سادہ اور مختصر سی آیات جو شیطان کو بھگانے یا بلائیں اور آفات دور کرنے کے لئے مخصوص سمجھی جاتی ہیں وہی ہماری اتنی مدد کر سکتی ہیں جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں ضرورت پڑنے پر انہی سے مدد لوں گا اور میرا یقین ہے کہ مجھے مایوسی اور ناکامی نہیں ہو گی۔"

تحسین چند لمحے ایک ٹک ان کی طرف دیکھتا رہا۔ ان کی باتوں سے جیسے اس کی کچھ اور ڈھارس بندھی تھی لیکن پھر جیسے اچانک کوئی خیال اس کے ذہن میں لپکا اور اس کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں۔ وہ مضبوط سے لہجے میں بولا۔ "جمال صاحب! آپ نے دیکھا تھا آسیہ تجہیز و تکفین کے وقت کیسی شگفتہ و صحت مند دکھائی دے رہی تھی؟ وہ نوجوانی اور کنوار پن کے زمانے میں ایسی ہوا کرتی تھی۔"

"ہاں.....مجھے یاد ہے۔" جمال صاحب نے جواب دیا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ احمد علی کی طرح رات کو وہ بھی قبر سے غائب ہو جائے۔ درحقیقت اس کی یہ موت مصنوعی اور ہماری نظر کا دھوکہ ہو۔ وہ درحقیقت کسی کے اشاروں کی غلام اور کٹھ پتلی بن گئی ہو اور اس کے حکم پر قبر سے نکل کر کہیں جا رہی ہو۔ ہمیں اس قبر کی نگرانی کرنی چاہئے تھی۔"

"ہاں.....اس امکان پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔" جمال صاحب نے تسلیم کیا۔

"رات گہری ہو رہی ہے.....میرا خیال ہے ہمیں چل کر دیکھنا چاہئے۔" تحسین بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا۔

"ہاں.....چلو.....چلتے ہیں۔" جمال صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے لوڈڈ



ریوالور جیب میں رکھ لیا جو عام حالات میں ان کے ڈرائیور کے پاس رہتا تھا لیکن ڈرائیور کو وہ رخصت کر چکے تھے۔ انہیں چونکہ خود اندازہ نہیں تھا کہ انہیں گاؤں میں کتنے دن رہنا تھا اور یہاں ڈرائیور کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی اس لئے وہ چھٹی لے کر اپنے گاؤں چلا گیا تھا جو یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ضرورت پڑنے پر جمال صاحب پیغام بھیج کر اسے بلوا سکتے تھے۔ تحسین نے ہتھیار کے طور پر اپنا بیلچہ اٹھا لیا۔ سارہ اس وقت سو رہی تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہ پیدل ہی جا رہے تھے۔ راستے میں جمال صاحب بولے۔ "خدا کرے ہمارے اندیشے غلط ہوں..... لیکن پھر بھی.....جا کر دیکھ لینا ہی بہتر ہے۔"

تحسین خاموشی سے بیلچہ کندھے پر لٹکائے ان کے ساتھ چلتا رہا۔ ہولناک سناٹے میں وہ قبرستان میں داخل ہوئے۔ ملگجی تاریکی اپنے دامن میں گویا ان گنت بھید چھپائے ان کی منتظر تھی۔ وہ آسیہ کی قبر سے ابھی کچھ دور ہی تھے کہ انہوں نے قبر سے دودھیا سا دھواں پھوٹتے دیکھا۔ یہ دھواں کچھ روشن روشن سا بھی محسوس ہو رہا تھا۔ قبر جوں کی توں تھی۔ اس کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا تھا لیکن دھواں اسی میں سے پھوٹ رہا تھا اور ایک بگولے کی طرح قبر پر ہی جمع ہو رہا تھا۔

تحسین اور جمال صاحب غیر ارادی طور پر اپنی جگہ رک گئے اور ٹکٹکی باندھ کر یہ منظر دیکھنے لگے۔ وہ چمکیلا سا سفید دھواں ایک ستون کی سی صورت میں چکرا رہا تھا۔ مرغولے اوپر نیچے حرکت کر رہے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ دھواں انسانی ہیولے کی صورت اختیار کرنے لگا۔ چند لمحوں میں یہ انسانی ہیولا کچھ اور واضح ہو گیا۔ آخر کار وہ مکمل انسان بن گیا۔

وہ آسیہ تھی۔ تحسین اور جمال صاحب دونوں کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ آسیہ کے کفن کی بندشیں اس طرح کھلی ہوئی تھیں کہ وہ لباس کا کام تو دے رہا تھا لیکن اس کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ باہر تھا۔ وہ ہوا میں ادھر ادھر ہلکورے لے رہی تھی۔ اس کے بال دھیرے دھیرے لہرا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور ہونٹوں پر ایک خوابناک سی مسکراہٹ تھی۔ اس کا حلیہ مردوں جیسا ضرور تھا لیکن چہرے مہرے سے وہ مردہ ہرگز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ نوجوان' صحت مند اور نہایت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ اس کے وجود پر سفیدی سی چھائی ہوئی تھی جیسے وہ سر سے پاؤں تک چاندنی میں نہائی ہوئی ہو۔

پھر وہ اسی طرح زمین سے ذرا بلندی پر گویا ہوا میں ہلکورے لیتی ان کی طرف بڑھی۔ وہ گویا ملگجے اندھیرے میں بھی انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اب پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو چکی تھی۔ وہ دونوں بازو پھیلائے سیدھی تحسین

کی طرف آ رہی تھی جیسے اسے بازوؤں میں بھر لینا چاہتی ہو۔ خوف کے باعث تحسین کے ہاتھ سے بیلچہ چھوٹ گیا۔ وہ جو زندگی میں اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا تھا' اس وقت اسے یوں والہانہ انداز میں بازو پھیلائے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر بری طرح خوفزدہ ہو کر الٹے قدموں بھاگا۔

جمال صاحب کسی حد تک خوفزدہ ضرور تھے لیکن اتنے نہیں کہ بھاگ کھڑے ہوتے۔ وہ نہ صرف اپنی جگہ جمے کھڑے رہے بلکہ انہوں نے ریوالور بھی نکال لیا۔ انہیں اندیشہ محسوس ہوا کہ آسیہ نے اگر تحسین تک پہنچ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا تو تحسین کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے دو فائر کئے۔ گولیاں آسیہ کے سینے سے پار ہو گئیں۔ جمال صاحب کو یقین تھا کہ ان کا نشانہ خطا نہیں ہوا تھا اور گولیاں آسیہ کے وجود سے گزری تھیں مگر نہ تو خون نکلتا دکھائی دیا اور نہ ہی آسیہ پر کوئی اثر ہوا۔

اس کی مسکراہٹ تک میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسی طرح بازو پھیلائے تحسین کی طرف بڑھتی رہی۔ تب جمال صاحب نے باقی گولیاں بھی اس کے وجود میں اتار دیں۔ ریوالور خالی ہو گیا اور آسیہ پر اب بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ ہوا کے ایک سرد جھونکے کی طرح جمال صاحب کے قریب سے گزری۔ انہیں جھرجھری سی آ گئی۔ آسیہ بازو پھیلائے تحسین کے تعاقب میں جا رہی تھی اور تحسین سرپٹ بھاگ رہا تھا مگر پھر وہ شاید کسی قبر سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔

جمال صاحب نے تحسین کے ہاتھ سے گرا ہوا بیلچہ اٹھایا اور آسیہ کے تعاقب میں دوڑے۔ آسیہ کی رفتار تیز نہیں تھی۔ اس نے گردن گھما کر جمال صاحب کی طرف دیکھا۔ انہیں اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ اس کی نظروں سے سحرزدہ ہو کر رہ جائیں گے۔ ان کے ہاتھ پاؤں شل ہو جائیں گے۔ انہوں نے پوری قوت سے بیلچہ گھمایا اور آسیہ کی گردن پر وار کیا۔ بیلچہ تیز دھار تھا۔ آسیہ کی گردن کٹ گئی۔ دوسرے وار میں سر کٹ کر دور جا گرا مگر یہ دیکھ کر جمال صاحب کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی کہ کٹا ہوا سر لڑھکتے لڑھکتے ایک جگہ سیدھا ٹک گیا۔ اس کی آنکھیں اب بھی کھلی تھیں اور جمال صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اب بھی خوابناک انداز میں مسکرا رہا تھا!

○



اس کٹے ہوئے سر کو مسکراتے دیکھ کر جمال صاحب کے جسم میں دہشت سے لہو سرد ہونے لگا مگر پھر انہوں نے خود کو سنبھالا کیونکہ انہیں احساس تھا کہ تحسین کی حالت تو ان سے کہیں زیادہ خراب تھی اور اسے بھی سنبھالنا گویا انہی کی ذمہ داری تھی۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ کٹے ہوئے سر کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی خوابناک سی مسکراہٹ میں نفرت جھلکنے لگی۔ چند لمحے وہ بعد وہ سر انہیں بے پناہ نفرت سے گھور رہا تھا۔ جمال صاحب کو اپنے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑتے محسوس ہوئے۔

اچانک انہیں اپنے قریب سے تحسین کی پھٹی پھٹی اور وحشت زدہ سی آواز سنائی دی۔ "سر! ہمیں جلد از جلد آسیہ کا کٹا ہوا سر اس کے دھڑ کے ساتھ جوڑ دینا چاہئے۔ اگر یہ سر نہ جڑ سکا تو آسیہ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی اور میڈیکل سائنس ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔"

جمال صاحب نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی اور ان میں وحشت ناچ رہی تھی۔ ہونٹ نیم وا تھے اور ان کے عقب سے دانت جھانک رہے تھے۔ دھندلی دھندلی چاندنی میں اس وقت وہ خود بھی ایک مردہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ جمال صاحب کو شبہ ہوا کہ اس کا ذہنی توازن خطرے میں تھا لیکن اس وقت اسے سمجھایا بھی تو نہیں جا سکتا تھا۔ آسیہ کا دھڑ اس کے سر سے کچھ دور کھڑا تھا۔ کفن کی بندشیں کھل جانے کی وجہ سے کفن کے کچھ حصے ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔

اچانک تحسین' آسیہ کا سر اٹھانے کے لئے لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ جمال صاحب نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چلایا۔ "اگر دیر ہو گئی تو آسیہ کا سر اس کے دھڑ کے ساتھ نہیں جڑ سکے گا جمال صاحب! آپ اتنی سی بات بھی نہیں جانتے؟ آپ کیسے سرجن ہیں؟"

ان دنوں بظاہر وہ بالکل کمزور ہو چکا تھا لیکن اس وقت اس کے جسم میں کچھ ایسی ہی طاقت پیدا ہو چکی تھی جو کمزور لوگوں کے جسموں میں بھی عموماً" دیوانگی یا نیم دیوانگی کے عالم میں پیدا ہو جاتی ہے۔

"تم آسیہ کے دھڑ یا سر کے قریب ہرگز نہ جانا تحسین!" جمال صاحب گھٹی گھٹی آواز

میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ صحیح طور پر انہیں خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ تحسین کو آسیہ کے سر یا دھڑ کے قریب جانے سے باز رکھنے کی کوشش کیوں کر رہے تھے لیکن انہیں گویا کوئی غیبی طاقت ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ تحسین اپنے آپ کو ان کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ کشمکش صرف چند سیکنڈ جاری رہی۔ پھر تحسین نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوششیں ترک کر دیں کیونکہ اس کی وحشت زدہ نظریں کسی اور طرف مرتکز ہو رہی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جس طرف دیکھ رہا تھا' جمال صاحب نے بھی اس طرف دیکھا۔ ادھر موجود دو تین قبروں کے دہانے کھل چکے تھے۔ دھندلی چاندنی میں یہ کھلی ہوئی قبریں کسی جناتی مخلوق کے دہن اور ان کے سرہانے کھڑے ہوئے کتبے اکلوتے دانت کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ پھر ایک قبر سے ایک استخوانی ہاتھ برآمد ہوا۔ وہ ہاتھ قبر کے کنارے مٹی پر جم گیا۔ دوسرے ہی لمحے کنارے کا سہارا لے کر ایک مردہ اچھل کر باہر آگیا۔ اس کا کفن مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔

اس کے بعد مزید کئی قبریں شق ہو گئیں اور کئی مردے باہر آ گئے۔ تحسین کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ وہ جمال صاحب کے بازوؤں کی گرفت میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ خود جمال صاحب کے اعصاب بھی چیخ رہے تھے۔ ان کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ کفن پھڑپھڑاتے اور ہوا کے دوش پر ہلکورے لیتے مردے ان کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ ان کے چہروں پر گویا زردی ملی ہوئی تھی اور ان کی بے نور آنکھیں یا آنکھوں کی جگہ تاریک گڑھے بے حد بھیانک لگ رہے تھے۔

ان میں سے ایک مردے نے آسیہ کا کٹا ہوا سر اٹھا لیا اور دونوں استخوانی ہاتھوں سے اسے اپنے چہرے کے سامنے لاتے ہوئے مسکرایا۔ جواباً کٹا ہوا سر بھی مسکرایا۔ یہ ایک وحشت انگیز منظر تھا۔ پھر مردے نے وہ سر لے جا کر آسیہ کے دھڑ کو دے دیا۔ دھڑ نے وہ سر لے کر دونوں ہاتھوں سے خود ہی اپنی کٹی ہوئی گردن پر ٹکا لیا اور فوراً ہی جڑ گیا۔

اب آسیہ تحسین کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور دونوں ہاتھوں کے اشارے سے اسے قریب بلا رہی تھی۔ تحسین نے یہ منظر دیکھا تو اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر وہ جمال صاحب کے بازوؤں میں جھول گیا۔ جمال صاحب نے آہستگی سے اسے نرم زمین پر لٹا دیا اور اپنی ہمت و جرات مجتمع کر کے آسیہ کی طرف مڑے۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتے تھے کہ آخر یہ لوگ کس قسم کی موت کا شکار ہوئے تھے اور اب کیا روپ دھار چکے تھے۔

مگر جونہی وہ سیدھے کھڑے ہوئے انہیں حیرت و خوف کا شدید جھٹکا لگا۔ آسیہ اور دیگر تمام مردے غائب تھے اور قبریں بالکل صحیح سلامت نظر آ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا



تھا کہ پلک جھپکنے میں وہ سب کسی نامعلوم مشن پر روانہ ہو چکے تھے یا پھر شاید وہ محض نظر کا دھوکہ تھا۔ جمال صاحب کو گمان گزرا کہ انہوں نے اور تحسین نے شاید کوئی خواب دیکھا تھا۔

گاڑی انہوں نے وہاں سے کچھ دور چھوڑی تھی۔ وہ بھاگ کر گئے اور گاڑی میں سے پانی کی بوتل نکال کر لائے جو وہ احتیاطاً گاڑی میں رکھتے تھے۔ بوتل سے انہوں نے تحسین کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اسے ہلا جلا کر ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

کئی بار تیزی سے پلکیں جھپکنے کے بعد جیسے اسے کچھ یاد آیا اور اس نے جلدی سے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ جمال صاحب اس کا سر سہلا رہے تھے۔ وہ خوفزدہ سی آواز میں بولا۔ "شاید میں سو گیا تھا.....میں نے ابھی ابھی ایک خوفناک خواب دیکھا ہے....."

پھر وہ جمال صاحب کو وہ سب کچھ بتانے لگا جو خود جمال صاحب بھی چند منٹ پہلے دیکھ چکے تھے۔ باتیں کرتے کرتے وہ اٹھ بیٹھا اور آخر کار جھرجھری لے کر بولا۔ "یہ بہت ہی خوفناک خواب تھا.....ہے نا جمال صاحب؟"

جمال صاحب نے یہ جان کر سکون کی سانس لی کہ وہ اسے خواب سمجھ رہا تھا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور دھیمی آواز میں بولے۔ "ہاں.....بے شک.....یہ بہت خوفناک خواب تھا.....لیکن میرا خیال ہے ہمیں اب آسیہ کی قبر کی نگرانی ترک کر دینی چاہئے اور گھر چلنا چاہئے۔ شاید نگرانی کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے.....جیسے آپ کی مرضی.....!" تحسین تھکے تھکے لہجے میں بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جمال صاحب سوچ رہے تھے' محض قبروں کی نگرانی کرنے سے واقعی کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اس مسئلے کی جڑ تلاش کرنا اور اس کا علاج کرنا ضروری تھا۔ اگر جڑ ختم ہو جاتی تو باقی باتیں خود بخود معمول پر آ سکتی تھیں۔ کہیں کوئی شیطانی قوت موجود تھی جو یہ سب ڈوریاں ہلا رہی تھی۔ اسے تلاش کرنا اور اس کا بندوبست کرنا ضروری تھا۔ جمال صاحب کو اندازہ تو ہو چکا تھا کہ وہ پس پردہ طاقت کون سی تھی اور اس کا ہیڈ کوارٹر کہاں تھا؟ اب صرف اس اندازے کی تصدیق کرنے اور پھر جرات و ہمت سے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

○

خالد اپنی والدہ کو ساتھ لے کر علی الصبح ہسپتال جا پہنچا۔ اس نے اس سلسلے میں جمشید کو مطلع نہیں کیا تھا اور اسے امید نہیں تھی کہ وہ اپنی والدہ کو میمونہ کے پاس پہنچانے میں کامیاب ہو سکے گا۔ جمشید اس پر پہلے ہی واضح کر چکے تھے کہ اس ہسپتال میں مریض

کے پاس کسی تیماردار کا رہنا ضروری نہیں تھا۔ اس کا دوسرا مطلب یہی تھا کہ جمشید ایسا نہیں چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میمونہ کے پاس کوئی دوسرا فرد موجود رہے لیکن خالد نے اب ان کی مرضی کی پرواہ نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

راستے میں وہ اپنی والدہ کو ذہنی طور پر ہسپتال کے ماحول اور میمونہ کی تبدیلیوں کے بارے میں تیار کرنے کے لئے باتیں کرتا آیا تھا کہ اگر انہیں کوئی غیر متوقع یا خلاف معمول کیفیت دیکھنے کو ملے تو وہ حیران و پریشان نہ ہوں۔ اس کی والدہ جیسے صورت حال کو کچھ کچھ سمجھ رہی تھیں۔ وہ تسبیح کرتے کرتے رک کر بولیں۔ "تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بیٹا! میں ہر قسم کے حالات کے لئے تیار ہوں.....اور جس قدر جلد ہو سکا میں بہو کو بھی وہاں سے نکال لاؤں گی۔"

ہسپتال پہنچ کر خالد نے چوری چھپے اندر جانے کی کوشش نہیں کی۔ ریسپشن پر سفید یونیفارم میں وہ بھاری بھرکم سی مضبوط عورت موجود تھی جس کی آنکھیں منگولوں کی طرح لمبوتری تھیں۔ خالد اس وقت حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا جب اس نے خالد اور اس کی والدہ‘ دونوں میں سے کسی کے بھی اندر جانے پر اعتراض نہیں کیا حالانکہ خالد نے اسے بتا بھی دیا کہ وہ میمونہ کی دیکھ بھال کے خیال سے اپنی والدہ کو ان کے پاس چھوڑنے کے لئے لایا ہے۔ اس عورت نے خوشی سے انہیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے رویئے سے یہی ظاہر ہوا جیسے یہ کوئی خلاف معمول بات نہیں تھی۔ خالد نے یہی سوچا اسے ابھی جمشید کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی خصوصی ہدایت موصول نہیں ہوئی۔

خالد جب والدہ کو ساتھ لے کر میمونہ کے کمرے میں پہنچا تو اسے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ جب اکیلا یہاں آیا تھا تو اسے کمرے کا دروازہ مقفل ملا تھا اور سلاخوں والی کھڑکی سے اس نے میمونہ کو عجیب ہی حالت میں دیکھا لیکن آج کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور میمونہ ایک مریضہ ہی کی طرح تکئے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ بھی مریضوں ہی کی طرح ستا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جسم میں گویا خون کی ایک بوند بھی نہیں تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر ایک عجیب تاثر تھا جو اسے دوسرے مریضوں سے مختلف بنا رہا تھا۔ یہ تاثر نفرت اور خونخواری کا تھا۔ یہ نفرت اور خونخواری گو کہ دبی دبی سی تھی لیکن خالد نے کمرے میں قدم رکھتے ہی اسے محسوس کر لیا تھا۔

میمونہ نے سر اٹھا کر اجنبی سی نظروں سے ان کی طرف دیکھا جیسے انہیں پہچانتی ہی نہ ہو۔ اس اجنبیت کی تہہ میں وہی نفرت و خونخواری تھی۔ خالد کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ نفرت و خونخواری کس کے خلاف تھی۔ اس نے ساس کو سلام تک کرنے کی زحمت نہیں کی۔ تاہم خالد نے حتی الامکان خوش خلقی اور ملائمت سے کہا۔ "کیسی ہو میمونہ؟"

"میں جیسی بھی ہوں آپ کو اس سے کیا؟" میمونہ کے حلق سے عجیب کھرکھراتی ہوئی



سی آواز برآمد ہوئی۔ خالد نے محسوس کیا کہ یہ میمونہ کی آواز نہیں تھی۔ اس کے ہونٹ ضرور ہلے تھے لیکن اس کے وجود میں سے کہ گویا کسی اور کی آواز برآمد ہوئی تھی۔

خالد اپنے لہجے کی نرمی برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ "ہو سکتا ہے تم نے محسوس کیا ہو کہ میں تمہارا خیال نہیں رکھ رہا تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ اس ہسپتال کے ضابطے اور قاعدے میرے راستے کی رکاوٹ بنے ہوئے تھے اور کچھ تم نے بھی اپنے دل میں زیادہ ہی بدگمانی بٹھا لی ہے۔ بہرحال تمہیں اب ذرا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں.....سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں امی کو لے آیا ہوں۔ یہ چوبیس گھنٹے تمہارا خیال رکھیں گی۔"

جہاں آراء بیگم بیڈ کے قریب کھڑی بڑے غور سے پرخیال انداز میں میمونہ کو تک رہی تھیں اور ان کا ہاتھ دھیرے دھیرے تسبیح پر چل رہا تھا۔ میمونہ کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی نفرت یک لخت ہی شدت اختیار کر گئی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے جہاں آراء بیگم کی طرف دیکھا اور گویا پھٹ پڑی۔ "کیوں لائے ہیں آپ انہیں یہاں؟ کیا ضرورت تھی ان کی یہاں؟ انہیں فوراً" یہاں سے لے جائیں۔ میں ان کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔"

خالد کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کچھ شرمندگی بھی ہوئی۔ اس نے معذرت خواہانہ سی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا لیکن ان کے چہرے پر کوئی تغیر نہیں آیا تھا۔ وہ اسی طرح خاموشی سے‘ پرخیال انداز میں ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھیں اور زیر لب غالباً" تسبیح پر کچھ پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک نظر بیٹے کی طرف دیکھا اور گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں بولیں..... تمہیں شرمندہ یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں.....میں صورت حال کو سمجھ رہی ہوں..... مجھے اندازہ ہے کہ بہو اپنے آپ میں نہیں ہے.....

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو میمونہ؟" خالد کے لہجے میں احتجاج تھا۔ "امی اس عمر میں اتنی دور سے محض تمہاری خاطر زحمت اور بے آرامی اٹھانے آئی ہیں اور تم اس طرح کا استقبال کر رہی ہو؟"

"کیا میں نے کہا تھا انہیں بلائیں؟" میمونہ غرائی۔ "یا میں نے انہیں خط لکھ کر بلایا ہے.....یا میں نے فون کیا تھا؟ انہیں فوراً" یہاں سے لے جاؤ.....اور ان سے یہ چیز تو فوراً" ہی لے کر باہر کہیں دور رکھ کر آؤ....." اس نے جہاں آراء بیگم کی تسبیح کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے حلق سے بدستور کھرکھراتی سی آواز ہی نکل رہی تھی اور اس نے تسبیح کی طرف اشارہ نہایت ناگواری سے کیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے تسبیح کے لئے "یہ چیز" کے الفاظ بھی اس طرح استعمال کئے تھے جیسے وہ اس کا اصل نام بھی بھول چکی ہو۔

اب جہاں آراء بیگم نہایت شیریں لہجے میں بولیں۔ "ارے بیٹا.....! تم تو تسبیح کی باتیں کر رہی ہو۔ مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ میں جلدی میں قرآن پاک ساتھ لانا بھول

گئی۔ خیر.....میں ابھی خالد بیٹے سے کہے دیتی ہوں.....یہ دوسرا چکر لگانے آئے گا تو لیتا آئے گا۔ جہاں تسبیح اور قرآن پاک موجود ہو گا.....اور خلوص دل سے اللہ کا ذکر کرنے والا کوئی بندہ موجود ہو گا وہاں سے سب بلائیں خود بخود بھاگ جائیں گی۔"

"فی الحال تو آپ خود یہاں سے بھاگ جائیں....." میمونہ ہاتھ کے اشارے کے ساتھ بولی۔ "میں آپ کو ایک سنٹ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔"

خالد کو یہ دیکھ کر کچھ عجیب سا محسوس ہوا کہ میمونہ کے چہرے کے نقوش میں ایک عجیب سا تناؤ آتا جا رہا تھا۔ اسے اس کے لئے کوئی موزوں لفظ نہیں مل رہا تھا۔ شاید وہ ایک طرح کی حیوانیت تھی۔ خالد کو شبہ ہوا کہ شاید اس کی باچھوں سے کف بھی بہہ رہا تھا جسے اس نے جلدی سے ایک ٹشو پیپر سے صاف کر لیا تھا۔ یہ تو گویا وہ میمونہ ہی نہیں تھی جسے وہ یہاں چھوڑ کر گیا تھا اور جو اس کی زندگی کی رفیق تھی۔ جو پھولوں کی طرح تروتازہ اور بچوں کی طرح معصوم تھی۔ جو اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھی اور جو جہاں آراء بیگم کا دل و جان سے احترام کرتی تھی۔ وہ میمونہ تو شاید بہت پہلے ہی کہیں کھو گئی تھی لیکن اس کے عقب سے بھی ایسی میمونہ برآمد نہیں ہوئی تھی جسے وہ اب دیکھ رہا تھا۔

وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ اس کی والدہ ہاتھ ہلاتے ہوئے مشفقانہ لہجے میں بولیں۔

"بیٹا! تم جاؤ.....میں سنبھال لوں گی۔ اس وقت بہو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے.....لیکن جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ تمہیں خود پریشان ہونے یا بہو کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔"

خالد ہچکچایا۔ اس کا اتنی جلدی جانے کو دل نہیں مان رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا' میمونہ قہر آلود نظروں سے ساس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "وہ تو جائیں یا نہ جائیں لیکن آپ ضرور چلی جائیں۔ مجھے زیادہ تکلیف آپ کی موجودگی سے ہو رہی ہے۔"

جہاں آراء بیگم کے چہرے پر اب بھی ناگواری سی نمودار نہ ہوئی۔ انہوں نے ایک بار پھر خالد کو جانے کا اشارہ کیا۔ خالد بادل نخواستہ رخصت ہو گیا۔ کمرے سے نکلتے وقت اس نے دیکھا' اس کی والدہ میمونہ کے سرہانے کھڑی تھیں اور ان کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ شاید وہ کچھ پڑھ پڑھ کر میمونہ پر پھونکنا چاہتی تھیں۔ خالد ست قدموں سے راہداری کے کونے تک پہنچا تھا کہ اسے زوردار آواز سنائی دی۔ یہ میمونہ کے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز تھی۔ اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ دروازہ میمونہ نے بند کیا تھا یا اس کی والدہ نے؟"

وہ ایک لمحے کے لئے رکا لیکن پھر ہچکچاہٹ آمیز انداز میں موڑ مڑ گیا۔ ابھی وہ دو قدم ہی آگے چلا تھا کہ ایک اور آواز نے اس کا تعاقب کیا۔ یہ خرخراہٹ کی سی آواز تھی۔ خالد اس کی نوعیت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا



کہ یہ کسی انسان کی آواز ہو۔ کوئی ایسا انسان جس کا گلا گھونٹا جا رہا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی درندہ خرخرا رہا ہو لیکن بھلا ہسپتال میں یہ دونوں ہی باتیں کیسے ممکن تھیں؟ وہاں نہ تو کسی درندے کی موجودگی کا امکان تھا اور نہ ہی کسی انسان کا گلا گھونٹا جا سکتا تھا۔

اس کے باوجود وہ ایک بار پھر تذبذب کے عالم میں رک گیا۔ اس کا دل کسی انجانے اندیشے سے دھڑک رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ واپس جا کر دیکھ لینے میں کیا حرج تھا۔ وہ تیزی سے واپس پلٹا اور کمرے تک پہنچا۔ دروازے پر پہنچنے سے پہلے سلاخوں والی کھڑکی کے سامنے سے اس کا گزر ہوا۔ غیر ارادی طور پر اس نے کھڑکی سے ہی اندر دیکھ لیا اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

میمونہ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے جہاں آراء بیگم کی گردن دبوچی ہوئی تھی اور ان کی آنکھیں حلقوں سے ابل آئی تھیں۔ چہرے کی نسیں پھول کر گویا پھٹنے کو تھیں۔ صورت گویا مسخ ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک تو وہ ویسے ہی ضعیف اور کمزور سی خاتون تھیں۔ اوپر سے میمونہ میں شاید اس وقت کوئی حیوانی طاقت سمائی ہوئی تھی۔ اس کی صورت پر بھی حیوانیت سی غالب تھی۔ اس کا چہرہ نہ جانے کیوں اس کا اپنا چہرہ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ گویا ایک درندے کا چہرہ تھا جس میں انسان کی کچھ مشابہت موجود تھی۔

اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں جن سے دانت جھانک رہے تھے یہ دانت نوکیلے اور چھدرے سے دکھائی دے رہے تھے۔ ہونٹوں کے گوشوں سے کف بہہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں.....خدا کی پناہ.....! وہ کسی انسان کی آنکھیں تو ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ صورت حال کا تقاضا تو یہی تھا کہ اس پر خوف غلبہ نہ پاتا۔ اس وقت تو اسے فوری طور پر کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔ خوف کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اسے صورت حال میں مداخلت کرنی چاہئے تھی۔ اس کے باوجود ایک لمحے کے لئے خوف سے اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔

میمونہ نے بھی اس کی طرف دیکھا لیکن اس نے جہاں آراء بیگم کی گردن نہیں چھوڑی بلکہ اس کی درندگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ خالد ہڑبڑا کر گویا ہوش میں آیا اور دروازے کی طرف لپکا۔ اس نے دروازے کو پوری طاقت سے دھکیلا مگر وہ یقیناً" اندر سے مقفل بھی تھا اور بولٹ بھی چڑھا ہوا تھا۔ دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ خالد نے کندھے سے پوری طاقت سے دروازے پر ٹکر رسید کی مگر دروازہ ذرا بھی نہ ہلا البتہ اس کا پورا جسم جھنجھنا کر رہ گیا۔

وہ پلٹ کر بے تابانہ انداز میں دوبارہ کھڑکی پر آیا تو اس کے دیکھتے ہی دیکھتے میمونہ نے جہاں آراء بیگم کو چھوڑ دیا اور وہ دھپ سے فرش پر گر پڑیں اور وہیں ساکت رہیں۔ وہ یقیناً" مر چکی تھیں۔ ان میں زندگی کی رمق کی امید رکھنا خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"میمونہ.....! تم نے انہیں مار دیا.....!" خالد بے اختیار اذیت زدہ انداز میں چیخا۔

میمونہ عجیب فاتحانہ سے انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بلاشبہ اس وقت ہیبت ناک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کسی ایسے درندے سے مشابہ دکھائی دے رہی تھی جو غیظ و غضب کے عالم میں کوئی شکار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اس کا چہرہ درندے سے کہیں زیادہ خوفناک تھا۔

اس نے قہقہہ لگایا اور عجیب' کھرکھراتی بھیانک سی آواز میں بولی۔ "ہاں..... میں اسے مارنے میں کامیاب ہو گئی..... اس سے پہلے کہ اس کی طاقت میری طاقت پر غالب آتی میں نے اسے ٹھکانے لگا دیا....." پھر اس کی آواز کچھ نیچی ہو گئی۔ "لیکن مجھے معلوم ہے اب تم مجھے چین سے نہیں جینے دو گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ میں بھی....."

اس نے اپنے بیڈ کے گدے کے نیچے ہاتھ مارا اور سرجری میں استعمال ہونے والی ایک نہایت تیز دھار چھری نکال لی۔ خالد کو یہ سمجھنے میں ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی کہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔ اس نے چھری اپنے نرخرے پر رکھ لی اور خوابناک سے انداز میں مسکرائی جیسے کوئی بہت اچھا اور پرلطف کام کرنے جا رہی ہو۔ خالد کو یقین نہیں تھا کہ وہ خود کو بھی ہلاک کر لے گی لیکن وہ غیر ارادی طور پر چیخ اٹھا۔ "ارے کوئی ہے.....؟ بچاؤ..... مدد..... کوئی اس دروازے کی چابی لے کر آئے۔ خدا کے لئے جلدی کرو....."

لیکن اس کی فریادی سی آواز سنسان راہداری میں گویا درودیوار سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ طویل و عریض عمارت سنسان پڑی تھی۔ کوئی چابی لے کر نہ آیا۔ کوئی اس کی مدد کو نہ پہنچا۔ وہ ایک بار پھر کھڑکی کی طرف گھوما اور بے ساختہ اس کے حلق سے ایک دہشت زدہ چیخ نکل گئی۔ میمونہ نے سرجری کی چھری اپنے نرخرے پر پھیر لی تھی۔ اس کا نرخرہ کٹ گیا تھا اور خون کا فوارہ دور تک جا رہا تھا مگر عجیب بات یہ تھی کہ یہ خون نیلے رنگ کا تھا۔

میمونہ کا منہ عجیب سے انداز میں کھلا کا کھلا رہ گیا اور آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ پھر وہ کسی مجسمے کی طرح جہاں آراء بیگم کے قریب ہی گر پڑی۔ اس نے نزع کے سے عالم میں ایک جھرجھری لی' حلق سے خرخراہٹ کی چند آوازیں نکلیں پھر خون کا فوارہ بھی بند ہو گیا اور وہ بھی ساکت ہو گئی۔ خالد کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ زور زور سے چیخنا چاہتا تھا لیکن اس کی قوت گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر اسے یوں لگا جیسے وہ چکرا کر گرنے والا تھا لیکن اس نے کھڑکی کی سلاخیں تھام کر خود کو گرنے سے بچایا اور منہ پھاڑ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ پھر اس نے کھڑکی کی طرف پشت کر لی۔ اس کمرے کے منظر کو مزید دیکھنا اس کے بس سے باہر تھا۔

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی ٹانگوں میں اس کا وزن سہارنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ دیوار سے رگڑ کھاتا ہوا وہ دھیرے دھیرے اکڑوں بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں



میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگا۔ اس کے چاروں طرف گہرا سکوت تھا۔ اس کی سسکیوں کے سوا کوئی آواز نہیں ابھر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کائنات ہی خاموش ہو گئی تھی۔

اچانک راہداری کے موڑ سے ماربل کے فرش پر بھاری جوتوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ خالد نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا۔ جمشید چلے آ رہے تھے۔ کامران ایک سعادت مند ہمزاد کی طرح ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ جمشید نے دور ہی خالد کو دیکھ کر پرجوش انداز میں ہاتھ ہلایا اور وہیں سے بآواز بلند بولے۔ "ارے بھئی خالد میاں! یہ تم باہر اکڑوں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ اندر کیوں نہیں بیٹھتے؟ میں اور کامران تمہاری بیوی کی عیادت کے لئے آئے ہیں۔ آج بڑی مشکل سے وقت نکالا ہے۔ بڑی شرم محسوس ہو رہی تھی کہ ہمارے بہترین ساتھی کی اہلیہ ہسپتال میں ہے اور ہم ابھی تک اس کی عیادت کو بھی نہیں جا سکے....."

یہ کہتے ہوئے وہ عین خالد کے مقابل پہنچ چکے تھے۔ خالد آنسوؤں سے بھیگی آنکھوں سے ایک ٹک ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ قدرے حیرت سے بولے۔ "ارے بھئی تم تو رو رہے ہو' خیریت تو ہے؟ تم جیسے آدمی کو رونا تو نہیں چاہئے..... بات کیا ہے؟"

خالد کا دل کہہ رہا تھا کہ ان کی یہ معصومیت' یہ لاعلمی محض اداکاری تھی۔ انہیں یقیناً" سب کچھ معلوم تھا۔ وہ تعزیت کے لئے یا محض اتفاقاً" بھی نہیں آ پہنچے تھے۔ شاید سب کچھ ان کی مرضی کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ پھر گویا یکدم ان کی نظر کھڑکی سے اندر کمرے کے منظر پر پڑی اور وہ چونک کر بولے۔ "اوہ..... لگتا ہے یہاں تو کوئی خوفناک حادثہ پیش آ چکا ہے.....!"

خالد کے خیال میں ان کے الفاظ بھی ان کی اداکاری ہی کا تسلسل تھے۔ ان کے لہجے میں کوئی تاسف' کوئی پریشانی نہیں تھی..... کچھ بعید نہیں کہ وہ اس وقت میری کیفیت سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ خالد نے سوچا۔ وہ ایک ٹک ان کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے آنسو تھم چکے تھے لیکن اس کے سینے میں جیسے بہت سے انگارے جمع تھے۔ اس کی رگوں میں لہو جیسے چنگاریاں بن کر دوڑ رہا تھا مگر اس نے خود پر قابو رکھا۔ وہ بالکل خاموش اور بظاہر گویا صدمے سے گم صم تھا لیکن اس کی آنکھوں میں شاید کوئی خاص بات تھی جسے محسوس کرتے ہوئے جمشید ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولے۔ "میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ اپنی والدہ کو یہاں نہ بلانا..... مگر تم نے میری بات پر توجہ نہ دی۔ میری بات نہ ماننے والے لوگ" بڑا نقصان اٹھاتے ہیں....."

پھر ان کی آواز مدھم ہو گئی۔ "تم نے تو خود مجھے بھی اپنا بہت بڑا نقصان کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ایک بیج بویا تھا۔ تم نے پودے کے پروان چڑھنے سے پہلے اس کی زمین اجاڑ دی۔ پودا تو بچ جائے گا لیکن اب مجھے اس کی پرورش کے لئے کوئی اور تدبیر کرنی

پڑے گی....."

خالد کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ "اچھا.....تو گویا تم اعتراف بھی کر رہے ہو کہ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے....." اس نے دل میں سوچا۔ "اور تمہیں مجھ سے.....بلکہ شاید کسی سے بھی کوئی خوف نہیں.....تمہارا خیال ہے ہم سب تمہارے معمول ہیں.....ہم سب صرف وہی کریں گے جو تم چاہو گے.....ہم سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے محروم ہیں.....تمہارے اشاروں پر ناچنے والی مخلوق ہیں.....تمہارے غلام ہیں....."

وہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی غیبی قوت اس کے خیالات پر بھی اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ اس کے خلاف مزاحمت کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں جو آندھیاں سی چل رہی تھیں وہ گویا اس کی مدد کر رہی تھیں۔ وہ جیسے اس کے ذہن پر اثر انداز ہونے والی لہروں کو اڑائے لئے جا رہی تھیں اور ان کی اپنی ایک طاقت تھی جو شاید خالد کی مددگار تھی۔ اسے اس کے اپنے محسوسات کے مطابق سوچنے میں مدد دے رہی تھی۔

جمشید کا لہجہ ایک بار پھر بدلا اور وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے با آواز بلند بولے۔ "بھئی کوئی ہے.....؟ کہاں مر گئے سب.....؟ کوئی آ کر اس کمرے کا دروازہ کھولے.....ذرا آ کر دیکھو تو سہی یہاں کتنا بڑا حادثہ ہو گیا ہے۔ اس خطرناک ذہنی مریضہ نے اپنی ساس کو ہلاک کر کے خودکشی کر لی ہے....."

ان کی آواز میں جیسے جادوئی اثر تھا۔ اس سے پہلے خالد اتنا چلایا تھا مگر کوئی نہیں آیا تھا لیکن اب فوراً ہی ایک طرف سے ایک نرس آتی دکھائی دی۔ خالد ایک بار پھر ایک ٹک جمشید کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ان کی پل پل رنگ بدلتی شخصیت پر حیران تھا لیکن یک لخت ہی اسے ایک گونہ اطمینان سا بھی محسوس ہو رہا تھا کہ خود اسکے اندر اب تغیر و تبدل اور اتار چڑھاؤ یکدم رک گیا تھا۔ وہ جیسے یکسو ہو گیا تھا۔ ایک خیال پہاڑ کی سی مضبوطی سے اس کے دل میں جم گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ صرف جمشید مختار اس کی تمام تر تباہی و بربادی کا ذمہ دار تھا۔ اس نے اس کا سب کچھ لوٹ لیا تھا۔ اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

نرس نے دروازے کو دھکیل کر دیکھا پھر اپنی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر ایک چابی تالے میں لگانے لگی۔

○

سارہ جمال صاحب کے لئے چائے بنا کر لائی تو ایک بار پھر ان کی نظریں اس کے ہاتھ پر چپکی ہوئی بینڈیج پر پڑی اور ان کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ سارہ انہیں بتا چکی تھی کہ اس کے ہاتھ پر کس طرح ایک معمولی سا زخم آ گیا تھا۔ جمال صاحب کو کچھ ٹھیک



نہیں لگا تھا۔ کچھ مشکوک سی بات تھی۔ اس میں کچھ نہ کچھ پراسراریت ضرور تھی لیکن وہ خود اس کی وضاحت کرنے سے قاصر تھے۔

تحسین اس وقت آرام کر رہا تھا۔ وہ چائے پی چکا تھا اور اب اس کی حالت کافی بہتر تھی۔ گزشتہ رات کا واقعہ جسے وہ خواب سمجھ رہا تھا' اس کے شکستہ اعصاب کو اتھل پتھل کر گیا تھا لیکن اب وہ سنبھل چکا تھا۔ اس نے دوا بھی لی تھی اور آرام بھی کیا تھا۔ ایک بار پھر شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ چائے پی کر جمال صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور تحسین سے مخاطب ہوئے۔ "میں ذرا اکیلا ہی گاؤں کا جائزہ لینے جا رہا ہوں۔ تم ابھی مزید آرام کرو اور گھر پر ہی رہو....."

پھر انہوں نے کن انکھیوں سے کچن کی طرف دیکھا۔ سارہ ایک بار پھر کچن میں چلی گئی تھی۔ جمال صاحب نیچی آواز میں بولے۔ "تم ذرا سارہ کا خاص طور پر خیال رکھنا۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری میں تمہیں سونپ رہا ہوں۔"

"آپ بے فکر رہیں....." تحسین بھی نیچی آواز میں بولا۔ "اس کی حفاظت کے لئے اگر مجھے اپنی جان بھی دینا پڑی تو گریز نہیں کروں گا۔"

جمال صاحب مطمئن ہو کر سارہ کو مطلع کئے بغیر ہی گھر سے نکل آئے اور گاڑی میں بیٹھ کر گاؤں کے نواح کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ بہت غوروخوض اور بڑی تیاری کے بعد گھر سے نکلے تھے۔ شام کا دھندلکا گہرا ہو چکا تھا لیکن آخر کار انہیں پرانے اور متروک فلور مل کی نیم شکستہ عمارت کے سائے دور ہی سے دکھائی دے گئے۔ تب انہوں نے پجیرو کو پگڈنڈی سے اتارا اور جنگل کی طرف لے گئے۔ انہوں نے گاڑی درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپا دی اور باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔ تقریباً آدھا میل چل کر وہ طویل و عریض نیم شکستہ عمارت کے قریب جا پہنچے۔ اچانک ہی ایک دیوار کی اوٹ سے ایک شخص نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔

جمال صاحب کو یاد پڑتا تھا کہ وہ اسے اس وقت بھی نیاز علی کے ساتھ دیکھ چکے تھے جب گاؤں کی طرف آتے وقت ان کا اس سے سامنا ہوا تھا۔ وہ بھی یقیناً انہیں پہچانتا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے سخت گیری اور درشتی عیاں تھی۔ وہ انہیں گھورتے ہوئے کھردرے لہجے میں بولا۔ "کہاں جا رہے ہو ڈاکٹر صاحب؟" اس کے پہلو میں ہولسٹر بھی لٹکا ہوا تھا جس میں ایک ٹی ٹی موجود تھا۔ کمر سے گولیوں کی پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ غیرارادی سے انداز میں بار بار ہولسٹر کی طرف جا رہا تھا۔

"میں نیاز علی صاحب سے ملنے آیا ہوں۔" جمال صاحب نے نہایت نرمی اور شائستگی سے کہا۔

"ارے بابا.....! نیاز علی صاحب سے ملنا ہے تو ان کی حویلی پر ملو....." وہ شخص اپنے

مخصوص کھردرے انداز میں بولا۔ "نیاز علی صاحب یہاں تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔"

"لیکن میرا دل کہتا ہے کہ حویلی سے زیادہ ان کا وقت یہاں گزرتا ہے۔۔۔۔" جمال صاحب بدستور نرمی سے بولے۔ "اور مجھے معلوم ہے وہ اس وقت بھی یہاں ہیں۔ میں ان کی حویلی سے معلوم کر کے آیا ہوں۔ وہ وہاں نہیں ہیں۔"

وہ شخص ایک لمحے کے لئے الجھن میں پڑ گیا لیکن پھر گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے تم ایسے جان نہیں چھوڑو گے بڑے ڈاکٹر صاحب! آؤ میرے ساتھ آؤ۔۔۔۔" وہ اندر جانے کے لئے مڑ گیا۔ جمال صاحب اس کے پیچھے چل دیئے۔

ایک نیم شکستہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ ایک دروازے کے سامنے پہنچ کر بولا۔ "تم یہیں ٹھہرو' میں ابھی آتا ہوں۔"

ایک چابی سے دروازے کا تالا کھول کر وہ اندر غائب ہو گیا۔ جمال صاحب نے ایک بات بطور خاص نوٹ کی تھی کہ عمارت بظاہر خستہ حال دکھائی دے رہی تھی لیکن باہر سے جتنے بھی دروازے اور کھڑکیاں وغیرہ دکھائی دے رہی تھیں وہ نسبتاً نئی اور مضبوط معلوم ہوتی تھیں۔ چند منٹ بعد اس شخص نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔

اس کی رہنمائی میں وہ ایک ہال میں پہنچے۔ اندر سے عمارت کی حالت کچھ ایسی بری نہیں تھی اور نہ ہی اسے متروک کہا جا سکتا تھا حتیٰ کہ وہاں پرانا مگر مضبوط اور بھاری بھرکم فرنیچر بھی موجود تھا۔ جمال صاحب کا اندازہ درست تھا۔ اس جگہ کو آسیب زدہ مشہور کر کے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ درست بھی تھا۔ یہاں آسیب کا نہ سہی لیکن شیطانی قوتوں کا ڈیرہ ضرور تھا۔ وہ شخص انہیں بٹھا کر رخصت ہو گیا۔

جمال صاحب نے اس کے جاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ایک بڑی سی کھڑکی کا بولٹ گرا دیا۔ اس کھڑکی میں سلاخیں نہیں تھیں اور اس کا رخ بغلی برآمدے کی طرف تھا۔ ٹھوس لکڑی کے پٹ انہوں نے بند ہی رہنے دیئے۔ اب وہ بوقت ضرورت اس طرف سے اندر داخل ہو سکتے تھے۔ وہ پردہ برابر کر کے جلدی سے صوفے پر واپس جا بیٹھے۔

چند لمحے بعد ہی نیاز علی آن پہنچا لیکن اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے جمال صاحب کا یہاں آنا سخت ناگوار گزرا تھا اور وہ محض دکھاوے کے لئے بھی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ سخت اور بے مروت سے لہجے میں بولا۔ "آپ کو یہاں آنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟"

"خود میں نے ہی اپنے آپ کو مشورہ دیا تھا۔" جمال صاحب بے خوفی سے بولے پھر انہوں نے بھی بلا تمہید بات شروع کر دی۔ "میں ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کروں گا نیاز علی! میں تمہارا گیم سمجھ گیا ہوں۔ تم کسی شیطانی قوت کے آلہ کار بنے ہوئے



ہو اور خود اپنی ہی بستی کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ یہ تمہارا اپنا علاقہ ہے۔ یہاں کے لوگوں پر رحم کھاؤ اور انہیں نارمل انسانوں کی سی زندگی گزارنے دو ورنہ جو زہر تم ان کی زندگیوں میں گھول رہے ہو یہ تمہاری اپنی زندگی کو بھی چاٹ لے گا۔ شیطانیت کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ انسان کو بربادی کے کھیل اچھے لگنے لگتے ہیں۔ ان میں لطف آنے لگتا ہے۔ وہ دوسروں کے گھر جلا کر تماشہ دیکھتا اور لطف اندوز ہوتا ہے حتیٰ کہ ایک روز اچانک اس کا اپنا گھر بھی آگ کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ یوں سمجھو کہ میں ایک بزرگ کی حیثیت سے تمہیں مشورہ دے رہا ہوں۔۔۔۔ بلکہ بزرگ ہوتے ہوئے تمہاری منت کر رہا ہوں کہ اپنے طور طریقے بدل لو۔ شیطانیت سے نجات حاصل کرو اور اللہ کی مخلوق سے محبت کرنا سیکھو۔"

نیاز علی اس دوران میں غضبناک سی نظروں سے جمال صاحب کو گھورتا رہا۔ اس نے ایک مرتبہ بھی پلک نہیں جھپکی۔ جمال صاحب خاموش ہوئے تو وہ بولا۔ "ختم ہو گیا آپ کا لیکچر۔۔۔۔؟ جس طرح آپ نے یہاں آ کر میرے معاملات میں دخل دیا ہے اور جس طرح مجھ پر الزامات عائد کئے ہیں' اگر مہمانداری کا لحاظ نہ ہوتا تو میں ابھی اس بات کا بندوبست کر دیتا کہ آپ کی واپسی عمل میں نہ آتی لیکن فی الحال میں آپ کے ساتھ سب سے بڑی مہربانی یہی کر سکتا ہوں کہ آپ کو واپس بھیج دوں۔۔۔۔"

پھر اس نے بلند آواز میں پکارا۔ "ڈیو۔۔۔۔ بشیرا۔۔۔۔"

وہی آدمی جو جمال صاحب کو یہاں تک لایا تھا' اندر آیا۔ اس کے ساتھ اس سے بھی دراز قد اور تنومند ایک اور شخص تھا۔ اس کے کندھے پر کلاشنکوف تھی۔ نیاز نے جمال صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں حکم دیا۔ "صاحب کو واپس گاؤں کے قریب چھوڑ آؤ۔ گاڑی میں بٹھا کر لے جاؤ۔"

پھر وہ جمال صاحب سے مخاطب ہوا۔ "اگر آپ دوبارہ اس طرف آتے دیکھے گئے تو میں آپ کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکوں گا۔۔۔۔ اور ڈھونڈنے والوں کو یہاں آپ کی قبر بھی نہیں مل سکے گی۔" اس کے لہجے میں حد درجہ سفاکی اور سرد مہری تھی۔

ڈیو اور بشیرا نے جمال صاحب کے دائیں بائیں آ کر ان کے دونوں بازو پکڑ لئے۔ اس سے پہلے کہ وہ انہیں زبردستی اٹھاتے وہ خود ہی اٹھ کھڑے ہوئے دونوں کی گرفت آہنی تھی۔ باہر لا کر انہوں نے جمال صاحب کو ایک جگہ جھاڑیوں کے عقب میں کھڑی نیاز علی کی 'پجیرو' میں بٹھایا اور لے کر چل دیئے۔ ڈیو نے ٹی ٹی کی نال جمال صاحب کی پسلیوں پر رکھی ہوئی تھی۔

جنگل کے قریب پہنچ کر جمال صاحب التجائیہ لہجے میں بولے۔ "بس۔۔۔۔ مجھے یہاں اتار دو۔ میں خود ہی واپس چلا جاؤں گا۔ کیوں زحمت کرتے ہو۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو

گیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں دوبارہ ادھر آنے کی جرات نہیں کروں گا۔"

دونوں نے مشورہ طلب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ شاید خود بھی اس بیگار سے بچنا چاہتے تھے۔ آخر بشیرا نے گاڑی روک دی اور جمال صاحب جلدی سے گاڑی سے اتر گئے۔ ڈیبو بولا۔ "اپنی زبان کا خیال رکھنا۔ یہ زبان تمہیں مروا بھی سکتی ہے۔"

جمال صاحب نے کوئی جواب نہ دیا اور خوفزدگی کی اداکاری کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے گاؤں کی طرف چل دیئے۔ ہیڈ لائٹس کی رسائی سے دور جاتے ہی انہوں نے رفتار کم کرلی۔ اس دوران میں شاید ڈیبو اور بشیرا بھی ان کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے۔ جمال صاحب نے پیچھے دیکھے بغیر محسوس کرلیا کہ گاڑی ٹرن لے کر واپس جا رہی تھی۔ جونہی گاڑی کی آواز اور مدھم سی روشنی معدوم ہوئی انہوں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

اس بار انہوں نے زیادہ لمبا چکر کاٹا لیکن اب انہیں عمارت کے بارے میں بہت سے اندازے ہو چکے تھے اب وہ زیادہ بہتر طور پر کوئی حکمت عملی اختیار کر سکتے تھے۔ اس بار وہ عقبی سمت سے عمارت تک پہنچے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ عمارت کی صرف سامنے کی طرف سے نگرانی کی جاتی تھی۔ گاؤں کی طرف سے اگر کوئی عمارت کی طرف آتا تو ادھر سے اسے فوراً دیکھا جا سکتا تھا اور ادھر ہی سے لوگوں کی آمد کا تھوڑا بہت امکان ہو سکتا تھا۔

چار دیواری زیادہ اونچی نہیں تھی اور کئی جگہوں سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ اسے پھلانگ کر اندر پہنچنا جمال صاحب کے لئے مشکل ثابت نہیں ہوا۔ اب تاریکی گہری ہو چکی تھی۔ عمارت کے دروازوں کھڑکیوں سے بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اندر روشنی تھی یا نہیں۔ وہ کھڑکی جمال صاحب کے بہت کام آئی جس کا بولٹ وہ اندر سے گرا گئے تھے۔ اس کا پٹ نہایت آہستگی اور خاموشی سے کھول کر وہ اندر جا پہنچے۔ اس کمرے میں اندھیرا ہی تھا۔

دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ اس کے دروازے پر پہنچے تو راہداری نما ایک حصے کے اختتام پر انہیں سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دیں۔ سیڑھیوں سے نہایت مدھم سی روشنی اوپر آ رہی تھی۔ جمال صاحب دیوار کے ساتھ ساتھ کھسکتے ہوئے اس طرف بڑھے۔ سیڑھیوں سے جھانک کر انہیں اندازہ ہوا کہ نیچے کوئی تہہ خانہ تھا۔

وہ بلی کی طرح دبے قدموں سیڑھیاں اترنے لگے۔ سیڑھیوں کے اختتام پر حوالات جیسا سلاخوں والا دروازہ تھا مگر وہ کھلا تھا۔ جمال صاحب کچھ آیتیں پڑھتے اندر جا پہنچے۔ دفعتاً انہیں دیوار سے چپک جانا پڑا۔ سامنے ہی نیاز علی کھڑا تھا۔ جمال صاحب صرف ایک پہلو سے اسے دیکھ سکتے تھے۔ وہ گویا گردوپیش سے بالکل بے خبر تھا اور اس وقت وہ اپنے لباس کے اوپر کفن جیسا ایک لبادہ چڑھائے ہوئے تھا اور اب اپنے چہرے پر ایک بھیانک



ماسک چڑھا رہا تھا۔ وہ پہلے ہی کچھ کم بدشکل نہیں تھا لیکن اس ماسک نے تو اسے بالکل ہی عفریت بنا دیا تھا۔ اوپر سے وہ آتش دان کے سامنے کھڑا تھا جس میں آگ روشن تھی۔ لرزتی ہوئی نارنجی روشنی اس کے بھیانک ماسک پر پڑ رہی تھی جس سے وہ اور بھی خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔

پھر وہ ایک بڑی سی دیوار گیر الماری تک پہنچا اور اس میں سے ایک چھوٹا سا کوئی ڈبہ سا نکال لایا۔ ایک بار پھر وہ آتشدان کے سامنے آن کھڑا ہوا اور تب جمال صاحب نے دیکھا' چھوٹا سا وہ چوبی ڈبہ دراصل ایک تابوت تھا۔ اس میں خوبصورت سرخ کپڑوں میں ملبوس ننھی سی ایک گڑیا لیٹی ہوئی تھی۔ نیاز علی اسے اپنے ماسک کے سامنے لاتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں با آواز بولا۔ "جلد ہی یہاں کی تمام حسین لڑکیاں ایک ایک کر کے میری کنیزیں بن جائیں گی اور تمام خوبصورت...... کڑیل نوجوان عبرتناک موت کا شکار ہو کر بعد از مرگ بھی غلاموں کی طرح میری خدمت کریں گے...... ہا ہا ہا......"

اس کے خوفناک سراپا کے ساتھ اس کا بھیانک قہقہہ تہہ خانے میں گونجا تو جیسے دور کہیں ان گنت روحیں بین کرنے لگیں۔ پھر وہ اس ننھے سے تابوت میں دلہن کے سے روپ میں لیٹی ہوئی گڑیا کو آتشدان کے سامنے ہاتھ میں جھولے دیتے ہوئے زیر لب پڑھنے لگا۔

نیاز علی گو کہ بڑبڑانے کے سے انداز میں کچھ پڑھ رہا تھا لیکن اس کی آواز تہہ خانے میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ "کاوالوسترا..... کاوا نیسترا..... کاوالوسترا..... کاوا نیسترا....."

اس دوران میں وہ تابوت میں رکھی ہوئی ننھی سی دلہن گڑیا کو جھولے بھی دیئے جا رہا تھا۔ ایک بار اس نے جھولا دیا تو جمال صاحب کو گڑیا کا چہرہ صاف نظر آیا' انہیں وہ چہرہ اپنی بیٹی سارہ سے مشابہہ دکھائی دیا' ان کے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی' وہ سارہ کے ہاتھ پر ایک بینڈج بھی دیکھ چکے تھے اور سارہ نے انہیں بتایا تھا کہ کس طرح ایک بھکارن نما عورت کے پیالے میں اس کے ہاتھ کے خون کے چند قطرے ٹپک چکے تھے جو دوسرے ہی لمحے غائب ہو گئے تھے' یہ سب باتیں خالی از علت نہیں تھیں۔

انہیں سارہ کے بارے میں تشویش ہونے لگی لیکن یہ سوچ کر قدرے اطمینان ہوا کہ وہ تحسین کو اس کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے آئے تھے۔ وہ جلدی جلدی کچھ اور آیات کا ورد کرنے لگے۔ انہوں نے وہ پورا دن مطالعے میں گزارا تھا جس کے نتیجے میں ان کے علم میں بے حد اضافہ ہوا تھا اور انہیں یقین تھا کہ کلام الٰہی کی طاقت سے وہ نیاز علی اور اس کی سرپرستی کرنے والی شیطانی طاقتوں کا آسانی سے مقابلہ کر سکیں گے۔ اس یقین و اعتماد نے ان کے جسم میں ایک نئی طاقت بھر دی تھی۔ نیاز علی نے اس وقت اپنے مخصوص الفاظ کی نہایت تیزی کے ساتھ گردان کرتے ہوئے تابوت میں لیٹی گڑیا کو آگ کے بالکل قریب کر دیا' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بھی لمحے وہ گڑیا کو آگ میں جھونک دے گا۔

عین اس وقت وہاں سے کافی دور گاؤں میں تحسین کے مکان میں بیٹھی سارہ نے جھرجھری سی لی' اس کے سارے بدن میں جیسے آگ سی بھرتی جا رہی تھی' وہ بری طرح بے چین ہونے لگی' اس کا چہرہ اور بالائی دھڑ پسینے سے بھیگنے لگا' وہ اپنے سامنے پڑی تپائی پر جھک گئی اور آہستہ آہستہ کسی اجنبی زبان کے بول دہرانے لگی۔

"کاوالوسترا..... کاوا نیسترا..... کاوالوسترا..... کاوا نیسترا....."

تحسین جو اس وقت اپنی بیوی کے لئے ایک بار پھر دعائے مغفرت کر کے فارغ ہوا تھا' اس کی یہ بڑبڑاہٹ سن کر چونکا اور بولا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو سارہ؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"



سارہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں' تحسین کو اس کا چہرہ اجنبی اجنبی سا دکھائی دیا پھر وہ بدلی ہوئی بھاری بھاری سی آواز میں بولی۔ "ہاں..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی' اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب شیطانی سی مسکراہٹ تھی' وہ یکدم ہی ایک بدلی ہوئی سی لڑکی نظر آنے لگی تھی' وہ ہوا میں جیسے کسی غیر مرئی چیز کو ایک ٹک دیکھ رہی تھی اور اپنی جگہ کھڑے کھڑے آگے پیچھے جھول رہی تھی۔ تحسین کو شبہ ہوا کہ اسے چکر آ رہے تھے' اس نے اسے پکڑ کر زبردستی صوفے پر لٹایا اور اس کے لئے کوئی دوا لینے اس کمرے میں چلا گیا جہاں اس کا سارا طبی سامان اور دوائیں وغیرہ جمع رہتی تھیں' اس کے جاتے ہی سارہ صوفے سے اٹھی اور خاموشی سے دروازہ کھول کر بے آواز قدموں سے باہر نکل گئی۔

اس وقت وہاں سے دور نیم شکستہ عمارت کے تہہ خانے میں نیاز علی کے ہونٹوں پر ایک طمانیت بھری مسکراہٹ رینگ آئی' اس نے آنکھیں کھولیں اور والہانہ سے انداز میں گڑیا کی طرف دیکھتے ہوئے اسے واپس اسی الماری میں رکھ دیا جس سے نکالا تھا' پھر دوسری طرف کے دروازے سے کسی اور کمرے میں چلا گیا۔

چند لمحے بعد جمال صاحب دیوار کی اوٹ سے نکلے اور تہہ خانے میں جا پہنچے' انہوں نے دیوار گیر بڑی سی الماری کو کھول کر دیکھا' اس میں قطار در قطار بہت سے چھوٹے موٹے تابوت رکھے ہوئے تھے' سب میں ربڑ کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت گڑیاں لیٹی ہوئی ہیں' سب کی سب عروسی لباس میں تھیں' الماری کے نچلے خانے میں جو تابوت رکھے تھے' ان میں ربڑ کے گڈے لیٹے ہوئے تھے' ان کے لباس مختلف تھے' وہ سب بھی بے حد خوبصورت اور وجیہہ دکھائی دے رہے تھے' ایک گڑیا میں انہیں واقعی سارہ کی شباہت محسوس ہوئی اور ان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

انہوں نے جلدی سے اس تابوت کو آتشدان میں ڈال دیا' تابوت یا گڑیا نے ذرا بھی آگ نہ پکڑی حتیٰ کہ اس کا عروسی لباس بھی بالکل محفوظ تھا' تابوت میں لیٹی گڑیا ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ لئے گویا ایک ٹک جمال صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی' جمال صاحب کو کچھ خوف سا محسوس ہوا لیکن پھر انہوں نے زیر لب تیزی سے کچھ مخصوص آیات پڑھنی شروع کیں' ان کا نہ صرف خوف دور ہو گیا بلکہ تابوت اور گڑیا بھی یکدم خس و خاشاک کی طرح جل اٹھی۔

جمال صاحب نے تیزی سے ورد جاری رکھتے ہوئے ایک ایک تابوت کو اٹھا کر آگ میں جھونکنا شروع کیا' وہ سب پٹرول میں بھیگے کاغذ کی طرح تیزی سے جلنے لگے' آتشدان کی آگ بہت تیز ہو گئی' باہر آنے لگی' جمال صاحب کچھ پیچھے ہٹ گئے' اس وقت انہوں

نے آخری تابوت آگ میں جھونکا تھا' جب اچانک اپنے عقب سے وہ ایک گرجدار آواز سن کر گھومے۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم احمق آدمی! کون ہو تم؟"

جمال صاحب نے دیکھا' وہ ایک تنومند آدمی تھا اور اس کے ہاتھ میں کسی جدید آتشیں ہتھیار کے بجائے اس قسم کی ایک بھاری بھرکم اور جھلملاتی تلوار تھی جیسی پرانے وقتوں میں شاہی جلاد کسی کی گردن قلم کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے' اس شخص کا چہرہ غیظ و غضب سے بگڑا ہوا تھا' جمال صاحب نے بلا تامل کوٹ کی جیب سے ریوالور نکالا اور اس کے سینے پر فائر کر دیا۔

گولی یقینی طور پر اس کے سینے سے پار ہو گئی مگر اس کا بال بھی بیکا نہ ہوا' جمال صاحب نے اس کے سینے میں سوراخ نمودار ہوتے دیکھا مگر وہ دوسرے ہی لمحے یوں معدوم ہو گیا جیسے کیچڑ یا دلدلی مٹی میں کسی نے چھڑی چبھو کر نکال لی ہو اور مٹی دوبارہ برابر ہو گئی ہو' جمال صاحب کا یہ یقین ایک بار پھر پختہ ہو گیا کہ شیطان کے ان پیروکاروں کا دنیاوی ہتھیاروں سے کچھ نہیں بگڑتا تھا' انہیں صرف کلام الٰہی سے ہی شکست دی جا سکتی تھی اور اسی کی طاقت سے فنا کیا جا سکتا تھا۔

اس وقت ان کے دل و دماغ میں ایک عجیب سا جوش اور ہیجان بھرا ہوا تھا جس نے انہیں اس شخص سے خوفزدہ نہیں ہونے دیا اور اس عمر میں بھی انہیں گویا بے حد طاقتور اور پراعتماد بنا دیا۔ چنانچہ جب اس شخص نے آگے بڑھ کر ان پر تلوار کا وار کیا تو وہ نہایت پھرتی سے اچھل کر ایک طرف ہٹ گئے' وہ شخص اپنی جھونک میں ذرا لڑکھڑایا تو جمال صاحب نے اس کے پہلو میں لات رسید کی وہ لڑکھڑاتا ہوا کچھ اور دور چلا گیا' اس کا سر ایک ستون سے ٹکرایا اور وہ شاید ایک لمحے کے لئے چکرا گیا' تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

جمال صاحب نے لپک کر تلوار اٹھا لی اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر اٹھتا' اس کی گردن پر پوری قوت سے وار کیا' اس وقت ان کے جسم میں گویا کئی آدمیوں کی طاقت بھری ہوئی تھی' اس تنومند شخص کی گردن کٹ گئی اور سر لڑھکتا ہوا دور جا گرا' گردن سے خون کا فوارہ ابل پڑا مگر جمال صاحب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ خون گہرے نیلے بلکہ تقریباً" جامنی رنگ کا تھا' خون بہتا ہوا آتشدان کی طرف جانے لگا۔

اس دوران میں جمال صاحب نے محسوس کیا کہ قریب ہی کہیں سے چیخ و پکار کی سی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں جیسے بہت سی روحیں بین کر رہی ہوں' یہ بڑی عجیب اور جسم میں سنسنی دوڑا دینے والی آوازیں تھیں' ان کے درمیان ایک بلند اور الگ تھلگ سی غضبناک آواز بھی سنائی دے رہی تھی' کوئی دہاڑ رہا تھا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا کسی



نے گڈے اور گڑیوں کے ذخیرے کو آگ لگا دی ہے' لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ انہیں تو آگ لگ ہی نہیں سکتی.....؟"

جمال صاحب نے پہچان لیا' یہ نیاز علی کی آواز تھی شاید وہ اسی بڑے کمرے کی طرف آنا چاہ رہا تھا لیکن کوئی اس کا راستہ روک رہا تھا اور وہ چلا رہا تھا۔ "ہٹو..... میرے راستے سے ہٹو....."

اس دوران میں اس شخص کا خون بہتا ہوا آتشدان تک جا پہنچا جس کی گردن جمال صاحب نے قلم کی تھی' یہ دیکھ کر ان کی حیرت میں اضافہ ہو گیا کہ اس خون نے پٹرول کی طرح آگ پکڑ لی' آگ تیزی سے لپکتی ہوئی اس سربریدہ شخص تک آن پہنچی اور اس کا مردہ جسم بھی خشک لکڑی کی طرح جلنے لگا' تہہ خانے کی دیگر چیزوں میں بھی آگ لگ گئی جو دیکھتے ہی دیکھتے تیزی سے پھیل گئی' پورا تہہ خانہ آگ کی لپیٹ میں آتا دکھائی دے رہا تھا' جمال صاحب خود کو بچاتے ہوئے دوسرے دروازے تک پہنچے۔

اگلا کمرہ خالی تھا' اس سے گزر کر انہوں نے ایک اور دروازے سے جھانکا تو عجیب ہی منظر ان کا منتظر تھا وہ بھی ایک طویل و عریض کمرہ تھا لیکن اس کا منظر زمانہ قدیم کی کسی قربان گاہ سے مشابہہ تھا' ایک طرف قربانی کا چبوترا بھی بنا ہوا تھا جس پر جمی ہوئی خون کی سیاہ لکیریں اس کی کہنگی کا پتہ دے رہی تھیں' دیواروں پر مشعلیں روشن تھیں لیکن وہاں جو تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی' وہ ان مشعلوں کی رہن منت نہیں تھی درحقیقت وہاں بہت سے مردے ادھر سے ادھر ناچتے' بلبلاتے اور فریادی سی آوازیں نکالتے ہوئے چکرا رہے تھے' ان کے کفنوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور وہ آگ ان کے استخوانی جسموں کو بھی لپیٹ میں لے چکی تھی اسی عالم میں ان سب نے نیاز علی کو گھیرے میں لے رکھا تھا جو اس وقت اپنا بھیانک شیطانی سا ماسک اتار چکا تھا۔

جمال صاحب نے اسی ڈراؤنی فریادی سی آواز میں ایک مردے کو کہتے سنا۔ "تم بچ کر کہاں جا رہے ہو؟ جس آگ میں ہم جل رہے ہیں' اس میں تمہیں بھی تو جلنا چاہئے۔"

یہ بات وہ یقیناً" نیاز علی سے کہہ رہا تھا کیونکہ اس کے بعد تمام آتش بجاں مردے نیاز علی سے لپٹ گئے' وہ ان کے درمیان چھپ کر رہ گیا اور اس کی اذیت ناک چیخیں بھی ان کی آوازوں میں شامل ہو گئیں۔ یقیناً" اس کے جسم میں بھی آگ لگ چکی تھی' وہ سب مل کر گویا آگ کا ایک بڑا سا گولا بن گئے تھے جو چھت تک پہنچ رہا تھا۔ ادھر تہہ خانے کی آگ بھی پھیلتی ہوئی وہاں تک آ پہنچی تھی' ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر چیز آگ کی لپیٹ میں آ کر خس و خاشاک کی طرح راکھ ہو جائے گی۔

جمال صاحب کے اندازے کے مطابق اب تک تو انہیں بھی جھلس جانا چاہئے تھا لیکن وہ صرف تیز تپش محسوس کر رہے تھے تاہم انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے لئے یہاں

سے نکل لینا بہتر تھا۔ ایک طرف انہیں سیڑھیاں اوپر جاتی دکھائی دے رہی تھیں' اگر وہ اس سارے ہنگامے سے بچ بچا کر دوڑ کر ان تک پہنچ جاتے تو اوپر جا سکتے تھے اور اس نیم تباہ شدہ عمارت سے نکل سکتے تھے جو شاید اب مکمل تباہ ہونے جا رہی تھی۔

وہ تیزی سے دوڑتے ہوئے سیڑھیوں تک جا پہنچے' انہیں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی لیکن عین اسی لمحے انہوں نے سب سے اوپر کی سیڑھی پر سارہ کو نمودار ہوتے دیکھا' وہ دونوں ہاتھ پھیلائے گویا نیند کے سے عالم میں چلی آ رہی تھی' اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر ان میں خواب کی سی کیفیت تھی' تہہ خانے کے منظر نے گویا اسے خواب سے چونکا دیا' اس نے جھرجھری سی لی اور دوسرے ہی لمحے اس کی کیفیت بدل گئی۔

اب وہ ایک بیدار انسان نظر آ رہی تھی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سب کچھ دیکھ رہی تھی گویا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ وہ کہاں پہنچ گئی تھی اور کیا دیکھ رہی تھی اسی اثناء میں جمال صاحب نے اس کے عقب میں تحسین کو بھی دیکھا' وہ گویا ہانپتا ہانپتا دوڑا آ رہا تھا اور اسے پکار رہا تھا۔ "سارہ! رک جاؤ..... خدا کے لئے رک جاؤ..... وہاں مت جانا....."

اب سارہ نہ صرف رک چکی تھی بلکہ خوفزدہ انداز میں سب کچھ دیکھنے کے بعد پلٹنے بھی لگی تھی۔ جمال صاحب تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اس کے قریب جا پہنچے۔ سارہ خوف سے تھرتھر کانپ رہی تھی' جمال صاحب نے اسے بازوؤں میں بھر لیا اور سینے سے لگا لیا۔

"میری بچی.....!" وہ گلوگیر آواز میں بولے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے ڈیڈی؟ یہ آگ کیسی لگی ہوئی ہے؟" سارہ کانپتی آواز میں بولی۔

"جو کچھ بھی ہو رہا ہے' ٹھیک ہو رہا ہے اور بروقت ہو رہا ہے....." جمال صاحب بولے۔ "چلو..... تم باہر چلو....."

اس دوران میں تحسین بھی ان کے قریب پہنچ چکا تھا اور نیچے جھانکتے ہوئے ہانپ رہا تھا۔ اس نے بھی سارہ کو سہارا دیا اور وہ تینوں عمارت سے باہر آ گئے۔ کافی دور درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ وہاں تک پہنچ کر جمال صاحب رک گئے اور پلٹ کر دیکھنے لگے۔ آگ اب عمارت کے بالائی حصے کو بھی لپیٹ میں لے چکی تھی اور شعلے بلند ہوتے دکھائی دینے لگے تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھنڈرات جلنے اور زمیں بوس ہونے لگے۔

"کیا..... کیا..... سب کچھ ختم ہو گیا؟" تحسین نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں..... خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ شیطانی چکر کافی آسانی سے ختم ہو گیا۔" جمال صاحب نے طمانیت کی گہری سانس لے کر جواب دیا۔ "اس شیطانی طاقت نے جن لوگوں کو ہلاک کیا تھا' درحقیقت ان کے جسموں اور روحوں پر قبضہ جما لیا تھا لیکن اب وہ اس کے چنگل سے آزاد ہو گئے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ان کی موت مصنوعی سی تھی۔ حقیقی



موت انہیں اب آئی ہے۔ اب وہ اپنی قبروں میں موجود رہیں گے اور زندہ یا مردہ دوشیزائیں بھی اس شیطانی قوت کے سحر سے آزاد ہو چکی ہیں۔ اس گاؤں پر سے اب نحوست کے سائے ہٹ چکے ہیں۔ اب ہم اپنے دلوں میں اطمینان لے کر یہاں سے رخصت ہو سکیں گے اور تحسین بھی چاہے گا تو ایک نئے عزم کے ساتھ ایک نارمل انسان کی طرح' نارمل انسانوں کے درمیان ایک نئی زندگی شروع کر سکے گا۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد تحسین ہچکچاہٹ آمیز سے لہجے میں بولا۔ "نہیں سر! میں نے سوچا ہے اب میں بھی آپ کے ساتھ واپس ہی چلوں گا۔ میرا اب یہاں کیا رہ گیا ہے..... اور جہاں تک انسانیت کی خدمت کا تعلق ہے تو وہ تو انسان کہیں بھی رہ کر کر سکتا ہے۔ صرف جذبہ اور نیت ہونی چاہئے۔"

کچھ دیر بعد کھنڈرات کی آگ معدوم ہو گئی اور وہ تینوں تھکے تھکے قدموں سے اس طرف چل دیئے جہاں جمال صاحب نے اپنی گاڑی چھپائی تھی۔

☆.....☆.....☆

میمونہ اور جہاں آراء بیگم کی تدفین عمل میں آ چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی جیسے خالد کے اندر کی دنیا بھی بدل کر رہ گئی تھی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ جمشید کے زیر سایہ آ کر وہ برباد ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا تھا۔ اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ اب اس کے پاس کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں..... وہ بالکل تہی دست تھا اور اپنی اس تباہی و بربادی کا ذمہ دار وہ خود تھا۔

اب اس کے اندر وہ غیبی طاقت بھی دم توڑ گئی تھی جو اسے جمشید سے خوف زدہ رکھتی تھی اور ان کے خلاف سوچنے سے باز رکھتی تھی۔ شاید اس کے باغیانہ خیالات نے اس طاقت کو مغلوب کر لیا تھا یا پھر شیطانی گرفت خود ہی کچھ کمزور پڑ رہی تھی۔ اسے جمشید سے نفرت ہو گئی تھی اور اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ جس طرح اس شخص نے اسے برباد کیا تھا اسی طرح وہ بھی اسے تباہ و برباد کر کے چھوڑے گا۔ اسے نیست و نابود کر دے گا..... لیکن اس کا کوئی طریقہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جمشید دنیاوی اعتبار سے بھی ایک طاقتور آدمی تھا اور ان کی پراسرار شیطانی قوتیں اس کے علاوہ تھیں۔

تاہم جب وہ دل ہی دل میں اس فیصلے پر پہنچ گیا کہ اسے جمشید سے انتقام لینا تھا تو پھر اس کے لئے اس عمارت میں ان کے زیر سایہ رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ اس کا دل غم و غصے سے بوجھل تھا لیکن ساتھ ہی وہ ایک عجیب سی پریشانی اور بے چینی میں بھی مبتلا تھا۔ کوئی غیبی طاقت گویا اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ اس اپارٹمنٹ سے نکل بھاگے جس میں رہائش اختیار کرتے ہی وہ سمجھا تھا کہ اس کا زبردست ترقی کا سفر شروع ہو گیا ہے لیکن درحقیقت وہ اس کی تباہی و بربادی کا آغاز تھا۔

رات ڈھل رہی تھی اور اس کے لئے بے چینی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ بستر پر کروٹیں لیتے لیتے آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چھوٹے سے ایک بیگ میں اس نے اپنی صرف انتہائی ضروری چیزیں ڈالیں اور خاموشی سے اپارٹمنٹ سے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے درودیوار پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور لفٹ کے ذریعے نیچے آگیا لیکن اس نے مین گیٹ کا رخ نہیں کیا' اسے معلوم تھا کہ مین گیٹ پر گارڈ موجود ہو گا۔ اسے اندیشہ تھا کہ گارڈ اس وقت اسے باہر نہیں جانے دے گا۔ عین ممکن تھا کہ اسے جمشید سے اس سلسلے میں کچھ ہدایات مل چکی ہوں۔

بلڈنگ کے عقب میں ایک چھوٹا سا گیٹ موجود تھا۔ وہ اس طرف چل دیا۔ اسے کچھ زیادہ امید نہیں تھی کہ ادھر سے بھی وہ نکلنے میں کامیاب ہو سکے گا۔ اگر جمشید اپنی پراسرار شیطانی قوتوں کے ذریعے اس وقت اس کی طرف متوجہ ہوتے اور اس کی نقل و حرکت دیکھ رہے ہوتے تو وہ کامران کے ذریعے یا کسی اور طرح کسی بھی لمحے اس کا راستہ روک سکتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت وہ اس کی طرف سے غافل تھے۔

وہ اپنی چابی کے ذریعے خاموشی سے پچھلے گیٹ کا تالا کھول کر باہر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اپنی گاڑی بھی نکالنے کی زحمت نہیں کی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا تیزی سے مین روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے گویا اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اس نے ذرا بھی تاخیر کی شاید تو ہزاروں بدروحیں اس کے تعاقب میں روانہ ہو جائیں گی۔

اس کی خوش قسمتی کہ رات کے اس پہر اسے اس سنسان علاقے میں مین روڈ پر کچھ دور پہنچ کر ایک ٹیکسی مل گئی اور وہ اس میں بیٹھ کر صدر کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں آگیا۔ وہ کچھ دیر اس عمارت اور اس کے ماحول سے دور کہیں بیٹھ کر سکون اور یکسوئی سے کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ ہوٹل کے چھوٹے سے کمرے میں پہنچ کر اسے بے حد سکون کا احساس ہوا۔ اس عظیم الشان بلڈنگ اور اس اپارٹمنٹ کی کشادگی' آسائشیں اور بیش قیمت چیزیں آج اسے کاٹنے کو دوڑنے لگی تھی جہاں وہ آج تک رہتا آیا تھا۔

اس نے کپڑے بھی نہیں بدلے اور بیڈ پر دراز ہو کر چھت کو تکتے ہوئے حالات پر غور کرنے لگا۔ وہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کس طرح وہ جمشید اور ان کی چھوٹی سی شیطانی سلطنت کو تباہ کر سکتا تھا۔ بہت دیر کی سوچ بچار کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو جو کچھ بھی بنا تھا' جمشید کے زیر سایہ ہی رہ کر بنا تھا۔ ان کے بغیر تو وہ ایک معمولی' کمزور اور بے وسیلہ سا آدمی تھا۔ ایک عجیب سی بے بسی کے احساس سے اس کا دل بھر آیا اور پھر وہ بے اختیار چپکے چپکے رونے لگا۔

کافی دیر تک وہ ایک ننھے بچے کی طرح ہلکی ہلکی سسکیوں کے ساتھ روتا رہا آخر کار آنسو ختم ہو گئے۔ رونے سے اسے اپنے دل کا غبار ہلکا ہوتا محسوس ہوا۔ اچانک اسے سامنے



ہی ایک کارنس پر قرآن پاک اور جائے نماز دکھائی دیا۔ اس سے پہلے بھی اسے کئی بار ہوٹلوں میں قیام کا اتفاق ہوا تھا لیکن اس نے کبھی توجہ نہیں دی تھی کہ اکثر ہوٹلوں میں کمروں میں جائے نماز اور قرآن پاک کی موجودگی کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ اس روز اسے یاد آیا کہ اس نے تو برسوں سے کبھی عید کی نماز بھی نہیں پڑھی تھی اور قرآن پاک اس نے لڑکپن میں پڑھ کر ایک بار لپیٹ کر رکھ دیا تھا تو پھر آج تک نہیں کھولا تھا۔

اس کی والدہ اس بات پر اکثر اسے ٹوکتی رہتی تھیں۔ کئی بار انہوں نے سختی سے سرزنش بھی کی لیکن اس کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی تھی۔ اس کے دل پر جیسے اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس معاملے میں وہ کچھ بے حس ہو گیا تھا آج اسے پہلی بار ایک عجیب سی ندامت کا احساس ہوا۔ وہ گویا ایک ایسے مالک کا مغرور غلام تھا جس نے اسے زندگی کی ہر نعمت عطا کی تھی لیکن وہ پھر بھی اس کا در چھوڑ کر ادھر سے ادھر بھٹکتا پھر رہا تھا اور اس نے کبھی اس مہرباں اور شفیق مالک کے در کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ کیسا ناشکرا اور احسان فراموش تھا۔ ایک بار پھر اس کے آنسو بہنے لگے۔ آج دل پر رقت طاری تھی دل حقیقی سوز غم سے آشنا ہو رہا تھا۔ جیسے وہ سراپا گداز بن گیا تھا۔ دل پر دو بڑے زخم لگے تھے تو گویا اس کا پتھر کا سا وجود پگھل کر موم ہونے لگا تھا۔

اچانک ہی وہ بستر سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ ابھی عشاء کا وقت باقی تھا۔ اس نے وضو کیا۔ کارنس سے جائے نماز اتاری اور قبلہ رو ہو کر نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ زندگی میں شاید اس نے کبھی اتنے خلوص نیت سے نماز نہیں پڑھی تھی۔ اس دوران میں بھی کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں نمی چھلک آئی۔

نماز کے بعد اس نے کارنس سے قرآن پاک اتارا اور بیٹھ کر نیچی آواز میں تلاوت کرنے لگا۔ لڑکپن کے بعد اس نے کبھی قرآن کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا اس پر اٹک اٹک کر پڑھ رہا تھا۔ اس نے سورہ فاتحہ سے آغاز کیا اور جوں جوں آگے بڑھتا گیا' زبان میں روانی آتی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بار پھر اس کے آنسوؤں میں بھی روانی آنے لگی۔ اسے کچھ احساس نہ رہا کہ وہ کتنی دیر تک تلاوت کرتا رہا۔

جاء نماز اس نے دیوار کے قریب ہی بچھائی ہوئی تھی۔ ایک بار اس نے تھکن سی محسوس کرتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگائی تو اسے غنودگی سی آگئی۔ مدت بعد اس کے اعصاب کو ایسا سکون ملا تھا اس لئے وہ اسی عالم میں بیٹھے بیٹھے نیند کی سی حالت میں چلا گیا لیکن وہ خود کو بیدار ہی محسوس کر رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا اس کے بیڈ پر ایک نہایت دبلے پتلے مگر نورانی چہرے کے مالک بزرگ بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ خالد کو ان کی صورت کچھ مانوس سی محسوس ہوئی لیکن اسے یاد نہ آیا کہ اس سے پہلے اس نے انہیں کہاں دیکھا

تھا۔

"اس کمرے میں تو ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تم یہاں کہاں سے گھس آئے؟" وہ نہایت مشفقانہ لہجے میں بولے۔

"مجھے تو یہ کمرہ ہوٹل والوں نے دیا ہے بزرگوار! انہوں نے تو مجھے نہیں بتایا کہ اس میں کوئی پہلے سے ٹھہرا ہوا ہے۔" خالد نے جواب دیا۔

"ہاں.....وہ بے چارے بھلا کیسے بتاتے۔" بزرگ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "انہیں خود نہیں معلوم کہ ہم یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"حیرت ہے.....! آپ ان کی لاعلمی میں ٹھہرے ہوئے ہیں؟" خالد بولا۔

"ہاں.....ایک آدھ دن کی تو بات ہے.....پھر ہم نہ جانے کس طرف کو نکل جائیں۔ اس لئے ہم نے سوچا ہوٹل والوں کو اپنے بارے میں کیا بتانا.....! شاید ہم انہیں نظر ہی نہ آتے.....اور جو لوگ نظر نہیں آتے ان سے بات چیت کرنے میں دنیا والوں کو بڑی دقت ہوتی ہے۔" وہ بدستور مسکرا رہے تھے۔

"آپ کون ہیں؟ آپ کی صورت مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی ہے۔" خالد ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"تم ہمیں بھی بھول گئے.....ہمارا پڑھایا ہوا سبق بھی بھول گئے.....ماں کی بتائی ہوئی باتیں بھی بھول گئے.....تم سب کچھ بھول گئے.....ایسے ہی لوگوں کے تو دل سیاہ ہو جاتے ہیں اور پھر شیطان اپنے چیلوں کے ذریعے ان سیاہ دلوں پر قبضہ کر لیتا ہے.....!" بزرگ کچھ افسوس زدہ سے لہجے میں بولے۔

تب خالد کو اچانک یاد آیا وہ حافظ تاج محمد تھے جو بچپن میں اسے گاؤں کی مسجد میں دوسرے کئی بچوں کے ساتھ قرآن پڑھایا کرتے تھے۔ وہ امام مسجد بھی تھے لیکن روایتی اماموں سے بہت مختلف تھے۔ مسجد ہی میں ایک حجرے میں رہتے تھے اور دنیا سے گویا ان کا ناطہ ٹوٹا ہوا تھا۔ کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے۔ بالکل تنہا تھے کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کون تھے' کہاں سے آئے تھے۔ اس وقت بھی وہ بہت ضعیف تھے اور خالد کو یاد تھا کہ اسی زمانے میں ان کا تو انتقال ہو گیا تھا لیکن اب وہ خالد کے سامنے بیٹھے تھے تو نہ جانے کیوں خالد کو اس بات پر کوئی خاص حیرت نہیں ہو رہی تھی۔

"حافظ تاج محمد صاحب.....!" وہ یکدم ایک عجیب و غریب سے جوش سے چلا اٹھا۔

بزرگ مسکرائے۔ "خدا کا شکر ہے تمہیں کچھ تو یاد آیا.....سب کچھ لٹا کر ہی سہی.....لیکن تم ہوش میں تو آئے.....اب اس کے حضور میں پیش ہوئے ہو جس سے تمہیں بہت پہلے ہی مدد مانگ لینی چاہئے تھی.....خیر.....اب بھی وقت ہے.....تم جمشید کو فنا



کرنا چاہتے ہو.....جاؤ.....جلدی سے جا کر دنیا کو اس کے بوجھ سے نجات دلا دو.....تمہارے لئے یہ ایک اعزاز ہے کہ یہ کام تمہارے ہاتھ ہو رہا ہے۔"

"یعنی آپ کو معلوم ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں....." خالد حیرت سے بولا پھر اس نے جواب کا انتظار کئے بغیر بے تابی سے کہا۔ "لیکن میں بھلا یہ کام کیسے کر سکتا ہوں! میں ایک کمزور اور بے وسیلہ آدمی ہوں۔ میں تو اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ تو اتنی پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ ذہنوں میں جھانک لیتا ہے۔ ارادے جان لیتا ہے اور اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے کسی کو بھی ٹھکانے لگا دیتا ہے۔"

حافظ تاج صاحب نے تاسفانہ انداز میں سر ہلایا۔ "تم واقعی سارے سبق بھول گئے ہو۔ شاید اس لئے کہ ایک زمانے سے تم نے وہ سبق دہرائے نہیں.....تم ایک گم کردہ راہ مسافر ہو' اس لئے تمہیں ہر چیز بہت مشکل لگ رہی ہے۔ میں نے اور تمہاری والدہ مرحومہ نے پچاسوں مرتبہ تمہیں بتایا تھا کہ تمہارے پاس تو ہر مسئلے کا حل' پھر بڑی سے بڑی مصیبت میں کام آنے والا مددگار اور ہر جنگ میں فتح دلانے والا سب سے بڑا ہتھیار موجود ہے۔"

"وہ کیا ہے.....؟ کہاں ہے؟" خالد نے بے تابی سے پوچھا۔

"تمہارے سامنے تو رکھا ہے۔"

خالد نے سر جھکا کر دیکھا۔ اس کے سامنے قرآن پاک رکھا تھا۔ اس نے حیرت سے دوبارہ حافظ تاج محمد صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "بس.....اسے اٹھاؤ اور ہاتھوں میں لئے اس عمارت کے دروازے پر چلے جاؤ جہاں شیطان کے وہ سارے چیلے جمع ہیں۔ یہ وقت اس اعتبار سے بہت اچھا ہو گا کہ اس وقت وہ سب ایک ہی جگہ موجود ہیں۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" خالد نے شکی سے لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھنا۔" جواب ملا۔

"کیا یہ اتنا ہی آسان کام ہے؟" خالد کے لہجے میں اب بھی شک تھا۔

حافظ صاحب ترحم آمیز سے بولے۔ "اللہ تعالیٰ نے تو زندگی کو انسان کے لئے بہت آسان بنایا تھا اور تمام مسائل کے حل بہت آسان رکھے تھے لیکن یہ بدبخت دنیا دار انسان دن بدن اپنی زندگی کو مشکل سے مشکل تر بناتا چلا گیا۔ اس نے اپنے آپ کو گنجلک خواہشوں کی ایک عجیب و غریب دلدل میں پھنسا لیا۔ مسائل اس کے اپنے پیدا کردہ ہیں اس لئے ہر مسئلہ اس کے لئے ایک عفریت ہے.....اور جہاں تک جمشید کا تعلق ہے.....تو اس قسم کے لوگ تم جیسے لوگوں کی نظر میں بڑے اور طاقتور ہوتے ہیں.....اوپر والے کی نظر میں نہیں....." انہوں نے انگلی اٹھا کر اوپر اشارہ کیا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولے۔ "اس قسم کے لوگوں کی ساری شان و شوکت' دبدبہ' ان کی شیطانی طاقتیں' ان کے وسائل' ان کی تعمیر کردہ چھوٹی چھوٹی سلطنتیں..... یہ سب بظاہر بڑی مضبوط' بڑی طاقتور اور ناقابل شکست دکھائی دیتی ہیں لیکن درحقیقت وہ جو کائنات کی سب سے بڑی قوت ہے اس کے سامنے یہ ہوائی قلعوں اور خس و خاشاک کی طرح ہوتی ہیں۔ جب اس کا اشارہ ہوتا ہے تو یہ سب کچھ اس طرح اڑنے لگتا ہے جیسے تیز آندھیوں میں تنکے..... جیسے بگولوں کی زد میں ریت کے گھروندے....."

"اور یہ کام مجھ گنہگار کے توسط سے ہونا ہے؟" خالد نے بے یقینی سے پوچھا۔

حافظ صاحب اس کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں قدرے افسردگی سے مسکرائے اور بہت دھیمی آواز میں بولے۔ "اپنے بدترین بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ زندگی میں کم از کم ایک اچھا کام کرنے کا موقع تو عطا فرما ہی دیتا ہے....." یہ کہتے ہوئے وہ وہیں بیٹھے بیٹھے خالد کی نظروں سے غائب ہو گئے۔

خالد نے ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ دیوار کے سہارے بیٹھا تھا۔ قرآن پاک اس کے سامنے کھلا رکھا تھا اور سردی کے باوجود اس کا جسم پسینے میں تر تھا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا مگر اس نے جو کچھ دیکھا تھا جو کچھ سنا تھا اسے بہت اچھی طرح یاد تھا اور وہ اس پر فوری طور پر عمل کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس نے قرآن پاک کو جز دان میں لپیٹا اور سینے سے لگا کر دیوانوں کی طرح کمرے سے نکل کھڑا ہوا۔ اس وقت سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ استقبالیہ پر وہ اونگھتے ہوئے کلرک کے سامنے سے گزرتا چلا گیا مگر اس نے نظر اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھا۔

ہوٹل کے قریب سے خالد کو ٹیکسی مل گئی اور وہ اس میں بیٹھ کر اس بلڈنگ کی طرف روانہ ہو گیا جس میں رہ کر اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ بلڈنگ سے کچھ دور ہی وہ ٹیکسی سے اتر گیا۔ اس طرف ویسے بھی عمارتیں خالی خالی ہی تھیں۔ ہر طرف سناٹے اور ویرانی کا راج تھا۔ ابھی یہاں زندگی بیدار ہونا شروع نہیں ہوئی تھی۔ اپنی بلڈنگ کے قریب پہنچ کر خالد نے دیکھا وہ صبح کے ملگجے اجالے میں لپٹی' اپنی تمامتر جدت اور خوبصورتی کے باوجود کسی بھوت گھر سے مشابہہ دکھائی دے رہی تھی اور ایک بہت بڑے ہیولے کی طرح ایستادہ تھی۔

خالد دونوں ہاتھوں پر قرآن پاک اٹھائے دیوانوں کی طرح اس کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں سے اس وقت بھی آنسو رواں تھے اور دل و دماغ پر ایک عجیب سا ہیجان طاری تھا۔ بلڈنگ کا گیٹ بند تھا اور وہ اپنے دیوانگی کے سے عالم میں سیدھا گیٹ سے جا ٹکرایا۔ دوسرے ہی لمحے اسے گھبرا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ ایک خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی تھی۔

پھر اسے اپنی زندگی کا سب سے حیران کن منظر دکھائی دیا۔ اتنی بڑی عمارت یکدم ہی



چاروں طرف سے اس طرح شعلوں کی لپیٹ میں آگئی جیسے گتے کے چھوٹے سے گھر پر پٹرول چھڑک کر اسے تیلی دکھادی گئی ہو۔ خالد کو عجیب مکروہ اور بھیانک سی چیخیں سنائی دینے لگیں جیسے ان گنت بدروحیں اس آگ میں گھر گئی ہوں۔

وہ کچھ دور کھڑا یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اسے نہ تو تپش محسوس ہو رہی تھی اور نہ ہی اب اس پر خوف و گھبراہٹ کا غلبہ رہا تھا۔ اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ اس کے سامنے اتنی بڑی آتشزدگی برپا تھی' کبھی کبھی گڑگڑاہٹ کی سی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی اور کریہہ و بھیانک قسم کی معدوم ہوتی چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں لیکن آس پاس کہیں سے اس کا کوئی ردعمل دکھائی نہیں دیا تھا۔

اس عمارت کے آس پاس تو کوئی دوسری عمارت نہیں تھی لیکن جس طرح اس میں آگ لگی ہوئی تھی' اس کا تو بہت دور دور تک بہت سے لوگوں کو علم ہو جانا چاہئے تھا مگر ہر طرف وہی سکوت' وہی خاموشی' وہی سناٹا تھا۔ خالد کو کچھ یوں لگا جیسے آتشزدگی کا یہ منظر صرف وہی دیکھ رہا تھا' وہ چیخیں اور گڑگڑاہٹ صرف اسے ہی سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے ادھر ادھر بہت دور تک دیکھا۔ مین روڈ پر اسے اکا دکا گاڑیاں بھی جاتی دکھائی دیں لیکن اس طرف جیسے کوئی متوجہ ہی نہیں تھا۔

جلد ہی شعلے مدھم پڑنے لگے۔ گڑگڑاہٹ کی سی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ چیخیں بھی معدوم ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ شعلے بھی غائب ہو گئے اور یہ دیکھ کر خالد کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ وہاں نہ تو سوختہ ملبے کا انبار تھا اور نہ ہی کسی بھی قسم کا جلتا سلگتا سامان بکھرا دکھائی دے رہا تھا بلکہ اس کی نظروں کے سامنے صرف ایک بڑا سا خالی پلاٹ تھا جس پر تھوڑی بہت جھاڑیاں بھی اگی ہوئی تھیں۔ وہ عمارت یوں غائب ہو چکی تھی جیسے اس کا چند منٹ پہلے تک تو کیا' برسوں پہلے بھی وہاں قطعاً" کوئی وجود نہیں تھا۔ اس نے بے یقینی سے کئی بار آنکھیں زور زور سے کھولیں اور بند کیں لیکن منظر نہ بدلا۔ اسے گمان گزرا کہ شاید جمشید ایسوسی ایٹس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز اسی طرح نیست و نابود ہو چکی ہو۔ وجود سے عدم وجود کی طرف لے جا چکی ہو۔

تب یکدم ہی اس نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اس کی رگ و پے میں طمانیت اور شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ واپس روانہ ہوا تو خود کو ایک نیا انسان محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک کاروباری عمارت کے سامنے سے گزر رہا تھا جب اس نے سامنے سے ایک کار کو تیز رفتاری سے آتے دیکھا۔ گو کہ دن کا اجالا پھیلنے لگا تھا لیکن ابھی روشنی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ کار کی ہیڈ لائٹیں روشن تھیں۔ وہ تیز رفتاری سے ہی اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔

چند سیکنڈ بعد ایک موٹر سائیکل نمودار ہوئی۔ اس کی ہیڈ لائٹ روشن تھی۔ وہ بھی

تیز رفتاری سے اسی سمت میں جا رہی تھی جدھر کار گئی تھی.....بلکہ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کار کا تعاقب کر رہی تھی لیکن کچھ ہی دور جا کر موٹر سائیکل کی رفتار کم ہوئی پھر وہ مڑ کر واپس آنے لگی۔ خالد نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا لیکن اپنے راستے پر چلتا رہا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ فراٹے سے گزرنے والی کار میں شمشیر علی کے چار ساتھی تھے۔ موٹر سائیکل پر شمشیر علی خود تھا۔ وہ لوگ اس وقت کلفٹن کے ایک بنگلے میں کامیابی سے ڈاکہ ڈالنے کے بعد اس راستے سے واپس جا رہے تھے جو ان کے خیال میں زیادہ محفوظ تھا۔ کار اور موٹر سائیکل دونوں چوری کی تھیں۔ شمشیر نے مصلحتاً خود ہی موٹر سائیکل پر رہنا پسند کیا تھا اور اب اپنے ساتھیوں کے پیچھے پیچھے جاتے وقت اچانک اس کی نظر سڑک کے کنارے کنارے جاتے ہوئے خالد پر پڑی تھی اور وہ حیران رہ گیا تھا کہ وکیل اس وقت موٹی سی کوئی کتاب سینے سے چمٹائے خبط الحواس انسانوں کی طرح کہاں چلا جا رہا تھا؟ علی الصبح اسے پیدل کہاں جانے کی ضرورت پیش آگئی تھی؟ اس کا انداز جوگنگ کرنے کا بھی نہیں تھا۔

شمشیر کے نزدیک ان سوالوں کی تو کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اصل اہمیت تو اس بات کی تھی کہ بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال اس کے ذہن میں لپکا تھا.....اور وہ یہ کہ شاید قدرت اسے یہ موقع فراہم کر رہی تھی۔ جو کام وہ ہفتے دس دن یا مہینے بعد کرنے کا ارادہ رکھتا تھا' اسے لگے ہاتھوں آج ہی نمٹایا جا سکتا تھا۔ اس سے اچھا موقع ملنا تو مشکل ہی تھا۔ اس علاقے میں تو ابھی زندگی خوابیدہ تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے ضرور بچھڑ رہا تھا لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ واردات کے بعد وہ کبھی کبھار بچھڑ ہی جاتے تھے لیکن پھر طے شدہ مقام پر یکجا ہو جاتے تھے۔ آج بھی ایسا ہو سکتا تھا۔ بیچ میں یہ دو چار منٹ کا کام بھی نمٹاتے ہوئے چلنا چاہئے۔ یہی سب کچھ چند لمحوں کے اندر اندر سوچ کر شمشیر نے موٹر سائیکل موڑی تھی۔

وہ چاہتا تو دور سے ہی خالد کو گولی مار کر فرار ہو سکتا تھا۔ ٹی ٹی اس کی قمیض کے نیچے بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا اور سڑک کے کنارے کنارے جاتا ہوا خالد اس وقت ایک نہایت آسان ٹارگٹ تھا لیکن شمشیر اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ کس کے ہاتھوں مر رہا تھا اور کیوں مر رہا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل خالد کے عین سامنے لے جا کر روکی اور دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "کہاں جا رہے ہیں وکیل صاحب؟"

خالد ذرا گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تھا لیکن نوجوان کو دوستانہ انداز میں مسکراتے دیکھ کر اس کا خوف دور ہو گیا۔ نوجوان نے اسے "وکیل صاحب" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔اس کا مطلب تھا وہ اسے جانتا تھا۔ خالد کو بھی کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس



نوجوان کو کہیں دیکھ چکا تھا لیکن اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا تھا۔

"بس.....یونہی ذرا ایک کام سے جا رہا تھا۔" خالد نے ذرا رکھائی سے جواب دیا۔ وہ اس وقت کسی کو کچھ بتانا یا راستے میں رکنا نہیں چاہتا تھا لیکن نوجوان موٹر سائیکل سے اتر کر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"مجھے آپ سے ایک کیس کے بارے میں بات کرنا تھی وکیل صاحب!" شمشیر بولا۔

"اس وقت میں کسی کیس کے بارے میں بات کرنا نہیں چاہتا۔ پھر کسی وقت مجھ سے رابطہ کیجئے گا۔" خالد نے کترا کر نکلنے کی کوشش کی لیکن نوجوان بدستور اس کے راستے میں حائل رہا۔

"یہ آپ کے ہاتھوں میں کیا ہے.....؟" نوجوان بولا۔ پھر اسے خود ہی انداز ہو گیا۔ "ارے.....یہ تو قرآن پاک ہے.....!" وہ ایک لمحے کے لئے گویا حیرت زدہ رہ گیا لیکن پھر سنبھل کر اسے اس کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے بولا۔ "ایسی مقدس کتاب کا آپ جیسے اور مجھ جیسے گناہگار انسانوں کے ہاتھوں میں کیا کام.....اسے یہاں ذرا اونچی جگہ پر رکھ دیجئے.....ہم بات کرلیں تو پھر لے جائیں گے....." اس نے مقدس کتاب کو ایک ہائی روف کے جنگلے پر رکھ دیا اور خالد کا بازو تھام کر دوستانہ سے انداز میں ٹہل ٹہل کر بات کرنے کے انداز میں اس کاروباری عمارت کے کونے کی طرف لے گیا۔ ادھر چھوٹی گلی تھی۔

"آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں؟" شمشیر وہاں پہنچ کر بولا۔

خالد نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر تمہیں کیس کے بارے میں ہی بات کرنا تھی تو پھر کسی وقت....." اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس نوجوان سے کیسے جان چھڑائے جو مخواہ کمبل ہوا جا رہا تھا۔

"پھر کسی وقت کی بات جانے دیجئے وکیل صاحب! کیا پتہ زندگی کسی کو کسی کام کی مہلت دے یا نہ دے۔ ویسے بھی میں آپ سے ایک ایسے کیس کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں جس کا عدالت تو فیصلہ دے چکی ہے لیکن ایک فیصلہ میں بھی دینا چاہتا ہوں.....کافی عرصہ پہلے آپ نے حیدر آباد میں ایک دس سالہ بچی کے ساتھ زیادتی کے ملزم نیاز علی کا مقدمہ لڑا تھا....."

تب اچانک خالد کو یاد آگیا۔ وہ شاہدہ کا بھائی شمشیر علی تھا جسے وہ اس وقت عدالت میں معمولی کرتے' شلوار اور کبھی کبھی مختصر سی پگڑی کے ساتھ کئی بار اچٹتی سی نظروں سے دیکھ چکا تھا۔ اس وقت وہ جینز' عمدہ قمیض اور لیدر کی جیکٹ میں تھا۔ اسے یکدم کسی خطرے کا احساس ہوا۔

وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ "اوہ.....یہ تم ہو شمشیر علی.....! دیکھو مجھے اب احساس ہو چکا ہے۔ میں نے وہ مقدمہ لڑ کر اور نیاز علی کو بری کروا کر غلطی کی تھی..... لیکن.....اب میں

ایک بدلا ہوا انسان ہوں.....میں اس قسم کے مقدموں میں وکیل صفائی بننے سے ہی نہیں.....بلکہ یوں سمجھو فی الحال تو وکالت سے ہی تائب ہو چکا ہوں.....تم.....تم مجھے معاف کر دو.....“

مگر اس وقت تک شمشیر علی ٹی ٹی نکال چکا تھا۔ وہ زہریلے انداز میں ہنسا۔ ”شکر ہے آپ نے مجھ غریب کو پہچان لیا.....لیکن موت کو سامنے دیکھ کر آپ جیسے لوگ بھی عجیب عجیب باتیں کیوں کرنے لگ جاتے ہیں؟“

”دیکھو شمشیر علی.....!“ خالد نے پھنسی پھنسی آواز میں ایک بار پھر اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن شمشیر نے اسے مزید کچھ بولنے کی مہلت نہیں دی۔ اسے بھی احساس تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ بات کو طول دینا خواہ مخواہ زیادہ خطرہ مول لینے کے مترادف تھا۔ اس نے پھرتی سے ٹی ٹی خالد کے چہرے کی طرف کیا اور تیزی سے دو مرتبہ ٹریگر دبا دیا۔ خالد کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا اور دہن کی جگہ ایک بڑا سا زخم رہ گیا۔ ان دونوں جگہوں سے بھل بھل خون ابل پڑا۔ خالد زمین پر گرا تو اس کی آنکھیں حیرت و وحشت سے کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ شمشیر نے نفرت سے اس کی لاش کو ایک ٹھوکر رسید کی اور پلٹ کر اس طرف دوڑا جہاں اس کی موٹر سائیکل سٹارٹ حالت میں ہی کھڑی ہوئی تھی۔

وہ ٹی ٹی کو بیلٹ میں اڑس کر موٹر سائیکل پر بیٹھ کر تیزی سے روانہ ہی ہوا تھا کہ اسے عقب سے کسی پولیس موبائل کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ اس نے خالد کے پاس رکنے سے پہلے چاروں طرف دور دور تک دیکھ کر اطمینان کر لیا تھا۔ اسے کہیں پولیس کی کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی لیکن شاید یہ کسی عمارت کے عقب میں موجود تھی اور فائروں کی آواز سن کر ادھر آ رہی تھی یا پھر کہیں اور سے آتی ہوئی اتفاقاً یہاں اس وقت پہنچی تھی جب فائروں کی آواز گونجی تھی۔

موبائل والوں نے دور سے ہی شمشیر کو تیزی سے روانہ ہوتے دیکھ لیا تھا۔ موبائل اس کے پیچھے لگ گئی اور جلد ہی قریب آ پہنچی۔ انہوں نے کئی بار سائرن اس انداز میں بجایا اور ہارن بھی دیا جیسے ان کے ذریعے اسے رکنے کا اشارہ دے رہے ہوں۔ کسی نے چیخ کر کچھ کہا بھی.....لیکن شمشیر کو اس وقت ہوا کی شاں شاں کے علاوہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ آخر موبائل سے ایک فائر ہوا۔ شمشیر کی موٹر سائیکل بری طرح لہرا کر فٹ پاتھ سے ٹکرائی اور شمشیر خود اچھل کر ذرا دور تک گویا اڑتا ہوا ایک کھمبے سے جا ٹکرایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ وہ چاروں خانے چت سڑک پر آن پڑا اس کی آنکھیں البتہ خالد کی طرح کھلی نہیں تھیں۔ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی تھیں۔ گولی صرف اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ ایک اے ایس آئی نے اس کی ٹانگ کا نشانہ لے



شش تو یہی کی تھی کہ اسے صرف رکنے پر مجبور کیا جائے لیکن کھمبے سے سر ٹکرانے کی
سے فوراً ہی اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔

موبائل اس کی لاش کے قریب آ کر رکی تو سائرن گویا اس کی موت پر نوحہ گری کر
تھا۔

(ختم شد)